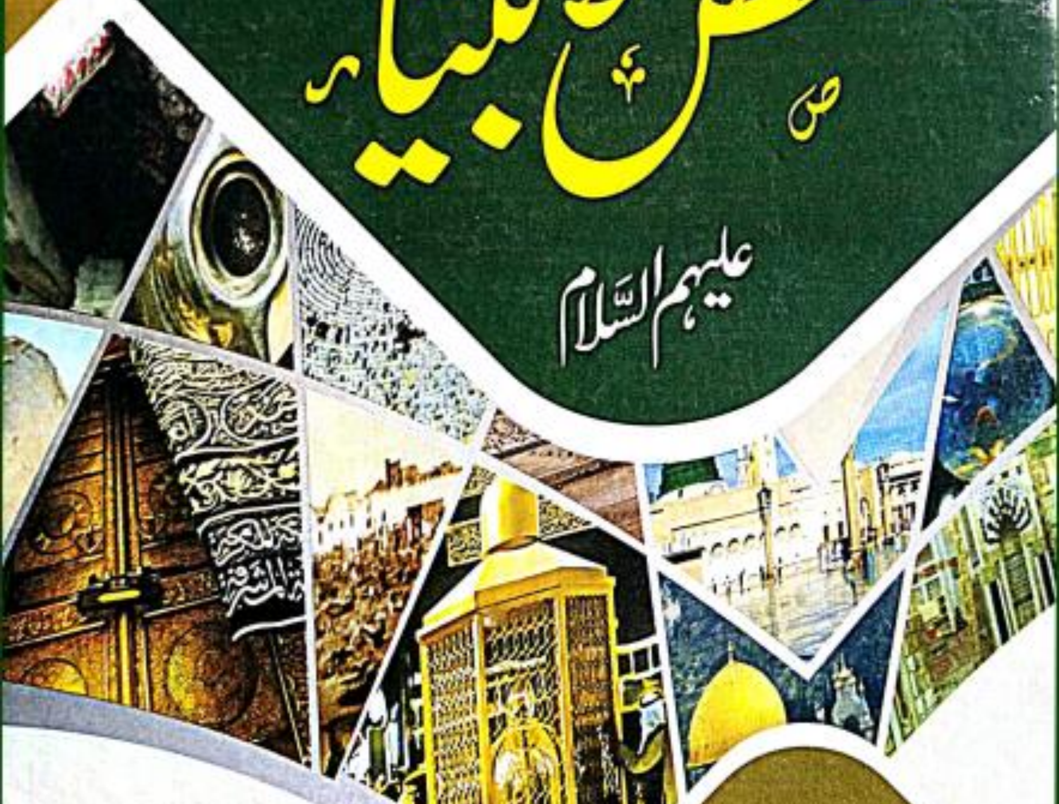
مستند

قصص الانبیاء

علیہم السلام



از افادات

مفتی اعظم حضرت مولانا

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

ودیگر اکابرین

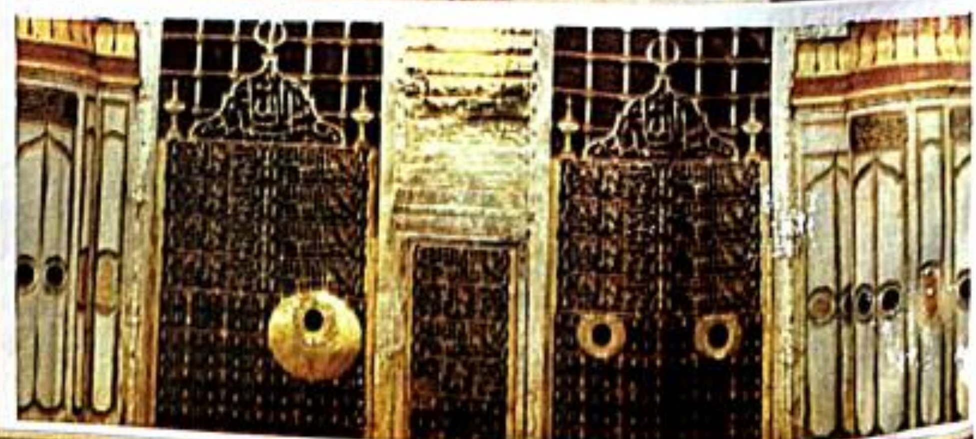
ادارہ تالیفات اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان
0322-6180738
061-4519240



جبل اُحد کا وہ غار جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی ہونے کے بعد آرام فرمایا

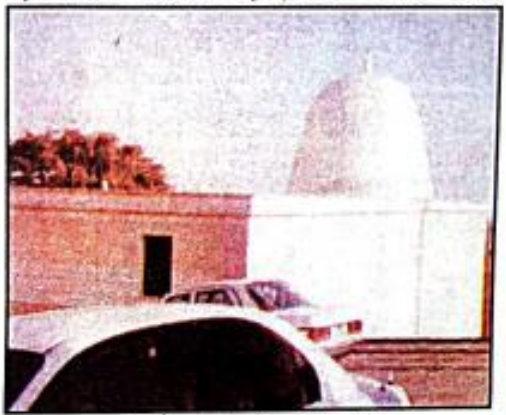


غار حرا جہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی

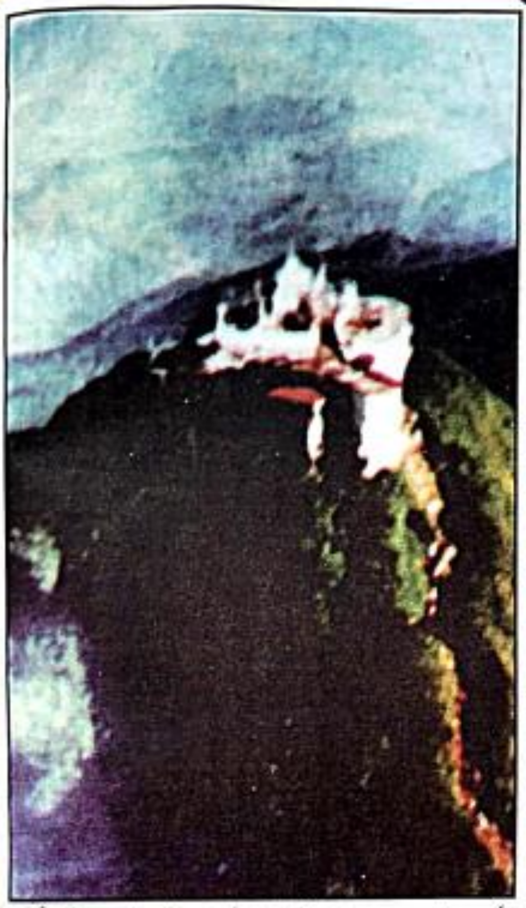




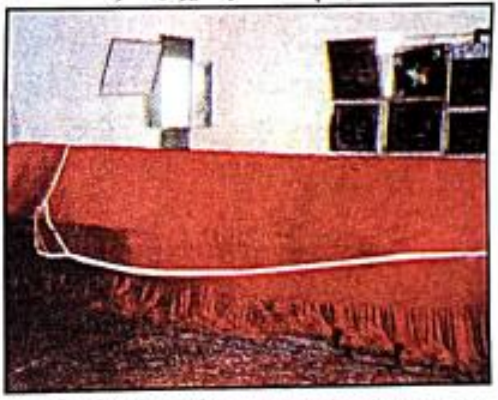
یہ مقبرہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے جو الخلیل قبرستان کے باہر بنا ہوا ہے



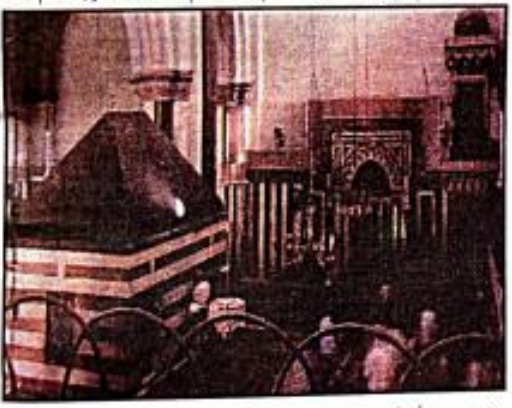
حضرت ہابیل کے مزار کا بیرونی منظر



یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام نے دنیا میں پہلا قدم رکھا



حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت ہابیل کی قبر جس کی لمبائی آٹھ گز ہے



حضرت سارہ علیہا السلام زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے مزار



جدہ میں حضرت حوا علیہا السلام کا مزار۔ سو سال پہلے کی ایک تصویر



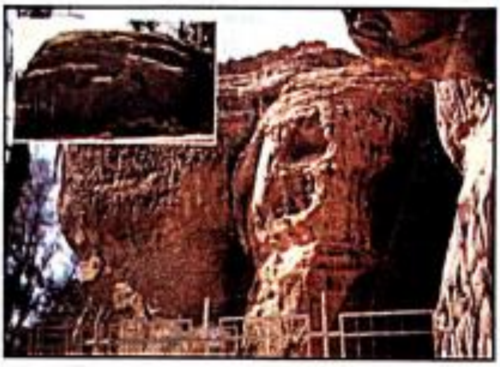
وہ مقام جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کے لئے لٹایا گیا



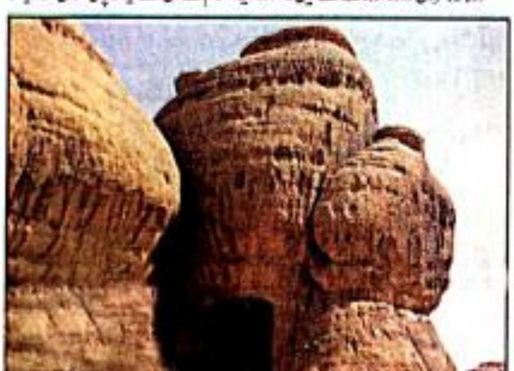
قلعہ اسلامیہ: ترکوں نے یہ قلعہ اس کنویں پر تعمیر کیا جس سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنویں کے علاوہ کسی جگہ سے پانی لینے سے منع فرما دیا تھا



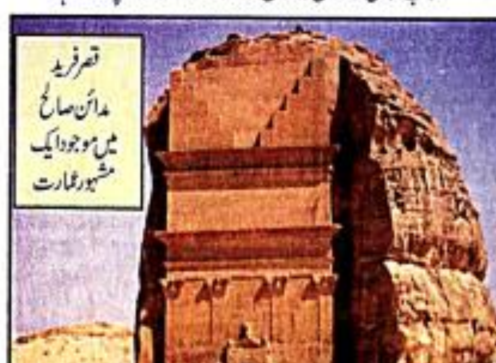
قصر البنت (شہزادی کا محل) اُڑنے کے لئے پر تولتا
عقاب شاہی خاندان کا نشان تھا جو دروازے کے اوپر کندہ ہے



بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان کھودا گیا ایک کنواں۔ اس وسیع بستی میں کچھ کنویں پتھر کھود کر
اور کچھ پتھروں کو جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ان سے لیا ہوا پانی ضائع کرا دیا تھا



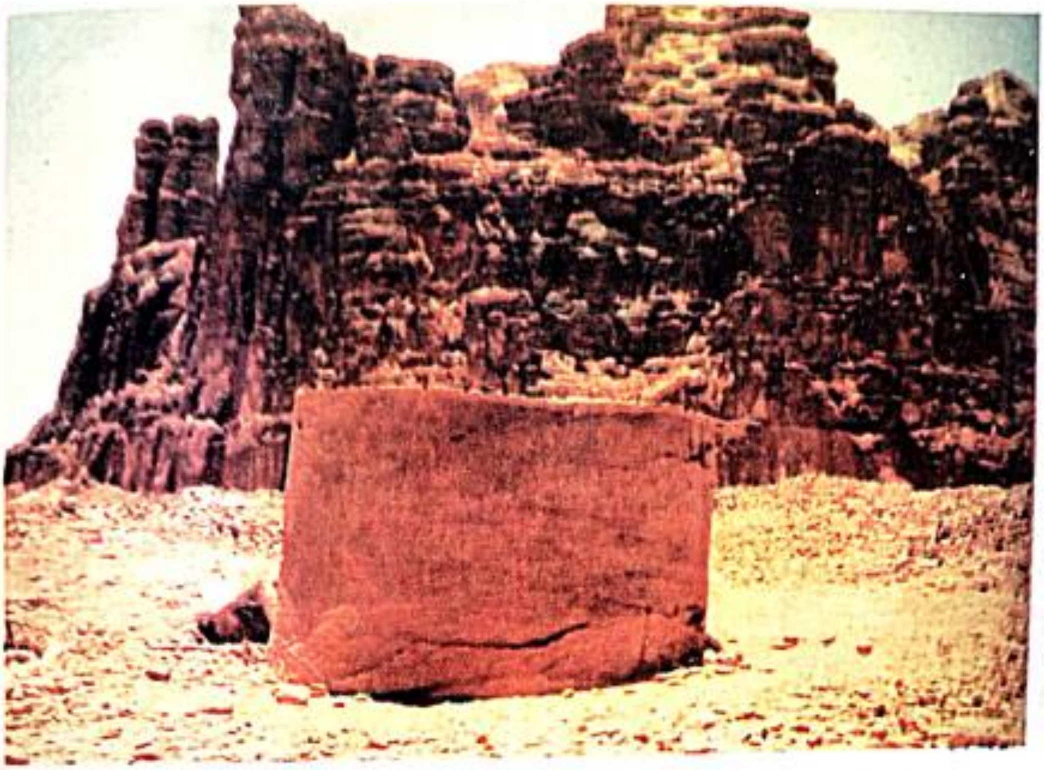
قصر دیوان: بادشاہ کی نشست گاہ جو پہاڑ کو کھود کر عمارت سے تعمیر کی گئی



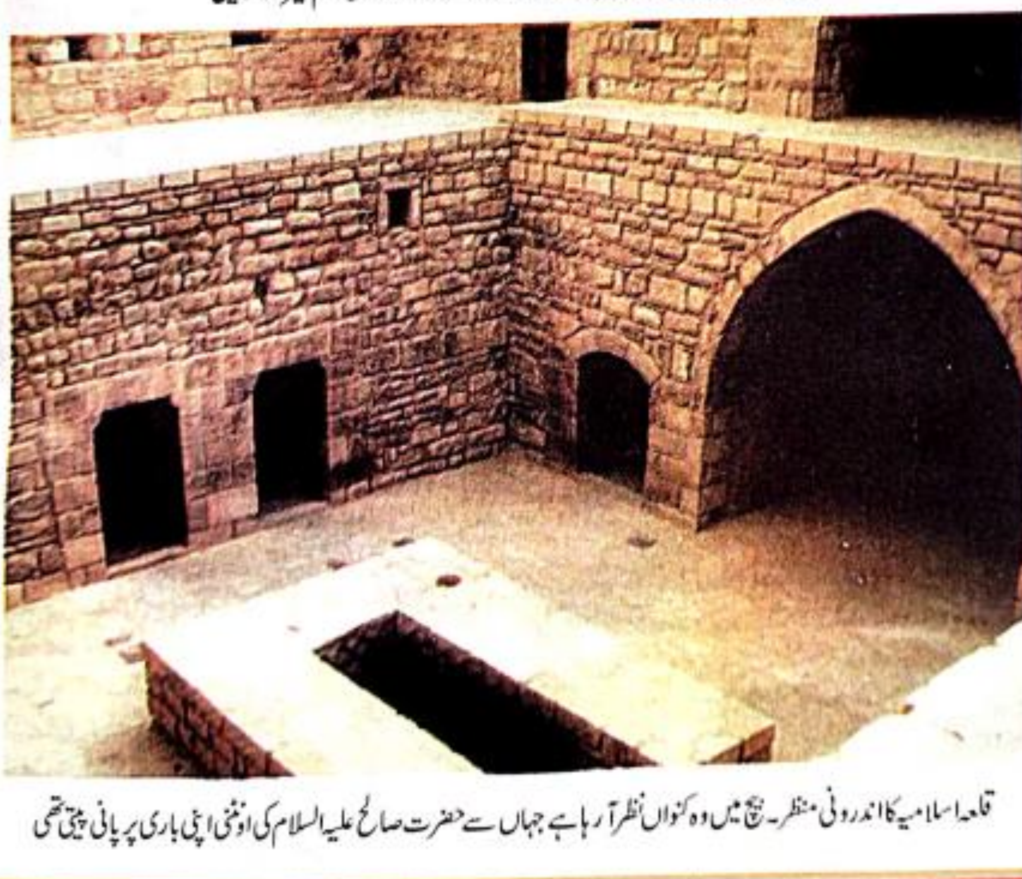
قصر فرید
مدائن صالح
میں موجود ایک
مشہور عمارت



قلعہ اسلامیہ کے باہر جنوبی سمت میں وہ حوض جہاں اس چشمہ کا پانی جمع ہوتا ہے۔



بدوؤں کا بیان ہے کہ اسی پہاڑ سے حضرت صالح کی دعا سے اونٹنی برآمد ہوئی تھی۔ سامنے وہ پیالہ ہے
جس میں اونٹنی کا دودھ دھویا جاتا تھا۔ اتنا دودھ ہوتا کہ ساری قوم سیر ہو کر پیتی



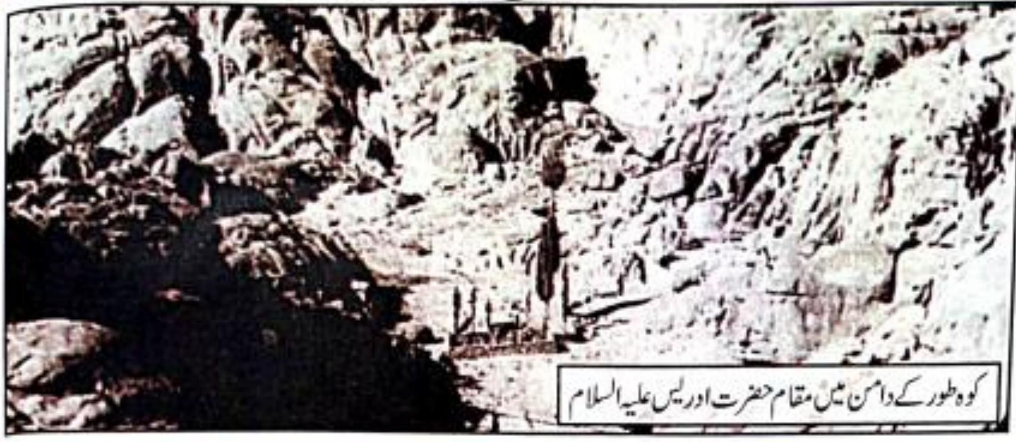
قلعہ اسلامیہ کا اندرونی منظر۔ بیچ میں وہ کنواں نظر آ رہا ہے جہاں سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اپنی باری پر پانی پیتی تھی



الخلیل میں مسجد ابراہیمی جہاں حضرت ابراہیم حضرت اسحٰق حضرت یعقوب اور ان کی بیویاں دفن ہیں



حکومت اردن نے حضرت شعیب کا شاندار مقبرہ اور متصل مسجد تعمیر کروائی



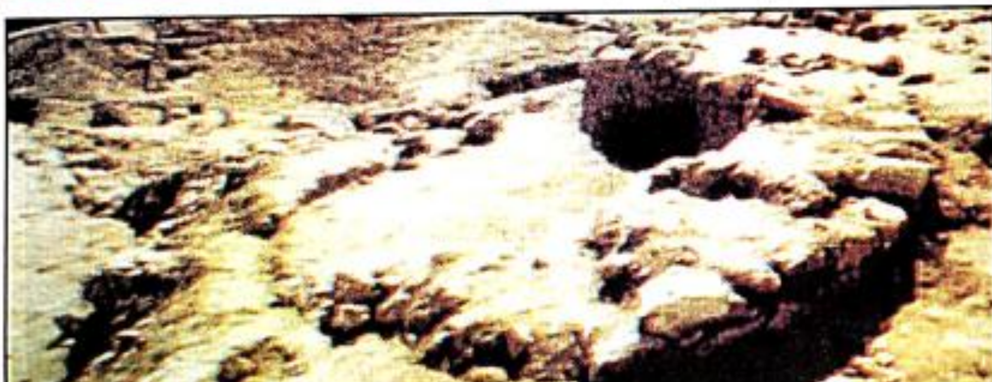
کوہ طور کے دامن میں مقام حضرت ادریس علیہ السلام



صفا مروہ



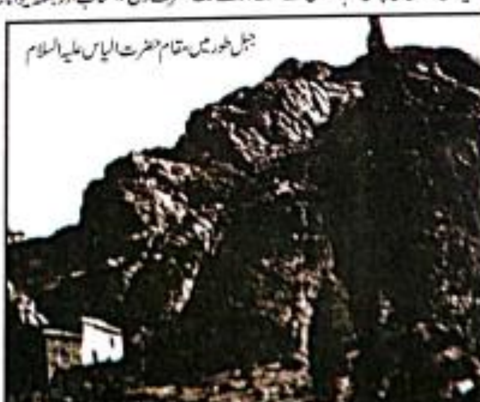
حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار اقدس



یہ جبل جودی کی چوٹی ہے زمین کے خشک ہونے تک حضرت نوح، اصحاب اور جملہ حیوانات یہاں قیام پذیر ہوئے۔ چند سال پہلے یہیں سے کشتی بھی صحیح وسالم برف میں دبی ہوئی ملی



حضرت لقمان علیہ السلام کا مزار



جبل طور میں مقام حضرت الیاس علیہ السلام



اردن میں حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر پر گنبد جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہے



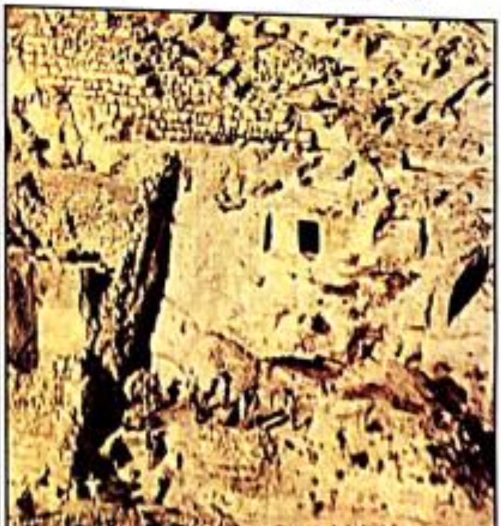
دمشق میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مزار



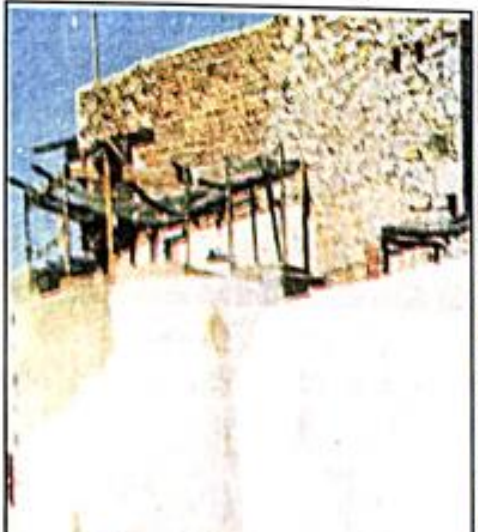
عثمانؓ کا کنواں- حضرت عثمان غنی نے یہ کنواں
یہودی سے خرید کر مسلمانوں کو دے دیا



طویٰ کا کنواں: حضور فتح مکہ کی رات یہاں رہے اور صبح
اس کنویں کے پانی سے غسل فرما کر مکہ شہر میں داخل ہوئے



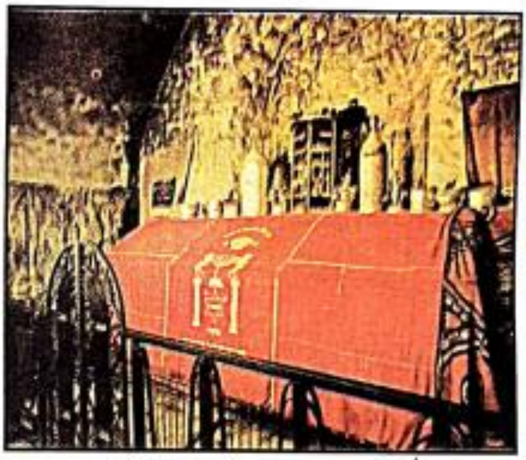
یروشلم میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کے
ذریعہ جو شہر تعمیر کروایا تھا اسے کھود کر برآمد کیا جا رہا ہے



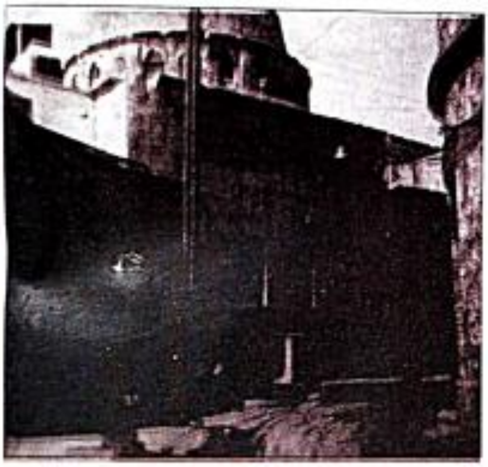
جعرانہ کا کنواں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پانی پسند تھا
اس کا پانی پینے سے پتھری اور گردے کی صفائی ہو جاتی ہے



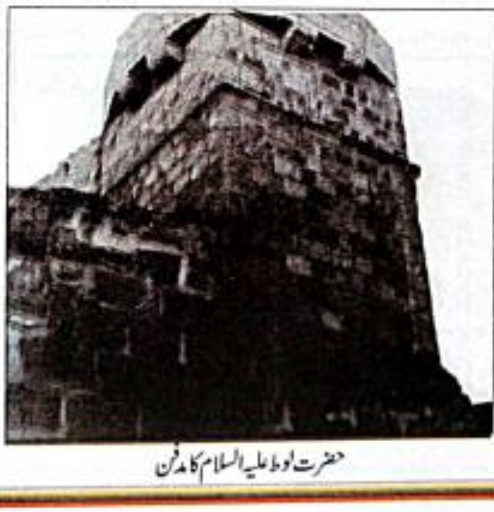
حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار جو موجودہ اردن میں ہے۔ دیواروں پر آیات قرآنی کی خطاطی کے خوبصورت نمونے ہیں



بیت لحم کے غار میں حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار
جو بیت المقدس سے دس کیلومیٹر پر فلسطین کا بہت بڑا گاؤں ہے



حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار جو دمشق (شام) میں واقع ہے



حضرت لوط علیہ السلام کا مدفن



منیٰ کی اس مسجد خیف میں حضرت آدم علیہ السلام مدفون ہیں
یہ بھی روایت ہے کہ ۳۰ سے زیادہ انبیاء اس کے احاطے میں ابدی نیند سو رہے ہیں

مستند

قصص الانبیاء علیہم السلام

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

مرتب

مولانا زاہد محمود

(فاضل جامعہ قاسم العلوم)

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4519240-0322-6180738

قصص الانبیاء علیہم السلام

تاریخ اشاعت.................. الثانی ۱۴۳۴ھ
ناشر..................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان
مکتبہ سید احمد شہید...... اردو بازار..... لاہور
مکتبہ امدادیہ.......... اکوڑہ خٹک...... پشاور
اسلامی کتاب گھر.... خیابان سرسید.... راولپنڈی
دارالاشاعت....... اُردو بازار......... کراچی
مکتبہ رشیدیہ...... سرکی روڈ..... کوئٹہ
مکتبہ دارالاخلاص.... قصہ خوانی بازار...... پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد للہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

عرض ناشر

"مستند قصص الانبیاء" آپ کے ہاتھوں میں ہے...

بندہ کی عرصہ دراز سے یہ تمنا تھی کہ کسی طرح ہمارے اکابر کی تالیفات سے یہ اہم موضوع یعنی "قصص الانبیاء" مرتب ہو جائے.. الحمد للہ علماء کرام کی مشاورت سے "معارف القرآن" اور "قصص القرآن" سے یہ اہم کتاب مرتب ہوگئی۔

ادارہ نے زر کثیر لگا کر اس کی ترتیب کا کام جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے مکمل کرایا۔

اللہ پاک ہماری اس سعی کو محض اپنے فضل وکرم سے شرف قبول نصیب فرمائیں۔ آمین

والسلام

محمد اسحٰق ملتانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ مرتب

انبیائے کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے واقعات موضوعات قرآن میں سے ایک اہم موضوع ہے۔ قرآن کریم نے اسلامی تعلیمات کے بیشتر عقائد وحقائق کے اثبات اور تفہیم کے لئے سابقہ انبیائے کرام کے حالات وواقعات کے بیان سے کام لیا ہے۔ اس لئے یہ واقعات قرآنِ کریم کے مُدّعا اور مقصد اور اسلامی عقائد کو سمجھنے اور سمجھانے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ علمائے مفسرین نے اپنی تفاسیر میں ان واقعات کی تفصیلات بیان فرمائیں اور کئی علمائے مصنفین ومحققین نے انبیائے کرام کے قصص پر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جنہیں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ تحقیق کے لحاظ سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی ''قصص القرآن'' بے مثال کتاب ہے ہم نے اپنے اکابر اساتذہ کرام سے اس کی بہت تعریف وتوصیف سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو اس پر تمام امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

مصنفین نے واقعات کو مسلسل ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر قرآن کریم کا انداز منفرد ہے۔ قرآن کریم نے واقعات کو بطور واقعہ بیان نہیں کیا بلکہ کسی اور مقصد کو ثابت کرنے کیلئے انہیں بطور استشہاد پیش کیا ہے اس لئے قرآن کریم میں واقعات مسلسل، مکمل، مرتب نہیں ہیں اور نہ ہی انبیائے کرام کے شخصی تعارف پر کوئی کلام ہے سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ انبیائے کرام کے واقعات کو قرآن کریم کے اسلوب بیان اور اس کے مقاصد عالیہ کے سیاق وسباق کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔

اس کتاب میں قرآنی سورتوں میں سے متعلقہ آیات کا خلاصۂ تفسیر اور اس کے بعد اس سے متعلق تفسیری مضامین سے حالات وواقعات لے کر انہیں مرتب کرکے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ مواد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر معارف القرآن سے لیا گیا ہے۔ البتہ واقعہ کے شروع میں ہر پیغمبر کا شخصی تعارف، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی قصص القرآن سے لیا گیا ہے۔ چند ایک وہ انبیائے کرام جن کا تذکرہ قرآن کریم نے اشارۃً کیا ہے۔ یا ایک آدھا جگہ مختصر ذکر کیا ہے ان کے واقعات کی تفصیلات بھی ''قصص القرآن'' سے لی گئی ہیں۔

اور آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر مشتمل حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی کتاب ''سیرت خاتم الانبیاء'' معمولی اختصار کے ساتھ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت عطا فرما کر ہمارے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی کا ذریعہ بنائے۔ آمین

والسلام زاہد محمود قاسمی

جامعہ قاسم العلوم ملتان

فہرست عنوانات

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام

وحضرت ہارون علیہ السلام

حضرت خضر علیہ السلام

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

حضرت حزقیل علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام

حضرت لقمانؒ

حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام

سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

☆.....☆.....☆

اجمالی فہرست

حضرت آدم علیہ السلام

انسان اول:

حضرت آدم (علیہ السلام) کے متعلق قرآن عزیز نے جو حقائق بیان کئے ہیں ان کے تفصیلی تذکرہ سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ انسان کے عالم وجود میں آنے کا مسئلہ آج علمی نقطۂ نگاہ سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے یعنی ارتقاء (Evolution) کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق وتکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائنات ہست وبود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی ہے، اس لئے کہ مبدأ حیات نے جمادات ونباتات کی مختلف شکلیں اختیار کر کے ہزاروں لاکھوں برس بعد درجہ بدرجہ ترقی کر کے اول "لبونہ" (پانی کی جونک) کا لباس پہنا اور پھر ایسی ہی طویل مدت کے بعد حیوانات کے مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے گزر کر موجودہ انسان کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔

اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات نے انسان اول کو آدم (علیہ السلام) کی شکل میں ہی پیدا کیا اور پھر اس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حوا کو وجود دے کر کائنات ارض پر نسل انسان کا سلسلہ قائم کیا، اور یہی وہ انسان ہے جس کو خالق کائنات نے عام مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانت الٰہی کا بار گراں اس کے سپرد فرمایا اور کل کائنات کو اس کے ہاتھ میں مسخر کر کے خلافت ونیابت الٰہی کا شرف اس ہی کو بخشا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین ۹۵ آیت ۴)

بلاشبہ ہم نے انسانوں کو بہترین اندازہ سے بنایا ہے۔

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۷۰

بے شبہ ہم نے نسل آدم کو تمام کائنات پر بزرگی اور برتری بخشی

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ ۲، آیت ۳۰)

میں زمین پر (آدم کو) اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (الاحزاب ۲۳، ۷۲)

ہم نے بار امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے (کل کائنات) امانت الٰہی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس بار گراں کو اٹھا لیا۔

قرآن عزیز میں حضرت آدم کا نام پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہوتا ہے۔

قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابوالبشر حضرت آدم (علیہ السلام) کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۂ حجر و ص میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آل عمران، مائدہ، مریم اور یٰس میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اوپر کی تمام سورتوں اور آیتوں میں اگرچہ اسلوب بیان، طرز ادا، لطیف تعبیر کے اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیش نظر حسب موقع بیان کی گئی ہے۔

تخلیق آدم اور فرشتے

قرآن کریم میں ہے کہ اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں جس میں حکمت و مصلحت تھی مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالا و برتر ہیں، غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکام شرعیہ کے اجراء و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا) کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں (فرشتوں کی یہ گزارش نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہوں گے، بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیازمندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گروہِ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عملہ بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلائیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا اصلی سبب ہے کیونکہ اجراء احکام وانتظام تو جبھی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود تم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہوسکتا، اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام

کے لئے موزوں وہ مخلوق ہوسکتی ہے جن میں شر وفساد کا عنصر موجود تو ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی، آگے اسی حکمت الٰہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ) اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دے دیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کردیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار وخواص کے) اگر تم سچے ہو (یعنی اپنے اس قول میں سچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں (اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرمادیا ہم سے پوشیدہ رکھا کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے الگ کر کے دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انہوں نے حاصل کرلیا، فرشتوں کی طبیعت اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا) مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم وفہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراف تو ثابت ہوگیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم تم بتلادو ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات وخواص کے جب آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے روبرو بتلادیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہوگئے ہیں) سو جب بتلادیئے ان کو آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کردیتے ہو اور

جس کو دل میں رکھتے ہو۔ (البقرہ: ۳۰-۳۳)

اللہ جل شانہ، نے جب تخلیق آدم علیہ السلام اور دنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، ان کو زمین کی خلافت اور انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ نیکی ان کی فطرت ہے، برائی کا صدور ہی ان سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دنیا کے انتظامات بھی وہ درست کرسکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے تم واقف نہیں، اسکو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدمؑ کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔

تخلیق آدم کی گفتگو فرشتوں سے کس مصلحت پر مبنی تھی

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حضرت حق جل وعلا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرانا اس کا منشاء تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں، تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہوسکتیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں، اور ظاہر و باطن ہر چیز ان کے علم و بصر کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں؟

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہے جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن وانس سب ان کی مخلوق ومملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔ (۲۱:۲۳) (اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا)

بات یہی ہے کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہوسکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرامؓ سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو صاحبِ وحی ہیں، تمام معاملات اور ان کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے۔ مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورے کی تاکید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا (کما فی روح البیان) دوسرا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل واعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ لن یخلق اللہ خلقاً اکرم علیہ منا ولا اعلم (یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرمائیں گے) حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل واعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت ونیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس نے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

تخلیق آدم پر فرشتوں کا سوال

فرشتوں نے اپنے علم وبصیرت کے مطابق نیاز مندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفۂ زمین بنارہے ہیں اس میں تو شر وفساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن وامان کا انتظام کیسے کرسکتا ہے، جبکہ وہ خود خوں ریزی کا بھی مرتکب ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر وفساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح وتقدیس اور عبادت واطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں کیونکہ فرشتے ایسے خیالات وحالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کرکے یہ کام اس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے؟

سوال کا جواب

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی تم خلافت الٰہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا امتحان

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص وآثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت وجبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع ومضر چیزیں اور ان کے خواص وآثار، ہر جاندار اور ہر قوم کے مزاج وطبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے معلوم

فرشتوں کا اعترافِ عجز

غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلا دیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کو دیکھنا نہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے ثمرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں، تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر وغرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے فوراً بول اٹھے:

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

(پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم وحکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا اقرار تھا کہ زیادہ اعلم وافضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

فرشتوں نے کیسے کہا کہ انسان خونریزی کرے گا

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہے کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علم غیب تھا؟ یا محض اٹکل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہورِ محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفۂ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی نے ان کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد وخوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علمی

تفوق کا اظہار فرما کر دے دیا گیا، اور فساد وخوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت وخلافت کے منافی سمجھ رہے ہو، درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلا دیا گیا کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کردیئے جس سے کسی گناہ خطا کار کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کردیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء خداوندی ہے، جس میں خیر وشر، نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر وشر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذبات شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہوسکتی ہے کیونکہ جس چیز کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کو بھی ان چیزوں کا اجمالی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دے دیا گیا۔

فرشتوں کو سجدہ کا حکم اور شیطان کا مردود ہونا

قرآن کریم میں ہے کہ اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ) سجدہ میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے، سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔ (البقرہ:۳۴)

امتحان کا فیصلہ

جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ وجن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، ان کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جاوے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جائے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور مصداق ۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے ہیں اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم وقویٰ کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں اور گویا بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر

فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آ گیا۔

کیا سجدہ کا حکم جنات کو بھی تھا

سجدۂ آدم علیہ السلام کا حکم اس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا، جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنات کا بدرجۂ اولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا۔

سجدہ تعظیمی پہلی اُمتوں میں جائز تھا اسلام میں ممنوع ہے

اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، اور سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مذکور ہے یہ تو ظاہر ہے کے یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک و کفر ہے، جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں سجدے کا بھی وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

امام جصاص رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہؐ میں منسوخ ہو گیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام، مصافحہ کی اجازت دی گئی، رکوع، سجدہ اور بہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دے دیا گیا۔

شیطان کے دلائل اور مہلت

قرآن کریم میں ہے کہ اور (وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے) جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا اور) کہا کہ کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے (اس پر مردود ہو گیا اس وقت) کہنے لگا کہ اس شخص کو جو آپ نے مجھ پر فوقیت دی ہے (اور اسی بناء پر اس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے) تو بھلا بتلایئے تو (اس میں کیا فضیلت ہے جس کی وجہ سے میں مردود ہوا) اگر آپ نے (میری درخواست کے مطابق) مجھ کو قیامت کے زمانے تک (موت سے) مہلت دیدی تو میں (بھی) بجز قدر قلیل لوگوں کے (جو مخلصین ہونگے باقی) اس کی تمام اولاد کو اپنے قابو میں کرلوں گا (یعنی گمراہ کردوں گا) ارشاد ہوا جا (جو تجھ سے ہو سکے کرلے) جو شخص ان میں سے تیرے ساتھ ہو لے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے پوری سزا اور ان میں سے جس پر تیرا قابو چلے اپنی چیخ پکار سے (یعنی اغوا اور وسوسہ سے) اس کا قدم (راہ راست سے) اکھاڑ دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالانا (کہ تیرا سارا لشکر ملکر گمراہ کرنے میں خوب زور لگا دے) اور ان کے مال اور اولاد میں اپنا ساجھا کرلینا (یعنی مال و اولاد کو گمراہی کا ذریعہ بنا دینا جیسا کہ اس کا مشاہدہ ہوا) اور ان سے (جھوٹے جھوٹے) وعدے کرنا (کہ قیامت میں گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا اور یہ سب باتیں شیطان کو بطور زجر و تنبیہ کے کہی گئی ہیں۔ اور شیطان ان لوگوں سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے (یہ بطور جملہ معترضہ کے تھا آگے پھر شیطان کو خطاب ہے) میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہ چلے گا اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کا قابو مخلصین پر کیونکر چلے کہ) آپ کا رب (ان کا) کارساز کافی ہے۔ (بنی اسرائیل ۶۱-۶۵)

شیطان کی آوازیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ گانے اور مزامیر اور لہو ولعب کی آوازیں یہی شیطان کی آواز ہے جس سے وہ لوگوں کو حق سے قطع کرتا ہے (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ مزامیر موسیقی اور گانا بجانا حرام ہے۔ (قرطبی)

شیطان کا بیہودہ سوال

ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے وقت دو باتیں کہی تھیں اوّل یہ کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے اور میں آگ کی مخلوق ہوں آپ نے مٹی کو آگ پر کیوں فوقیت اور فضیلت دے دی۔ یہ سوال امر الٰہی کے مقابلہ میں حکم کی حکمت معلوم کرنے سے متعلق تھا جس کا کسی مامور کو حق نہیں۔ اللہ جل شانہ کی طرف سے مامور کو تو طلب حکمت کا حق کیا ہوتا دنیا میں خود انسان اپنے نوکر کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی کام کو کہے، تو خادم وہ کام کرنے کے بجائے آقا سے پوچھے کہ اس کام میں کیا حکمت ہے اس لئے اس کا یہ سوال ناقابل جواب قرار دے کر یہاں اس کا جواب نہیں دیا گیا، اسکے علاوہ جواب ظاہر یہی ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر فوقیت دینے کا حق اسی ذات کو ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور پالا ہے وہ جس وقت جس چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دے دے وہی افضل ہو جائے گی۔

قیامت تک انسانوں کو گمراہ کرنے کا عزم

دوسری بات یہ کہی تھی کہ اگر تا قیامت زندگی ملنے کی میری درخواست منظور کر لی گئی تو میں آدم کی ساری اولاد کو بجز قدر قلیل کے گمراہ کر ڈالوں گا۔ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اسکا جواب دیدیا کہ میرے خاص بندے جو مخلص ہیں ان پر تو تیرا قابو نہ چلے گا چاہے تو اپنا سارا لاؤ لشکر لے آئے اور پورا زور خرچ کرے باقی غیر مخلص اگر وہ تیرے قابو میں آگئے تو ان کا بھی وہی حال ہوگا جو تیرا ہے کہ جہنم کے عذاب میں تم سب گرفتار ہو گے اس میں وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ میں جو شیطانی لشکر کے سوار اور پیادوں کا ذکر ہے اس سے یہ لازم

نہیں آتا کہ واقع میں بھی شیطان کے کچھ افراد سوار ہوں کچھ پیادے بلکہ یہ محاورہ پورے لشکر اور پوری طاقت استعمال کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور اگر واقع میں ایسا ہو کہ کچھ شیطان سوار ہوتے ہوں کچھ پیادہ تو اس میں بھی کوئی وجہ انکار نہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جتنے افراد بھی کفر و معصیت کی حمایت کیلئے لڑنے کو چلتے ہیں وہ سوار اور پیادے سب شیطان ہی کا سوار اور پیادہ لشکر ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ شیطان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ اولاد آدم کو بہکا کر گمراہ کرنے پر قادر ہو جائے گا جس کی بناء پر اس نے یہ دعویٰ کیا تو ممکن ہے کہ انسان کے اجزاء ترکیبی کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اس کے اندر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوگا اس لئے بہکائے میں آ جانا دشوار نہیں اور اس میں بھی کچھ بعد نہیں کہ یہ دعویٰ بھی محض جھوٹ ہی ہو۔

ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں

ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو عملاً ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل سبب حکم ربانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

ابلیس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا

یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے تکبر کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی دی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کرلی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ حب جاہ اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کو ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے

اذالم یکن عون من اللّٰہ للفتیٰ　　　فاوّل ما یجنی علیہ اجتہادہ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہے جو آخر عمر اور اوّل منازل آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان وعمل اور علم ومعرفت پر غرہ نہ ہونا چاہئے۔ (روح)

شیطان کا حضرت آدم وحوّا کو ورغلانا

جب آدم علیہ السلام کی فضیلت اور خلافت ارضی کے لئے صلاحیت فرشتوں پر واضح کردی گئی، انہوں نے تسلیم کرلیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہوکر نکال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوّا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا شیطان، جو آدم علیہ السلام کی وجہ سے مردود ہوا وہ خار کھائے ہوئے تھا اس نے کسی طرح موقع پاکر اور مصلحتیں بتلا کران دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کردیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو اور یہ بھی بتلادیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل وغش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی، جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

جنت میں رہنے کا حکم کب ہوا؟

وَ قُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّةَ "اور ہم نے کہا کہ اے آدم ٹھہرو تم اور تمہاری زوجہ جنت میں"۔ یہ واقعہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدہ کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت سے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک ان کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن ومستقر کہاں ہوگا۔

جنت کی عام تام نعمتیں اور ممنوعہ درخت

آدم وحوّا علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پھل بافراغت استعمال کرتے رہو، نہ ان کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ فکر کہ یہ غذا ختم یا کم ہوجائے گی۔

کسی خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ اور مراد یہی ہے کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ، یہ درخت کونسا تھا قرآن کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعیین مذکور نہیں، ائمۂ تفسیر میں سے کسی نے گندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جسکو قرآن وحدیث نے مبہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے (قرطبی)

شیطان کی کارروائی

زلۃ کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، ازلال کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم وحوا، کو لغزش دے دی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم وحوا کی یہ خلاف ورزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہ گاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آ گئی کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، میں لفظ عن بمعنی سبب ہے، یعنی اس درخت کے سبب وذریعہ سے شیطان نے آدم وحوا کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

شیطان جنت میں کیسے پہنچا

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بناء پر پہلے ہی مردود کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا تو یہ آدم وحوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ملاقات کے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنی قوت جنیہ کے ذریعہ مسمریزم کی صورت سے آدم وحوا کے ذہن کو متاثر کیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل

میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو اور شاید یہی سبب ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (۷:۲۱) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان صرف وسوسہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم وحوا سے زبانی گفتگو کر کے اور قسمیں کھا کر متاثر کیا۔

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی جنت سے نقل مکانی

یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم وحوا علیہما السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گزر بسر کر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ بحکم خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔ اور قرآن کریم میں ہے کہ "ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے" اس حکم کے مخاطب حضرت آدم وحوا ہیں، اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جا چکا تھا، تو پھر اس کلام کا رخ آدم وحوا اور ان کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلایا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اتارا گیا دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطف زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی"۔ (بیان القرآن)

ادم وحوا علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک میعاد معین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی بھول

سورہ طٰہٰ میں ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا

اس میں لفظ عهدنا امرنا و صينا کے معنے میں ہے (بحر محیط) مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس واقعہ کے متعلق آپ سے بہت پہلے آدم علیہ السلام کو ایک وصیت کی تھی یعنی تاکیدی

حکم دیا تھا (جس کا ذکر سورۂ بقرہ وغیرہ میں بھی آ چکا ہے۔ اور آگے بھی کچھ آ رہا ہے کہ ایک درخت کو معین کر کے بتلا دیا تھا کہ اس درخت کو یعنی اس کے پھل پھول یا کسی جز کو نہ کھانا اور اس کے قریب بھی نہ جانا، باقی ساری جنت کے باغات اور نعمتیں تمہارے لئے کھلی ہوئی ہیں ان کو استعمال کرتے رہو اور جیسا کہ آگے آتا ہے یہ بھی بتلا دیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے کہیں اس کے بہکانے میں نہ آ جانا کہ تمہارے لئے مصیبت بنے مگر آدم علیہ السلام بھول گئے اور ان میں ہم نے ارادہ کی پختگی نہ پائی۔

نسیان اور عزم

یہاں دو لفظ آئے ہیں ایک نسیان دوسرے عزم، نسیان کے معنی مشہور ہیں بھول جانا، غفلت میں پڑ جانا اور عزم کے لفظی معنے کسی کام کے لئے اپنے ارادے کو مضبوط باندھنے کے ہیں۔ ان دونوں لفظوں سے مراد اس جگہ کیا ہے اس کے سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور پیغمبر سب کے سب گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

پہلے لفظ میں حضرت آدم علیہ السلام پر نسیان اور بھول طاری ہو جانے کا ذکر ہے اور چونکہ بھول اور نسیان غیر اختیاری امر ہے اس لئے اس کو گناہ ہی میں شمار نہیں کیا گیا جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے رفع عن امتی الخطا والنسیان، یعنی میری امت سے خطا اور نسیان کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم کا ارشاد عام ہے لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّاوُسْعَھَا یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کے اختیار و قدرت سے باہر ہو۔ لیکن یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم میں ایسے اسباب بھی رکھے ہیں کہ ان کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو انسان بھول اور خطا سے بچ سکتا ہے انبیاء علیہم السلام چونکہ حق تعالیٰ کے مقربین خاص ہیں ان سے اتنی بات پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے کہ ان اسباب اختیاریہ سے کیوں کام نہ لیا جن کے ذریعہ اس بھول سے بچ سکتے تھے۔ بسا اوقات ایک وزیر سلطنت کیلئے وہ کام قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے جو عام نوکروں کے لئے

قابل انعام ہوتا ہے اسی کو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے حسنات الابرار سیئات المقربین یعنی امت کے صالحین اور نیک لوگوں کے بہت سے نیک عمل مقربان بارگاہِ الٰہی کے حق میں سیئات اور لغزش قرار دی جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا یہ واقعہ اول تو نبوت ورسالت سے پہلے کا ہے جس میں کسی گناہ کا صدور انبیاء سے بعض علمائے اہل سنت کے نزدیک عصمت کے خلاف نہیں۔ دوسرے درحقیقت یہ بھول ہے جو گناہ نہیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کے مقام بلند اور تقرب حق سبحانہ وتعالیٰ کے لحاظ سے اس کو بھی ان کے حق میں ایک لغزش قرار دی گئی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور ان کو متنبہ کرنے کے لئے اس لغزش کو عصیان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

دوسرا لفظ عزم ہے اور اسی آیت میں یہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام میں عزم نہ پایا گیا اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عزم کے معنی کسی کام کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام حکم ربانی کی تعمیل کا مکمل فیصلہ اور قصد کئے ہوئے تھے مگر شیطانی وساوس سے اس قصد کی مضبوطی میں فرق آ گیا اور بھول نے اس پر قائم نہ رہنے دیا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اس درخت سے کھا لیا جو بظاہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ومحفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں۔ (قرطبی)

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاءؑ کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جائے گا، اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء علیہم السلام ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء علیہم السلام کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب بھی ہوا، حضرت ادم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاء و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطاء و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا، اور یہ سہو و نسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو و نسیان ہو سکتا ہے۔ (تفسیر بحر المحیط)

مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق مختلف توجیہات

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں ان میں چند یہ ہیں۔

اوّل یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس

کے جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہی حکم ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہوسکتا ہے کہ ممانعت صرف اس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہے جو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہوگیا کہ جس درخت کی طرف اشارہ کرکے منع کیا گیا تھا ممانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی وسوسہ ان کے دل میں مزین اور مستحکم کردیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں تمہیں کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی ممانعت کی گئی ہے وہ دوسرا ہے، اس درخت کی ممانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ وسوسہ دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی ممانعت صرف آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی جیسے چھوٹے بچوں کو اوّل عمر میں قوی غذا سے روکا جاتا ہے، ہلکی غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہوجانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہوجاتی ہے، تو اب آپ قوی ہوچکے ہیں، اس لئے وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اطمینان ہوجائے گا، اس وقت ان کو وہ ممانعت یاد نہ رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (۲۰:۱۱۵) یعنی آدم علیہ السلام بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی" یہ اسی احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہوسکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہوگئی، یا اجتہادی لغزش، جو درحقیقت گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شان نبوت اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے

اعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ واستغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

دوراز کار بحثوں سے اجتناب

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی وسوسہ ڈالے، جنات وشیاطین کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دور سے بھی دل میں وسوسہ ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم وحوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ: کہ ”شیطان تمہارا دشمن ہے“ ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرادے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکہ میں کس طرح آگئے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات وشیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا معافی کے کلمات سکھانا

شیطانی وسوسہ اور حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش اور اس کے نتیجہ میں جنت سے نکلنے اور زمین پر اترنے کا حکم سنا تو حضرت آدم علیہ السلام بہت نادم ہوئے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ایسے خطاب وعتاب کہاں سنے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی سہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلاف شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان

خاموش تھی، اللہ رب العزت دلوں کی بات سے واقف اور رحیم وکریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھا دیئے۔

زمین پر مستقل رہائش کا حکم

مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود میں آنا اور انکو ایک طرح کا اختیار دیکر احکام شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافت الٰہیہ قائم کرنا، حدود اور احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا، کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور سزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافت الٰہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں ان فرائض منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ: ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی، تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

جو کلمات سکھائے گئے وہ کیا تھے

وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو بغرض توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مفسرین صحابہ رضی اللہ عنہم سے کئی روایات منقول ہیں مشہور قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو قرآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ (۷:۲۳)

حضرت آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام سے جو اجتہادی لغزش یا بھول صادر ہوئی اولاً تو

قرآن کریم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا علیہا السلام کو شریک کر کے لفظ اهبطوا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں بہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوّا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس لغزش کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے، عصی ادم وغیرہ۔

ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مستور رکھا ہے، اسلئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحۃً نہیں فرمایا، اور ایک جگہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا میں دونوں کی توبہ کا ذکر کر بھی دیا گیا، تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت حوّا کا قصور معاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقل ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (قرطبی)

حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر اترنا سزا نہیں بلکہ مقصد کی تکمیل کیلئے تھا

جنت سے زمین پر اترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اتارنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافت الٰہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر ہے جو خلافت الٰہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کردی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے ان کا خلیفہ بنانا ہے۔

سجدہ نہ کرنے کے سبب شیطان کا مردود ہونا

قرآن کریم میں ہے کہ اور ہم نے تم کو پیدا (کرنے کا سامان شروع) کیا (یعنی آدم علیہ السلام کا مادہ بنایا، اسی مادے سے تم سب لوگ ہو) پھر (مادہ بنا کر) ہم نے تمہاری صورت بنائی (یعنی اس مادے میں آدم علیہ السلام کی صورت بنائی، پھر وہی صورت ان کی اولاد میں چلی آرہی ہے، یہ نعمت ایجاد ہوئی) پھر (جب آدم علیہ السلام بن گئے اور علومِ اسماء سے مشرف ہوئے تو) ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو (اب) سجدہ کرو (یہ نعمت اکرام ہوئی) تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا، بجز ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کونسا امر مانع ہے، جب کہ میں (خود) تجھ کو سجدہ کا حکم دے چکا، کہنے لگا (وہ امر مانع یہ ہے کہ) آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے (یہ شیطانی استدلال کا پہلا مقدمہ ہے، اور دوسرا مقدمہ جس کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آگ بوجہ نورانی ہونے کے خاک سے افضل ہے، تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کی فرع اور اولاد بھی غیر افضل کی فرع سے افضل ہوتی ہے، چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کا سجدہ کرنا غیر افضل کو نامناسب ہے، ان چاروں مقدمات کو ملا کر شیطان نے اپنے سجدہ نہ کرنے کی یہ دلیل بنائی کہ میں افضل ہوں اس لئے غیر افضل کو سجدہ نہیں کیا، مگر پہلے مقدمہ کے سوا سارے ہی مقدمات غلط ہیں، اور پہلا مقدمہ بھی عام انسانوں کے حق میں اس معنی سے صحیح ہے کہ انسان کی تخلیق میں جزو غالب مٹی کا ہے، باقی مقدمات دلیل کا غلط ہونا کھلا ہوا ہے، کیونکہ آگ کا خاک پر افضل ہونا ایک جزوی فضیلت تو ہو سکتی ہے، کلی طور پر اس

کو افضل کہنا دعویٰ بے دلیل ہے، اسی طرح افضل کی فرع اور اولاد کا افضل ہونا بھی مشکوک ہے، ہزاروں واقعات اس کے خلاف سامنے آئے ہیں، کہ نیک کی اولاد بد اور بد کی اولاد نیک ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ بھی غلط ہے، کہ افضل کو مفضول کے لئے سجدہ نامناسب ہے، بعض اوقات مصالح کا تقاضا اس کے خلاف ہونا مشاہد ہے)

حق تعالیٰ نے فرمایا (جب تو ایسا نافرمان ہے) تو آسمان سے نیچے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے، (خاص کر) آسمان میں رہ کر (جہاں سب فرمانبرداروں ہی کا مقام ہے) تو (یہاں سے) نکل (دور ہو) بے شک تو (اس تکبر کی وجہ سے) ذلیلوں میں شمار ہونے لگا، وہ کہنے لگا مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی، وہ کہنے لگا کہ بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان (کے یعنی آدم اور اولاد آدم کی رہزنی کرنے) کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر (جو کہ دین حق ہے جا کر) بیٹھ جاؤں گا پھر ان پر (ہر چار طرف سے) حملہ کروں گا۔ ان کے آگے سے بھی پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور بائیں جانب سے بھی (یعنی ان کے بہکانے میں کوشش کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑوں گا تا کہ وہ آپ کی عبادت نہ کرنے پائیں) اور میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا، چنانچہ) آپ ان میں سے اکثروں کو (آپ کی نعمتوں کا) احسان ماننے والا نہ پائیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں (آسمان) سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا (اور تو جو اولاد آدم کو بہکانے کو کہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے کر لے میں سب سے بے نیاز ہوں نہ کسی کے راہِ راست پر آنے سے میرا کوئی فائدہ ہے نہ گمراہ ہونے سے کوئی نقصان) جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سے (یعنی ابلیس اور اس کی بات ماننے والوں سے) جہنم کو بھر دوں گا۔ (الاعراف: ۱۴-۱۸)

ابلیس کی دعا قیامت تک زندگی کی قبول ہوئی یا نہیں

ابلیس نے عین اس وقت جبکہ اس پر عتاب وعقاب ہو رہا تھا اللہ تعالیٰ سے ایک دعا مانگی

اور وہ بھی عجیب دعا کہ حشر تک زندگی کی مہلت عطا فرمادیجئے، اسکے جواب میں جو ارشاد حق تعالیٰ نے فرمایا اسکے الفاظ اس جگہ مذکورہ آیت میں تو صرف یہ ہیں اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ یعنی تجھ کو مہلت دی گئی" ان الفاظ سے بقرینہ دعاء وسوال یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ مہلت حشر تک کی دی گئی، جیسا کہ اس نے سوال کیا تھا، مگر اس کی تصریح اس آیت میں نہیں ہے، کہ جس مہلت دینے کا ذکر یہاں فرمایا ہے وہ ابلیس کے کہنے کے مطابق حشر تک ہے یا کسی اور میعاد تک، لیکن دوسری آیت میں اس جگہ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ کے الفاظ بھی آئے ہیں جن کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کی مانگی ہوئی مہلت قیامت تک نہیں دی گئی، بلکہ کسی خاص مدت تک دی گئی ہے جو علم الٰہی میں محفوظ ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ ابلیس کی یہ دعا قبول تو ہوئی مگر ناتمام کی بجائے روز قیامت کے ایک خاص مدت تک کی مہلت دے دی گئی۔

تفسیر ابن جریر میں ایک روایت سدی رحمہ اللہ سے منقول ہے اس سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو یوم بعث تک مہلت نہیں دی بلکہ ایک معین دن تک مہلت دی ہے اور وہ دن وہ ہے جس میں پہلا صور پھونکا جائے گا، جس سے آسمان وزمین والے سب بے ہوش ہو جائیں گے اور مر جائیں گے۔"

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ شیطان نے تو اپنی دعاء میں اس وقت تک کی مہلت مانگی تھی، جبکہ دوسرا صور پھونکنے تک تمام مردوں کو زندہ کیا جائے گا، اسی کا نام یوم البعث ہے، اگر یہ دعا بعینہٖ قبول ہوتی تو جس وقت ایک ذات حی وقیوم کے سوا کوئی زندہ نہ رہے گا، اور کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ کا ظہور ہوگا، اس دعاء کی بناء پر ابلیس اس وقت بھی زندہ رہتا، اس لئے اس کی ایک دعا کو یوم بعث تک کی مہلت کے بجائے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ تک کی مہلت سے تبدیل کر کے قبول کیا گیا جس کا اثر یہ ہوگا کہ جس وقت سارے عالم پر موت طاری ہوگی، اس وقت ابلیس کو بھی موت آئے گی، پھر جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو وہ بھی زندہ ہو جائے گا۔

اس تحقیق سے وہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو آیت **کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ** سے اس دعا کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر دونوں میں تعارض ہوگیا۔

لیکن حاصل اس تحقیق کا یہ ہے کہ **یوم البعث** اور **یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ** دو الگ الگ دن ہیں ابلیس نے یوم البعث تک کی مہلت مانگی تھی وہ پوری قبول نہ ہوئی، اس کو بدل کر **یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ** تک کی مہلت دی گئی، سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ نے بیان القرآن میں ترجیح اس کو دی ہے، کہ درحقیقت یہ دونوں الگ الگ دن ہیں، بلکہ نفخۂ اولیٰ کے وقت سے دخولِ جنت و نار تک ایک طویل دن ہوگا، اس کے مختلف حصوں میں مختلف واقعات ہوں گے، انہی واقعات مختلفہ کی بنا پر اس دن کی ہر واقعہ کی طرف نسبت کرسکتے ہیں، مثلاً اس کو یوم نفخ صور و یوم فنا بھی کہہ سکتے ہیں، اور یوم بعث اور یوم جزا بھی اس سے سب اشکالات رفع ہوگئے، **فللّٰہ الحمد**۔

ابلیس کو بیباکانہ گفتگو کی جرأت کیسے ہوئی؟

رب العزت جل شانہ کی بارگاہ قدس میں فرشتوں اور رسولوں کو بھی ہیبت و جلال کی بناء پر مجال دم زدنی نہیں تھی، ابلیس کو ایسی جرأت کیسے ہوگئی، علماء نے فرمایا کہ یہ قہر الٰہی کا انتہائی سخت مظہر ہے کہ ابلیس کے مردود ہوجانے کے باعث ایک ایسا حجاب حائل ہوگیا جس نے اس پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کو مستور کردیا اور بے حیائی اس پر مسلط کردی (بیان القرآن ملخصاً وموضحاً)

جنت کا لباس اترنا

قرآن کریم میں ہے کہ اور ہم نے (آدم علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری بی بی (حوا) جنت میں رہو پھر جس جگہ سے چاہو (اور جس چیز کو چاہو) دونوں آدمی کھاؤ اور (اتنا خیال رہے کہ) اس (خاص) درخت کے پاس (بھی) مت جاؤ (یعنی اس کا پھل نہ کھاؤ) کبھی ان لوگوں کے شمار میں آ جاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتے ہیں، پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ (ان کو وہ ممنوع درخت کھلا کر) ان کا مستور بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کر دے (کیونکہ اس درخت کے کھانے کی یہی تاثیر ہے، خواہ بالذات یا بوجہ ممانعت کے) اور (وہ وسوسہ یہ تھا کہ دونوں سے) کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے) سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں (اس کو کھا کر) کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ (حاصل وسوسہ کا یہ تھا کہ اس درخت کے کھانے سے قوت ملکیت اور دائمی زندگی کی پیدا ہو جاتی ہے، مگر شروع میں آپ کا وجود اس طاقتور غذا کا متحمل نہ تھا، اس لئے منع کر دیا گیا تھا، اب آپ کی حالت اور قوت میں ترقی ہو گئی اور آپ کے قویٰ میں اس کا تحمل ہو گیا تو اب وہ ممانعت باقی نہ رہی) اور ان دونوں کے روبرو (اس بات پر) قسم کھالی کہ یقین جانئے میں آپ دونوں کا دل سے) خیر خواہ ہوں تو (ایسی باتیں بنا کر) ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا، (نیچے لانا باعتبار حالت اور رائے کے بھی تھا کہ اپنی رائے عالی کو چھوڑ کر اس دشمن کی رائے پر مائل ہو گئے، اور مقام کے اعتبار سے بھی کہ جنت سے اسفل کی طرف اتارے گئے) پس ان دونوں نے جو درخت کو چکھا (فوراً) دونوں کا مستور بدن ایک دوسرے کے سامنے کھل گیا، (یعنی جنت کا لباس اتر پڑا اور دونوں شرما گئے) اور (بدن چھپانے کے لئے) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے اور (اس وقت) ان کے رب نے ان کو پکارا، کیا میں تم دونوں

کو اس درخت (کے کھانے سے) ممانعت نہ کر چکا تھا اور یہ بتلا چکا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، (اس کے بہکانے سے بچتے رہنا) دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا (کہ پوری احتیاط اور تأمل سے کام نہ لیا) اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے، حق تعالیٰ نے (آدم و حوا علیہما السلام سے) فرمایا کہ (جنت سے) نیچے (زمین پر) ایسی حالت میں جاؤ کہ تم (یعنی تمہاری اولاد) باہم بعضے بعض کے دشمن ہو گئے، اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ (تجویز کی گئی) ہے اور (اسباب معیشت سے) نفع حاصل کرنا (تجویز ہوا ہے) ایک وقت (خاص) تک (یعنی موت کے وقت تک اور یہ بھی) فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے (قیامت کے روز) پھر زندہ ہو کر نکلنا ہے۔

لباس کا مقصد اور شیطان کے فتنے

آیت ۲۶ تا ۲۷ میں ہے کہ اے اولاد آدم (ایک ہمارا انعام یہ ہے کہ) ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے ستر (یعنی پردہ والے بدن) کو بھی چھپاتا ہے اور (تمہارے بدن کے لئے) موجب زینت بھی (ہوتا) ہے، اور (اس ظاہری لباس کے علاوہ ایک معنوی لباس بھی تمہارے لئے تجویز کیا ہے جو تقویٰ (یعنی دینداری) کا لباس (ہے کہ) یہ اس (لباس ظاہری) سے بڑھ کر (ضروری) ہے (کیونکہ اس ظاہری لباس کا مطلوب شرعی ہونا اسی تقویٰ یعنی دینداری کی ایک فرع ہے، اصل مقصود ہر حالت میں لباس تقویٰ ہی ہے) یہ (لباس پیدا کرنا) اللہ تعالیٰ کے (فضل و کرم) کی نشانیوں میں سے ہوتا ہے، تاکہ یہ لوگ (اس نعمت کو) یاد رکھیں (اور یاد رکھ کر اپنے منعم اور محسن کا حق اطاعت ادا کریں اور وہ حق اطاعت وہی ہے جس کو لباس تقویٰ فرمایا ہے) اے اولادِ آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے (کہ خلاف دین و تقویٰ تم سے کوئی کام کرا دے) جیسا اس نے تمہارے دادا دادی (یعنی آدم و حوا علیہما السلام) کو جنت سے باہر کرا دیا (یعنی ان سے ایسا کام کرا دیا کہ اس کے نتیجہ میں وہ جنت سے باہر ہو گئے، اور باہر بھی) ایسی حالت سے (کرایا) کہ ان کا لباس بھی ان (کے بدن) سے اتروا دیا، تاکہ دونوں کو ایک دوسرے کے پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے

(جو شریف انسان کے لئے بڑی شرم و رسوائی ہے، غرض شیطان تمہارا قدیم دشمن ہے، اس سے بہت ہوشیار رہو اور زیادہ احتیاط اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ) وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو (عادۃً) نہیں دیکھتے ہو (ظاہر ہے کہ ایسا دشمن بہت خطرناک ہے، اس سے بچنے کا پورا اہتمام چاہئے، اور یہ اہتمام ایمان کامل اور تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے وہ اختیار کرلو تو بچاؤ کا سامان ہو جائے گا، کیونکہ) ہم شیطانوں کو انہی کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے (اگر بالکل ایمان نہیں تو پوری طرح شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور اگر ایمان تو ہے مگر کامل نہیں تو اس سے کم درجہ کا تسلط ہوتا ہے، بخلاف مؤمن کامل کے کہ اس پر شیطان کا بالکل قابو نہیں چلتا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ .

لباس عظیم نعمت ہے

آیات مذکورہ سے پہلے ایک پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان رجیم کا واقعہ بیان فرمایا گیا تھا، جس میں شیطانی اغواء کا پہلا اثر یہ ہوا تھا کہ آدم وحوا علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور وہ ننگے رہ گئے، اور پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے۔

متذکرہ آیات میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے تمام اولاد آدم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ تمہارا لباس قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی قدر کرو، یہاں خطاب صرف مسلمانوں کو نہیں، بلکہ پوری اولاد آدم کو ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور ضرورت ہے، بغیر امتیاز کسی مذہب و ملت کے سب ہی اس کے پابند ہیں۔

تین قسم کے لباس

پھر اس کی تفصیل میں تین قسم کے لباسوں کا ذکر فرمایا۔

اوّل: لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ، اس میں یواری، موارات سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں چھپانے کے، اور سواۃ سوءۃ کی جمع ہے، ان اعضاء انسانی کو سورۃ کہا جاتا ہے، جن کے کھلنے کو انسان فطرۃً برا اور قابل شرم سمجھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہاری صلاح

وفلاح کے لئے ایک ایسا لباس اتارا ہے، جس سے تم اپنے قابل شرم اعضاء کو چھپا سکو۔

اس کے بعد فرمایا وریشا، ریش اس لباس کو کہا جاتا ہے جو آدمی زینت و جمال کے لئے استعمال کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ صرف ستر چھپانے کے لئے تو مختصر سا لباس کافی ہوتا ہے، مگر ہم نے تمہیں اس سے زیادہ لباس اس لئے عطا کیا کہ تم اس کے ذریعہ زینت و جمال حاصل کرسکو، اور اپنی ہیئت کو شائستہ بنا سکو۔

اس جگہ قرآن کریم نے انزلنا یعنی اتارنے کا لفظ استعمال فرمایا ہے، مراد اس سے عطا کرنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آسمان سے بنا بنایا اترا ہوا، جیسے دوسری جگہ انزلنا الحدید کا لفظ آیا ہے، یعنی ہم نے لوہا اتارا جو سب کے سامنے زمین سے نکلتا ہے، البتہ دونوں جگہ لفظ انزلنا فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ جس طرح آسمان سے اترنے والی چیزوں میں کسی انسانی تدبیر اور صنعت کو دخل نہیں ہوتا اسی طرح لباس کا اصل مادہ جو روئی یا اون وغیرہ ہے اس میں کسی انسانی تدبیر کو ذرہ برابر دخل نہیں، وہ محض قدرت حق تعالیٰ کا عطیہ ہے، البتہ ان چیزوں سے اپنی راحت و آرام اور مزاج کے مناسب سردی گرمی سے بچنے کے لئے لباس بنا لینے میں انسانی صنعت گری کام کرتی ہے، اور وہ صنعت بھی حق تعالیٰ ہی کی بتلائی اور سکھائی ہوئی ہے اس لئے حقیقت شناس نگاہ میں یہ سب حق تعالیٰ ہی کا ایسا عطیہ ہے جیسے آسمان سے اتارا گیا ہو۔

لباس کے دو فائدے

اس میں لباس کے دو فائدے بتلائے گئے، ایک ستر پوشی، دوسرے سردی گرمی سے حفاظت اور آرائش بدن، اور پہلے فائدہ کو مقدم کر کے اس طرف اشارہ کردیا کہ انسانی لباس کا اصل مقصد ستر پوشی ہے، اور یہی اس کا عام جانوروں سے امتیاز ہے کہ جانوروں کا لباس جو قدرتی طور پر ان کے بدن کا جز بنا دیا گیا ہے اس کا کام صرف سردی گرمی سے حفاظت یا زینت ہے، ستر پوشی کا اس میں اتنا اہتمام نہیں، البتہ اعضائے مخصوصہ کی وضع ان کے بدن میں اس طرح رکھ دی ہے کہ بالکل کھلے نہ رہیں، کہیں ان پر دم کا پردہ کہیں دوسری طرح کا۔

اور حضرت آدم وحوا اور اغواء شیطانی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لباس کے ذکر کرنے

میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لئے ننگا ہونا اور قابل شرم اعضاء کا دوسروں کے سامنے کھلنا انتہائی ذلت ورسوائی اور بے حیائی کی علامت اور طرح طرح کے شر وفساد کا مقدمہ ہے۔

انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اس کو ننگا کرنیکی صورت میں ہوا آج بھی نئی شیطانی تہذیب انسان کو برہنہ یا نیم برہنہ کرنے میں لگی ہوئی ہے

اور یہی وجہ ہے کہ شیطان کا سب سے پہلا حملہ انسان کے خلاف اسی راہ سے ہوا کہ اس کا لباس اتر گیا، اور آج بھی شیطان اپنے شاگردوں کے ذریعے جب انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو تہذیب وشائستگی کا نام لے کر سب سے پہلے اس کو برہنہ یا نیم برہنہ کر کے عام سڑکوں اور گلیوں میں کھڑا کر دیتا ہے اور شیطان نے جس کا نام ترقی رکھ دیا ہے وہ تو عورت کو شرم وحیاء سے محروم کر کے منظر عام پر نیم برہنہ حالت میں لے آنے کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی۔

لباس کی ایک تیسری قسم

ستر پوشی اور راحت وزینت کے لئے دو قسم کے لباسوں کا ذکر فرمانے کے بعد قرآن کریم نے ایک تیسرے لباس کا ذکر اس طرح فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ بعض قراءتوں میں فتح یعنی زبر کے ساتھ لباس التقویٰ پڑھا گیا ہے، تو انزلنا کے تحت میں داخل ہو کر معنی یہ ہوئے کہ ہم نے ایک تیسرا لباس تقویٰ کا اتارا ہے، اور مشہور قراءت کی رو سے معنی یہ ہیں کہ یہ دو لباس تو سب جانتے ہیں، ایک تیسرا لباس تقویٰ کا ہے اور وہ سب لباسوں سے زیادہ بہتر ہے، لباس تقویٰ سے مراد حضرت ابن عباس اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق عمل صالح اور خوف خدا ہے۔ (روح)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ظاہری لباس انسان کے قابل شرم اعضاء کے لئے پردہ اور سردی گرمی سے بچنے اور زینت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح ایک معنوی لباس عمل صالح اور خوف خدا تعالیٰ کا ہے جو انسان کے اخلاقی عیوب اور کمزوریوں کا پردہ ہے اور دائمی تکلیفوں اور مصیبتوں سے نجات کا ذریعہ ہے اسی لئے وہ سب سے بہتر لباس ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک اہم ہدایت ان کے ادب واحترام کی حفاظت

قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں آیت مذکورہ میں جو الفاظ عصٰی وغیرہ آدم علیہ السلام کے بارے میں ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

ہم میں سے کسی کے لئے آج یہ جائز نہیں کہ آدم علیہ السلام کی طرف یہ لفظ عصیان منسوب کرے پھر اس کے کہ قرآن کی اس آیت کے یا کسی حدیث نبوی کے ضمن میں آیا ہو وہ بیان کرے لیکن یہ کہ اپنی طرف سے یہ لفظ منسوب کرنا ہمارے اپنے قریبی آباء واجداد کے لئے بھی جائز نہیں، پھر ہمارے سب سے پہلے باپ جو ہر حیثیت میں ہمارے آباء سے مقدم اور اعظم واکرم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معزز ہیں جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور معافی کا اعلان کر دیا ان کے لئے تو کسی حال میں جائز نہیں۔

اس لئے قیشری ابونصر نے فرمایا کہ اس لفظ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی اور غاوی کہنا جائز نہیں اور قرآن کریم میں جہاں کہیں کسی نبی یا رسول کے بارے میں ایسے الفاظ آئے ہیں یا تو وہ خلاف اولیٰ امور ہیں یا نبوت سے پہلے کے ہیں۔ اس لئے بضمن آیات قرآن و روایات حدیث تو ان کا تذکرہ درست ہے لیکن اپنی طرف سے ان کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ (قرطبی)

اترنے کا حکم کس کس کو ہوا

زمین پر اترنے کا حکم حضرت آدم و ابلیس دونوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ شیطان کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی جنت سے نکالا جا چکا تھا اب اس کو اس خطاب میں شریک قرار دینا بعید ہے تو دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ خطاب آدم وحواء علیہما السلام دونوں کو ہو۔ اس صورت میں باہمی عداوت سے مراد ان کی اولاد میں باہمی عداوت ہونے کو بیان کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اولاد میں باہمی عداوت ماں باپ کی زندگی بھی تلخ کر دیتی ہے۔

حضرت آدم وحواء علیہما السلام

آدم وحواء کے نام

مشہور محدث حافظ ابن حجر مکی کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ''سریانی'' نام ہے اور بائبل میں الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یعنی آدام اور علامہ جوہری اور جوالیقی یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہیں اور دوسرے سوال کے متعلق ثعلبی کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں آدام مٹی کو کہتے ہیں، چونکہ ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی، اس لیے آدم یا آدام نام رکھا گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ ادمتہ سے ماخوذ ہے اس لیے کہ وہ ''ادیم الارض'' یعنی صفحہ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں اور بعض علماء کہتے ہیں کہ ''ادمت'' بمعنی ''خلطت'' سے ماخوذ ہے کہ اور چونکہ ان کا خمیر پانی اور مٹی کو ملا کر اور خلط ملط کر کے بنایا گیا ہے اس لیے اس مناسبت سے ان کو آدم کہا گیا۔ اسی طرح حواء اس لیے نام پڑا کہ وہ ہر ''انسانی حی'' (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور مبالغہ کا صیغہ بنا کر ان کا نام رکھ دیا گیا (۲) بہر حال نام اور معنی میں مناسبت کا یہ سوال نکتہ اور لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے بیان کردہ تمام وجوہ بیک وقت صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور کسی ایک وجہ کو دوسری پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے کیونکہ یہ بات بہت وسیع ہے۔

حضرت حواء کی پیدائش

قرآن عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النسآء ۴۔۱) ''اور اس (نفس) سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا'' یہ نظم قرآنی حواء کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی، اس لیے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں اول یہ کہ حواء حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے، دوم یہ

کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اسی کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقہ حیات بنتی ہے۔

آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز صرف حضرت حواء کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ ''عورت کی تخلیق کے متعلق'' اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے البتہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔

الفاظ یہ ہیں

استو صوابا لنساء فان المرأة خلقت من ضلع (الحدیث)

عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔

اس کا مطلب ابن اسحٰق نے تو یہ بیان کیا ہے کہ حوا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی مگر ابن اسحٰق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبی نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی خلقت کی ابتدا پسلی سے کی گئی ہے اس کا حال پسلی ہی کی طرح ہے اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرنا چاہیے ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوشگواری کی جگہ تعلق کی شکست و ریخت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

جنت آدم کی تحقیق

حضرت آدم (علیہ السلام) جس جنت میں مقیم تھے اور جہاں سے انہیں زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا وہ جنت کونسی جنت ہے "جنت الماویٰ"؟ جو بعد قیامت اہل ایمان کا مستقر ہے یا "جنت ارضی" جو اسی سرزمین میں کسی بلند و پر فضا مقام پر آدم کی حکومت کے لیے بنائی گئی تھی جمہور علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ "جنت الماویٰ" ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آیات و احادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے مثلاً

وَ قُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرہ ۲، آیت ۳۵)

ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی (حواء) جنت میں رہو۔

اس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے (الجنۃ) الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآن عزیز میں قیام قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کی حقیقت کا اظہار ہوتا پھر اس کو جانی پہچانی چیز کی طرح ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔

تم وہاں سے ایک ساتھ اترو

ہبوط: (اترنا) بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے، اس لئے یہ جنت اراضی نہیں ہو سکتی بلکہ "جنۃ ماویٰ" ہی ہو سکتی ہے۔

۳۔ مسلم میں ایک طویل حدیث ہے۔ جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

یجمع اللہ الناس فیقوم المؤمنون حین تزدلف لھم الجنۃ فیاتون ادم فیقولون یاابانا استفتح لنا الجنۃ فیقول وھل اخرجکم من الجنۃ الا خطئۃ ابیکم (الحدیث)

اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا، پس اہل ایمان کھڑے ہوں گے جب جنت ان کے قریب ہوگی۔ پھر وہ آدم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے، اے ہمارے باپ ہمارے لیے اس جنت کو کھولیے

اس پر حضرت آدم فرمائیں گے کیا تم کو جنت سے تمہارے باپ کی خطا کاری ہی نے نہیں نکالا تھا؟

اس کے برعکس علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جنت دنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی "جنۃ الماویٰ" نہ تھی اور اپنے قول کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ آیات قرآنی ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم وحواء کو وہاں کھانے پینے کا مکلف بنایا اور ایک درخت کے نہ کھانے کی تکلیف دی پھر وہاں آدم راحت میں بھی رہتے تھے اور وہاں ابلیس بھی آتا جاتا رہتا تھا اور اس نے حضرت آدم کو بہکا بھی دیا اور پھر آدم وحواء اور ابلیس وہاں سے نکالے بھی گئے تو یہ تمام وہ امور ہیں جو دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور "جنت الماویٰ" میں ان کا وجود نہیں ہے نہ وہ عالم تکلیف ہے اور نہ اس میں داخلہ کے بعد اخراج ہے یہ قول بھی بڑے بڑے علما اسلام کی طرف منسوب ہے اور ان دو رایوں کے علاوہ اس سلسلہ میں دو رائیں اور بھی ہیں اور اس طرح اس مسئلہ میں چار اقوال ہو جاتے ہیں۔

(۱) یہ جنت الماویٰ ہے (۲) یہ جنت ارضی ہے (۳) یہ جنت الماویٰ اور جنت ارضی کے علاوہ ایک اور جنت ہے جو صرف اسی غرض سے تیار کی گئی تھی۔

(۴) اس معاملہ میں توقف اور سکوت کرنا چاہیے اور اسے اللہ کے حوالہ کر دینا چاہیے یہ بحث بہت طویل ہے اور حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں اس کو بڑے شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور تمام اقوال کے مفصل دلائل اور نظائر کو بھی نقل کیا ہے۔ تفصیل دیکھنے کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیے۔

بہر حال حقیقت حال کا عالم تو اللہ ہی ہے لیکن تمام دلائل و براہین کے دیکھنے کے بعد ہماری رائے تو یہی ہے کہ یہ معاملہ بلاشبہ "جنت الماویٰ" ہی میں پیش آیا ہے اور کھانے سونے اور شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے لیے تمام معاملات "جنت الماویٰ" میں اس وقت پیش آئے ہیں جبکہ انسان ابھی تک عالم تکلیف میں نہیں آیا تھا۔ پس یہ جو کچھ ہوا مشیت الٰہی کی حکمت بالغہ کے زیر اثر اس لیے ہوا کہ یہ تمام تکوینی امور انسان کے زمین پر آباد ہونے اور "خلافت الٰہیہ" کے حقدار بننے کے لیے ضروری تھے پس اگر یہی راجح قول ہے کہ اس جگہ جنت سے مراد "جنت الماویٰ" ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حواء (علیہما السلام) زمین کے کس حصے پر اتارے گئے تو بعض ضعیف روایتوں میں ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حواء جدہ کی سرزمین پر اتارے گئے اور پھر چل کر دونوں عرفات (حجاز) کے میدان میں ایک دوسرے سے جا ملے اسی لیے اس

میدان حج کا نام عرفات ہوا کیوں کہ دونوں نے اسی مقام پر ایک دوسرے کو پہچانا۔

لیکن قرآن عزیز نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اس کا اظہار رشد و ہدایت سے غیر متعلق تھا' البتہ قلبی رجحان اور نفسیاتی برہان اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آدم حواء ایک ہی جگہ اتارے گئے ہوں گے تاکہ حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے زیر اثر جلد ہی نسل انسانی کی افزائش اپنا کام کر سکے اور اس عالم خاکی کی وارث و مکین اللہ کی زمین کو آباد کر کے انسانیت کے سب سے بڑے شرف ''خلافت ارضی'' کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

ظریفانہ نکتہ

جو علماء اس کے قائل ہیں کہ یہ ''جنت الماوی'' ہے ان پر دوسرے علماء کا یہ اعتراض ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے (اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کا دوسرا نام جنت الخلد ہے) تو حضرت آدمؑ سے ابلیس کا یہ کہنا کہ میں تمہیں شجر خلد کا پتہ بتاؤں کیا معنی رکھتا ہے؟

لیکن اول الذکر علماء ان حضرات سے جو جنت ارضی کے قائل ہیں پلٹ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ جنت ارضی تھی تو اس دار فانی میں ابلیس حضرت آدم سے ایسی بحث ہی کیسے کر سکتا تھا کہ دنیا اور اس کی تمام اشیاء تو فانی ہیں مگر اس میں ایک شجر خلد بھی ہے۔ دار فانی میں خلود کہاں اس کو تو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت آدم علیہ السلام۔

جنت ارضی علماء طبقات الارض کی نظر میں

جو علماء اس جنت کو ''جنت ارضی'' بتاتے ہیں ان میں سے علماء طبقات الارض کا یہ دعویٰ ہے کہ ربع مسکون میں سے جس خطہ پر جنت قائم تھی وہ آج کائنات ارضی پر موجود نہیں ہے۔ یہ حصہ ''قارۂ مو'' کے نام سے اس دنیا میں آباد تھا مگر مختلف حوادث اور پیہم زلزلوں کے باعث بحر ہند میں ہزاروں سال ہوئے کہ غرق ہو گیا اور یہ کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تھا تو اس خطہ پر بسنے والی انسانی آبادی تقریباً ساٹھ ملین (چھ کروڑ) کی تعداد میں ہلاک ہو گئی۔

اور بائبل کے سفر تکوین اصحاح میں اس کا مقام وقوع وہ بتایا گیا ہے جہاں سے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔

کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی اور رسول ہیں؟

شریعت اسلامی میں ''نبی'' اس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چن لیا ہو اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتی ہو اور ''رسول'' اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو۔

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام دنیائے انسانی کے باپ ہیں تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنی نسل کی دنیوی سعادت وفلاح کے لیے رہنما اور ہادی تھے اسی طرح اخروی سعادت وفلاح کے لئے پیغمبر تھے یا نہیں؟

اس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے کہ وہ بلاشبہ اللہ کے سچے پیغمبر اور نبی حق تھے اور اس مسئلہ میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں اور اسی لیے کبھی یہ مسئلہ موضوع بحث نہیں بنا مگر اس مسئلہ میں اس وقت سے اہمیت پیدا ہوئی جبکہ مصر کے قریہ ومنہور کے ایک شخص نے حضرت آدم کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے دعوے کی دلیل میں یہ پیش کیا کہ قرآن عزیز میں کسی مقام پر بھی حضرت آدم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ''نبی'' نہیں کہا گیا۔

اس شخص کا یہ کہنا کہ قرآن عزیز نے حضرت آدم کو کسی جگہ لفظ ''نبی'' سے مخاطب نہیں کیا 'لفظی اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے لیکن حقیقت نبوت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے اس لیے کہ نبوت کے جو معنی اسلامی اصطلاح میں بیان کئے گئے ہیں بغیر کسی تاویل کے اس کا اطلاق حضرت آدم پر نظم قرآنی میں بہت سے مقامات میں موجود ہے' جگہ جگہ یہ ثابت ہے

کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطہ کے حضرت آدم سے ہم کلام ہوتا رہا ہے اور اس تمام مخاطبت اور بات چیت میں امر و نہی اور حلال و حرام کے احکام دیتا رہا ہے اور ان احکام کے لیے آدم کے پاس کسی کو نبی و رسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ براہ راست انہی سے خطاب فرمایا گیا' پس جبکہ نبوت کی حقیقت بھی یہی ہے تو حضرت آدم کی نبوت کا انکار قطعاً باطل اور بے معنی ہے' نیز ان کے رسول ہونے نہ ہونے کی بحث بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اس لیے کہ جب وہ پہلے انسان ہیں تو انسانی آبادی کے لیے اللہ کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی انہوں نے سنائے وہی ان کی شریعت سمجھی جائے گی اور اس لیے وہ رسول بھی ہیں بہرحال ان کی نبوت پر یقین رکھنے اور قلب میں اطمینان پیدا کرنے کے لیے نظم قرآنی کی وہ تمام آیات کافی و شافی دلیل ہیں جو حضرت آدم (علیہ السلام) اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہ راست گفتگو اور مکالمت و مخاطبت کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کیا آدم نبی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی، انہیں اللہ العلمین سے شرف تخاطب و تکلم حاصل ہوا ہے" روایت کے الفاظ یہ ہیں عن ابی ذر "قال قلت یا رسول الله ارای ادم انبیاء کان قال نعم نبیا رسولا یکلم الله (تفسیر ابن کثیر ج اص ۳۴۴ قدیم)

قابیل و ہابیل

ان دونوں کا واقعہ بھی چونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے واقعہ کا ایک حصہ ہے' اس لیے یہاں قابل ذکر ہے۔

قرآن عزیز نے حضرت آدم کے ان دونوں صاحبزادوں کا نام ذکر نہیں کیا صرف "بنی آدم" (آدم کے دو بیٹے) کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے' البتہ توراۃ میں ان کے یہی نام بیان کیے گئے ہیں جو عنوان میں درج ہیں' ان کے واقعہ کے متعلق حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ میں سدی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) اور بعض دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے اس کا مضمون یہ ہے' دنیائے انسانی میں اضافہ کے لئے حضرت آدم کا یہ دستور تھا کہ حواء سے توام (جڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا' قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیرہ ہابیل کی ہمشیرہ سے زیادہ حسین و خوبرو تھی اس لئے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیرہ سے اسکی شادی اور ہابیل کی اس کی ہمشیرہ سے' معاملہ کو ختم کرنے کے لئے حضرت آدم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے اردہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اس کو جلا دیتی تھی' اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دنبہ اللہ کی نذر کیا اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردی قسم کا غلہ قربانی کے لیے پیش کی' دونوں کی حسن نیت اور نیت بد کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا لہذا حسب دستور آگ نے آ کر ہابیل کی

نذر کو جلا دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف اس کے حصہ میں آیا۔

قابیل اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا اور اس نے غیظ و غضب میں آ کر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑوں گا تا کہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے۔ ہابیل نے جواب دیا میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا' باقی تیری جو مرضی آئے وہ کر' رہا قربانی کا معاملہ سو اللہ کے یہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہو سکتی ہے وہاں بدنیت کے نہ دھمکی کام آ سکتی ہے اور نہ بے وجہ کا غم و غصہ' قابیل پر اس نصیحت کا الٹا اثر پڑا اور اس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔

مگر قرآن عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے' صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے' اور اس روایت سے زائد ہابیل کی نعش کے دفن کے متعلق یہ اضافہ ہے۔

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس نعش کا کیا کرے؟ ابھی تک نسل آدم موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور اسی لئے حضرت آدم نے مردے کے بارہ میں کوئی حکم الٰہی نہیں سنایا تھا۔ یکا یک اس نے دیکھا کہ ایک کوے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا' قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے اور بعض روایت میں ہے کے کہ کوے نے دوسرے مردہ کو اس گڑھے میں چھپا دیا۔

قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا' ندامت سے سر جھکا لیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کی نعش کو سپرد خاک کر دیا۔

ہابیل و قابیل کا واقعہ

قرآن میں ہے کہ اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان اہل کتاب کو (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کا (یعنی ہابیل و قابیل کا) قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنایئے (تا کہ ان کو انتساب بالصلحین کا گھمنڈ جاتا رہے) جس کا نحن ابناء اللہ میں اظہار ہو رہا ہے، اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ دونوں نے (اللہ تعالیٰ کے نام کی) ایک ایک نیاز پیش کی اور ان میں سے ایک کی (یعنی ہابیل کی) تو مقبول ہو گئی اور دوسرے کی (یعنی قابیل کی) مقبول نہ

ہوئی، (کیونکہ جس معاملہ کے فیصلہ کے لئے یہ نیاز چڑھائی گئی تھی اس میں ہابیل حق پر تھا، اس لئے اس کی نیاز قبول ہوگئی، اور قابیل حق پر نہ تھا اس کی قبول نہ ہوئی، ورنہ پھر فیصلہ نہ ہوتا، بلکہ اور خلط واشتباہ ہوجاتا جب) وہ دوسرا (یعنی قابیل اس میں بھی ہارا تو جھلا کر) کہنے لگا کہ میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا، اس ایک نے (یعنی ہابیل نے) جواب دیا (کہ تیرا ہارنا تو تیری ہی ناحق پرستی کی وجہ سے ہے میری کیا خطا، کیونکہ) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں (میں نے تو تقویٰ اختیار کیا اور خدا کے حکم پر رہا، خدائے تعالیٰ نے میری نیاز قبول کی، تو نے تقویٰ چھوڑ دیا اور خدا کے حکم سے منہ موڑا تیری نیاز قبول نہیں کی، سو اس میں تیری خطا ہے یا میری، انصاف کر، لیکن اگر پھر بھی تیرا یہی ارادہ ہے تو تو جان، میں نے تو پختہ قصد کرلیا ہے) اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کرنے کے لئے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں (کیونکہ) میں تو خدائے پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں (کہ باوجودیکہ تیرے جواز قتل کا بظاہر ایک سبب موجود ہے، یعنی یہ کہ تو مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے، مگر اس وجہ سے کہ یہ جواز اب تک کسی نص جزئی سے مجھ کو محقق نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے ارتکاب کو احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں، اور اس شبہ کی وجہ سے خدا سے ڈرتا ہوں، اور یہ ہمت تجھی کو ہے کہ باوجود کہ میرے جواز قتل کا کوئی امر مقتضی نہیں بلکہ مانع موجود ہے لیکن پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتا) میں یوں چاہتا ہوں کہ (مجھ سے کوئی گناہ کا کام نہ ہو گو تو مجھ پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کرے جس سے کہ) تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ کرلے، پھر تو دوزخیوں میں شامل ہوجاوے اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی سو (یوں تو پہلے ہی سے قتل کا ارادہ کر چکا تھا یہ جو سنا کہ مدافعت بھی نہ کرے گا، چاہیئے تو تھا کہ گداختہ ہوجاتا مگر بے فکر ہوکر اور بھی) اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کردیا (پھر) آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا جس سے (کمبخت) بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہوگیا (دنیا میں تو یہ نقصان کہ اپنا قوت بازو اور راحت روح گم کر بیٹھا، اور آخرت میں یہ نقصان کہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، اب جب قتل سے فارغ ہوا تو اب حیران ہے کہ لاش کو کیا کروں جس سے یہ راز پوشیدہ رہے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو) پھر (آخر) اللہ تعالیٰ نے ایک کوا (وہاں) بھیجا کہ وہ (چونچ اور پنجوں سے) زمین کو کھودتا تھا (اور کھود کر ایک دوسرے کوے کو کہ وہ مرا ہوا تھا اس گھڑے میں

ڈھکیل کر اس پر مٹی ڈالتا تھا) تا کہ وہ (کوا) اس (قابیل) کو تعلیم کر دے کہ اپنے بھائی (ہابیل) کی لاش کو کس طریقہ سے چھپا دے (قابیل یہ واقعہ دیکھ کر اپنے جی میں بڑا ذلیل ہوا کہ مجھ کو کوے کے برابر بھی فہم نہیں، اور غایت حسرت سے) کہنے لگا کہ افسوس میری حالت پر کیا میں اس سے بھی گیا گذار کہ اس کوے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا (سو اس بد حالی پر) بڑا شرمندہ ہوا، گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا، (غیر واجب کی قید اس لئے لگائی کہ جس شخص کا قتل شرعاً واجب اس کی امداد یا سفارش حرام ہے، اور اس مضمون احیاء کے لکھنے سے بھی تشدید قتل کی ظاہر ہوگئی کہ جب احیاء ایسا محمود ہے تو ضرور قتل مذموم ہوگا، اس لئے اس کا ترتب وتسبب بھی بواسطہ عطف کے من اجل ذلک پر صحیح ہو گیا) اور بنی اسرائیل کے پاس (اس مضمون کے لکھ دینے کے بعد) ہمارے بہت سے پیغمبر بھی دلائل واضحہ (نبوت کے) لے کر آئے، اور وقتاً فوقتاً اس مضمون کی تاکید کرتے رہے) مگر پھر اس (تاکید واہتمام) کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا میں زیادتی کرنیوالے ہی رہے (اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا حتیٰ کہ بعض نے خود ان انبیاء ہی کو قتل کر دیا)

قصہ بیان کرنے کا مقصد

قرآن مجید پر نظر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کریم کوئی قصہ کہانی یا تاریخ کی کتاب نہیں جس کا مقصد کسی واقعہ کو اول سے آخر تک بیان کرنا ہو، لیکن واقعات ماضیہ اور گذشتہ اقوام کی سرگذشت اپنے دامن میں بہت سی عبرتیں اور نصیحتیں رکھتی ہے، وہی تاریخ کی اصل روح ہے، اور ان میں بہت سے حالات وواقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جن پر مختلف احکام شرعیہ کی بنیاد ہوتی ہے، انہی فوائد کے پیش نظر قرآن کریم کا اسلوب ہر جگہ یہ ہے کہ موقع بہ موقع کوئی واقعہ بیان کرتا ہے، اور اکثر پورا واقعہ بھی ایک جگہ بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے جتنے حصہ سے اس جگہ کوئی مقصد متعلق ہوتا ہے اس کا وہی ٹکڑا یہاں بیان کر دیا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا یہ قصہ بھی اسی اسلوب حکیم پر نقل کیا جا رہا ہے، اس میں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بہت سی عبرتیں اور مواعظ ہیں، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام شرعیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ہابیل وقابیل کا فیصلہ

قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا کہ ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی اپنی قربانی پیش کی، مگر ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔

اس قربانی کے پیش کرنے کا واقعہ جو صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ منقول ہے اور ابن کثیر نے اس کو علماء سلف وخلف کا متفقہ قول قرار دیا ہے یہ ہے کہ جب حضرت آدم اور حواء علیہما السلام دنیا میں آئے اور توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر ایک حمل سے ان کے دو بچے توام پیدا ہوئے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی، اس وقت جبکہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں بجز بہن بھائیوں کے کوئی اور نہ تھا، اور بھائی بہن کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا تو اللہ جل شانہ، نے اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے شریعت آدم علیہ السلام میں یہ خصوصی حکم جاری فرمادیا تھا کہ ایک حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہو وہ تو آپس میں حقیقی بہن بھائی سمجھے جائیں، اور ان کے درمیان نکاح حرام قرار پائے، لیکن دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے کے لئے پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی حقیقی بہن کے حکم میں نہیں ہوگی، بلکہ ان کے درمیان رشتہ ازدواج ومناکحت جائز ہوگا۔

لیکن ہوا یہ کہ پہلے لڑکے قابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ حسین وجمیل تھی اور دوسرے لڑکے ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی بدشکل تھی، جب نکاح کا وقت آیا تو حسب ضابطہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بدشکل لڑکی قابیل کے حصہ میں آئی اس پر قابیل ناراض ہوکر ہابیل کا دشمن ہوگیا، اور اس پر اصرار کرنے لگا کہ میرے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی ہے وہی میرے نکاح میں دی جائے، حضرت آدم علیہ السلام نے شرعی قاعدہ کے موافق اس کو قبول نہ فرمایا، اور ہابیل وقابیل کے درمیان رفع اختلاف کے لئے یہ صورت تجویز فرمائی کہ تم دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ کے لئے پیش کرو جس کی قربانی قبول ہوجائے گی یہ لڑکی اس کو دی جائے گی، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ قربانی اسی کی قبول ہوگی جس کا حق ہے، یعنی ہابیل کی۔

اس زمانہ میں قربانی قبول ہونے کی ایک واضح اور کھلی ہوئی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور قربانی کو کھا جاتی تھی، اور جس قربانی کو آگ نہ کھائے تو یہ علامت اس کے نامقبول ہونے کی ہوتی تھی۔

قربانی قبول نہ ہونے پر قابیل کا غصہ

اب صورت یہ پیش آئی کہ ہابیل کے پاس بھیڑ بکریاں تھیں، اس نے ایک عمدہ دنبہ کی قربانی کی، قابیل کاشتکار آدمی تھا، اس نے کچھ غلہ، گندم وغیرہ قربانی کے لئے پیش کیا، اور ہوا یہ کہ حسب دستور آسمان سے آگ آئی، ہابیل کی قربانی کو کھا گئی، اور قابیل کی قربانی جوں کی توں پڑی رہ گئی، اس پر قابیل کو اپنی ناکامی کے ساتھ رسوائی کا غم وغصہ اور بڑھ گیا، تو اس سے رہا نہ گیا، اور کھلے طور پر اپنے بھائی سے کہہ دیا لا قتلنک یعنی میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔

ہابیل کا تحمل

ہابیل نے اس وقت بھی غصہ کی بات کا جواب غصہ کے ساتھ دینے کے بجائے ایک ٹھنڈی اور اصولی بات کہی جس میں اس کی ہمدردی وخیر خواہی بھی تھی کہ **اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ**، یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہے کہ متقی پرہیز گار کا عمل قبول فرمایا کرتے ہیں۔ اگر تم تقویٰ وپرہیز گاری اختیار کرتے تو تمہاری قربانی بھی قبول ہوتی، تم نے ایسا نہیں کیا تو قربانی قبول نہ ہوئی، اس میں میرا کیا قصور ہے؟

اس کلام میں حاسد کے حسد کا علاج بھی ذکر کر دیا گیا ہے، کہ حاسد کو جب یہ نظر آئے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص نعمت عطا فرمائی ہے جو اس کو حاصل نہیں تو اس کو چاہیے کہ اپنی محرومی کو اپنی عملی کوتاہی اور گناہوں کے سبب سے سمجھ کر ان سے تائب ہونے کی فکر کرے، نہ یہ کہ دوسرے سے اس نعمت کے زوال کی فکر میں پڑ جائے، کیونکہ یہ اس کے فائدہ کے بجائے ضرر کا سبب ہے، کیونکہ مقبولیت عند اللہ کا مدار تقویٰ پر ہے (مظہری)

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح (علیہ السلام) پہلے رسول ہیں

حضرت آدم (علیہ السلام) کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جن کو ”رسالت“ سے نوازا گیا صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے اس میں یہ تصریح ہے۔

یا نوح انت اول الرسل الی الارض

اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا۔

نسب نامہ

علم الانساب کے ماہرین نے حضرت نوح علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ یا خنوخ بن یارد بن مہلئیل بن قینان بن انوش بن شیث (علیہ السلام) بن آدم (علیہ السلام)

قرآن عزیز میں حضرت نوح (علیہ السلام) کا تذکرہ

قرآن عزیز کے معجز نما نظم کلام کی یہ سنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد ”وعظ و تذکیر“ کے پیش نظر واقعہ کی انہی جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لئے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرار واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی ”موعظت و عبرت“ کا مقصد ہے، چنانچہ اسی اسلوب بیان کے مطابق قرآن عزیز نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس جگہ کیا ہے۔

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم نے انہی سورتوں کے تناظر میں یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح (علیہ السلام) پہلے رسول ہیں

حضرت آدم (علیہ السلام) کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جن کو "رسالت" سے نوازا گیا صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے اس میں یہ تصریح ہے۔

یا نوح انت اول الرسل الی الارض

اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا۔

نسب نامہ

علم الانساب کے ماہرین نے حضرت نوح علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ یا خنوخ بن یارد بن مہلئیل بن قینان بن انوش بن شیث (علیہ السلام) بن آدم (علیہ السلام)

قرآن عزیز میں حضرت نوح (علیہ السلام) کا تذکرہ

قرآن عزیز کے معجز نما نظم کلام کی یہ سنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد ''وعظ و تذکیر'' کے پیش نظر واقعہ کی انہی جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لئے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرار واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی ''موعظت و عبرت' کا مقصد ہے، چنانچہ اسی اسلوب بیان کے مطابق قرآن عزیز نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس جگہ کیا ہے۔

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم نے انہی سورتوں کے تناظر میں یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔

قوم نوح

حضرت نوح کی بعثت سے پہلے تمام قوم اللہ کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر نا آشنا ہو چکی تھی اور حقیقی اللہ کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی، غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

حضرت نوح کی خصوصیات

سلسلۂ انبیاء میں سب سے پہلے نبی اگرچہ آدم علیہ السلام ہیں۔ لیکن ان کے زمانہ میں کفر و ضلالت کا مقابلہ نہ تھا ان کی شریعت میں زیادہ تر احکام بھی زمین کی آبادکاری اور انسانی ضروریات کے متعلق تھے کفر اور کافر کہیں موجود نہ تھے کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا۔ اور رسالت و شریعت کی حیثیت سے دنیا میں وہ سب سے پہلے رسول ہیں۔ اس کے علاوہ طوفان میں پوری دنیا غرق ہو جانے کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے رفقاء سفینہ تھے انہیں سے نئی دنیا آباد ہوئی اسی لئے ان کو آدم اصغر کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصص انبیاء کا آغاز بھی انہیں سے کیا گیا ہے۔ جس میں ساڑھے نو سو برس کی طویل عمر میں ان کی پیغمبرانہ جدوجہد اور اس پر اکثر امت کی کجروی اور اس کے نتیجہ میں بجز تھوڑے سے مؤمنین کے باقی سب کا غرق ہونا بیان ہوا ہے۔

حضرت نوح کا زمانہ

نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہیں۔ مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں۔ اور یہی مضمون طبرانی نے بروایت ابی ذر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے (تفسیر مظہری) قرن عام طور پر ایک سو سال کو کہا جاتا ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان اس روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا عرصہ ہو گیا۔ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سو چھبیس سال بعد ہوئی ہے اور بتصریح قرآن ان کی عمر نو سو پچاس سال ہوئی۔ اور آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے اس طرح آدم

علیہ السلام کی پیدائش سے نوح علیہ السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپن سال ہوجاتے ہیں۔ یہ مدت مظہری (ص ۳۶۷ ج ۳) سے لی گئی ہے لیکن بظاہر اسکے حساب میں غلطی ہوئی ہے، خود مظہری کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی کل عمر ۱۰۵۰ سال ہوئی، (کیونکہ ۹۵۰ سال جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبوت کے بعد اور طوفان سے پہلے کی مدت پر مشتمل ہیں۔ نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی، اور طوفان کے بعد بھی وہ ساٹھ سال زندہ رہے) اس طرح کل مدت ۲۸۵۶ کے بجائے ۲۸۳۶ سال بنتی ہے، اور اگر حضرت نوح علیہ السلام کی کل عمر ۱۰۵۰ کے بجائے ۹۵۰ قرار دی جائے جیسا کہ مصنف نے ذکر کیا ہے تو کل مدت ۲۷۳۶ قرار پاتی ہے۔ محمد تقی عثمانی (۱۲/ ۷/ ۱۴۲۵ھ) (مظہری)

نوح علیہ السلام کا اصلی نام شاکر اور بعض روایات میں سکن اور بعض میں عبدالغفار آیا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام سے پہلے ہے یا بعد میں۔ اکثر صحابہ کا قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام سے پہلے ہیں (بحر محیط)

مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ اور طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔

قوم نوح اور دعوت نوح

آیت قرآن لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ سے ثابت ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت و نبوت صرف اپنی قوم کے لئے تھی ساری دنیا کے لئے عام نہ تھی اور ان کی قوم عراق میں آباد بظاہر مہذب مگر شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ یہ تھی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ یعنی اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔ اسکے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت ہے جو اصل اصول ہے۔ دوسرے جملہ میں شرک وکفر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے جو اس قوم میں وباء کی طرح پھیل گیا تھا۔ تیسرے جملہ میں اس عذاب عظیم کے خطرہ سے آگاہ

کرنا ہے جو خلاف ورزی کی صورت میں ان کو پیش آنے والا ہے۔ اس عذاب عظیم سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہوسکتا ہے اور دنیا میں طوفان کا عذاب بھی۔ (کبیر)

سردارانِ قوم کا دلخراش جواب

حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کے دین سے ہم کو نکالنا چاہتے ہیں اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور جزا و سزا پانے کے خیالات یہ سب اوہام ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا جواب

اس دل آزار دلخراش گفتگو کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے پیغمبرانہ لہجہ میں جو جواب دیا وہ مبلغین اور مصلحین کے لئے ایک اہم تعلیم اور ہدایت ہے کہ اشتعال کی بات پر مشتعل اور غضبناک ہونے کے بجائے سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کا ازالہ فرما رہے ہیں۔)قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔

یعنی اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے مگر بات یہ ہے کہ میں تمہاری طرح آبائی رسوم جہالت کا پابند نہیں بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں جو کچھ کہتا ہوں ہدایات ربی سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچاتا ہوں جس میں تمہارا ہی بھلا ہے نہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ اور نہ میری کوئی غرض۔ اس میں رب العالمین کا لفظ عقیدہ شرک پر ضرب کاری ہے کہ اس میں غور کرنے کے بعد نہ کوئی دیوی اور دیوتا ٹھہر سکتا ہے نہ کوئی یزدان واہرمن۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم کو جو قیامت کے عذاب میں شبہات ہیں اس کی وجہ تمہاری بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا علم یقین دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے شبہ کا جواب ہے جو سورۂ مؤمنون میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ مَاهٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً الخ یعنی ان کی قوم نے نوح علیہ السلام کی دعوت پر ایک شبہ یہ بھی کیا کہ یہ تو

ہماری ہی طرح ایک بشر اور انسان ہیں ہماری ہی طرح کھاتے پیتے سوتے جاگتے ہیں ان کو ہم کیسے اپنا مقتداء مان لیں اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے کوئی پیغام بھیجنا تھا تو وہ فرشتوں کو بھیجتے جن کا امتیاز اور بڑائی ہم سب پر واضح ہوتی ہے۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ہماری قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنا تفوق اور بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں فرمایا اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَ كُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ یعنی کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے رب کا پیغام تمہاری طرف ایک ایسے شخص کی معرفت آیا جو تمہاری ہی جنس کا ہے تا کہ وہ تمہیں ڈراوے اور تا کہ تم ڈر جاؤ اور تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی اس کے ڈرانے سے تم متنبہ ہو کر مخالفت چھوڑ دو جس کے نتیجہ میں تم پر رحمت نازل ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بشر کو رسول بنایا جائے۔ اوّل تو حق تعالیٰ مختار مطلق ہیں جس کو چاہیں اپنی نبوت و رسالت عطا فرمائیں اس میں کسی کو چوں چرا کی مجال نہیں۔ اس کے علاوہ اصل معاملہ پر غور کرو تو واضح ہو جائے کہ عام انسانوں کی طرف رسالت و نبوت کا مقصد بشر ہی کے ذریعہ پورا ہو سکتا ہے فرشتوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اصل مقصد رسالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور عبادت پر لوگوں کو قائم کر دیا جائے اور اس کے احکام کی مخالفت سے بچایا جائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کی جنس بشر کا کوئی شخص نمونہ عمل بن کر ان کو دکھلائے کہ بشری تقاضوں اور خواہشوں کے ساتھ بھی احکام الٰہیہ کی اطاعت اور اس کی عبادت جمع ہو سکتی ہے۔ اگر فرشتے یہ دعوت لے کر آتے اور اپنی مثال لوگوں کے سامنے رکھتے تو سب لوگوں کا یہ عذر ظاہر تھا کہ فرشتے تو بشری خواہشات سے پاک ہیں نہ ان کو بھوک پیاس لگتی ہے نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے ان کی طرح ہم کیسے بن جائیں۔ لیکن جب اپنا ہی ایک ہم جنس بشر تمام بشری خواہشات اور خصوصیات رکھنے کے باوجود ان احکام الٰہیہ کی مکمل اطاعت کر کے دکھلائے تو ان کے لئے کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا جس کے ڈرانے سے متاثر ہو کر لوگ ڈر جائیں وہ وہی ہو سکتا ہے جو ان کا ہم جنس اور ان کی طرح بشری خصوصیات کا جامع ہو۔ یہ شبہ اکثر امتوں کے کفار نے پیش کیا کہ کوئی بشر نبی اور رسول نہیں ہونا چاہئے اور قرآن نے سب کا یہی جواب دیا ہے۔ افسوس ہے کہ قرآن کی اتنی تصریحات کے باوجود آج بھی کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ مگر جاہل انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتا وہ کسی اپنے ہم جنس کی برتری کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ہمعصر اولیاء اور علماء سے ان کی معاصرت کی بنا پر نفرت وحقارت کا برتاؤ جاہلوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

قوم نوح پر عذاب

قوم نوح علیہ السلام کے دل خراش کلام کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ مشفقانہ اور ناصحانہ رویہ بھی ان کی بے حس قوم پر اثر انداز نہ ہوا بلکہ اندھے بن کر جھٹلانے ہی میں لگے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا۔ ارشاد فرمایا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ۔ یعنی نوح علیہ السلام کی ظالم قوم نے ان کی نصیحت وخیر خواہی کی کوئی پروا نہ کی اور برابر اپنی تکذیب پر جمع رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے طوفان سے نجات دے دی اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا۔ بے شک یہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔

حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ قوم نوح پر طوفان کا عذاب اس وقت آیا جب کہ وہ اپنی کثرت وقوت کے اعتبار سے بھرپور تھے۔ عراق کی زمین اور اس کے پہاڑ ان کی کثرت کے سبب تنگ ہو رہے تھے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ عذاب اس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی کثرت، قوت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جائیں۔ اور اس میں بدمست ہو جائیں۔ (ابن کثیر)

عذاب سے نجات یافتہ

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں کتنے آدمی تھے اس میں روایات مختلف

ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بروایت ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اسّی آدمی تھے جن میں ایک کا نام جرہم تھا یہ عربی زبان بولتا تھا۔ (ابن کثیر)

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ اسّی کے عدد میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ طوفان کے بعد یہ سب حضرات موصل میں جس جگہ مقیم ہوئے اس بستی کا نام ثمانون مشہور ہوگیا۔

قوم والوں کی طرف سے اعتراضات کی بھرمار

حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دی تو قوم نے ان کی نبوت ورسالت پر چند شبہات واعتراضات پیش کئے، حضرت نوح علیہ السلام نے باذن اللہ ان کے جوابات دیئے۔

پہلا اعتراض

ان لوگوں کا پہلا اعتراض حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت ورسالت پر یہ تھا کہ مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا یعنی آپ تو ہمیں جیسے انسان اور آدمی ہو، ہماری ہی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے ہو پھر ہم آپ کا یہ فوق العادت امتیاز کیسے تسلیم کرلیں کہ آپ خدا کے رسول اور پیغمبر ہیں۔

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانوں کی طرف جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا جائے وہ جنس بشر سے نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ کوئی فرشتہ ہو جس کا امتیاز سارے انسانوں کو چار وناچار تسلیم کرنا پڑے۔

اعتراض کا جواب

یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ

اس میں بتلایا گیا کہ رسول کا بشر یا آدمی ہونا تو نبوت ورسالت کے منافی نہیں بلکہ غور کرو تو یہی ضروری ہے کہ آدمیوں کا رسول آدمی ہونا چاہئے تاکہ آدمیوں کو اس سے دین سیکھنا آسان ہو انسان اور فرشتہ کے مزاج میں زمین آسمان کا تفاوت ہے، اگر فرشتہ کو رسول بنا

کر بھیج دیا جاتا تو انسانوں کو اس سے دین سیکھنا سخت مشکل ہو جاتا، کیونکہ فرستہ کو تو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے، نہ اس کو انسانی ضروریات و حوائج پیش آتی ہیں وہ انسانوں کی اس کمزوری کا احساس کیسے کرتا، اور بغیر اس احساس کے انسان عمل میں اس کا اتباع کیسے کر سکتے، یہ مضمون قرآن کی دوسری آیتوں میں صراحۃً اور اشارۃً کئی جگہ آچکا ہے یہاں اس کا ذکر کرنے کے بجائے یہ بتلایا کہ اگر عقل سے کام لو تو رسول و پیغمبر کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ آدمی نہ ہو، ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بینہ اور حجت اس کے ساتھ ہو جس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ تسلیم کرنا آسان ہو جائے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، وہ بینہ اور حجت عام لوگوں کے لئے انبیاء علیہم السلام کے معجزات ہوتے ہیں، اسی لئے نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے ساتھ اللہ کی طرف سے بینہ اور حجت اور رحمت لے کر آیا ہوں تم اس کو دیکھتے اور غور کرتے تو انکار نہ کرتے، مگر تمہارے انکار و عناد نے تمہاری نگاہوں کو اس سے اندھا کر دیا اور تم انکار کر بیٹھے اور اپنی ضد پر جم گئے۔

مگر خدا تعالیٰ کی یہ رحمت جو پیغمبر کے ذریعہ آتی ہے ایسی چیز نہیں کہ زبردستی لوگوں کے سر ڈال دی جائے جب تک وہ خود اس کی طرف رغبت نہ کریں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ دولت ایمان جو میں لے کر آیا ہوں اگر میرا بس چلتا تو تمہارے انکار اور ضد کے باوجود تمہیں دے ہی دیتا، مگر یہ قانون قدرت کے خلاف ہے، یہ نعمت زبردستی کسی کے سر نہیں ڈالی جا سکتی، اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبردستی کسی کو مؤمن یا مسلمان بنانا کسی دور نبوت میں جائز نہیں رکھا گیا، بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا سفید جھوٹ گھڑنے والے خود بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں مگر ایک بات ہے جو ناواقفوں کے دلوں میں تردد پیدا کرنے کے لئے چلتی کی جاتی ہے۔

اس کے ضمن میں اس کی وجہ بھی سمجھی گئی کہ فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ فرشتہ جو مافوق العادت قوت و طاقت رکھتا ہے اور اپنے وجود کی ہر حیثیت میں انسان سے ممتاز ہے اس کو دیکھ کر ایمان لانا تو ایک جبری عمل ہو جاتا کس کی مجال تھی کہ فرشتہ کے سامنے وہ ہٹ دھرمی کرتا جو انبیاء کے سامنے کی جاتی ہے اور شرعاً وہ ایمان مقبول نہیں جو کسی قوت قاہرہ سے مجبور ہو کر اختیار کیا جائے، بلکہ مطلوب ایمان بالغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ کا پورا مشاہدہ کئے بغیر ایمان اختیار کیا جائے۔

دوسرا اعتراض

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّأْیِ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر ایمان لانے والے سب سرسری نظر میں حقیر و ذلیل کمینے لوگ ہیں، کوئی شریف بڑا آدمی نہیں، اس اعتراض کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ تمہاری بات اگر حق اور صحیح ہوتی تو قوم کے بڑے لوگ اس کو قبول کرتے، ان چھوٹے اور رذیل لوگوں کا قبول کرنا اس کی علامت ہے کہ آپ کی دعوت ہی قبول کرنے کے قابل نہیں، دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے لئے آپ کی دعوت ایمان قبول کرنے سے رکاوٹ یہ ہے کہ ہم ایمان لے آئیں تو بحیثیت مسلمان ہم بھی ان کے برابر سمجھے جائیں گے، نمازوں کی صفوف اور دوسری مجالس میں ہمیں ان کے ساتھ ان کے برابر بیٹھنا پڑے گا یہ ہم سے نہیں ہوسکتا۔

حقیقت سے دور ان ناواقفوں نے غرباء فقراء کو جن کے پاس مال کی بہتات نہیں اور دنیوی جاہ و مال نہیں ان کو اراذل قرار دے رکھا تھا، حالانکہ یہ خود ایک جاہلانہ خیال ہے، عزت وذلت اور عقل وفہم مال و دولت کے تابع نہیں بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ جاہ و مال کا ایک نشہ ہوتا ہے جو انسان کو بہت سی معقول اور صحیح باتوں کے سمجھنے اور قبول کرنے سے روک دیتا ہے، کمزور غریب آدمی کی نظر کے سامنے یہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں وہ حق اور صحیح بات کو قبول کرنے میں مسابقت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم سے عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ پیغمبروں پر اول ایمان لانے والے غرباء، فقراء ہی ہوتے ہیں، اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی تصریحات بھی موجود ہیں، اسی وجہ سے جب ہرقل شاہ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دعوت ایمان کے لئے پہنچا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ معاملہ کی تحقیق کرے چونکہ اس نے تورات وانجیل میں انبیاء علیہم السلام کی علامات پڑھی ہوئی تھیں اس لئے اس وقت عرب کے جو لوگ ملک شام میں آئے ہوئے تھے ان کو جمع کر کے ان علامات کے متعلق چند سوالات کئے۔

ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کا اتباع کرنے والے قوم کے کمزور اور غریب لوگ ہیں یا وہ جو قوم کے بڑے کہلاتے ہیں؟ ان لوگوں نے بتلایا کہ کمزور اور غریب لوگ ہیں! اس پر ہرقل نے اقرار کیا کہ یہ علامت تو سچے نبی ہونے کی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اول اول اتباع کرنے والے یہی کمزور غریب لوگ ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ غرباء وفقراء کو رذیل سمجھنا ان کی جہالت تھی، حقیقت میں رذیل تو وہ ہے جو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے مالک کو نہ پہچانے، اسکے احکام سے روگردانی کرے، اسی لئے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کمینہ اور رذیل کون ہے؟ تو فرمایا وہ لوگ جو بادشاہوں اور افسروں کی خوشامد میں لگے رہیں، اور ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کمینہ وہ آدمی ہے جو اپنا دین بیچ کر دنیا کمائے کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ کمینہ کون ہے تو فرمایا وہ شخص جو اپنا دین برباد کر کے کسی دوسرے کی دنیا سنوارے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمینہ وہ شخص ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہے کیونکہ وہ پوری امت کے سب سے بڑے محسن ہیں جن کے ذریعہ دولت ایمان وشریعت ان کو پہنچی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اصولی ہدایات

سورۂ ھود میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ تقریر نقل کی گئی ہے جو انہوں نے اپنی قوم کے سب اعتراضات سننے کے بعد ان کو کچھ اصولی ہدایات دینے کے لئے ارشاد فرمائی جس میں بتلایا گیا ہے کہ نبوت ورسالت کے لئے وہ چیزیں ضروری نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہیں۔

مثلاً پہلے فرمایا وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اس میں ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہے کہ جب اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں تو ان کے ہاتھ میں خزانے ہونے چاہئیں جن سے لوگوں کو دادودہش کرتے رہیں، نوح علیہ السلام نے بتلا دیا کہ انبیاء کی بعثت کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو متاع دنیا میں الجھائیں، اس لئے خزانوں سے ان کا کیا کام۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہو جو بعض لوگ سمجھا کرتے ہیں کہ اللہ نے انبیاء کو بلکہ اولیاء کو بھی مکمل اختیارات دے دیئے ہیں اللہ کی قدرت کے خزانے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں تو نوح علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے خزانوں کا مکمل اختیار کسی نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، اولیاء کا تو کیا ذکر ہے، البتہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں اور خواہشیں اپنی قدرت سے پوری فرماتے ہیں۔

دوسرے فرمایا و لا اعلم الغیب، ان جاہلوں کا یہ بھی خیال تھا کہ جو شخص خدا تعالیٰ کا رسول ہو وہ عالم الغیب بھی ہونا چاہئے، اس جملہ نے واضح کر دیا کہ نبوت و رسالت علم غیب کی مقتضی نہیں اور کیسے ہوتی جبکہ علم غیب حق تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے جس میں کوئی نبی یا فرشتہ شریک نہیں ہو سکتا، ہاں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں غیب کے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کو عالم الغیب کہنا درست نہیں ہوتا کیونکہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جس غیب کو چاہیں معلوم کر لیں۔

تیسری بات یہ فرمائی و لا اقول انی ملک یعنی میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اس میں ان کے اس خیال کی تردید ہو گئی کہ رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہئے۔

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمہاری نظریں جن غریب بے سرمایہ لوگوں کو حقیر و ذلیل دیکھتی ہیں میں تمہاری طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کو کوئی خیر اور بھلائی نہ دے گا کیونکہ خیر اور بھلائی کا تعلق مال و دولت سے نہیں بلکہ انسان کے قلب سے ہے اور دلوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا قلب خیر و صلاح کے قابل ہے کس کا نہیں۔

پھر فرمایا کہ اگر میں بھی تمہاری طرح ان کو حقیر و ذلیل کہنے لگوں تو میں بھی ظالم ہو جاؤں گا۔

قوم کے ہاتھوں اذیتیں اٹھانا

بروایت ضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان کی قوم ان کو اتنا مارتی کہ وہ گر جاتے تو انکو ایک کمبل میں لپیٹ کر مکان میں ڈال دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے یہ مر گئے، مگر پھر جب اگلے روز انکو ہوش آتا تو ان کو اللہ کی طرف بلاتے اور تبلیغ کے عمل میں لگ جاتے۔ محمد بن اسحق نے عبید بن عمر ولیثی سے روایت کیا ہے کہ انکو یہ خبر پہنچی ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم ان کا گلا گھونٹ دیتی تھی جس سے وہ بے ہوش ہو جاتے اور جب ہوش آتا تو یہ دعا کرتے تھے رب اغفر لقومی انھم لا یعلمون۔ اے میرے پروردگار، میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ جانتے نہیں۔

ان کی ایک نسل کے ایمان لانے سے مایوسی ہوئی تو یہ امید رکھتے تھے کہ ان کی اولاد میں کوئی ایمان لے آئیگا وہ نسل بھی گزر جاتی تو تیسری نسل سے یہی توقع لگا کر اپنے فرض منصبی میں مشغول رہتے کیونکہ ان نسلوں کی عمریں اتنی طویل نہ تھیں جتنی حضرت نوح علیہ السلام کو بطور معجزہ عطا ہوئی تھی۔

قوم کے لئے بددعاء

جب ان کی نسل پر نسل گزرتی رہی اور ہر آنے والی نسل پچھلی سے زیادہ شریر اور بدتر ثابت ہوئی تو حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں اپنا شکوہ پیش فرمایا جس میں بتلایا کہ میں نے ان کو رات دن اجتماعاً و انفراداً، علانیہ اور خفیہ جو جو طریقہ کسی کو راستہ پر لانے کا ہو سکتا ہے وہ سب اختیار کیا کبھی اللہ کے عذاب سے ڈرایا، کبھی جنتوں کی نعمتوں کی ترغیب دلائی اور یہ بھی کہ ایمان اور عمل صالح کی برکت سے تمہیں دنیا میں بھی فراخی اور خوشحالی نصیب ہو گی کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیوں کو پیش کر کے سمجھایا مگر انہوں نے ایک نہ سنی، دوسری طرف حق تعالیٰ نے ان کو یہ بھی بتلا دیا کہ آپ کی پوری قوم میں جس کو ایمان لانا تھا لے آیا آگے ان میں کوئی ایمان قبول نہ کرے گا اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِکَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ کا یہی مطلب ہے اس وقت حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر بددعا کے کلمات آئے جس کا آگے ذکر کیا گیا جس کے نتیجہ مین پوری قوم غرق و ہلاک ہو گئی، بجز مومنین کے جن کو ایک کشتی میں سوار کر لیا گیا تھا۔

ایمان و استغفار کی دعوت

قوم کی فہمائش کے سلسلہ میں نوح علیہ السلام نے ان کو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے یعنی ایمان لا کر پچھلے گناہوں کو معافی مانگنے کی دعوت دی اور اس کا دنیاوی نفع یہ بتلایا کہ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّ یُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ اس سے اکثر علماء نے استدلال کیا ہے کہ گناہوں سے توبہ و استغفار سے اللہ تعالیٰ بارش حسب موقع برسا دیتے ہیں قحط نہیں پڑنے دیتے اور مال و اولاد میں استغفار سے برکت ہوتی ہے کہیں کسی حکمت الٰہیہ کے تقاضے سے اس کے خلاف بھی ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ عام لوگوں کے ساتھ یہی ہے کہ توبہ و استغفار اور ترک معصیت سے دنیا کی بلائیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

قوم والوں کا مکر

قوم کے شکوہ کے سلسلہ میں فرمایا وَمَکَرُوْا مَکْرًا کُبَّارًا، کبارا کبر کا مبالغہ ہے جس کے معنے بہت بڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے بہت بڑا مکر کیا وہ یہ تھا کہ خود تو

تکذیب کر کے ایذائیں پہنچاتے ہی تھے بستی کے غنڈوں اور شریروں کو بھی ان کے پیچھے ڈال دیتے تھے۔ اسی شکوہ میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا کہ انہوں نے باہم معاہدہ کیا کہ لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا یعنی اپنے بتوں کو خصوصاً ان پانچ بڑے بتوں کی عبادت کو نہ چھوڑو یہ پانچ نام ہیں پانچ بتوں کے۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں دراصل اللہ کے نیک و صالح بندے تھے جو آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں گزرے تھے ان کے بہت سے لوگ معتقد اور متبع تھے ان لوگوں نے ان کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ دراز تک انہیں کے نقش قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔ کچھ عرصہ کے بعد شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کے تابع عبادت کرتے ہو اگر ان کی تصویریں بنا کر سامنے رکھا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ یہ لوگ اس فریب میں آ کے ان کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے۔ اور ان کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے ایک خاص کیفیت محسوس کرنے لگے یہاں تک کہ اسی حال میں یہ لوگ سب یکے بعد دیگرے مر گئے اور بالکل نئی نسل نے ان کی جگہ لے لی تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ تمہارے بزرگوں کے خدا اور معبود بھی بت تھے وہ انہیں کی عبادت کیا کرتے تھے یہاں سے بت پرستی شروع ہو گئی اور ان پانچ بتوں کی عظمت ان کے دلوں میں چونکہ سب سے زیادہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے باہمی معاہدے میں ان کا نام خاص طور سے لیا گیا۔

ایک سوال کا جواب

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا فرض منصبی قوم کو ہدایت کرنے کا ہے۔ نوح علیہ السلام نے ان کی گمراہی کی بددعا کیسے کی کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس کی تو خبر دے دی تھی کہ اب ان میں کوئی مسلمان نہیں ہوگا اس لئے ان کا گمراہی اور کفر پر مرنا تو یقینی تھا حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی گمراہی بڑھا دینے کی دعا اس لئے فرمائی کہ جلد ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ہلاک کر دیئے جائیں۔

پانی میں آگ کا عذاب

سورۂ نوح میں ہے مِمَّا خَطِيْئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا، یعنی یہ لوگ اپنی خطاؤں کفروشرک کی وجہ سے پانی میں غرق کیے گئے تو یہ آگ میں داخل ہو گئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں کیونکہ اس میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔

عذاب قبر قرآن سے ثابت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ یعنی قبر میں رہنے کے زمانے میں بھی مردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیث صحیحہ متواترہ میں قبر کے اندر عذاب و ثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جاسکتا اس لئے اس پر امت کا اجماع اور اس کا اقرار اہل سنت والجماعت کی علامت ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتی کوششیں

حضرت نوح علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تقریباً ایک ہزار سال کی عمر دراز عطا فرمائی اس کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دینے اور قوم کی اصلاح کرنے کی فکر اور پیغمبرانہ جدوجہد کا بھی یہ درجہ عطا فرمایا کہ اس طویل مدت عمر میں ہمیشہ اپنی قوم کو دین حق اور کلمۂ توحید کی دعوت دیتے رہے، قوم کی طرف سے سخت سخت ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا ان کی قوم ان پر پتھراؤ کرتی یہاں تک کہ بے ہوش ہو جاتے پھر جب ہوش آتا تو دعا کرتے کہ یا اللہ میری قوم کو معاف کردے یہ بے وقوف جاہل ہیں جانتے نہیں، قوم کی ایک نسل کے بعد دوسری کو اور دوسری کے بعد تیسری کو اس امید پر دعوت دیتے کہ شاید یہ حق کو قبول کرلیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا

جب اس عمل پر صدیاں گزر گئیں تو رب العزت کے سامنے ان کی حالت زار کی شکایت کی

جو سورۂ نوح میں مذکور ہے رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا، اور اتنے طویل مصائب کے بعد اس مرد خدا کی زبان پر یہ دعا آئی، رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنَ، یعنی اے میرے پروردگار ان کی تکذیب کے بالمقابل آپ میری مدد کیجئے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب

قوم نوح کا ظلم و جور حد سے گزر جانے کے بعد حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو خطاب فرمایا (بغوی، مظہری)

جس میں اول تو حضرت نوح علیہ السلام کو یہ بتلایا گیا کہ آپ کی قوم میں جن کو ایمان لانا تھا، لے آئے اب کوئی اور شخص ایمان قبول نہ کرے گا ان کے دلوں پر ان کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کی بناء پر مہر لگ چکی ہے اس لئے اب آپ اس قوم کا غم نہ کھائیں اور ان کے ایمان قبول نہ کرنے سے پریشان نہ ہوں۔

دوسری بات یہ بتلائی گئی کہ اب ہم اس قوم پر عذاب پانی کے طوفان کا بھیجنے والے ہیں اس لئے آپ ایک کشتی تیار کریں جس میں آپ کے اہل و عیال اور جتنے مسلمان ہیں مع اپنی ضروریات کے سما سکیں تا کہ طوفان کے وقت یہ سب اس میں سوار ہو کر نجات پا سکیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق کشتی بنائی، پھر جب طوفان کی ابتداء کی علامات سامنے آ گئیں کہ زمین سے پانی ابلنے لگا تو نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ خود مع اپنے اہل و عیال کے اور ان لوگوں کے جو آپ پر ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار ہو جائیں، اور انسانوں کی ضروریات جن جانوروں سے متعلق ہیں جیسے گائے، بیل، بکری، گھوڑا، گدھا وغیرہ ان کا بھی ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لیں حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق سب کو سوار کر لیا۔

آخر میں فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور کشتی میں سوار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کو تسلی اور نافرمانوں کیلئے عذاب

نوح علیہ السلام پر یہ وحی بھیجی گئی کہ ان کی قوم میں سے جو ایمان لانے والے تھے

لا چکے ہیں آئندہ اور کوئی ایمان نہ لائے گا اس لئے یہ لوگ جو کچھ معاملہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں اس سے آپ غمگین و پریشان نہ ہوں کیونکہ غم و پریشانی عموماً جب ہوتی ہے جب کسی سے صلاح وفلاح کی امید وابستہ ہو، مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہوتی ہے آپ ان سے مایوس ہو جائیے، اور جو تکلیف وصدمہ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی ایذاؤں سے پہنچ رہا تھا اس کے انتظام کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا کہ ان کو پانی کے طوفان میں غرق کر دیا جائے گا انہیں حالات میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر اپنی قوم کے لئے وہ بدعا آئی تھی جس کا ذکر سورۂ نوح میں کیا گیا ہے۔

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا

یعنی اے میرے پروردگار! اب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑیئے، کیونکہ اگر یہ رہے تو ان کی آئندہ نسل بھی ایسی ہی سرکش اور فاجر و کافر ہوگی۔

یہی دعا قبول ہو کر پوری قوم نوح طوفان میں غرق کی گئی۔

نوح علیہ السلام کو کشتی سازی کی تعلیم

حضرت نوح علیہ السلام کو جب کشتی بنانے کا حکم ملا اس وقت وہ نہ کشتی کو جانتے تھے نہ اس کے بنانے کو، اس لئے دوسری آیت میں ان کی سفینہ سازی کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا **واصنع الفلک باعیننا ووحینا** یعنی آپ کشتی بنائیں ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق۔

روایات حدیث میں ہے کہ جبرئیل امین نے بذریعہ وحی الٰہی حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی تمام ضروریات اور اس کا طریقہ بتلایا، انہوں نے سال کی لکڑی سے یہ کشتی تیار کی۔

بعض تاریخی روایات میں اس کی پیمائش یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ تین سو گز لانبا، پچاس گز چوڑا، تیس گز اونچا سہ منزلہ جہاز تھا اور روشن دان مروجہ طریق کے مطابق دائیں بائیں کھلتے تھے اس طرح یہ جہاز سازی کی صنعت وحی خداوندی کے ذریعہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے ہاتھوں شروع ہوئی، پھر اس میں ترقیات ہوتی رہیں۔

تمام ضروری صنعتوں کی ابتداء وحی کے ذریعہ ہوئی

حافظ شمس الدین ذہبی کی الطب النبوی میں بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان سب کی ابتداء بذریعہ وحی الٰہی کسی پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آئی ہے پھر حسب ضروریات اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں، سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف جو وحی آئی ہے اس کا بیشتر حصہ زمین کی آبادکاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے، بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعہ چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ کی ایجادات میں سے ہے۔

سرسید صاحب بانی علیگڑھ کالج نے خوب فرمایا ہے کہ زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کرلیں لیکن مدار کار ہر قسم کی گاڑیوں کا دھری اور پہیے پر ہی رہا، وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی سے لے کر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے اس لئے سب سے بڑا موجد گاڑیوں کا وہ شخص ہے جس نے پہیہ ایجاد کیا کہ دنیا بھر کی ساری مشینری کی روح پہیہ ہی ہے اور معلوم ہو چکا کہ یہ ایجاد پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بذریعہ وحی الٰہی عمل میں آئی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اشیاء ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ بطور وحی انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی ہے۔

قوم والوں کا کشتی بنانے پر مذاق اُڑانا

حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی ہدایت دینے کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ آپ کی قوم پر طوفان آئے گا، وہ غرق ہوں گے، اس وقت آپ اپنی شفقت کی بناء پر ان کے بارے میں کوئی سفارش نہ کریں۔

حضرت نوح علیہ السلام بحکم خداوندی کشتی بنانے میں مشغول تھے ان کی قوم کے سردار جب ان کو دیکھتے اور پوچھتے کہ کیا کر رہے ہو؟ تو یہ فرماتے کہ طوفان آنے والا ہے اس لئے کشتی تیار کر رہا ہوں ان کی قوم ان کا مذاق اڑاتی اور استہزاء کرتی تھی کہ یہاں پینے کے لئے

تو پانی کا قحط ہے، یہ بزرگ اس خشکی میں کشتی چلانے کی فکر میں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا کہ "اگر آج تم ہم سے استہزاء کرتے ہو تو یاد رکھو کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں ہم تم سے استہزاء کریں گے" مراد یہ ہے کہ حالات ایسے پیش آئیں گے جو خود تمہارے استہزاء کے موجب ہوں گے، کیونکہ حقیقۃً استہزاء و تمسخر شان انبیاء کے خلاف ہے وہ کسی کے لئے جائز نہیں بلکہ حرام ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ۔ یعنی کوئی کسی کے ساتھ استہزاء نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو، اس لئے یہاں استہزاء سے مراد ان کے استہزاء کا عملی جواب ہے کہ جب تم عذاب میں گرفتار ہو گے تو ہم تمہیں بتلائیں گے کہ یہ ہے تمہارے استہزاء کا انجام، جیسا کہ اس کے بعد چوتھی آیت میں فرمایا ہے کہ "عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور کس پر دائمی عذاب ہوتا ہے۔" پہلے عذاب سے دنیا کا اور عذاب مقیم سے آخرت کا دائمی عذاب مراد ہے۔

طوفان کی ابتداء اور ہدایات

طوفان کی ابتداء اور اس سے متعلقہ ہدایات اور واقعات کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ یعنی جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور سے پانی ابلنا شروع ہو گیا۔

لفظ تنور کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، سطح زمین کو بھی تنور کہتے ہیں، روٹی پکانے کے تنور کو بھی تنور کہا جاتا ہے، زمین کے بلند حصہ کے لئے بھی لفظ تنور بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ اس جگہ تنور سے مراد سطح زمین ہے کہ اس سے پانی ابلنے لگا۔ بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام "عین وردہ" ملک شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا۔ بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا وہ مراد ہے، اکثر مفسرین حضرت حسن، مجاہد، شعبی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ ہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

اور شعبی رحمہ اللہ تو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ تنور شہر کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجد کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ آپکے گھر کے تنور سے پانی ابلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آ گیا۔ (قرطبی و مظہری)

مفسر قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگرچہ تنور کے معنی میں مفسرین کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی اختلاف نہیں، جب طوفان کا پانی ابلنا شروع ہوا تو روٹی پکانے کے تنور سے بھی نکلا سطح زمین سے بھی ابلا، ملک شام عین الوردہ کے تنور سے بھی نکلا، جیسا کہ قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا۔ یعنی ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے لئے کھول دیئے اور زمین سے چشمے ہی چشمے پھوٹ پڑے۔

شعبی رحمہ اللہ نے اپنے بیان میں یہ بھی فرمایا کہ یہ کوفہ کی جامع مسجد، مسجد حرام اور مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بعد چوتھی مسجد ہے جو ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔

ہر جاندار کے جوڑے کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم

جب طوفان شروع ہو گیا تو حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا۔ احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یعنی سوار کر لیجئے اس کشتی میں ہر جوڑے والے جانوروں کا ایک ایک جوڑا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کشتی نوح میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ صرف وہ جانور جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، اس لئے تمام دریائی جانور اس سے نکل گئے اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض سب نکل گئے صرف پالتو جانور گائے، بیل، بھینس، بکری وغیرہ رہ گئے۔

اس سے وہ شبہ دور ہو گیا جو سطحی نظر میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کشتی میں اتنی وسعت کیسے ہو گئی کہ دنیا بھر کے جانور سما گئے۔

ایمان والوں کو کشتی پر سوار کرنے کا حکم

اور پھر نوح علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے اہل و عیال کو بجز ان کے جو کفر پر ہیں

کشتی میں سوار کرلیں اور ان سب لوگوں کو بھی جو آپ پر ایمان لائے ہیں، مگر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

کشتی والوں کی صحیح تعداد قرآن وحدیث میں متعین نہیں کی گئی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ تعداد کل اسی آدمیوں کی تھی جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث، اور ان کی تین بیبیاں تھیں، چوتھا بیٹا کفار کے ساتھ رہ کر طوفان میں غرق ہوا۔

عذاب کی آمد، کشتی پر سواری اور کشتی کا پہاڑ پر ٹھہرنا

قرآن کریم میں ہے کہ اور نوح (علیہ السلام) نے (سب جانوروں کو سوار کر کے اپنے متبعین سے) فرمایا کہ (آؤ) اس کشتی میں سوار ہو جاؤ (اور غرق سے کچھ اندیشہ مت کرنا کیونکہ) اس کا چلنا اور ٹھہرنا (سب) اللہ ہی کے نام سے ہے (اور وہی اس کے محافظ ہیں پھر اندیشہ کیوں کیا جائے اور گو بندوں کے گناہ مقتضی غرق کو ہیں مگر) بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے (وہ اپنی رحمت سے گناہ بخش دیتا ہے اور حفاظت بھی کرتا ہے، غرض سب کشتی پر سوار ہو گئے اور اس اثناء میں پانی بڑھ گیا) اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے (ایک سگے یا سوتیلے) بیٹے کو (جس کا نام کنعان تھا اور وہ باوجود فہمائش کے ایمان نہ لایا تھا اور بوجہ ایمان نہ لانے کے کشتی میں سوار نہ کیا گیا تھا اور اس وقت کشتی کنارے کے قریب ہی تھی اور وہ کنارہ پر موجود تھا بطور آخری دعوت کے) پکارا اور وہ (کشتی سے) علیحدہ مقام پر تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے (کشتی میں سوار ہونے کی شرط کہ ایمان ہے بجا لا کر جلدی) ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور (عقیدہ میں) کافروں کے سات مت ہو (یعنی کفر کو چھوڑ دے کہ غرق سے بچ جائے) وہ کہنے لگا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی (میں غرق ہونے) سے بچا لے گا (کیونکہ وہ وقت ابتداء طوفان کا تھا پہاڑوں کے اوپر پانی نہ پہنچا تھا) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں (نہ پہاڑ اور نہ اور کوئی چیز) لیکن جس پر وہی رحم کرے (تو اس کو خود ہی بچا لے، غرض کنعان اس وقت بھی ایمان نہ لایا اور پانی زور شور کے

ساتھ اس طرف سے بڑھ گیا) اور دونوں (باپ بیٹوں) کے بیچ میں ایک موج حائل ہوگئی پس وہ (بھی مثل دوسرے کافروں کے) غرق ہوگیا اور (جب کفار سب غرق ہو چکے تو) حکم ہوگیا کہ اے زمین اپنا پانی (جو کہ تیری سطح پر موجود ہے) نگل جا، اور اے آسمان (برسنے سے) تھم جا (چنانچہ دونوں امر واقع ہوگئے) اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی (کوہ) جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دور۔ (ھود:۴۱-۴۴)

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان

جب حضرت نوح علیہ السلام کے سب اہل وعیال کشتی میں سوار ہوگئے مگر ایک لڑکا جس کا نام کنعان بتلایا جاتا ہے سوار ہونے سے رہ گیا تو پدرانہ شفقت سے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو پکارا کہ ہمارے ساتھ کشتی میں آجاؤ، کافروں کے ساتھ نہ رہو کہ غرق ہوجاؤ گے، یہ لڑکا کافروں دشمنوں کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور حقیقت میں کافر تھا مگر غالباً حضرت نوح علیہ السلام کو اس کے کافر ہونے کا یقینی طور پر علم نہ تھا اور اگر علم تھا تو کفر سے توبہ کر کے ایمان لانے کی دعوت کے طور پر اس کو کشتی میں سوار ہونے اور کافروں کا ساتھ چھوڑنے کی نصیحت فرمائی، مگر اس بدبخت نے اس وقت بھی طوفان کو سرسری سمجھا اور کہنے لگا کہ آپ فکر نہ کریں، میں پہاڑ پر چڑھ کر طوفان سے بچ جاؤں گا، حضرت نوح علیہ السلام نے پھر متنبہ کیا کہ ظالم کس خیال میں ہے آج کوئی اونچی عمارت یا پہاڑ کسی کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں اور بچنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم فرمادیں، باپ بیٹے کی یہ گفتگو دور سے چل ہی رہی تھی کہ ایک موج اس طوفان کی آئی اور بیٹے کو بہالے گئی، تاریخی روایات میں ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کا پانی بڑے سے بڑے پہاڑ کی چوٹی سے پندرہ گز اور بعض روایات کے لحاظ سے چالیس گز اونچائی پر تھا۔

طوفان کا اختتام

قرآن کریم میں طوفان کے ختم ہونے اور حالات کے ہموار ہونے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو خطاب کر کے حکم دیا ابْلَعِيْ مَآءَكِ اے زمین تو اپنا

پانی نگل لے، مراد یہ تھی کہ جس قدر پانی زمین سے ابلا تھا اس کے لئے یہ حکم دے دیا کہ اس کو پھر زمین اپنے اندر اتار لے، آسمان کو حکم دیا گیا کہ اب پانی برسانا بند کر دے، اس طرح زمین سے نکلا ہوا پانی پھر زمین میں چلا گیا اور آسمان سے آئندہ پانی برسنا بند ہو گیا، آسمان سے برسا ہوا جتنا پانی زمین پر موجود تھا اس کو قدرت نے دریاؤں اور نہروں کی شکل دے دی جس سے انسان فائدہ اٹھائے (تفسیر قرطبی و مظہری)

کشتی کا جودی پہاڑ پر ٹھہرنا

زمین و آسمان نے احکام کی تعمیل کی تو طوفان کا قصہ ختم ہو گیا، اور سفینہ نوح علیہ السلام جودی پہاڑ پر ٹھہر گیا، اور ظالموں کو ہمیشہ کے لئے رحمت سے دور کہہ دیا گیا۔

جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے اس کا محل وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطن اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصہ کا نام جودی ہے، اسی کے ایک حصہ کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہِ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہری تھی۔

قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں جن کو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

کشتی ٹھہرنے کی تاریخ

تفسیر طبری اور بغوی میں ہے کہ نوح علیہ السلام ۱۰ ماہ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینہ تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سات مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کو بلند کر کے غرق سے بچا لیا تھا، پھر ۱۰ محرم یوم عاشورا میں طوفان ختم ہو کر کشتی جبل جودی پر ٹھہری، حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا اور کشتی میں جتنے آدمی ساتھ تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی کے شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا۔ (مظہری و قرطبی)

روزہ عاشورا یعنی محرم کی دسویں تاریخ کی اہمیت تمام شرائع انبیاء میں قدیم سے چلی آتی

ہے ابتداء اسلام میں رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورا کا روزہ فرض تھا، رمضان کی فرضیت نازل ہونے کے بعد فرض نہیں، مگر سنت اور ثواب عظیم ہمیشہ کے لئے ہے۔

بیٹے کیلئے دعا

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان جب والد بزرگوار کی نصیحت اور دعوت کے باوجود کشتی میں سوار نہ ہوا تو اس کو موج طوفان میں مبتلا دیکھ کر شفقت پدری نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کیا کہ آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میرے گھر والوں کو طوفان سے بچائیں گے اور بلاشبہ آپ کا وعدہ حق وصحیح ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ میرا بیٹا جو میرے گھر والوں میں داخل ہے وہ طوفان کی نذر ہورہا ہے اور آپ تو احکم الحاکمین ہیں ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، اب بھی اس کو طوفان سے بچا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب

حق تعالیٰ کی طرف سے اسکے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ یہ لڑکا آپ کے اہل وعیال میں داخل نہیں رہا کیونکہ اس کا عمل اچھا نہیں بلکہ تباہ کار ہے اس لئے آپ کو نہیں چاہئے کہ اس حقیقت حال سے بے خبر رہ کر مجھ سے کوئی سوال کریں ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ

حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اس بیٹے کے کفر کا پورا حال معلوم نہ تھا اس. کے نفاق کی وجہ سے وہ اس کو مسلمان ہی جانتے تھے، اسی لئے اس کو اپنے اہل کا ایک فرد قرار دے کر طوفان سے بچانے کی دعا کر بیٹھے ورنہ اگر ان کو حقیقت حال معلوم ہوتی تو ایسی دعا نہ کرتے، کیونکہ ان کو صریح طور پر پہلے ہی یہ ہدایت دے دی گئی تھی کہ جب طوفان آجائے تو پھر آپ ان سرکشوں میں سے کسی کے متعلق کوئی سفارش کی گفتگو نہ فرمائیں، جیسا کہ پچھلی آیات میں گزر چکا ہے۔ وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ۔ اس صاف وصریح حکم کے بعد ناممکن تھا کہ پیغمبر خدا اس کی خلاف ورزی کی جرأت کرتے، بجز اس احتمال کے کہ اس دعاء کا حاصل اس بیٹے کے مومن

ہو جانے کی دعا ہے یہ نہیں کہ اسکے موجودہ حال میں اس کو طوفان سے بچایا جائے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی اس کے کفر سے لاعلمی اور اس کی بناء پر دعا نجات کو بھی حق تعالیٰ نے عذر صحیح قرار نہیں دیا اور اسی لئے تنبیہ کی گئی کہ بغیر علم کے ایسی دعا کیوں کی، اور یہ پیغمبرانہ شان کی ایک ایسی لغزش ہے جس کو حضرت نوح علیہ السلام اس وقت بھی اپنے عذر میں پیش کریں گے جب محشر میں پوری مخلوق خدا آپ سے شفاعت کرنے کی درخواست کرے گی تو وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے ایسی لغزش ہو چکی ہے اسلئے میں شفاعت کی جرأت نہیں کر سکتا۔

کشتی سے اترنے کا حکم اور سلامتی کا وعدہ

قصہ طوفان کا خاتمہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب طوفان ختم ہو چکا اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی، اور زمین کا پانی زمین نے نگل لیا، اور آسمان کا باقی ماندہ پانی نہروں، دریاؤں کی شکل میں محفوظ ہو گیا، جس کے نتیجہ میں زمین انسانی رہائش کے قابل ہو گئی تو حضرت نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ اب آپ پہاڑ سے زمین پر اتریئے، اور کوئی فکر نہ کیجئے کیونکہ آپ کے ساتھ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہوں گی، یعنی آفات اور مصائب سے سلامتی اور مال و اولاد میں وسعت و برکت ہو گی۔

اس ارشاد کے مطابق طوفان کے بعد دنیا میں ساری انسانی آبادی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے، قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ، یعنی اس واقعہ کے بعد دنیا میں باقی رہنے والی سب قومیں صرف نوح علیہ السلام ہی کی ذریت و اولاد ہوں گی، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو اہل تاریخ آدم ثانی کا نام دیتے ہیں۔

پھر یہ سلامت و برکت کا وعدہ جو حضرت نوح علیہ السلام سے کیا گیا ہے صرف ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ فرمایا گیا وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ یعنی جو امتیں اور جماعتیں آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہیں ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور برکت نازل ہو گی، حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو آیت میں امم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو امۃ کی جمع ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ کشتی میں سوار ہونے والے مختلف

قوموں اور امتوں پر مشتمل تھے حالانکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے زیادہ تر حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے لوگ تھے اور معدودے چند دوسرے مومن بھی تھے، تو ان لوگوں کو مختلف امتیں اور قومیں اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ ان کی آنے والی نسلوں میں مختلف امتیں اور قومیں ہوں گی، اس سے معلوم ہوا کہ اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَکَ کے الفاظ میں وہ تمام نسل انسانی داخل ہے جو قیامت تک پیدا ہوگی۔

اسی لئے اس کی ضرورت پڑی کہ سلامت و برکت کے مضمون میں تفصیل کی جائے کیونکہ قیامت تک آنے والی نسل انسانی میں تو مؤمن بھی ہوں گے کافر بھی، مومن کے لئے تو سلامت و برکت اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے درست ہے کہ دنیا میں بھی ان کو سلامت و برکت نصیب ہوگی آخرت میں بھی، لیکن اسی نسل میں جو کفار ہوں گے وہ تو جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، ان کو سلامت و برکت کا محل قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا اس لئے آخر آیت میں فرمادیا وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ یعنی دنیا کی سلامت و برکت تو اللہ تعالیٰ کا خوان نعماء ہے جس سے دوست دشمن سبھی کھاتے پیتے ہیں اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوں گے جو نوح علیہ السلام کی اولاد میں کفر اختیار کریں گے لیکن آخرت کی نجات و فلاح یہ صرف مومنین کے لئے مخصوص ہوگی، کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دلا کر فارغ کر دیا جائے گا، آخرت میں اس کے لئے بجز عذاب کے کچھ نہ ہوگا۔

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن میں:

قرآن عزیز میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے سورۂ مریم میں اور سورۂ انبیاء میں

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم آیت ۵۶۔۵۷)

اور یاد کر قرآن میں ادریس کو بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کا مقام

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (الانبیاء آیت ۸۵)

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذاالکفل ان میں سے ہر ایک تھا صبر کرنے والا۔

نام ونسب اور زمانہ:

حضرت ادریس کے نام نسب اور زمانہ کے متعلق مورخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن یا کم از کم راجح رائے نہیں قائم کی جا سکی' وجہ یہ ہے کہ قرآن عزیز نے تو اپنے مقصد رشد و ہدایت کے پیش نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف ان کی نبوت' رفعت مرتبت اور ان کی صفات عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اس سے آگے نہیں جاتیں' اس لئے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلاف سے معمور ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے جد امجد ہیں اور ان کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب ہے یا عربی زبان میں ادریس اور عبرانی یا سریانی میں ان کا نام اخنوخ ہے اور ان کا نسب نامہ یہ ہے۔

خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم (علیہ السلام) ابن اسحٰق کا رجحان اسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس و ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں اور ان

دونوں روایات کے پیش نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی سعی کی ہے کہ جد نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام ادریس ہے۔ اور الیاس لقب' مگر یہ رائے بھی بے سند اور بے دلیل ہے' بلکہ قرآن عزیز کا الیاس اور ادریس کو جدا جدا بیان کرنا شاید اس کو متحمل نہ ہو سکے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی اولیات

صحیح ابن حبان میں روایت ہے کہ حضرت ادریس پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کو استعمال کیا ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آ جاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرت ادریس ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے رمل کے کلمات ادا کئے (۲) البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد اول ص ۹۹) اور وہ ان کو "ہرمس (۳) ہرمس علم نجوم کے ماہر عالم کو کہتے ہیں اس لئے ہرمس الہرامسہ کے معنی یہ ہیں کہ ماہرین علم نجوم کا استاذ اول ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم گزرا ہے۔) الہرامسہ" کا لقب دیتے ہیں اور ان کی جانب بہت سی غلط باتیں اسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح ان کے علاوہ بہت سے انبیاء علماء حکماء اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔

حضرت ادریس اور معراج

'معراج کی بخاری مسلم (۱) صحیح بخاری باب الاسراء' مسلم جلد (۱) باب الاسراء) والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔

مگر مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ہلال بن یساف کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ

حضرت ادریس علیہ السلام سے متعلق اس آیت "وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا" کا کیا مطلب ہے؟ تو کعب نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس پر ایک مرتبہ یہ وحی نازل فرمائی اے ادریس تمام اہل دنیا جس قدر روزانہ نیک عمل کریں گے ان سب کے برابر میں تجھ کو ہر دن اجر عطا کروں گا۔ حضرت ادریس نے یہ سنا تو ان کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے اعمال میں روز افزوں اضافہ ہو اور اس لئے عمر کا حصہ طویل ہو جائے تو اچھا ہے انہوں نے وحی الٰہی اور اپنے اس خیال کو ایک رفیق فرشتہ پر ظاہر کر کے کہا کہ اس معاملہ میں فرشتہ موت سے گفتگو کرو تا کہ مجھ کو نیک اعمال کے اضافہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے' اس فرشتہ نے جب یہ سنا تو حضرت ادریس کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر لے اڑا جب یہ چوتھے آسمان سے گزر رہے تھے تو فرشتہ موت زمین کے لئے اتر رہا تھا وہیں دونوں کی ملاقات ہوئی دوست فرشتہ نے فرشتہ موت سے حضرت ادریس کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی' فرشتہ موت نے دریافت کیا' ادریس ہیں کہاں؟ اس نے کہا میری پشت پر سوار ہیں' فرشتہ موت کہنے لگا درگاہ الٰہی سے یہ حکم ہوا ہے کہ ادریس کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں اس لئے میں سخت حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریس زمین میں ہیں' اسی وقت فرشتہ موت نے حضرت ادریس کی روح قبض کر لی۔

یہ واقعہ نقل کر کے کعب احبار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد۔ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کی یہی تفسیر ہے ابن جریر کی طرح ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

ان ہر دو نقول کو روایت کرنے کے بعد حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں اور ان میں روایتی اعتبار سے بھی "نکارت" یعنی نا قابل اعتبار اچنبھا ہے اس لئے صحیح تفسیر وہی ہے جو آیت کے ترجمہ میں بیان کی گئی۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ الیاس نبی کا نام ہی ادریس ہے اور ان کے اس قول کی وجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو زہری نے معراج کے سلسلہ میں بیان کی ہے اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم اور انبیاء علیہم السلام کی آسمان پر ملاقات کا جو ذکر

ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب آپ کی ملاقات حضرت ادریس سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح" (برادر نیک تمہارا آنا مبارک) پس اگر حضرت ادریس اخنوخ ہوتے تو حضرت آدم و حضرت ابراہیم کی طرح "بالابن الصالح" کہتے یعنی نیک بھائی کی جگہ "نیک بیٹے" کے ساتھ خطاب کرتے۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے اس لئے کہ اول تو یہ امکان ہے کہ اس طویل حدیث میں راوی الفاظ کی پوری حفاظت نہ کر سکا ہو' دوم ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت قدر و رفعت مرتبت کے پیش نظر انہوں نے پدری انتساب کو نمایاں نہ کیا ہو اور از راہ تواضع برادرانہ حیثیت کو ہی ظاہر کرنا مناسب سمجھا ہو۔

رہا حضرت آدم و حضرت ابراہیم کا معاملہ سو ایک ابوالبشر ہیں اور دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور رفیع الشان پیغمبر جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (آل عمران پ۴ آیت ۹۵) لہٰذا ان کا "ابن" کے ساتھ خطاب کرنا ہر طرح موزوں اور برمحل ہے۔ ابن کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ادریس حضرت نوح سے قبل کے نبی نہیں ہیں بلکہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں اور الیاس ہی ادریس ہیں۔

توراۃ میں ان مقدس نبی کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے

"اور حنوک (اخنوخ) ۶۵ برس کا ہوا کہ اس سے متوشلح پیدا ہوا اور متوشلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس اللہ کے ساتھ چلتا تھا' اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی ساری عمر ۳۶۵ برس کی ہوئی اور حنوک اللہ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا' اس لئے کہ اللہ نے اسے لے لیا (۱) باب پیدائش آیت ۲۱-۲۴)

حضرت ادریس کی پیدائش

علامہ جمال الدین قطفی نے تاریخ الحکماء (۲) اس تاریخ کا پورا نام "المنتخبات الملتقطات من کتاب اخبار العلماء باخبار الحکماء" ہے اور علامہ جمال الدین ابوالحسنی علی بن یوسف قطفی کی تصنیف ہے اور مختصر زوزنی کے نام سے مشہور ہے۔) میں حضرت ادریس کا

تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے حضرت ادریس کے متعلق علماء تفسیر اور ارباب تاریخ وقصص نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت مشہور ہے اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں' البتہ حکماء اور فلاسفہ نے خصوصیت کے ساتھ ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ادریس کا مولد ومنشاء (جائے ولادت و پرورش) کہاں ہے اور انہوں نے نبوت سے پہلے کس سے علم حاصل کیا؟ حکماء اور فلاسفہ کے اقوال ان مسائل میں مختلف ہیں۔

ایک فرقہ کی رائے ہے کہ ان کا نام ہرمس الہرامسہ ہے اور مصر کے قریہ منف میں پیدا ہوئے یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں' ارمیس کے معنی عطارد ہیں (۴) ارمیس یا ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم اور ماہر فلکیات حکیم تھا اس لئے اس کو ارمیس (عطارد کہتے تھے) یونانی غلطی سے ادریس اور ارمیس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں حالانکہ ایسی فاحش غلطی ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس' عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے اور قرآن عزیز میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ادریس کہا ہے یہی جماعت کہتی ہے کہ ان کے استاد کا نام غوثاذیمون یا اغوثاذیمون (مصری) ہے' وہ غوثاذیمون کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتے کہ وہ یونان یا مصر کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں اور یہ جماعت ان کو ادرین دوم اور حضرت ادریس کو ادرین سوم کا لقب دیتی ہے اور غوثاذیمون کے معنی "سعد اور بہت نیک بخت" ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطاع عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیاسی سال کی عمر میں اپنی جانب اٹھالیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ ادریس بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی اور اوائل عمر میں انہوں نے حضرت شیث بن آدم سے علم حاصل کیا علم کلام کے مشہور عالم علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثاذیمون حضرت شیث علیہ السلام ہی کا نام ہے۔

نبوت اور دعوت

بہرحال جب حضرت ادریس سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا' تب انہوں نے شریر اور مفسدوں کو راہ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے ان کی ایک نہ سنی اور حضرت آدم وشیث کی شریعت کے مخالف ہی رہے' البتہ ایک چھوٹی سی جماعت مشرف بہ اسلام ہوگئی۔

ہجرت

حضرت ادریس نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیروؤں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی' پیروان ادریس نے جب یہ سنا تو ان کو ترک وطن بہت شاق گزرا اور کہنے لگے کہ بابل جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے (۱) بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ وفرات کی نہروں سے سرسبز وشاداب تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا' یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہو گیا۔) حضرت ادریس نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہو تو اس کی رحمت وسیع ہے وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گا پس ہمت نہ ہارو اور اللہ کے حکم کے سامنے سرنیاز جھکا دو۔

مسلمانوں کی رضا مندی کے بعد حضرت ادریس اور ان کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی اور حضرت ادریس نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا' بابلیون (۲) بابلیون کے معنی میں مختلف اقوال ہیں مثلاً تمہاری طرح کی نہر' مبارک نہر' مگر سب سے بہتر قول یہ ہے کہ ''یون'' سریانی میں تفصیل کی علامت ہے اور معنی ہیں ''بڑی نہر'') (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے حضرت ادریس کے اس جملہ ''بابلیون'' نے ایسی شہرت پائی کہ عرب کے علاوہ قدیم اقوام اس سرزمین کو بابلیون ہی کہنے لگیں' البتہ عرب نے اس کا نام مصر بتایا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ سنائی کہ طوفان نوح کے بعد یہ مصر بن حام کی نسل کا مسکن وموطن بنا ہے۔

بہتّر زبانوں میں تبلیغ

حضرت ادریس اور ان کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی انہوں نے پیغام الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا کہا جاتا ہے کہ ان کے زمانہ میں ۷۲ زبانیں بولی جاتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کی عطا وبخشش سے یہ وقت کی تمام زبانوں کے زبان دان تھے اور ہر ایک جماعت کو اسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔

تعلیم و تدریس

حضرت ادریس علیہ السلام نے دین الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاست مدن، شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کو بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لئے انہوں نے ہر ایک فرقہ و جماعت سے طلبہ جمع کئے اور ان کو مدنی سیاست اور اس کے اصول و قواعد سکھائے جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹ گئے تو انہوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصول پر بسایا، ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی، جن میں سب سے چھوٹا شہر (۳) یہ شہر صفحہ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔) "رہا" تھا۔ حضرت ادریس نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علم حکمت اور علم نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔

علم حکمت و نجوم کی ابتداء

حضرت ادریس پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علم حکمت و نجوم کی ابتداء کی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو افلاک اور ان کی ترکیب کواکب اور ان کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور ان کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی، اور ان کو علم عدد حساب کا عالم بنایا اور اگر اس پیغمبر اللہ کے ذریعہ ان علوم کا اکتشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی، انہوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کے لئے ان کے مناسب حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور اقطاع عالم کو چار حصوں میں منقسم کر کے ہر ربع کے لئے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصہ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا اور ان چاروں کے لئے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا۔ جس کی تعلیم وحی الٰہی کے ذریعے میں نے تم کو دی ہے اس سلسلہ کے سب سے پہلے چار بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

بلاوس (بمعنی رحیم) (۱) زوس (۳) اسقلیبوس (۴) زوس امون یا ایلاوس امون یا سیلوس۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیم کا خلاصہ

اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانا، صرف خالق کائنات کی پرستش کرنا، آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لئے اعمال صالح کو ڈھال بنانا، دنیا سے بے التفاتی اور تمام

امور میں عدل وانصاف کو پیش نظر رکھنا اور مقررہ طریقہ پر عبادت الٰہی ادا کرنا' اور ایام بیض (ا) ہر ماہ قمری کی ۱۴' ۱۵' ۱۶ تاریخ۔) کے روزے رکھنا' دشمنان اسلام سے جہاد کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' طہارت ونظافت سے رہنا' خصوصیت کے ساتھ جنابت' کتے اور سور سے اجتناب کرنا ہر نشہ آور شے سے پرہیز کرنا ان کی تعلیم کا لب لباب ہے۔

انہوں نے اپنے پیروؤں کے لئے بحکم الٰہی سال میں چند دن عید کے مقرر فرمائے اور چند مخصوص اوقات میں نذر اور قربانی دینا فرض قرار دیا' اور ان میں سے بعض رویت ہلال پر ادا کی جاتی تھیں اور بعض اس وقت جبکہ سورج کسی برج میں داخل ہونے لگا ہو اور بعض جبکہ سیارے اپنے بیوت و برج میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آ جائیں۔

نذرِ الٰہی کے طریقے

اللہ تعالیٰ کے سامنے نذر وقربانی پیش کرنے کے لئے ان کے یہاں تین چیزیں اہمیت رکھتی تھیں' خوشبوؤں کی دھونی' جانوروں کی قربانی اور شراب (۲) حکماء کا یہ تضاد بیان حیرت میں ڈالتا ہے کہ ایک جانب تو وہ شریعت ادریسی میں شراب کو حرام بتاتے ہیں اور دوسری جانب خدا کی جناب میں شراب کی قربانی ونذر کو قبول کہتے ہیں (اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ) اوران کے علاوہ میووں پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی اور میووں میں سے سیب کو' اناج میں سے گیہوں کو اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت

حضرت ادریس نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی ودنیوی اصلاح کے لئے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائیں گے اور ان کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی (ا) وہ ہر ایک بری بات سے بری اور پاک ہوں گے (۲) قابل ستائش اور فضائل میں کامل ہوں گے' زمین وآسمان کے احوال سے اور ان امور سے کہ جن میں کائنات کے لئے شفا ہے یا مرض' وحی الٰہی کے ذریعہ اس طرح واقف ہوں گے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہے گا وہ مستجاب الدعوات ہوں گے اور ان کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاح کائنات ہوگا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی خلافت ارضی

جب حضرت ادریس اللہ کی زمین کے مالک بنا دیئے گئے تو انہوں نے علم وعمل کے اعتبار سے اللہ کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا۔ کاہن' بادشاہ اور رعیت اور حسب ترتیب ان کے مراتب مقرر فرمائے' کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جواب دہ ہے اور بادشاہ کا دوسرا درجہ رکھا گیا اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور اموت مملکت کے متعلق جواب دہ ہے اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کیلئے جواب دہ ہے اس لئے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے' لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل و خاندان کے امتیازات کے لحاظ سے بہر حال حضرت ادریس علیہ السلام "رفع الی اللہ" تک انہی قوانین شریعت وسیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔

مذکورہ بالا چار بادشاہوں میں سے اقلیبوس بہت پختہ عزم وارادہ کا بادشاہ تھا اس نے حضرت ادریس کے کلمات کی حفاظت اور قوانین شریعت کی نگہداشت خوب کی اور حضرت ادریس کے اٹھا لئے جانے پر بے حد حزن و ملال کا اظہار کیا اور ہیکلوں میں ان کی اور ان کے رفع کی حالت کی تصاویر بنوائیں۔

اسقلیبوس اس خطہ پر حکومت کرتا تھا جو طوفان نوح کے بعد خطہ یونان کہلایا۔ یونانیوں نے طوفان کی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ہیکلوں میں جب حضرت ادریسؑ کے مجسمہ اور ان کے رفع کی تصویر کو دیکھا اور ساتھ ہی اسقلیبوس کی عظمت اور ہیکلوں میں حکمت وفلسفہ کی تدوین کا شہرہ سنا تو ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسقلیبوس ہی وہ ہستی ہے جس کا رفع ہوا حالانکہ یہ صریح غلطی ہے جو محض الکل وتخمین سے انہوں نے اختیار کی۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ

حضرت ادریس علیہ السلام کا حلیہ یہ ہے کہ گندم گوں رنگ' پورا قد وقامت' سر پر بال کم' خوبصورت وخوبرو' گھنی داڑھی' رنگ وروپ اور چہرہ کے خطوط میں ملاحت مضبوط بازو' چوڑے مونڈے' مضبوط ہڈی' دبلے پتلے' سرگیں چمکدار آنکھیں' گفتگو باوقار' خاموشی پسند سنجیدہ اور متین

چلتے ہوئے نیچی نظر انتہائی فکروخوض کے عادی غصہ کے وقت سخت غضبناک باتیں کرنے میں شہادت کی انگلی سے بار بار اشارہ کے عادی حضرت ادریس نے بیاسی سال کی عمر پائی۔

ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔

الصبر مع الایمان باللہ یورث الظفر

اللہ پر ایمان کے ساتھ صبر فتح مندی کا باعث ہے

اور کمر سے باندھنے والے پٹکہ پر یہ تحریر تھا

الا عیاد فی حفظ الفروض و الشریعۃ من تمام الدین و تمام الدین کمال المروۃ

حقیقی عیدیں اللہ تعالیٰ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں اور دین کا کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروت میں کمال دین کی تکمیل ہے

اور نماز جنازہ کے وقت جو پٹکہ باندھتے اس پر حسب ذیل جملے ثبت ہوتے

السعید من نظر لنفسہ و شفاعتہ عندربہ اعمالہ الصالحۃ

سعادت مندوہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اس کے اپنے نیک اعمال ہیں

پندونصائح

حضرت ادریس کے بہت سے پندونصائح اور آداب واخلاق کے جملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموزواسرار کی طرح مستعمل ہیں ان میں سے بعض درج ذیل ہیں

(۱)　اللہ کی بیکراں نعمتوں کا شکریہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔

(۲)　جو علم میں کمال اور عمل صالح کا خواہش مند ہو اس کو جہالت کے اسباب اور بدکرداری کے قریب بھی نہ جانا چاہئے کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہرفن مولا کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما، پس ہر وقت یہ پیش نظر رہے۔

ہم اللہ خواہی وہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است جنوں

(۳) دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور برائی "ندامت"

(۴) اللہ کی یاد اور عمل صالح کے لئے خلوص نیت شرط ہے

(۵) نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کے لئے تختہ مشق بناؤ اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو کیونکہ ایسا کرنے سے تم بھی شریک گناہ ہو جاؤ گے

(۶) ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو (جیسے سینگی لگانا، جانوروں کے جفتی کرانے پر اجرت لینا وغیرہ)

(۷) اپنے بادشاہوں کی (جو کہ پیغمبر کی جانب سے احکام شریعت کے نفاذ کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں) اطاعت کرو اور اپنے بڑوں کے سامنے پست رہو اور ہر وقت حمد الٰہی میں اپنی زبان کو تر رکھو

(۸) حکمت روح کی زندگی ہے

(۹) دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو اس لئے کہ ان کی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے

(۱۰) جو ضروریات زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ رہا

تاریخ الحکماء کے ج ا صفحہ ۳۴۸ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفان نوح سے قبل دنیا میں جس قدر علوم شائع ہوئے ان سب کے معلم اول یہی ہرمس اول ہیں جو مصر کے حصہ اعلیٰ کے باشندہ تھے اور عبرانی حضرات ان کو خنوخ نبی مانتے ہیں اور جو اپنے نسب میں حضرت آدم کے پڑپوتے ہیں۔

یعنی خنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلئیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم (علیہم السلام)

ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکات نجوم کا تذکرہ آتا ہے سب سے پہلے ان کا ذکر ان ہی کی زبان سے ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہیکلوں کی تعمیر، علم طب کی ایجاد ارضی و سماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہار خیال بھی ان ہی کی اولیات میں سے ہیں اور انہوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگان اللہ کو ڈرایا اور بتایا کہ ان کو دکھایا گیا ہے کہ ایک آسمانی آفت ہے جو زمین کو پانی اور آگ میں لپیٹ رہی ہے انہیں یہ دیکھ کر علوم کی بربادی اور صنعت و حرفت کی تباہی کا

خوف ہوا اور اس لئے انہوں نے مصر میں اہرام اور برابی (برابی ایسے ہیکل جو چلہ کشی کے لئے چہار جانب سے بند ہوں) بنائے اور ان میں تمام صناع اور نو ایجاد آلات کی تصاویر بنوائیں اور تمام علوم کے حقائق واوصاف کو منقش کیا تا کہ یہ علوم وصناعات تا ابد باقی رہیں اور فنا کا ہاتھ ان کو گزند نہ پہنچا سکے (تاریخ الحکماء جلد ا)

محاکمہ:

فلاسفہ اور حکمت وفلسفہ کی قدیم کتابوں کی (بعض باتوں سے قطع نظر) ان یاوہ گویوں اور بے سروپا باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو حضرت ادریس کے متعلق افسانوی حیثیت میں گھڑا گیا ہے کہ جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل اس کی تائید میں ہے بلکہ تحقیق اور صحیح علم تاریخ کے حقائق ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات کو آج اس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت سے انکار کے مترادف ہے مثلاً اہرام و برابی کی تاریخ آج جدید اکتشافات کی بدولت ہمارے سامنے بے نقاب ہے اور اہرام اور ان مقابر کی کھدائی نے علوم ونقوش اور صنائع کی تصویر کے بنانے والوں اور ان کے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج کے ترقی دینے والوں کے نام ان کے اجسام اور ان کے زر و جواہر کے خزانوں اور مختلف زمانوں کی تحریروں اور رسم الخط کی ترکیبوں کو سامنے لا کر روز روشن کی طرح آشکارا کر دیا ہے کہاں وہ حقیقتیں اور کہاں یہ دور از کار باتیں آج مینا' خوفو' منقرع اور طوطامن خامن وغیرہ بادشاہوں کے حالات سے کون آشنا نہیں ہے۔

تاہم ان بے سروپا باتوں کو بھی نقل کر دینا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ یہ آگاہی رہے کہ ان پیغمبر کے متعلق حکماء کی کتابوں میں بھی کس قسم کی دور از کار باتیں درج ہیں۔

اس سلسلہ میں بس اسی قدر سچ اور حق ہے جس کو ہم قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ سے نقل کر آئے ہیں یا توقف کے درجہ میں وہ چند جملے جو تورات سے نقل کئے گئے ہیں یا وہ اقوال جو پیغمبرانہ تعلیمات کے شایان شان ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح اور ثمود کا ذکر قرآن عزیز میں

قرآن عزیز میں صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے حسب ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

سورہ	آیات	میزان
اعراف	۷۷،۷۵،۷۳	۳
ہود	۸۹،۶۶،۶۲،۶۱	۴
شعراء	۱۴۲	۸۱

حضرت صالح علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے اس کو ثمود کہتے ہیں اور ثمود کا ذکر نو سورتوں میں کیا گیا ہے ذیل کا نقشہ اس کو واضح کرتا ہے۔

اعراف ہود حجر نمل فصلت النجم القمر الحاقہ الشمس

حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ

علماء انساب قوم ثمود کے پیغمبر حضرت صالح (علیہ السلام) کے نسب نامہ میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مشہور حافظ حدیث امام بغوی نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ صالح بن عبید بن آسف بن ماشح بن عبید بن حادر بن ثمود اور وہب بن منبہ مشہور تابعی اس طرح نقل کرتے ہیں۔ صالح بن عبید بن جابر بن ثمود (تفسیر ابن کثیر سورہ اعراف)

اگرچہ بغوی زمانہ کے اعتبار سے وہب سے بہت بعد میں ہیں اور وہب تورات کے بہت بڑے عالم بھی ہیں تاہم حضرت صالح سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں بغوی نے جوڑی

ہیں علماء انساب کے نزدیک وہی تاریخی حیثیت سے راجح اور قرین صواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قوم کو (جس کے ایک فرد حضرت صالح (علیہ السلام) بھی ہیں) ثمود اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب نامہ کا جد اعلیٰ ثمود ہے اور اسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔

ثمود سے حضرت نوح (علیہ السلام) تک بھی دو قول ہیں، اول ثمود بن عامر ارم بن سام دوم ثمود بن عاد بن عوص بن آدم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

سید محمود آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام ثعلبی دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں (جلد ۹ ص ۱۴۲)

بہر حال ان دونوں روایتوں سے یہ باتفاق ثابت ہوتا ہے کہ قوم ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً بلکہ یقیناً یہی وہ افراد قوم ہیں جو عاد اولی کی ہلاکت کے وقت حضرت ہود کے ساتھ بچ گئے تھے اور یہی نسل عاد ثانیہ کہلائی اور بلاشبہ یہ قوم بھی عرب بائدہ (ہلاکت شدہ عربی نسل) میں سے ہے۔

ثمود کی بستیاں

ثمود کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوئے تھے؟ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کی آبادیاں حجر میں تھیں حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا مقام سکونت ہے اور آج تک "فج الناقہ" کے نام سے مشہور ہے۔

ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں، اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری اہل تحقیق نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو "شاہی حویلی" کہی جاتی ہے، اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مورخ مسعدی لکھتا ہے۔

و رممهم باقية و آثار هم بادية فى طريق من و ردمن الشام (ج ۳ ص ۱۳۹)

جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اس کی راہ میں ان کے مٹے نشان اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں'
حجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عاد ارم کہا گیا ہے (حتی کہ قرآن عزیز نے تو ارم کو ان کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمود ارم یا عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔

مشرق خصوصاً عرب کے بارہ میں یورپ کے مستشرقین (۱) یورپ میں جو علماء مشرق کی تاریخ اور مشرقی علوم سے شغف رکھتے اور ان کے متعلق مباحث و نظریات قائم کرتے ہیں ان کو مستشرق کہتے ہیں ان میں سے بعض اگرچہ حقیقۃً حذاقت و مہارت رکھتے ہیں مگر اکثر محض ظنی اور تخمینی بلکہ من گھڑت نظریئے قائم کر کے مشرق سے یا تعصب کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنی کم مائیگی علم کا۔) جس طرح اپنی حذاقت و مہارت تاریخ کا ثبوت دیا کرتے ہیں اور تحقیق کے نام سے غلط دعاوی کرنے کے عادی ہیں اسی طرح انہوں نے ثمود کو بھی اپنی تحقیق کا تختہ مشق بنایا ہے' وہ سوال کرتے ہیں کہ ثمود کی اصل کیا ہے اور ان کا وجود کب ہوا اور کس زمانہ میں؟ اس سوال کے جواب میں ان کے دو گروہ ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو فلسطین میں داخل نہیں ہوا تھا اور یہیں بس گیا تھا' مگر یہ قول نہ صرف پایہ تحقیق سے گرا ہوا ہے بلکہ قطعاً غلط اور مہمل ہے اس لئے کہ تمام مورخین باتفاق آراء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ زمانہ قریب بھی نہ آیا تھا کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے کہ ثمود کی آبادیاں ہلاک و تباہ ہو چکی تھیں اور ان کا قلع قمع ہو چکا تھا' نیز قرآن عزیز تصریح کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم فرعون نے جھٹلایا تو آل فرعون ہی میں سے ایک مرد مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ڈرایا کہ تمہاری اس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہی نہ ہو جو تم سے پہلے قوم نوح' عاد اور ثمود اور ان کے بعد کی قوموں کا اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی وجہ سے ہوا تھا۔

مستشرقین کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے اور فرات کے مغربی ساحل سے اٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

ان میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے جن کو مصر کے بادشاہ احمس

نے خارج البلد کر دیا تھا اور چونکہ مصر کے زمانہ میں فن سنگ تراشی میں انہوں نے کمال حاصل کرلیا تھا اس لئے حجر جا کر پہاڑوں اور پتھروں کو تراش کر بے نظیر عمارات تعمیر کیں اور عام رائج طریقہ پر بھی عالی شان محل بنائے۔

مگر ہم عاد کے واقعہ میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ عاد و ثمود ساری اقوام میں سے ہیں اور یہ کہ اہل عرب ان کو محض یہود کی غلط تقلید میں عمالقہ میں سے کہہ دیتے ہیں' حالانکہ عملیق بن کا اس نسل سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اس لئے یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔

ان تمام آراء کے خلاف محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ عاد کا بقیہ ہیں اور یہی صحیح اور راجح قول ہے اور اہل حضر موت کا یہ دعویٰ کہ ثمود کی آبادیاں اور محلات عاد کی صناعی کا نتیجہ ہیں' اس قول کا مخالف نہیں ہے کہ ثمود فن تعمیر میں ید طولی رکھتے تھے اور یہ عمارات ان کی اپنی تعمیر ہیں اس لئے کہ عاد اولی اور عاد ثانیہ بہر حال عاد ہیں۔ حضرت صالح کا اپنی قوم سے یہ خطاب بھی اسی کا موید ہے۔

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ م بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا (الاعراف ۷ آیت ۷۴)

اور تم اس وقت کو یاد کرو کہ تم کو اللہ نے عاد کے بعد ان کا قائم مقام بنایا اور تم کو زمین پر جگہ دی کہ تم اس کی سطح اور نرم حصوں پر محلات بناتے ہو اور سنگ تراشی کر کے پہاڑوں میں مکان تراشتے ہو۔

رہا ثمود کے زمانہ کا مسئلہ سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا اس لئے کہ تاریخ اس بارہ میں غیر مطمئن ہے' البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے اور وہ اس جلیل القدر پیغمبر کی بعثت سے بہت پہلے ہلاک ہو چکے تھے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں پائی جاتی ہیں کہ جن پر آرامی زبان کے کتبے لگے ہوئے اور ان کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کی ہے' تو اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے بعد وجود میں آئی ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہ دراصل ان لوگوں کی قبریں ہیں جو اس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس کے بعد اتفاقاً یہاں آ کر بس گئے ہیں اور انہوں نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لئے آرامی خط میں (جو کہ قدیم خط ہے) اپنے کتبے لکھ کر لگا دیئے تا کہ یادگار رہیں ورنہ وہ قبریں نہ ثمود کی ہیں اور نہ ان کا یہ زمانہ ہے۔

مصر کا مشہور عیسائی مؤرخ جورجی زیدان اپنی کتاب ''العرب قبل الاسلام'' میں اسی کے قریب قریب لکھتا ہے' کہتا ہے

آثار و کتبات کے پڑھنے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صالح علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ولادت مسیح سے کچھ پہلے نبطیوں کے اقتدار میں آ گئی تھیں یہ لوگ بطرہ کے ساکنین میں سے تھے (جن کا ذکر عنقریب کتاب میں آنے والا ہے) اور ان کے آثار اور ٹیلوں کو بہت سے مستشرقین نے خود دیکھا ہے اور مقدمہ کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں ان ہی کے آثار کو انہوں نے پڑھا ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ کھنڈر ہیں جو قصر بنت' قبر باشا' قلعہ اور برج کے ناموں سے موسوم ہیں' ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی تحریر میں ہے اور ان میں سے بعض یا سب کی سب وہی تحریریں ہیں جو قبروں پر کندہ ہیں۔

مستشرقین نے یہاں جو کچھ پایا ان میں سے حسب ذیل ایک کتبہ بھی ہے جو پتھر پر نبطی حروف میں کندہ ہے اور ولادت مسیح علیہ السلام سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے (کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے) ''مقبرہ کمکم بنت وائلہ بنت حرم نے اور کمکم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بنوایا ہے۔ اس کی بنا بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے' وہ حارث جو اپنے قبیلے کا عاشق صادق ہے۔

پس ''عمی ذوالشریٰ (ا) وعرشہ''؟ لات' عمند' منوت اور قیس کی ان پر لعنت ہو جو ان قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے یا ان سے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے یا کمکم اس کی بیٹی اور اس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے اس پر ذوالشری ہبل' منوت کی پانچ

لعنتیں ہوں، اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب ہے مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں کممکم کلیبہ یا اس کی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اس اجنبی قبر کے لئے صاف اور صریح الفاظ میں اجازت موجود ہو اور وہ اصلی ہو جعلی نہ ہو اس مقبرہ کو وہب اللہ بن عبادہ نے بنایا۔

اہل ثمود کا مذہب

ثمود اپنے بت پرست پیشروؤں کی طرح بت پرست تھے، وہ اللہ واحد کے علاوہ بہت سے معبودان باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے، اس لئے ان کی اصلاح اور احقاق حق کے لئے ان ہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح کو ناصح پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا گیا تا کہ وہ ان کو راہ راست پر لائیں، ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے صبح و شام وہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور ان پر واضح کریں کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی توحید اور یکتائی پر شاہد ہے اور یقینی دلائل اور مسکت براہین کے ساتھ ان کی گمراہی کو ظاہر کریں اور بتائیں کہ پرستش و عبادت کے لائق ذات واحد کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔

حضرت صالح کا قوم کو دعوت دینا

قرآن کریم میں ہے کہ: اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا اے میری قوم تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں انہوں نے ایک خاص معجزہ کی درخواست کی کہ اس پتھر میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو تو ہم ایمان لائیں چنانچہ آپ کی دعا سے ایسا ہی ہوا کہ وہ پتھر پھٹا اور اس کے اندر سے ایک بڑی اونٹنی نکلی۔ رواہ محمد بن اسحٰق۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل میرے رسول ہونے کی آ چکی ہے آگے اس کا بیان ہے یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل بنا کر ظاہر کی گئی ہے اور اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلائی کہ اللہ کی دلیل ہے، سو علاوہ اس کے کہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں

گھاس چارہ کھاتی پھرا کرے اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے اور اس کو برائی اور تکلیف دہی کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آ پکڑے اور اے قوم تم یہ حالت یاد کرو اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم عاد کے بعد روئے زمین پر آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو دلخواہ ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر بھی بڑے بڑے محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں بھی گھر بناتے ہو سو خدا تعالیٰ کی ان نعمتوں کو اور دوسری نعمتوں کو بھی یاد کرو اور کفر و شرک کے ذریعے زمین میں فساد مت پھیلاؤ یعنی ایمان لے آؤ مگر باوجود اس قدر فہمائش کے کچھ غرباء ایمان لائے اور ان میں اور رئیسوں میں یہ گفتگو ہوئی یعنی ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے پوچھا کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجے ہوئے آئے ہیں انہوں نے جواب میں کہا کہ بیشک ہم تو اس حکم پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس چیز پر یقین لائے ہوئے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔

آیات مذکورہ میں ارشاد فرمایا وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا عاد و ثمود ایک ہی دادا کی اولاد میں دو شخصوں کا نام ہے ان کی اولاد بھی ان کے نام سے موسوم ہو کر دو قومیں بن گئیں ایک قوم عاد دوسری قوم ثمود کہلاتی ہے۔ عرب کے شمال مغرب میں بستے تھے اور ان کے بڑے شہر کا نام حجر تھا جس کو اب عموماً مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ قوم عاد کی طرح قوم ثمود بھی دولت مند، قوی اور بہادر قوم اور سنگ تراشی اور فن تعمیر میں ماہر تھی کھلی زمین پر بڑے بڑے محلات بنانے کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کر ان میں طرح طرح کی عمارتیں بناتے تھے۔ ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان کی تعمیری یادگاریں اب تک باقی ہیں ان پر ارمی اور ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں۔

قوم ثمود کی گمراہی

دنیا کی دولت و ثروت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خدا و آخرت سے غافل ہو

کر غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں۔قوم ثمود کا بھی یہی حال ہوا۔

ثمود سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کے عذاب کے واقعات کا تذکرہ ابھی تک دنیا میں موجود تھا اور پھر ان کے بھائی قوم عاد کی ہلاکت کے واقعات تو تازہ ہی تھے۔ مگر دولت وقوت کے نشہ کا خاصہ ہی یہ ہے کہ ابھی ایک شخص کی بنیاد منہدم ہوتی ہے دوسرا اس کی خاک کے ڈھیر پر اپنی تعمیر کھڑی کر لیتا ہے اور پہلے کے واقعات کو بھول جاتا ہے۔قوم عاد کی تباہی اور ہلاکت کے بعد قوم ثمود ان کے مکانات اور زمینوں کی وارث بنی اور انہی مقامات پر اپنے عشرت کدے تیار کیے جن میں ان کے بھائی ہلاک ہو چکے تھے اور ٹھیک وہ ہی اعمال وافعال شروع کر دیئے جو قوم عاد نے کئے تھے کہ خدا و آخرت سے غافل ہو کر شرک و بت پرستی میں لگ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔صالح علیہ السلام نسب و وطن کے اعتبار سے قوم ثمود ہی کے ایک فرد تھے۔کیونکہ یہ بھی سام ہی کی اولاد میں سے تھے اسی لئے قرآن کریم میں ان کو قوم ثمود کا بھائی فرمایا ہے اَخَاھُمْ صٰلِحًا. صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ وہی دعوت ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک سب انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. یعنی ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور بت پرستی سے بچو۔عام انبیاء سابقین کی طرح صالح علیہ السلام نے بھی قوم سے یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور خالق و مالک سمجھو اس کے سوا کوئی معبود بنانے کے لائق نہیں۔فرمایا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ

حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ یعنی اب تو ایک کھلا ہوا نشان بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آ پہنچا ہے۔اس نشان سے مراد ایک عجیب وغریب ناقہ ہے جس کا اجمالی ذکر اس آیت میں بھی ہے اور قرآن کریم

کی مختلف سورتوں میں اس کی مزید تفصیلات مذکور ہیں۔ واقعہ اس ناقہ کا یہ تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی جوانی کے زمانہ سے اپنی قوم کو دعوت توحید دینا شروع کی اور برابر اس میں لگے رہے یہاں تک کہ بڑھاپا کے آثار شروع ہو گئے۔ صالح علیہ السلام کے بار بار اصرار سے تنگ ہو کر ان کی قوم نے یہ قرار دیا کہ ان سے کوئی ایسا مطالبہ کرو جس کو یہ پورا نہ کر سکیں اور ہم ان کی مخالفت میں سرخرو ہو جائیں۔ مطالبہ یہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام کاتبہ تھا اس کے اندر سے ایک ایسی اونٹنی نکال دیجئے جو دس مہینہ کی گابھن ہو اور قوی وتندرست ہو۔

صالح علیہ السلام نے اول ان سے عہد لیا کہ اگر میں تمہارا یہ مطالبہ پورا کرا دوں تو تم سب مجھ پر اور میری دعوت پر ایمان لے آؤ گے۔ جب سب نے معاہدہ کر لیا تو صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ آپ کے لئے تو کوئی کام دشوار نہیں ان کا مطالبہ پورا فرما دیں۔ دعاء کرتے ہی پہاڑی کے اندر جنبش پیدا ہوئی اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اونٹنی اسی طرح کی نکل آئی جیسا مطالبہ کیا تھا۔

قوم کی عہد شکنی

صالح علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر ان میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے اور باقی تمام قوم نے بھی ارادہ کر لیا کہ ایمان لے آئیں۔ مگر قوم کے چند سردار جو بتوں کے خاص پجاری اور بت پرستی کے امام تھے انہوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔

اونٹنی کی حفاظت کے لئے نصیحت

حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے عہد شکنی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب آ جائے تو پیغمبرانہ شفقت کی بناء پر ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ اس اونٹنی کی حفاظت کرو اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ تو شاید تم عذاب سے محفوظ رہو ورنہ فوراً تم پر عذاب آ جائے گا یہی مضمون آیت مذکورہ کے ان جملوں میں ارشاد ہوا ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ

اٰیَۃً فَذَرُوْھَا تَاْکُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ وَلَا تَمَسُّوْھَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَکُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ
یعنی یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے۔ اور اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا ورنہ تم کو عذاب الیم آ پکڑے گا اس ناقہ کو ناقۃ اللہ اس لئے کہا گیا کہ اللہ کی قدرت کاملہ کی دلیل اور صالح علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر حیرت انگیز طریق سے پیدا ہوئی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ فرمایا گیا کہ ان کی پیدائش بھی معجزانہ انداز سے ہوئی تھی۔ تَاْکُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس ناقہ کے کھانے پینے میں تمہارے ملک اور تمہارے گھر سے کچھ نہیں جاتا زمین اللہ کی ہے اس کی پیداوار کا پیدا کرنے والا وہی ہے اس کی اونٹنی کو اس کی زمین میں آزاد چھوڑ دو کہ عام چراگاہوں میں کھاتی رہے۔

قوم ثمود جس کنوئیں سے پانی پیتے پلاتے تھے اسی سے یہ اونٹنی بھی پانی پیتی تھی مگر یہ عجیب الخلقۃ اونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنویں کا پانی ختم کر دیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے باذن ربانی یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے اور جس روز یہ اونٹنی پانی پیئے گی تو دوسروں کو پانی کی بجائے اونٹنی کا دودھ اتنی مقدار میں مل جاتا تھا کہ وہ اپنے سارے برتن اس سے بھر لیتے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس تقسیم کا ذکر اس طرح آیا ہے وَنَبِّئْھُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَۃٌ م بَیْنَھُمْ کُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ یعنی صالح علیہ السلام آپ اپنی قوم کو بتلا دیں کہ کنوئیں کا پانی ان کے اور ناقۃ اللہ کے درمیان تقسیم ہوگا ایک دن اونٹنی کا اور دوسرے دن پوری قوم کا اور اس تقسیم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی نگرانی مسلط ہوگی کہ کوئی اس کے خلاف نہ کر سکے۔ اور ایک دوسری آیت میں ہے ھٰذِہٖ نَاقَۃٌ لَّھَا شِرْبٌ وَّ لَکُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ یعنی یہ اللہ کی اونٹنی ہے ایک دن پانی کا حق اس کا اور دوسرے دن کا پانی تمہارے لئے معین و مقرر ہے۔

انعامات الٰہیہ کی یاد دہانی

اس وعدہ فراموش سرکش قوم کی خیر خواہی اور ان کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے

ان کو اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات یاد دلائے کہ اب بھی یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز آ جائیں فرمایا۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ م بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اس نے قوم عاد کو ہلاک کر کے ان کی جگہ تم کو بسایا ان کی زمین اور مکانات تمہارے قبضہ میں دے دیئے اور تم کو یہ صنعت سکھلا دی کہ کھلی زمین میں بڑے بڑے محلات بنا لیتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں کمرے اور مکانات بنا لیتے ہو۔ آخر آیات میں فرمایا فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. یعنی اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ان کا احسان مانو اس کی اطاعت اختیار کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

قوم ثمود کے مومنین و منکرین میں مکالمہ

قوم ثمود کے دو گروہ بن گئے۔ ایک وہ گروہ جو صالح علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا' دوسرا منکرین و کفار کا گروہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو منقول ہے۔ ارشاد فرمایا قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ یعنی کہا قوم صالح علیہ السلام میں سے ان لوگوں نے جنہوں نے تکبر کیا ان لوگوں سے جن کو حقیر وضعیف سمجھا جاتا تھا یعنی جو ایمان لائے تھے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ اس جگہ ان دونوں گروہوں کے دو وصف قرآن کریم نے بتلائے مگر کفار کا وصف بصیغہ معروف بتلایا استکبروا اور مؤمنین کا وصف بصیغہ مجہول بتلایا استضعفوا اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ کفار کا یہ حال کہ وہ تکبر کرتے تھے خود ان کا اپنا فعل تھا جو قابل مواخذہ و ملامت اور انجام کار موجب عذاب ہوا۔ اور مؤمنین کا جو وصف یہ لوگ بیان کرتے تھے کہ وہ ذلیل وحقیر اور ضعیف ہیں۔ یہ کفار کا کہنا ہے خود مؤمنین کا واقعی حال اور وصف نہیں جس پر کوئی ملامت ہو سکے بلکہ ملامت ان لوگوں پر ہے جو بلا وجہ ان کو حقیر وضعیف کہتے اور سمجھتے ہیں۔ آگے وہ مکالمہ جو دونوں گروہوں میں ہوا یہ ہے کہ کفار نے مؤمنین سے کہا کہ کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

مؤمنین نے جواب دیا کہ جو ہدایات وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے کر بھیجے گئے ہیں ہم ان سب پر یقین وایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر کشاف میں ہے کہ قوم ثمود کے مؤمنین نے کیسا بلیغ جواب دیا ہے کہ تم جس بحث میں پڑے ہوئے ہو کہ یہ رسول ہیں یا نہیں یہ بات قابل بحث ہی نہیں بلکہ بدیہی اور یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوا پیغام ہے۔ بات کچھ ہوسکتی ہے تو یہ کہ کون ان پر ایمان لاتا ہے کون نہیں، سو ہم نے بحمد اللہ ان کی لائی ہوئی سب ہدایات پر ایمان رکھتے ہیں۔

مگر ان کے بلیغ جواب پر بھی قوم نے وہی سرکشی کی بات کی کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ دنیا کی محبت اور دولت وقوت کے نشہ سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے کہ وہ انسان کی آنکھوں کا پردہ بن جاتے ہیں اور وہ بدیہی چیزوں کا انکار کرنے لگتا ہے۔

اونٹنی کا قتل

حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے پہاڑ کی ایک بڑی چٹان شق ہو کر اس سے ایک عجیب وغریب اونٹنی پیدا ہوگئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو بھی اس قوم کے لئے آخری امتحان بنا دیا تھا کہ جس کنویں سے ساری بستی کے لوگ اور ان کے مویشی پانی حاصل کرتے تھے یہ اس کا سارا پانی پی جاتی تھی اس لئے صالح علیہ السلام نے ان کے لئے باری مقرر کر دی تھی کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے دوسرے دن بستی والے۔

قوم ثمود اس اونٹی کی وجہ سے ایک تکلیف میں مبتلا تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ ہلاک ہو جائے مگر خود ایسی حرکت کرنے سے ڈرتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا۔

شیطان کا سب سے بڑا وہ فریب جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنی ہوش وعقل کھو بیٹھتا ہے وہ عورت کا فتنہ ہے۔ قوم کی دو حسین وجمیل عورتوں نے یہ بازی لگا دی کہ جو شخص اس ناقہ کو قتل کر دے گا ہم اور ہماری لڑکیوں میں سے جس کو چاہے وہ اس کی ہے۔

قوم کے دو نوجوان مصدع اور قدار اس نشہ میں مدہوش ہو کر اس ناقہ کو قتل کرنے

کے لئے نکلے اور ناقہ کے راستہ میں ایک پتھر کی چٹان کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب ناقہ سامنے آئی تو مصدع نے تیر کا وار کیا اور قذار نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ کر قتل کر دیا۔

قرآن کریم نے اسی کو قوم ثمود کا سب سے بڑا شقی اور بد بخت قرار دیا ہے۔ اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا۔ کیونکہ اس کے سبب پوری قوم عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

عذاب کی اطلاع

حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکم خداوندی بتلا دیا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں۔ تَمَتَّعُوۡا فِیۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ یعنی تین دن اور اپنے گھروں میں آرام کر لو اس کے بعد عذاب آنے والا ہے اور یہ وعدہ سچا ہے اس میں خلاف کا امکان نہیں۔ مگر جس قوم کا وقت خراب آ جاتا ہے اس کے لئے کوئی نصیحت و تنبیہ کارگر نہیں ہوتی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے اس ارشاد پر بھی ان بد بخت لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ یہ عذاب کیسے اور کہاں سے آئے گا اور اس کی علامت کیا ہوگی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ لو عذاب کی علامات بھی سن لو کل جمعرات کے روز تم سب کے چہرے سخت زرد ہو جائیں گے مرد عورت، بچہ بوڑھا کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہو گا، پھر پرسوں جمعہ کے روز سب کے چہرے سرخ ہو جائیں گے اور ترسوں ہفتہ کو سب کے چہرے شدید سیاہ ہو جائیں گے اور یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔

حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ

بدنصیب قوم نے یہ سن کر بھی بجائے اس کے کہ توبہ واستغفار کی طرف متوجہ ہو جاتے یہ فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام ہی کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اگر یہ سچے ہیں اور ہم پر عذاب آنا ہی ہے تو ہم اپنے سے پہلے ان کا کام تمام کیوں نہ کر دیں اور اگر جھوٹے ہیں تو اپنے جھوٹ کا خمیازہ بھگتیں۔ قوم کے اس ارادہ کا تذکرہ قرآن میں دوسری جگہ تفصیل سے موجود ہے۔ قوم کے اس متفقہ فیصلہ کے ماتحت کچھ لوگ رات کو حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر قتل

کے ارادہ سے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی میں ان پر پتھر برسا کر ہلاک کر دیا۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَايَشْعُرُوْنَ. یعنی انہوں نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایسی تدبیر کی کہ ان کو اس کی خبر نہ ہوئی۔

عذاب اور ہلاکت

اور جب جمعرات کی صبح ہوئی تو صالح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سب کے چہرے ایسے زرد ہو گئے جیسے گہرا زرد رنگ پھیر دیا گیا ہو۔ عذاب کی پہلی علامت کے سچا ہونے کے بعد بھی ظالموں کو اس طرف کوئی توجہ نہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے۔ اور اپنی غلط کاریوں سے باز آ جاتے۔ بلکہ ان کا غیظ و غضب حضرت صالح علیہ السلام پر اور بڑھ گیا اور پوری قوم ان کے قتل کی فکر میں پھرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے قہر سے بچائے اس کی بھی علامات ہوتی ہیں کہ قلوب و دماغ اوندھے ہو جاتے ہیں نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع۔ اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔ بالآخر دوسرا دن آیا تو پیش گوئی کے مطابق سب کے چہرے سرخ ہو گئے اور تیسرے دن سخت سیاہ ہو گئے۔ اب تو یہ سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر انتظار کرنے لگے کہ عذاب کس طرف سے کس طرح آتا ہے۔

اسی حال میں زمین سے ایک شدید زلزلہ آیا اور اوپر سخت ہیبت ناک چیخ اور شدید آواز ہوئی جس سے سب کے سب بیک وقت بیٹھے بیٹھے اوندھے گر کر مر گئے۔ زلزلہ کا ذکر تو ان آیات میں موجود ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ. رجفه کے معنی ہیں زلزلہ۔

اور دوسری آیات میں فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بھی آیا ہے صیحه کے معنی ہیں چیخ اور شدید آواز۔ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دونوں طرح کے عذاب ان پر جمع ہو گئے تھے۔ زمین سے زلزلہ اور اوپر سے صیحہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ. جٰثمین مصدر جثوم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حس و حرکت ہو کر ایک جگہ پڑ جانا یا بیٹھ رہنا (قاموس)۔ معنی یہ ہیں کہ جو جس حال میں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ نعوذ باللہ من قہرہ و عذابہ

قوم ثمود کے اس قصہ کے اہم اجزاء تو خود قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں

اور کچھ اجزاء روایات حدیث میں مذکور ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے لئے ہیں مگر ان پر کسی واقعہ اور حقیقت کے ثبوت کا مدار نہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ غزوہ تبوک کے سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا گزر اس مقام حجر پر ہوا جہاں قوم ثمود پر عذاب آیا تھا۔ تو آپؐ نے صحابہ کرام کو ہدایت فرمائی کہ اس عذاب زدہ بستی کی زمین میں کوئی اندر نہ جائے اور نہ اس کے کنوئیں کا پانی استعمال کرے۔ (مظہری)

ابورغال

اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو ان میں بجز ایک شخص ابورغال کے کوئی نہیں بچا۔ یہ شخص اس وقت حرم مکہ میں پہنچا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حرم مکہ کے احترام کے سبب اس وقت اس کو عذاب سے بچالیا اور بالآخر جب یہ حرم سے نکلا تو وہی عذاب جو اس کی قوم پر آیا تھا اس پر بھی آ گیا اور یہیں ہلاک ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مکہ سے باہر ابورغال کی قبر کا نشان بھی دکھلایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ ایک سونے کی چھڑی بھی دفن ہوگئی تھی۔ صحابہ کرام نے قبر کھولی تو سونے کی چھڑی مل گئی وہ نکال لی اس روایت میں یہ بھی ہے کہ طائف کے باشندے بنو ثقیف اسی ابورغال کی اولاد ہیں۔ (مظہری)

سامان عبرت

ان معذب قوموں کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کدے بنا کر قائم رکھا ہے اور قرآن کریم نے عرب کے لوگوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا ہے کہ تمہارے سفر شام کے راستہ پر یہ مقامات آج بھی داستان عبرت بنے ہوئے ہیں۔ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ م بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا

حضرت صالحؑ کی آخری نصیحت

قوم صالح علیہ السلام کے واقعہ عذاب کے آخر میں ارشاد ہے فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ.

یعنی قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مؤمنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ چار ہزار مؤمنین تھے ان سب کو لے کر یمن کے علاقہ حضر موت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوئی اور بعض روایات سے ان کا مکہ معظمہ چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر افسوس تم خیر خواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہو چکی تھی تو اب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کر کے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا نزول عذاب اور ہلاکت قوم سے پہلے ہوا ہو اگرچہ بیان میں اس کو مؤخر ذکر کیا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام

قرآن عزیز میں ہود کا ذکر

قرآن عزیز میں حضرت ہود علیہ السلام کا سات جگہ ذکر آیا ہے جو ذیل کے نقش سے ظاہر ہوتا ہے۔

نمبر شمار	سورہ	آیات
۱	اعراف	۶۵
۲	ہود	۵۰،۵۳،۵۸،۶۰،۸۹
۳	شعراء	۱۲۴

قرآن عزیز میں عاد کا ذکر

اور عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے یعنی اعراف، ہود، مومنون، شعراء، فصلت، احقاف، الذاریات، القمر اور الحاقہ میں۔

قوم عاد

اس سے قبل کہ ہم عاد کے متعلق تفصیلی بحث کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن عزیز کے علاوہ کوئی تاریخ کی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی، اس لئے اس قوم کے حالات کا نقشہ یا قرآن عزیز کے ذریعہ بن سکتا ہے اور یا پھر ان اثریات کے ذریعہ جو محققین علم الاثار نے اس بارہ میں حاصل کی ہیں۔

پہلا ذریعہ چونکہ قطعی اور یقینی ہے اس لئے اس کے بیان کردہ حقائق کو بھی بلاشبہ قطعیت حاصل ہے اور دوسرا ذریعہ تخمینی اور قیاسی، اس لئے اس کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن و تخمین سے آگے نہیں جاتی۔

عاد، عرب کے قدیم قبیلہ یا امم سامیہ کے صاحب قوت و اقتدار افراد و جماعت کا نام

ہے۔ تاریخ قدیم کے بعض یورپی مصنفین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں، مگر ان کا یہ یقین بالکل غلط اور سراسر وہم ہے، اس لئے کہ جدید تحقیقات کا یہ مسلم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرت افراد و قبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت وسطوت جماعت کی حیثیت میں تھے جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں اب فرق صرف اس قدر ہے کہ عرب ان باشندوں کو امم بائدہ (ہلاک ہو جانے والی قومیں) یا عرب عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد، ثمود، طسم اور جدیس کہتے ہیں (۱) معجم البلدان صفحہ ۱۲۹ جلد ۶) اور مستشرقین یورپ (امم سامیہ) نام رکھتے ہیں پس اصطلاحات و تعبیرات کے فرق سے حقیقت واقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو جاتی، اس لئے قرآن عزیز نے ان کو عاد اولی کہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ عرب کی قدیم قوم بنوسام اور عاد اولی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اہل جغرافیہ کا قول ہے کہ لفظ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں، خود عربی زبان میں اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں اور عرابہ کے معنی بدویت کے آتے ہیں۔

اور بعض اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا اور چونکہ اس کا جاء وقوع فرات کے غرب میں ہے اس لئے وہ آرامی قومیں (امم سامیہ) جو کہ فرات غربی پر آباد تھیں، اول غرب اور پھر غ کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں۔

ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ مقام قدیم امم سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اس لئے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے اور لفظ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی جس کے معنی عبرانی میں ''بلند و مشہور'' کے ہیں، قرآن عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی ''بلند و مشہور'' ہی کے ہیں، انہی عاد کو تورات کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ

عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے اور قرآن عزیز میں عاد کو

"مِنْ م بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ" کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امم سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن

عاد کا مرکزی مقام ارض احقاف ہے' یہ حضر موت کے شمال[1] میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی' مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور بعض مورخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضر موت اور یمن میں خلیج فارس کے ساحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دار الحکومت تھا۔

عاد کا مذہب

عاد بت پرست تھے اور اپنے پیشرو قوم نوح کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودان باطل بھی قوم نوح کی طرح ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر ہی تھے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر منقول ہے' اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتا تھا (۲) صدا بھی ان کا مشہور بت تھا' البدایہ والنہادیہ جلد ا)

حضرت ہود علیہ السلام

عاد اپنی مملکت کی سطوت و جبروت' جسمانی قوت وصولت کے غرور میں ایسے چکے کہ انہوں نے اللہ واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر

---

(۱) عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ سے سید عبداللہ بن احمد بن عمر بن یحییٰ علوی نے (جو حضر موت کے باشندہ ہیں) بیان کیا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ ان ہلاک شدہ قوموں کے قدیم مساکن کے کھوج میں حضر موت کے شمال میدان میں مقیم تھے' طویل جدو جہد کے بعد ہم نے مرمر کے بعض ظروف کو ریت کے ٹیلوں کی کھدائی میں حاصل کیا جن پر خط مساری میں تحریر تھا' مگر افسوس کہ مالیہ کی کمی نے اس عظیم الشان مہم کو پورا نہ ہونے دیا۔)

ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف و خطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا حضرت ہود عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے سرخ و سفید رنگ اور وجیہ تھے ان کی داڑھی بڑی تھی (۳) عینی جلد ۷ کتاب الانبیاء

تبلیغ اسلام

انہوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم و جور کرنے سے منع فرمایا' مگر عاد نے ایک نہ مانی اور ان کو سختی کے ساتھ جھٹلایا اور غرور و تکبر کے ساتھ کہنے لگے "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" (حم السجدہ پ ۲۴ آیت ۱۵) آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت و جبروت کا کون مالک ہے؟ مگر حضرت ہود مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے وہ اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور غرور و سرکشی کے نتائج بتا کر قوم نوح کے واقعات یاد دلاتے اور کبھی ارشاد فرماتے۔

اے قوم! اپنی جسمانی طاقت اور حکومت کے جبروت پر گھمنڈ نہ کر' بلکہ اللہ کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھ کو یہ دولت بخشی' قوم نوح کی تباہی کے بعد تجھ کو زمین کا مالک بنایا' خوش عیشی' فارغ البالی اور خوش حالی عطا کی لہذا اس کی نعمتوں کو نہ بھول اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے باز آ جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ دکھ دے سکتے ہیں' موت و زیست' نفع و ضرر سب ایک اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے' اے افراد قوم! مانا کہ تم عرصہ تک سرکشی اور اس کی نافرمانی میں مبتلا رہے ہو مگر آج بھی اگر توبہ کر لو اور باز آ جاؤ تو اس کی رحمت وسیع ہے اور دروازہ توبہ بند نہیں ہوا' اس سے مغفرت چاہو وہ بخش دے گا' اس کی طرف رجوع ہو جاؤ وہ معاف کر دے گا تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کر لو وہ تم کو دن دونی' رات چوگنی ترقی عطا کرے گا۔ بیش از بیش عزت دے گا اور مال و عزت میں سرفرازی بخشے گا۔

حضرت ہود علیہ السلام اپنی تبلیغ اور پیغام حق کے ساتھ ساتھ بار بار یہ بھی دہراتے کہ میں تم سے کسی اجر و عوض کا خواہاں نہیں' میرا اجر تو اللہ ہی کے پاس ہے اور یہ نبی کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے' ان کو کوئی یہ تہمت نہیں لگا سکتا کہ وہ مال کی طلب میں ایسا کرتے ہیں' یا

عزت و جاہ اور ریاست کے طالب ہیں وہ نہ قوم سے اپنی ریاست و عزت کے طالب ہوتے ہیں اور نہ مال ومنال کے ان کے سامنے تو صرف ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور وہ ادائے فرض اور اپنے مالک حقیقی کے احکام کی پیغامبری ہے۔

عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ

عاد اصل میں ایک شخص کا نام ہے جو نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور ان کے بیٹے سام کی اولاد میں ہے۔ پھر اس شخص کی اولاد اور پوری قوم عاد کے نام سے مشہور ہوگئی۔ قرآن کریم میں عاد کی ساتھ کہیں لفظ عاد اولیٰ اور کہیں اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کو ارم بھی کہا جاتا ہے۔ اور عاد اولیٰ کے مقابلہ میں کوئی عاد ثانیہ بھی ہے اس کی تحقیق میں مفسرین اور مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ عاد کے دادا کا نام ارم ہے اس کے ایک بیٹے یعنی عوص کی اولاد میں عاد ہے یہ عاد اولیٰ کہلاتا ہے اور دوسرے بیٹے جثو کا بیٹا ثمود ہے یہ عاد ثانی کہلاتا ہے۔ اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ عاد اور ثمود دونوں ارم کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کو عاد اولیٰ اور دوسری کو ثمود یا عاد ثانیہ بھی کہا جاتا ہے اور لفظ ارم عاد و ثمود دونوں کے لئے مشترک ہے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ قوم عاد پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظمہ گیا ہوا تھا وہ عذاب سے محفوظ رہا اس کو عاد اُخروی کہتے ہیں۔ (بیان القرآن)

اور ھود علیہ السلام ایک نبی کا نام ہے یہ بھی نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور سام کی اولاد میں ہیں قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ چوتھی پشت میں سام پر جمع ہو جاتا ہے اس لئے ہود علیہ السلام عاد کے نسبی بھائی ہیں اسی لئے اَخَاهُمْ هُودًا فرمایا گیا۔

قوم عاد کے تیرہ خاندان تھے۔ عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک ان کی بستیاں تھیں۔ ان کی زمینیں بڑی سرسبز و شاداب تھیں ہر قسم کے باغات تھے۔ رہنے کے لئے بڑے بڑے شاندار محلات بناتے تھے۔ بڑے قدآور قوی الجثہ آدمی تھے آیات مذکورہ میں وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری ہی نعمتوں کے

دروازے ان پر کھول دیئے تھے۔ مگر ان کی کج فہمی نے انہی نعمتوں کو ان کے لئے وبال جان بنا دیا۔ اپنی قوت وشوکت کے نشہ میں بدمست ہو کر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً کی ڈینگ مارنے لگے۔

اور رب العالمین جس کی نعمتوں کی بارش ان پر ہو رہی تھی اس کو چھوڑ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو خود انہی کے خاندان سے تھے۔ اور ابو البرکات جونی جو انساب عرب کے بڑے ماہر مشہور ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کے بیٹے یعرب بن قحطان ہیں جو یمن جا کر آباد ہوئے اور یمنی اقوام انہی کی نسل ہیں۔ اور عربی زبان کی ابتداء انہی سے ہوئی اور یعرب کی مناسبت سے ہی زبان کا نام عربی اور اس کے بولنے والوں کو عرب کہا گیا۔ (بحر محیط)

مگر صحیح یہ ہے کہ عربی زبان تو عہد نوح علیہ السلام سے جاری تھی کشتی نوح علیہ السلام کے ایک رفیق جرہم تھے جو عربی زبان بولتے تھے (بحر محیط)۔ اور یہی جرہم ہیں جن سے مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہوئی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یمن میں عربی زبان کی ابتدا یعرب بن قحطان سے ہوئی اور ابو البرکات کی تحقیق کا یہی مطلب ہو۔

عذاب

حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو بت پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور ظلم و جور چھوڑ کر عدل وانصاف اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ مگر یہ لوگ اپنی دولت وقوت کے نشہ میں سرشار تھے۔ بات نہ مانی جس کے نتیجہ میں ان پر پہلا عذاب تو یہ آیا کہ تین سال تک مسلسل بارش بند ہو گئی۔ ان کی زمینیں خشک ریگستانی صحرا بن گئیں باغات جل گئے مگر اس پر بھی یہ لوگ شرک وبت پرستی سے باز نہ آئے تو آٹھ دن اور سات راتوں تک ان پر شدید قسم کی آندھی کا عذاب مسلط ہوا جس نے ان کے رہے سہے باغات اور محلات کو زمین پر بچھا دیا ان کے آدمی اور جانور ہوا میں اڑتے اور پھر سر کے بل آ کر گرتے تھے۔ اس طرح یہ قوم عاد پوری کی پوری

طرح ہلاک کردی گئی۔ آیات مذکورہ میں جو ارشاد ہے وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا. یعنی ہم نے جھٹلانے والوں کی نسل قطع کردی اس کا مطلب بعض حضرات نے یہی قرار دیا ہے کہ اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ سب فنا کر دیئے گئے اور بعض حضرات نے اس لفظ کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ آئندہ کے لئے بھی قوم عاد کی نسل اللہ تعالیٰ نے منقطع کردی۔

حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھی

حضرت ہود علیہ السلام کی بات نہ ماننے اور کفر وشرک میں مبتلا رہنے پر جب ان کی قوم پر عذاب آیا تو ہود علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے ایک حظیرہ (گھیر) میں پناہ لی۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس طوفانی ہوا سے بڑے بڑے محلات تو منہدم ہو رہے تھے مگر اس گھیر میں ہوا نہایت معتدل ہو کر داخل ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام کے سب رفقاء عین نزول عذاب کے وقت بھی اسی جگہ مطمئن بیٹھے رہے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ قوم کے ہلاک ہو جانے کے بعد مکہ معظمہ میں منتقل ہو گئے اور پھر یہیں وفات پائی۔ (بحر محیط)

دوہرا عذاب

قوم عاد کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں آنا قرآن مجید میں صراحۃً مذکور اور منصوص ہے اور سورہ مؤمنون میں قصہ نوح علیہ السلام ذکر کرنے کے بعد جو ارشاد ہوا ہے ثُمَّ اَنْشَأْنَا مِنْ م بَعْدِهِمْ قَرْنًا یعنی پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور جماعت پیدا کی' ظاہر یہ ہے کہ اس جماعت سے مراد قوم عاد ہے۔ پھر اس جماعت کے اعمال واقوال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا فاخذتهم الصیحة بالحق یعنی پکڑ لیا ان کو ایک سخت آواز نے۔ اس ارشاد قرآنی کی بناء پر بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ قوم عاد پر سخت قسم کی ہیبت ناک آواز کا عذاب مسلط ہوا تھا مگر ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ سخت آواز بھی ہوئی ہو اور ہوا کا طوفان بھی۔

ابتدائی دعوت

قرآن کریم میں ہے وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط اَفَلَا تَتَّقُوْنَ یعنی ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو ہدایت کے لئے بھیجا تو انہوں نے فرمایا۔ اے میری قوم تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں۔

قوم عاد سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کا عذاب عظیم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے غائب نہ ہوا تھا اس لئے حضرت ہود علیہ السلام کو عذاب کی شدت و عظمت بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی صرف اتنا فرمانا کافی سمجھا کہ کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

سرداروں کا جواب

دوسری آیت میں ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَۃٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ یعنی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔

یہ تقریباً ایسا ہی معارضہ ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کیا تھا صرف بعض الفاظ کا فرق ہے۔ تیسری اور چوتھی آیت میں اس کا جواب بھی تقریباً اسی انداز کا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ مجھ میں بے وقوفی کچھ نہیں بات صرف اتنی ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول اور پیغمبر بن کر آیا ہوں اس کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس لئے تمہاری آبائی جہالتوں اور غلطیوں میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے میں تمہارے طبائع کے خلاف حق بات تمہیں پہنچاتا ہوں جس سے تم برا مانتے ہو۔

قوم کا اعتراض

پانچویں آیت میں قوم عاد کا وہی اعتراض ذکر کیا گیا ہے جو ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام نے پیش کیا تھا کہ ہم کسی اپنے ہی جیسے بشر اور انسان کو کیسے اپنا بڑا اور پیشوا مان لیں کوئی فرشتہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم مان لیتے۔ اس کا جواب بھی قرآن کریم نے وہی ذکر کیا جو نوح علیہ السلام نے دیا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی انسان اللہ کا نبی و رسول ہو کر لوگوں کو ڈرانے کے لئے آ جائے کیونکہ درحقیقت انسان کے سمجھانے بجھانے کے لئے انسان ہی کا پیغمبر ہونا مؤثر ہو سکتا ہے۔

انعامات کی یاددہانی

ان کو وہ انعامات یاد دلائے جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر مبذول فرمائے ہیں ارشاد فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ م بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْطَةً فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اس بات کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد زمین کا مالک و متصرف بنا دیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ اس کی ان نعمتوں کو یاد کرو تو تمہارا بھلا ہوگا۔

سرکشی کی انتہا

مگر اس سرکش بدمست قوم نے ایک نہ سنی اور وہی جواب دیا جو عام طور پر گمراہ لوگ دیا کرتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے ہمارے باپ دادا کا مذہب چھڑا دو اور سارے دیوتاؤں کو چھوڑ کر ہم صرف ایک خدا کو ماننے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ آپ جس عذاب کی دھمکی ہمیں دے رہے ہیں اس عذاب کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب تمہاری سرکشی اور بے ہوشی کی یہ حالت ہے تو اب تم پر خدا تعالیٰ کا غضب اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی اب اسی کا انتظار کرتے ہیں۔ قوم کے اس اشتعال آمیز جواب پر عذاب آنے کی خبر تو دے دی لیکن پیغمبرانہ شفقت و نصیحت نے پھر مجبور کیا کہ اس کلام کے دوران میں یہ بھی فرما دیا کہ افسوس ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بے عقل بے جان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیا جن کے معبود ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی اور پھر تم ان کی عبادت میں ایسے پختہ ہو گئے کہ ان کی حمایت میں مجھ سے جھگڑا کر رہے ہو۔

انجام

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہود علیہ السلام کی ساری جدوجہد اور عاد قوم کی سرکشی کا آخری انجام یہ ہوا کہ ہم نے ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے عذاب سے محفوظ رکھا اور جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

اس قصہ میں غافل انسانوں کے لئے خدا کی یاد اور اطاعت میں لگ جانے کی ہدایت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سامان عبرت اور مبلغین و مصلحین کے لئے پیغمبرانہ طریقہ تبلیغ واصلاح کی تعلیم ہے۔

عذاب

ان لوگوں نے ان باتوں میں سے کسی چیز پر کان نہ دھرا اور اپنی سرکشی پر قائم رہے تو خدا تعالیٰ کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں ان پر نازل ہوا جس نے مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا' آدمی اور جانور ہوا میں اڑ کر آسمانی فضاء تک جاتے اور وہاں سے اوندھے گرتے تھے آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی تھی' یہاں تک کہ یہ بے مثال قوت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک و برباد ہوگئی۔

جب اس قوم پر عذاب الٰہی کا حکم نافذ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سنت الٰہیہ کے مطابق اپنے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اس سخت عذاب سے بچالیا کہ عذاب آنے سے پہلے ان کو اس جگہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔

درس عبرت

قوم عاد کے واقعہ اور عذاب کا ذکر کرنے کے بعد دوسروں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے وہ قوم عاد جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی لعنت یعنی رحمت سے دوری ان کے ساتھ ساتھ لگی رہی اور قیامت میں بھی اسی طرح ساتھ لگی رہے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

نسب نامہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ توراۃ میں اس طرح مذکور ہے۔

ابراہیم (خلیل اللہ) بن تارخ بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالج بن عابر بن شالح بن ارفکشاذ بن سام بن نوح (علیہ السلام) یہ تصریح تورات اور تاریخ کے مطابق ہے مگر قرآن عزیز نے ان کے والد کا نام آزر بتایا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (الانعام ۶' آیت ۷۴)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا "کیا تو بتوں کو اللہ بناتا ہے؟"

آزر کی تحقیق: چونکہ تاریخ اور تورات دونوں ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ بتاتے ہیں اور قرآن عزیز آزر کہتا ہے اس لئے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو راہیں اختیار کی ہیں۔

(۱) ایسی صورت کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

(۲) تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح ہے اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارخ علم (اسمی نام) ہے اور آزر علم وصفی (وصفی نام)

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبری زبان میں "محبّ صنم" کو کہتے ہیں اور چونکہ تارخ میں بت تراشی و بت پرستی دونوں وصف موجود تھے اس لئے آزر کے لقب سے مشہور ہوا اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج (کم فہم) یا بے وقوف اور پیر فرتوت کے ہیں

اور چونکہ تارخ میں یہ باتیں موجود تھیں اس لئے وصف سے موصوف کیا گیا۔ قرآن عزیز نے اسی مشہور وصفی علم کو بیان کیا ہے۔ سہیلی نے روض الانف میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے تارخ جس کا پجاری اور مہنت تھا' چنانچہ مجاہد (رحمہ اللہ تعالیٰ) سے روایت ہے کہ قرآن عزیز کی مسطور بالا آیت کا مطلب یہ ہے۔

اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ای اتتخذ اصنا ما الهة

کیا تُو آزر کو اللہ مانتا ہے یعنی بتوں کو اللہ مانتا ہے؟

اور صنعانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے' صرف نحوی اعتبار سے تقدیر کلام میں وہ ایک دوسری راہ اختیار کرتے ہیں' غرض ان دونوں کے نزدیک آزر ''ابیہ'' کا بدل نہیں ہے بلکہ بت کا نام ہے اور اس طرح قرآن عزیز میں ان کے والد کا نام مذکور نہیں۔

ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا اور چچا کا آزر' اور چونکہ آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور بمنزلہ اولاد کے پالا تھا اس لئے قرآن عزیز میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا گیا جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے ''العم صنو ابیه'' چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاہد کا قول قرین قیاس اور قابل قبول ہے اس لئے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام آزرویس بھی آتا ہے جس کے معنی ''اللہ قوی و معین'' ہیں اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے' اس لئے اس بت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر آزر رکھا گیا ورنہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا۔

ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات باردہ ہیں' اس لیے کہ قرآن عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو اب ابراہیم (ابراہیم باپ) کہا ہے تو پھر محض علماء انساب اور بائیبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآن عزیز کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآن عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے۔

برسبیل تسلیم اگر آزر عاشق صنم کو کہتے ہیں یا بت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیر کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آذر رکھا گیا جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے اور کبھی خود بت ہی کے نام پر نام رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ "آدار" کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی "آزر" کہلایا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ اس لیے "آزر" ہی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی قرآن عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔

نیز جس مقدس انسان (ابراہیم علیہ السلام) کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہو کہ جب بت پرستی کی مذمت کے سلسلہ میں آزر سے مناظرہ ہوا اور آزر نے زچ ہو کر یہ کہا

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّکَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (مریم ۱۹ آیت ۴۶)

اے ابراہیم کیا تُو میرے خداؤں سے بیزار ہے تُو اگر اس حرکت سے باز نہ آیا تو میں ضرور تجھ کو سنگسار کروں گا اور جا میرے سامنے سے دور ہو جا۔

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقع پر بھی اس نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا اور جواب میں صرف یہ فرمایا سَلٰمٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ ط اِنَّهٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا (مریم ۱۹ آیت ۴۷)

تجھ پر سلامتی ہو میں عنقریب تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش چاہوں گا بلاشبہ وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے۔

اس ہستی سے یہ کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ آزر کو بے وقوف، پیر فرتوت اور اسی قسم کے تحقیر آمیز الفاظ کے ساتھ خطاب کرے؟

پس بلاشبہ تارخ کا تارخ، آزر ہی ہے اور وہ علم اسمی ہے نہ کہ علم وصفی اور تارخ یا غلط نام ہے اور یا آزر کا ترجمہ ہے جو توراۃ کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن گیا۔

مراتشی سترھویں صدی کا ایک عیسائی عالم ہے اس نے قرآن عزیز کا ترجمہ کیا ہے اور قرآن عزیز پر نہایت رکیک اور متعصبانہ حملے کیے ہیں اس نے اس موقع پر بھی عادت کے مطابق ایک مہمل اور لچر اعتراض کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یوزبیوس کی تاریخ کنیسہ کی ایک عبارت میں یہ لفظ آیا ہے جس کو غلط صیغہ کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن عزیز میں درج کر دیا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مراتشی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہ تاریخ کنیسہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ بتایا گیا ہے اور نہ اس اصل لفظ ہی کا پتہ دیتا ہے جس سے یہ غلط لفظ بنا لیا گیا اور نہ یہ بتلاتا ہے کہ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نقل کی کیا ضرورت پیش آئی اس لیے یہ قطعاً بے دلیل اور بے سروپا بات ہے جو محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہی گئی اور حق وہی ہے جو ہم نے ابھی واضح کیا۔

اپنے والد اور قوم کو توحید کی دعوت

سورۂ آل عمران میں ہے کہ: اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر (نام) سے فرمایا کہ کیا تُو بتوں کو معبود قرار دیتا ہے بے شک میں تجھ کو اور تیری ساری قوم کو جو اس اعتقاد میں تیرے شریک ہیں صریح غلطی میں دیکھ رہا ہوں اور ستاروں کے متعلق آگے گفتگو آئے گی درمیان میں ابراہیم علیہ السلام کا صحت نظر کے ساتھ موصوف ہونا کہ ماقبل و مابعد دونوں سے اس کا تعلق ہے فرماتے ہیں اور ہم نے ایسی ہی کامل طور پر ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات (بچشم معرفت) دکھلائیں تاکہ وہ خالق کی ذات و صفات کے عارف ہو جاویں اور تاکہ (از دیاد معرفت سے) کامل یقین کرنے والوں سے ہو جاویں گے (آگے ستاروں کے متعلق گفتگو کہ تتمہ مناظرہ کا ہے مذکور ہے کہ اوپر کی گفتگو تو بتوں کے متعلق ہو چکی) پھر اسی دن یا کسی اور دن جب رات کی تاریکی ان پر اسی طرح اور سب پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا کہ چمک رہا ہے آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمہارے خیال کے موافق یہ میرا اور تمہارا رب اور میرے احوال میں متصرف ہے بہت اچھا اب تھوڑی دیر میں حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے چنانچہ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ افق میں جا چھپا سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ

میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا اور محبت لوازم اعتقادِ ربوبیت سے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ میں رب نہیں سمجھتا پھر اسی شب میں یا کسی دوسری شب میں جب چاند کو دیکھا کہ چمکتا ہوا نکلا ہے تو پہلے ہی کی طرح فرمایا کہ تمہارے خیال کے موافق یہ میرا اور تمہارا رب اور متصرف فی الاحوال ہے بہتر اب تھوڑی دیر میں اس کی کیفیت بھی دیکھنا چنانچہ وہ بھی غروب ہو گیا سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب حقیقی ہدایت نہ کرتا رہے جیسا اب تک ہدایت کرتا رہتا ہے تو میں بھی تمہاری طرح گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں پھر یعنی اگر چاند کا قصہ اسی قمر کوکب کی شب کا تھا تب تو کسی شب کی صبح کو اور اگر چاند کا قصہ اسی قصہ کوکب کی شب کا نہ تھا تو قصہ کی شب کی صبح کو یا اس کے علاوہ کسی اور شب کی صبح کو جب آفتاب دیکھا کہ بڑی آب و تاب سے چمکتا ہوا نکلا ہے تو پہلی دو بار کی طرح پھر فرمایا کہ تمہارے خیال کے موافق یہ میرا اور تمہارا رب اور متصرف فی الاحوال ہے اور یہ تو سب مذکورہ ستاروں میں بڑا ہے اس پر خاتمہ کلام کا ہو جاوے گا' اگر اس کی ربوبیت باطل ہو گئی تو چھوٹوں کی بدرجہ اولیٰ باطل ہو جاوے گی' غرض شام ہوئی تو وہ بھی غروب ہو گیا سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار اور نفور ہوں یعنی براءت ظاہر کرتا ہوں (اعتقاداً تو ہمیشہ سے بیزار ہی تھے) میں سب طریقوں سے یک سو ہو کر اپنا رخ ظاہر کا اور دل کا اس ذات کی طرف کرنا تم سے ظاہر کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور میں تمہاری طرح شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں نہ اعتقاداً نہ قولاً نہ عملاً اور ان سے ان کی قوم نے بیہودہ حجت کرنا شروع کی وہ یہ کہ یہ رسم قدیم ہے وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا لَهَا عٰبِدِيْنَ اور معبودان باطلہ کے انکار پر ڈرایا بھی کہ کبھی تم کو یہ کسی آفت میں نہ پھنسا دیں کما یدل علیه الجواب بقوله و لا اخاف الخ) آپ نے پہلی بات کے جواب میں تو یہ فرمایا کہ کیا تم اللہ کی توحید کے معاملہ میں مجھ سے باطل حجت کرتے ہو' حالانکہ اس نے مجھ کو استدلال صحیح کا طریقہ بتلا دیا ہے' جس کو میں تمہارے روبرو پیش کر چکا ہوں اور محض رسم قدیم ہونا اس استدلال کا جواب نہیں ہو سکتا پھر اس سے احتجاج تمہارے لئے بے کار اور میرے نزدیک غیر قابل التفات اور دوسری بات کے جواب میں

یہ فرمایا کہ میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ استحقاق عبادت میں شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا کہ وہ مجھ کو کوئی صدمہ پہنچا سکتے ہیں کیونکہ ان میں خود صفت قدرت ہی مفقود ہے اور اگر کسی چیز میں ہو بھی تو استقلال قدرت مفقود ہے ہاں لیکن اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے تو وہ دوسری بات ہے وہ ہو جاوے گی لیکن اس سے الہہ وارباب باطلہ کی قدرت کا ثبوت یا ان سے خوف کی ضرورت کب لازم آئی اور میرا پروردگار جس طرح قادر مطلق ہے جیسا ان اشیاء سے معلوم ہوا اسی طرح وہ ہر چیز کو اپنے احاطہ علم میں بھی گھیرے ہوئے ہے غرض قدرت وعلم دونوں اسی کے ساتھ مختص ہیں اور تمہارے الٰہ کو نہ قدرت ہے نہ علم ہے کیا تم سنتے ہو اور پھر بھی خیال نہیں کرتے اور جس طرح میرے نہ ڈرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہارے معبود علم وقدرت سے محض معرّیٰ ہیں اسی طرح یہ بات بھی تو ہے کہ میں نے کوئی کام ڈر کا کیا بھی تو نہیں تو پھر میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ استحقاق عبادت اور اعتقاد ربوبیت میں شریک بنایا ہے حالانکہ تم کو ڈرنا چاہئے دو وجہ سے اول تم نے ڈر کا کام یعنی شرک کیا ہے، جس پر عذاب مرتب ہوتا ہے، دوسرے خدا کا عالم اور قادر ہونا معلوم ہو چکا ہے، مگر تم اس بات کے وبال سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے معبود ہونے پر اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل لفظاً یا معنیً نازل نہیں فرمائی مطلب یہ کہ ڈرنا چاہئے تم کو پھر الٹا مجھ کو ڈراتے ہو سو بعد اس تقریر کے انصاف سے سوچ کر بتلاؤ کہ ان دو مذکورہ جماعتوں میں سے یعنی مشرکین و موحدین میں سے امن کا یعنی اس کا کہ اس پر خوف واقع نہ ہو زیادہ مستحق کون ہے اور خوف بھی وہ جو واقع میں قابل اعتبار ہے یعنی آخرت کا اگر تم کچھ خبر رکھتے ہو:

تمام عرب کے جد امجد

ان سے پہلی آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین عرب کو خطاب اور بت پرستی چھوڑ کر صرف خدا پرستی کی دعوت کا بیان تھا۔

ان آیات میں اسی دعوت حق کی تائید ایک خاص انداز میں فرمائی گئی ہے، جو طبعی طور پر اہل عرب کے لئے دلنشین ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جد

امجد ہیں اور اسی لئے سارا عرب ان کی تعظیم پر ہمیشہ سے متفق چلا آیا ہے' ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے بت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا اور پھر سب کو توحید حق کا سبق دیا تھا۔

باپ کو دعوت

پہلی آیات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم نے اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود بنالیا ہے' میں تم کو اور تمہاری ساری قوم کو گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

والد کا نام

مشہور یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ہے' اور اکثر مؤرخین نے ان کا نام تارخ بتلایا ہے اور یہ کہ آزر ان کا لقب ہے اور امام رازیؒ اور علماء سلف میں سے ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر ہے' ان کا چچا آزر نمرود کی وزارت کے بعد شرک میں مبتلا ہو گیا تھا' اور چچا کو باپ کہنا عربی محاورات میں عام ہے' اسی محاورہ کے تحت آیت میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ فرمایا گیا ہے' زرقانی نے شرح مواہب میں اس کے کئی شواہد بھی نقل کئے ہیں۔

باپ سے اور قوم سے مناظرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برادری اور ان کے باپ دوہرے شرک میں مبتلا تھے کہ بتوں کی بھی پرستش کرتے تھے' اور ستاروں کی بھی' اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی دونوں مسئلوں پر اپنے باپ اور اپنی قوم سے مناظرہ کیا۔

پہلے بت پرستی کا ضلالت و گمراہی ہونا ذکر فرمایا' اگلی آیات میں ستاروں کا قابل عبادت نہ ہونا بیان فرمایا' اور اس سے پہلے ایک آیت میں بطور تمہید کے حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی ایک خاص شان اور علم و بصیرت میں اعلیٰ مقام کا ذکر اس طرح فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ'

یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات کو اس طرح دکھلا دیا کہ ان کو سب چیزوں کی حقیقت واشگاف طور پر معلوم ہو جائے' اور ان کا یقین مکمل ہو جائے' اسی کا

نتیجہ تھا جو بعد کی آیات میں ایک عجیب طرح کے مناظرہ کی شکل میں اس طرح مذکور ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیۡهِ الَّیۡلُ رَاٰ کَوۡکَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّیۡ یعنی ایک رات میں جب تاریکی چھا گئی اور ایک کوکب یعنی ستارہ پر نظر پڑی تو اپنی قوم کو سنا کر کہا کہ یہ ستارا میرا رب ہے' مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیالات وعقائد کی رُو سے یہی میرا اور تمہارا رب یعنی پالنے والا ہے' اب تھوڑی دیر میں اس کی حقیقت دیکھ لینا چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ غروب ہو گیا' تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم پر حجت قائم کرنے کا واضح موقع ہاتھ آیا' اور فرمایا لا احب الافلین' آفلین کا یہ لفظ افول سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غروب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ میں غروب ہو جانے والی چیزوں سے محبت نہیں رکھتا' اور جس کو خدا یا معبود بنایا جائے ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت وعظمت کا مستحق ہونا چاہیے' مولانا رومی رحمہ اللہ نے ایک شعر میں اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے۔

خلیل آسا در ملک یقیں زن
نوائے لا احب الآفلین زن

اس کے بعد پھر کسی دوسری رات میں چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو پھر اپنی قوم کو سنا کر وہی طریقہ اختیار فرمایا اور کہا کہ تمہارے عقائد کے مطابق یہ میرا رب ہے' مگر اس کی حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد سامنے آ جائے گی' چنانچہ جب چاند غروب ہو گیا تو فرمایا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا رہتا تو میں بھی تمہاری طرح گمراہوں میں داخل ہو جاتا' اور چاند ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھ بیٹھتا' لیکن اس کے طلوع وغروب کے بدلنے والے حالات نے مجھے متنبہ کر دیا کہ یہ ستارہ بھی قابل عبادت نہیں۔

اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ میرا رب کوئی دوسری شے ہے' جس کی طرف سے مجھے ہدایت ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد ایک روز آفتاب کو نکلتے ہوئے دیکھا تو پھر قوم کو سنا کر اسی طریقہ پر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا رب ہے' اور یہ تو سب سے بڑا ہے' مگر اس بڑے کی حقیقت وحیثیت بھی عنقریب تمہارے سامنے آ جائے گی' چنانچہ آفتاب بھی اپنے وقت پر

غروب ہوگیا' تو قوم پر آخری حجت تمام کرنے کے بعد اب اصل حقیقت کو واضح طور پر بیان فرمادیا کہ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ یعنی اے میری قوم! میں تمہارے ان مشرکانہ خیالات سے بیزار ہوں' کہ تم نے خدا تعالیٰ کی مخلوقات کو ہی خدائی کا شریک بنا رکھا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا رب (پالنے والا) ان تمام مخلوقات میں سے کوئی نہیں ہوسکتا' جو خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہیں' اور ہر وقت ہر آن عروج ونزول اور طلوع وغروب کے تغیرات میں گھری ہوئی ہیں' بلکہ ہمارا سب کا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے' اس لئے میں نے اپنا رخ تمہارے سب خود تراشیدہ بتوں اور تغیرات وتاثرات میں گھرے ہوئے ستاروں سے پھیر کر صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی طرف کرلیا ہے' اور میں تمہاری طرح مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

دعوت وتبلیغ میں حکمت وتدبیر سے کام لینا

اس واقعہ مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت وموعظت سے کام لے کر یکبارگی ان کی نجوم پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا' بلکہ ایک ایسا انداز قائم کیا' جس سے ہر ذی عقل انسان کا قلب ودماغ خود متاثر ہوکر حقیقت کو پہچان لے' ہاں بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں اول ہی شدت اختیار فرمائی' اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کردیا' وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا نامعقول گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا' بخلاف نجوم پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور جلی نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو استدلال بیان فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تغیر پذیر ہو اور اس کے حالات ادل بدل ہوتے رہتے ہوں' اور وہ اپنی حرکات میں کسی دوسری طاقت کے تابع ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا رب قرار دیں' اس استدلال میں سیاروں کے طلوع غروب اور درمیانی تمام حالات سے استدلال کیا جاسکتا تھا' کہ وہ اپنی حرکات میں خود مختار نہیں کسی

کے حکم کے تابع ایک خاص روش پر چل رہے ہیں' لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان تمام حالات و کیفیات میں سے استدلال کے لئے ان سیاروں کے غروب کو پیش کیا' کیونکہ ان کا غروب عوام کی نظروں میں ایک طرح سے ان کا زوال سمجھا جاتا ہے' اور انبیاء علیہم السلام کا عام طرز استدلال وہ ہوتا ہے جو عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہو' وہ فلسفیانہ حقائق کے پیچھے زیادہ نہیں پڑتے' بلکہ عام ذہنوں کے مطابق خطاب فرماتے ہیں' اس لئے ان سیاروں کی بے بسی اور بے اثری ثابت کرنے کے لئے ان کے غروب کو پیش کیا' ورنہ ان کے بے بس اور بے قدرت ہونے پر تو طلوع سے بھی استدلال ہوسکتا تھا' اور اس کے بعد غروب سے پہلے تک جتنے تغیرات پیش آتے ہیں ان سے بھی اس پر دلیل پکڑی جاسکتی ہے۔

نمرود سے مکالمہ

آیت ۲۵۸ میں ہے کہ (اے مخاطب) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ نعمت سلطنت پر احسان مانتا اور ایمان لاتا' اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ مباحثہ اس وقت شروع ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے وہ کوڑھ مغز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں کہ) میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جس کو چاہوں قتل کردوں یہ تو مارنا ہے اور جس کو چاہوں قتل سے معاف کردوں یہ جلانا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھدی عقل کا ہے کہ اس کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے' حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے' اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو' اور قرائن سے یہ معلوم ہوگیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھے گا نہیں' اس لئے اس ضرورت سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق سے نکالتا ہے تُو (ایک ہی دن) مغرب سے

نکال (کر دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن آیا اس کا مقتضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی گمراہی پر جما رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و سلطنت عطاء کر دیں تو اس کو عہدے کے نام سے تعبیر کرنا جائز ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

نمرود کی حیرانی

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے دفع اس شبہ کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہولیں، ذرا سی حجت میں سلطنت جاتی رہے یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

دعوت حق کو قوم کا جھٹلانا

آیت ۱۵ تا ۱۸ میں ہے کہ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے جو کہ بت پرست تھے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو (اور ڈر کر شرک چھوڑ دو) یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو بخلاف طریقہ شرک کے محض بے وقوفی ہے کیونکہ تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو جو بالکل عاجز اور ناکارہ ہیں پوج رہے ہو اور اس کے متعلق جھوٹی باتیں تراشتے ہو، کہ ان سے ہماری روزی روزگار کی کار برآری ہوتی ہے اور یہ محض جھوٹ ہے کیونکہ تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو یعنی اس سے مانگو مالک رزق وہی ہے اور جب مالک رزق وہی ہے تو اس کی عبادت کرو اور چونکہ پچھلا رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے تو اسی کا ذکر کرو ایک تو سبب وجوب عبادت کا یہ ہے کہ وہ مالک نفع کا ہے اور دوسرا سبب

یہ ہے کہ وہ مالک ضرر کا بھی ہے چنانچہ تم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے اس وقت کفر پر تم کو سزا دے گا اور اگر تم ان باتوں میں مجھ کو جھوٹا سمجھو تو یاد رکھو کہ میرا کوئی ضرر نہیں تم سے پہلے بھی بہت سی امتیں اپنے پیغمبروں کو جھوٹا سمجھ چکی ہیں مگر ان پیغمبروں کا کوئی ضرر نہیں ہوا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ پیغمبر کے ذمہ تو صرف بات کا صاف طور پر پہنچا دینا ہے منوانا اس کا کام نہیں پس سب انبیاء تبلیغ کے بعد سبکدوش ہو گئے اسی طرح میں بھی، پس ہم کو کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ البتہ ماننا تمہارے ذمہ واجب تھا اس کے ترک سے تمہارا ضرر ضرور ہوا)۔

حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت سارہ علیہ السلام کا آپ پر ایمان لانا

آیت ۲۴ تا ۲۷ میں ہے کہ: سو ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر دلپذیر کے بعد ان کی قوم کا آخری جواب بس یہ تھا کہ آپس میں کہنے لگے کہ ان کو یا تو قتل کر ڈالو یا ان کو جلا دو چنانچہ جلانے کا سامان کیا سو اللہ نے ان کو اس آگ سے بچا لیا جس کا قصہ سورہ انبیاء میں گذر چکا ہے بیشک اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں کئی نشانیاں ہیں یعنی یہ واقعہ کئی چیزوں کی دلیل ہے، اللہ کا قادر ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا نبی ہونا، کفر و شرک کا باطل ہونا اس لئے یہ ایک ہی دلیل متعدد دلائل کے قائم مقام ہو گئی اور ابراہیم علیہ السلام نے وعظ میں یہ بھی فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو معبود تجویز کر رکھا ہے، بس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر آدمی اپنے تعلقات اور دوستی اور رشتہ داروں کے طریق پر رہتا ہے اور اس وجہ سے حق بات میں غور نہیں کرتا، اور حق کو سمجھ کر بھی ڈرتا ہے کہ سب دوست اور رشتہ دار چھوٹ جاویں گے پھر قیامت میں تمہارا یہ حال ہو گا کہ تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا، جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے لعنت اختها اور سورہ سباء میں ہے یَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ نِ الْقَوْلَ اور سورہ بقرہ میں ہے اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا الخ خلاصہ یہ ہے کہ آج جن احباب و اقارب کی وجہ سے تم گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہو قیامت کے روز یہی احباب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہو گا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہو گا سوا تنے وعظ و پند پر بھی ان کی قوم نے نہ مانا صرف لوط علیہ السلام نے ان کی

تصدیق فرمائی اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تم لوگوں میں نہیں رہتا' بلکہ اپنے پروردگار کی بتلائی ہوئی جگہ کی طرف ترک وطن کر کے چلا جاؤں گا بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھ کو اس کا ثمرہ دے گا اور ہم نے ہجرت کے بعد ان کو اسحٰق بیٹا اور یعقوب پوتا عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کے سلسلہ کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی بڑے درجہ کے نیک بندوں میں ہوں گے (اس صلہ میں مراد قرب وقبول ہے)

حضرت ابراہیم کی ہجرت

حضرت لوط علیہ السلام وحضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھانجے تھے' آتش نمرود میں ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر سب سے پہلے انہوں نے تصدیق کی یہ اور آپ کی اہلیہ حضرت سارہ جو آپ کی چچازاد بہن بھی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں ان دونوں کو ساتھ لے کر ابراہیم علیہ السلام نے وطن سے ہجرت کا ارادہ کیا' ان کا وطن مقام کوثا تھا' جو کوفہ کی ایک بستی ہے' اور فرمایا انی مهاجر الی ربی' یعنی میں وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مقام کی طرف جاؤں گا جہاں رب کی عبادت میں رکاوٹ نہ ہو۔

حضرت نخعی رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے انی مهاجر کا قائل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے کیونکہ اس کے بعد وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ تو یقیناً انہی کا حال ہے' اور بعض حضرات مفسرین نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کو حضرت لوط علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے' خلاصہ تفسیر کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے' مگر سیاق کلام سے پہلی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے' اور حضرت لوط علیہ السلام بھی اگرچہ اس ہجرت میں شریک ضرور تھے مگر جیسا حضرت سارہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع تھیں اسی طرح لوط علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر مستقلاً نہ ہونا کچھ بعید نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلی ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جن کو دین کے لئے ترک وطن اور ہجرت اختیار کرنا پڑی' ان کی یہ ہجرت ۷۵ سال کی عمر میں ہوئی (یہ سب بیان قرطبی سے لیا گیا ہے)

مشرک کے لئے استغفار کی ممانعت

قرآن کریم میں ہے کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعاء مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں اس وجہ سے کہ کافر ہو کر مرے ہیں اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے شبہ ہو کہ انہوں نے اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا وہ اس کے قبل تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر ہو جاوے اور وہ بھی صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا اس قول میں ساستغفر لک ربی، غرض جواز تو اس لئے تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر نہ ہوا تھا اور وقوع کو اس سے ترجیح ہو گئی تھی کہ وعدہ کر لیا تھا ورنہ باوجود جواز کے بھی وقوع نہ ہوتا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ خدا کا دشمن یعنی کافر ہو کر مرا ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے کہ استغفار بھی چھوڑ دیا' کیونکہ اس وقت دعائے مغفرت کرنا بے معنی ہے کیونکہ کافر میں احتمال مغفرت کا ہے ہی نہیں' بخلاف حالت حیات کے کہ دعاء مغفرت کے معنی اس وقت طلب توفیق ہدایت ہو سکتے ہیں کہ توفیق ہدایت کے لئے مغفرت لازم ہے اور رہا یہ کہ وعدہ کیوں کر لیا تھا وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعی ابراہیم علیہ السلام بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے کہ باوجودیکہ باپ نے ان کو کیسی کیسی سخت باتیں کہیں' مگر حلم سے کام لیا' اور مزید براں یہ کہ شفقت کے جوش سے وعدہ کر لیا اور احتمال نفع تک اس وعدہ کو پورا فرمایا جب یاس ہو گیا ہار کر چھوڑ دیا' بخلاف تمہارے استغفار کے کہ مشرکین کے مرنے کے بعد ہو رہا ہے' جن کا حالت شرک پر مرنا ظاہر مشاہدہ سے معلوم ہے اور احکام شرعیہ میں ایسا ظاہر کافی ہے' پھر قیاس کب صحیح ہے اور اس قیاس پر شبہ کب مبنی ہو سکتا ہے) (۱۳-۱۱۴)

واقعہ نزول اس آیت کا صحیح بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے مگر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و حفاظت کرتے رہے' اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کسی طرح یہ کلمہ اسلام پڑھ لیں' اور ایمان لے آئیں تو

شفاعت کا موقع مل جائے گا اور یہ جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے' مرض وفات میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمہ شریف پڑھ لیں تو کام ہو جائے' چنانچہ اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے' مگر ابو جہل' عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے چچا! کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ لیں تو میں آپ کی بخشش کے لئے کوشش کروں گا' مگر ابو جہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ پھر اپنا کلام دہرایا' مگر ہر مرتبہ ابو جہل یہی بات کہہ دیتا' یہاں تک کہ آخری کلام میں ابو طالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں' اسی حالت میں وفات ہو گئی' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لئے برابر استغفار کرتا رہوں گا' جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے' اس پر آیت ممانعت کی نازل ہوئی' جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے لئے دعاء مغفرت کرنے سے منع فرما دیا' اگر چہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔

بعض مسلمانوں کے شبہ کا جواب

اس پر بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے کافر باپ کے لئے دعاء کی تھی' اس کے جواب میں دوسری آیت نازل ہوئی' مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ الایۃ' جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے والد کے لئے دعا کی تھی اس کا معاملہ یہ ہے کہ شروع میں جب تک ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر تک کفر ہی پر قائم رہے گا' اسی پر مرے گا' تو اس کا دوزخی ہونا یقینی نہیں تھا' اس وقت انہوں نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں آپ کے لئے دعاء مغفرت کروں گا' ساستغفر لک ربی' پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے یعنی کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوا ہے تو اس سے بے تعلقی اختیار کر لی اور استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

قرآن مجید کے مختلف مواقع میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لئے دعاء مغفرت کرنا منقول ہے وہ سب اسی پر محمول ہونا چاہئے' اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کو ایمان و اسلام کی توفیق دے تا کہ ان کی مغفرت ہو سکے۔

بتوں کو توڑنا

سورۂ الصافات میں ہے کہ: اور نوح علیہ السلام کے طریقہ والوں میں سے یعنی ان لوگوں میں سے جو اصولی عقائد میں نوح علیہ السلام کے ساتھ متفق تھے ابراہیم بھی تھے ان کا وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے صاف دل کا مطلب یہ کہ ان کا دل بدعقیدگی اور دکھلاوے کے جذبہ سے پاک تھا جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے جو بت پرست تھی فرمایا کہ تم کس واہیات چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا معبود بنانا چاہتے ہو تو تمہارا رب العالمین کے ساتھ کیا خیال ہے یعنی تم نے جو اس کی عبادت ترک کر رکھی ہے تو کیا اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ یعنی اول تو ایسا نہ ہونا چاہئے اور اگر کوئی شبہ ہے تو اسے رفع کر لو۔ غرض یوں ہی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا' ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کا کوئی تہوار آیا' قوم نے ان سے بھی درخواست کی کہ ہمارے میلہ میں چلو سو ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں اس لئے میلہ میں نہیں جاسکتا غرض وہ لوگ ان کا یہ عذر سن کر ان کو چھوڑ کر چلے گئے کہ ناحق بیماری میں ان کو اور ان کی وجہ سے اوروں کو تکلیف ہوگی تو یہ یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں میں جا گھسے اور استہزاء کے طور پر ان سے کہنے لگے کیا تم یہ چڑھاوے جو تمہارے سامنے رکھے ہیں کھاتے نہیں ہو اور تم کو کیا ہوا تم بولتے بھی نہیں؟ پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے اور کلہاڑی وغیرہ سے ان کو توڑ پھوڑ دیا سو ان لوگوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے گھبرائے ہوئے غصہ میں آئے اور گفتگو شروع ہوئی' ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو تو جو تمہارا محتاج ہو وہ خدا کیا ہوگا؟ حالانکہ تم کو اور تمہاری بنائی ہوئی ان چیزوں کو سب کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے سو عبادت اسکی کی کرنا چاہئے وہ لوگ جب مناظرہ میں مغلوب ہوئے تو جھلا کر باہم کہنے لگے کہ ابراہیم کیلئے ایک آتش خانہ تعمیر کرو اور اس میں آگ دہکا کر ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو' غرض ان لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کیساتھ برائی کرنی چاہی تھی کہ یہ ہلاک ہو جائیں گے سو ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔

حضرت ابراہیم اور حضرت نوح علیہما السلام

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کے بعد قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کے دو واقعے ذکر کئے ہیں' دونوں واقعے ایسے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض اللہ کے واسطے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے پہلا واقعہ جو مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ ہے' اور اس کی تفصیلات سورہ انبیاء میں گذر چکی ہیں' البتہ یہاں جس انداز میں اس کو بیان کیا گیا ہے اس میں چند باتیں تشریح طلب ہیں چنانچہ ان آیات میں یہ جو ہے کہ:

اِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ' شیعة عربی زبان میں اس گروہ یا جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بنیادی نظریات اور طور طریق میں یکساں ہوں' اور یہاں ظاہر یہی ہے کہ شیعتہ کی ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے' لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پیش رو نبی حضرت نوح علیہ السلام کے طریقے پر تھے' اور بنیادی اصول دین میں دونوں کا مکمل اتفاق تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کی شریعتیں بھی یکساں یا ملتی جلتی ہوں۔ واضح رہے کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کا وقفہ ہے' اور دونوں کے درمیان حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کے سوا کوئی اور نبی نہیں ہوا (کشاف' ص ۴۸ ج ۴)

قوم کے جشن میں جانے سے انکار

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک خاص دن میں تہوار منایا کرتی تھی' جب وہ دن آیا تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت دی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کے لئے چلیں مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جشن میں ہمارے ساتھ رہیں گے تو شاید ہمارے دین سے متاثر ہو جائیں' اور اپنے دین کی دعوت چھوڑ دیں۔ (در منثور و ابن جریر وغیرہ) لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع سے دوسرا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے' آپ کا ارادہ یہ تھا کہ جب ساری قوم جشن منانے چلی جائے گی تو میں ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے بتوں کو توڑ ڈالوں گا' تا کہ یہ لوگ واپس آ کر اپنے جھوٹے

معبودوں کی بے بسی کا عملی نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، ہوسکتا ہے کہ اپنے بتوں کو بے بس دیکھ کر کسی کے دل میں ایمان پیدا ہو اور وہ شرک سے توبہ کر لے۔ اس غرض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ جانے سے انکار فرما دیا، لیکن انکار کا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ پہلے نگاہ بھر کر ستاروں کو دیکھا اور پھر کہا کہ "میں بیمار ہوں" قوم والوں نے آپ کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیا اور جشن منانے چلے گئے۔

ستاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینے سے پہلے جو ستاروں پر نظر ڈالی، اس کا مقصد کیا تھا؟ بعض حضرات نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی عمل تھا، کسی اہم بات کو سوچتے ہوئے انسان بعض اوقات بے اختیار آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اس دعوت کو کس طرح ٹلاؤں؟ اسی سوچ کے عالم میں آپ نے بے اختیار ستاروں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد جواب دیا، ستاروں پر نظر ڈالنے کی یہ تشریح بظاہر بے غبار معلوم ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم کے اسلوب کے پیش نظر اسے درست کہنا مشکل ہے، اول تو اس لئے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ واقعات کے صرف اہم اور ضروری اجزاء کو بیان فرماتا ہے اور غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ دیتا ہے، خود انہی آیتوں میں واقعے کے کئی اجزاء محذوف ہیں، یہاں تک کہ اس کا پورا پس منظر بھی بیان نہیں کیا گیا، اس لئے یہ باور کرنا ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے واقعے کے پس منظر کو تو تطویل کے خیال سے چھوڑ دیا ہو اور ایک قطعی غیر اختیاری عمل جس کا واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہ تھا اسے پوری ایک آیت میں بیان فرمایا ہو۔ دوسرے اگر ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص حکمت پیش نظر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک غیر اختیاری عمل تھا تو عربی زبان کے قواعد کی رُو سے فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ کہنا چاہئے تھا فی النجوم نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص مصلحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیش نظر تھی، اسی لئے قرآن کریم نے اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اب وہ مصلحت کیا تھی؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ دراصل حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی قوم علم نجوم کی بڑی شیدائی تھی، اور ستاروں کو دیکھ دیکھ کر اپنے کاموں کا تعین کیا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر جو جواب دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قوم والے یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیماری کے بارے میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے، بلکہ ستاروں کے چلن پر غور کر کے کہہ رہے ہیں، اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بذات خود علم نجوم کے قائل نہ ہوں، لیکن جشن کی شرکت سے اپنی گلوخلاصی کے لئے آپ نے طریقہ وہ اختیار فرمایا جو ان کی نظر میں زیادہ قابل اعتماد ہو، اور چونکہ آپ نے زبان سے علم نجوم کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ یہ بتایا کہ ستاروں کو دیکھنے سے میرا مقصد علم نجوم سے مدد لینا ہے، بلکہ صرف نظر بھر کر ستاروں کو دیکھا، اس لئے اس میں جھوٹ کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوا۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے ان کافروں کی ہمت افزائی ہوئی ہوگی جو نہ صرف علم نجوم کے قائل تھے، بلکہ ستاروں کو دنیا کے واقعات میں مؤثر حقیقی مانتے تھے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ہمت افزائی تو تب ہوتی جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بعد میں انہیں صراحت کے ساتھ ان کی گمراہیوں پر متنبہ نہ فرماتے، یہاں تو یہ ساری تدبیر کی ہی اس لئے جارہی تھی کہ انہیں توحید کی دعوت زیادہ سے زیادہ مؤثر بنا کر دی جائے، چنانچہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی ایک ایک گمراہی کو کھول کھول کر بیان فرمادیا، اس لئے محض اس مبہم عمل سے کافروں کی ہمت افزائی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اصل مقصد جشن کی شرکت سے اپنی جان چھڑانا تھا، تاکہ دعوت حق کے لئے زیادہ مؤثر فضا پیدا کی جاسکے، اس مقصد کے لئے ایہام کا یہ طریقہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور اس پر کوئی معقول اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ستاروں کی طرف دیکھنے کی یہ تشریح اکثر مفسرین سے منقول ہے: اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کی دعوت کے جواب میں جوانی سقیم (میں بیمار ہوں) فرمایا تو کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت واقعی بیمار تھے؟ قرآن کریم میں

اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے، لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت ایسے بیمار نہیں تھے کہ قوم کے ساتھ نہ جاسکیں، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کیسے ارشاد فرمائی؟

اس کا جواب جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "توریہ" کیا تھا "توریہ" کا مطلب ہے "کوئی ایسی بات کہنا جو بظاہر واقعہ کے خلاف ہو، لیکن کہنے والے نے اس سے کوئی ایسے دور کے معنی مراد لئے ہوں جو واقعہ کے مطابق ہوں۔" یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو جملہ ارشاد فرمایا اس کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ "میں اس وقت بیمار ہوں" لیکن آپ علیہ السلام کی اصل مراد یہ نہیں تھی۔ اب اصل مراد کیا تھی؟ اس کے بارے میں مفسرین نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں، بعض نے فرمایا کہ اس سے آپ کا مقصود وہ طبعی انقباض تھا جو آپ کو اپنی قوم کی مشرکانہ حرکات دیکھ دیکھ کر پیدا ہو رہا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں "سقیم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "مریض" کے مقابلہ میں بہت ہلکا لفظ ہے، اور اس کا مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ "میری طبیعت ناساز ہے" ظاہر ہے کہ اس جملہ میں طبعی انقباض کے مفہوم کی بھی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ "انی سقیم" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ "میں بیمار ہونے والا ہوں" اس لئے کہ عربی زبان میں اسم فاعل کا صیغہ بکثرت زمانہ مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:۔

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ اس کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ "تم بھی مردہ ہو اور وہ بھی مردہ ہیں" لیکن ظاہر ہے یہاں مراد یہ معنیٰ ہیں کہ "تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں" اسی طرح انی سقیم کے معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مراد لئے تھے کہ "میں بیمار ہونے والا ہوں" اور یہ اس لئے فرمایا کہ موت سے پہلے پہلے ہر انسان کا بیمار ہونا یقینی امر ہے، اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے ذرا پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔

اور اگر کسی کا دل ان تاویلات پر مطمئن نہ ہو تو سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت اس وقت واقعۃً تھوڑی بہت ناساز تھی، لیکن بیماری ایسی نہ تھی جو جشن میں شرکت سے مانع ہوتی، آپ نے اپنی معمولی ناسازی طبع کا ذکر ایسے ماحول میں کیا جس سے سننے والے یہ سمجھے کہ آپ کو کوئی بڑی بیماری لاحق ہے، جس کی وجہ سے آپ واقعی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توریہ کی یہ تشریح سب سے زیادہ معقول اور اطمینان بخش ہے۔

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد "انی سقیم" کے لئے جو "کذبة" (جھوٹ) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے مراد "توریہ" ہے جس کی ظاہری شکل جھوٹ ہوتی ہے لیکن متکلم کی مراد کے لحاظ سے وہ جھوٹ نہیں ہوتا، خود اسی حدیث کی بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

ما منها كذبة الا ماحل بها عن دين الله

"ان میں سے کوئی جھوٹ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے دین کی مدافعت اور حمایت میں نہ بولا گیا ہو"۔ ان الفاظ نے خود یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں "کذب" اپنے عام معنی سے جدا مفہوم رکھتا ہے، اس حدیث سے متعلق قدرے تفصیلی بحث سورہ انبیاء میں آیت قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ کے تحت گذر چکی ہے۔

توریہ کا شرعی حکم

انہی آیات سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر توریہ کرنا جائز ہے، توریہ ایک تو قولی ہوتا ہے، یعنی ایسی بات کہنا جس کا ظاہری مفہوم خلاف واقعہ ہو، اور باطنی مراد مطابق واقعہ۔ اور ایک توریہ عملی ہوتا ہے، یعنی ایسا عمل کرنا جس کا مقصد دیکھنے والا کچھ سمجھے اور درحقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہو، اسے ایہام بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا (اکثر مفسرین کے قول کے مطابق) ایہام تھا، اور اپنے آپ کو بیمار کہنا توریہ ہے۔

ضرورت کے مواقع پر توریہ کی یہ دونوں قسمیں خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور

مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں لگے ہوئے تھے' تو راستے میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ ''یہ کون ہیں؟'' حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: **''ھو ھاد یھدینی''** (وہ میرے رہنما ہیں' مجھے راستہ دکھاتے ہیں) سننے والا یہ سمجھا کہ عام راستہ بتانے والے رہنما مراد ہیں' اس لئے چھوڑ کر چل دیا' حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دینی اور روحانی رہنما ہیں (روح المعانی)

اسی طرح حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کے لئے جس سمت میں جانا ہوتا مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت اس سمت میں روانہ ہونے کے بجائے کسی دوسری سمت میں چلنا شروع فرماتے تھے' تاکہ دیکھنے والوں کو صحیح منزل معلوم نہ ہو سکے (صحیح مسلم وغیرہ) یہ عملی توریہ اور ایہام تھا۔

مزاح اور خوش طبعی کے مواقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے توریہ ثابت ہے' شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے مزاحاً فرمایا ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی'' وہ عورت یہ سن کر بہت پریشان ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمائی کہ بوڑھیوں کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہ جائیں گی ہاں جوان ہو کر جائیں گی۔

آگ میں محفوظ رہنا

قرآن کریم میں ہے کہ: اور ہم نے اس زمانہ موسوی سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی شان کے مناسب خوش فہمی عطاء فرمائی تھی اور ہم ان کے کمالات علمیہ وعملیہ کو خوب جانتے تھے یعنی وہ بڑے کامل تھے ان کا وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے ان کو بت پرستی میں مشغول دیکھ کر فرمایا کہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے بیٹھے ہو یعنی یہ ہرگز قابل عبادت نہیں وہ لوگ جواب میں کہنے لگے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے' اور وہ لوگ عاقل تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورتیں لائق عبادت کے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے

کہا کہ بے شک تم اور تمہارے باپ دادے ان کو لائق عبادت سمجھنے میں صریح غلطی میں مبتلا ہو۔ یعنی خود ان ہی کے پاس ان کی معبودیت کی کوئی دلیل اور سند نہیں ہے وہ تو اس لئے ضلال میں ہیں اور تم ایسوں کی تقلید کرتے ہو جو بے دلیل بے ثبوت اوہام کے پیچھے چلنے والے ہیں اس لئے تم ضلال میں ہو چونکہ ان لوگوں نے ایسی بات سنی نہ تھی نہایت متعجب ہو کر وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا تم اپنے نزدیک سچی بات سمجھ کر ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو یا یوں ہی دل لگی کر رہے ہو؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں دل لگی نہیں بلکہ سچی بات ہے اور صرف میرے ہی نزدیک نہیں بلکہ واقع میں بھی سچی بات یہی ہے کہ یہ عبادت کے قابل نہیں بلکہ تمہارا رب حقیقی جو لائق عبادت ہے وہ ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے جس نے علاوہ تربیت کے ان سب آسمانوں اور زمین اور ان میں جو مخلوق ہے جس میں یہ اصنام بھی داخل ہیں سب کو پیدا کیا اور میں اس دعویٰ پر دلیل بھی رکھتا ہوں تمہاری طرح کورانہ تقلید سے کام نہیں کرتا اور خدا کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم ان کے پاس سے چلے جاؤ گے تاکہ ان کا عاجز اور درماندہ ہونا زیادہ مشاہدے میں آجاوے ان لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ اکیلے ہمارے مخالف کارروائی کیا کر سکتے ہیں کچھ التفات نہ کیا ہو گا اور چلے گئے تو ان کے چلے جانے کے بعد انہوں نے ان بتوں کو تبر وغیرہ سے توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بجز ان کے ایک بڑے بت کے جو جثے میں یا ان لوگوں کی نظر میں معظم ہونے میں بڑا تھا کہ اس کو چھوڑ دیا جس سے ایک قسم کا استہزاء مقصود تھا کہ ایک کے عالم اور دوسروں کے قطع و برید سے ایہام ہوتا ہے کہ کہیں اسی نے تو سب کو نہیں توڑا' پس ابتداء تو ایہام ہے پھر جب وہ لوگ قطع و برید کرنے والے کی تحقیق کریں گے اور اس بڑے بت پر احتمال بھی نہ کریں گے تو ان کی طرف سے اس کے عجز کا بھی اعتراف ہو جاوے گا اور حجت اور لازم تر ہو جاوے گی۔ پس انتہاءً یہ الزام و افحام ہے یعنی لاجواب کرنا ہے اور مقصود مشترک اثبات عجز ہے' بعض کا انکار سے اور ایک کا ان کے اقرار سے' غرض ایک کو اس مصلحت سے چھوڑ کر سب کو توڑ دیا کہ شاید وہ لوگ ابراہیم کی طرف دریافت کرنے کے طور پر رجوع کریں اور پھر وہ تقریر جواب سے مگر پوری طرح احقاق حق کر سکیں۔ غرض وہ لوگ جو

بت خانہ میں آئے تو بتوں کی بری گت بنی دیکھی آپس میں کہنے لگے کہ یہ بے ادبی کا کام ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی نے بڑا ہی غضب کیا یہ بات ایسے لوگوں نے پوچھی جن کو اس قول کی اطلاع نہ تھی تا اللہ لا کیدن الخ یا تو اس وجہ سے کہ وہ اس وقت موجود نہ ہوں گے کیونکہ اس مناظرہ کے وقت تمام قوم کا مجتمع ہونا ضروری نہیں اور یا موجود ہوں مگر سنا نہ ہو اور بعضوں نے سن لیا ہو' کذا فی الدر المنثور عن ابن مسعود نحوأمنہ بعضوں نے کہا جن کو اس قول کا علم تھا کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کر کے پکارا جاتا ہے ان بتوں کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرتے سنا ہے پھر وہ سب لوگ یا جنہوں نے اول استفسار کیا تھا بولے کہ جب یہ بات ہے تو اچھا اس کو سب آدمیوں کے سامنے حاضر کرو تا کہ شاید وہ اقرار کر لے اور وہ لوگ اس کے اقرار کے گواہ ہو جائیں پھر اتمام حجت کے بعد سزا دی جائے جس پر کوئی ملامت نہ کر سکے' غرض سب کے روبرو وہ آئے اور ان سے ان لوگوں نے کہا کہ کیا ہمارے بتوں کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم' انہوں نے جواب میں فرمایا کہ تم یہ احتمال کیوں نہیں فرض کرتے کہ یہ حرکت میں نے نہیں کی' بلکہ ان کے اس بڑے (گرو) نے کی اور جب اس کبیر میں فاعل ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے تو ان صغائر میں ناطق ہونے کا احتمال بھی ہوگا) سو ان ہی سے پوچھ لو نا' اگر یہ بولتے ہوں اور اگر بڑے بت کا فاعل اس عمل کا ہونا اور دوسرے بتوں میں بولنے کی طاقت ہونا باطل ہے تو عجز ان کا تمہارے نزدیک مسلم ہو گیا پھر اعتقاد الوہیت کی کیا وجہ ہے اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچے پھر آپس میں کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو اور ابراہیم حق پر ہے کہ جو ایسا عاجز ہو وہ کیا معبود ہوگا پھر شرمندگی کے مارے اپنے سروں کو جھکا لیا ابراہیم علیہ السلام سے نہایت مغلوبانہ لہجہ میں بولے کہ اے ابراہیم تم کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ بت کچھ بولتے نہیں ہم ان سے کیا پوچھیں اور اس سے فاعلیت کبیر کی نفی بدرجہ اولیٰ ہو گئی اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے خوب خبر لی اور فرمایا کہ افسوس جب یہ ایسے ہیں تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ بالمباشرۃ کچھ نقصان پہنچا سکے تف ہے تم پر کہ باوجود وضوحِ حق کے باطل پر مصر ہو اور ان پر بھی جن کو تم خدا کے سوا

پوجتے ہو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اس تمام تقریر کے خصوص اس سے کہ توڑنے پھوڑنے سے انکار نہیں فرمایا باوجودیکہ احتمال انتقام مقتضی انکار کو تھا ان کو ثابت ہو گیا کہ یہ کام ان ہی کا ہے اور تقریر کا کچھ جواب بن نہ آیا تو بمقتضائے اس قول کہ

چو حجت نماند جفا جوئے را   بہ پرخاش درہم کشد روئے را

یعنی جب جاہل جواب نہ رکھتا ہو اور قدرت رکھتا ہو تو برسر پیکار آ جاتا ہے' آپس میں وہ لوگ کہنے لگے کہ ان ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کا ان سے بدلا لو اگر تم کو کچھ کرنا ہے تو یہ کام کرو ورنہ بالکل ہی بات ڈوب جاوے گی۔ غرض سب نے متفق ہو کر اس کا سامان کیا اور ان کو آتش سوزاں میں ڈال دیا اس وقت ہم نے آگ کو حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا' ابراہیم کے حق میں یعنی نہ ایسی گرم رہ جس سے جلنے کی نوبت آوے اور نہ بہت ٹھنڈی برف ہو جا کہ اس کی ٹھنڈک سے تکلیف پہنچے بلکہ مثل ہوائے معتدل کے بن جا چنانچہ ایسا ہی ہو گیا اور ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا کہ ہلاک ہو جائیں گے سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا کہ ان کا مقصود حاصل نہ ہوا بلکہ اور بالعکس حقانیت ابراہیم علیہ السلام کا زیادہ ثبوت ہو گیا اور ہم نے ابراہیم کو اور ان کے برادرزادہ (کذا فی الدر المنثور) ابن عباس رضی اللہ عنہ لوط علیہ السلام کو کہ انہوں نے برخلاف قوم کے ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی تھی قال تعالیٰ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ اور اس وجہ سے لوگ ان کے بھی مخالف اور درپے تھے ایسے ملک یعنی شام کی طرف بھیج کر کافروں کے شر و ایذاء سے بچا لیا جس میں ہم نے دنیا جہان والوں کے واسطے خیر و برکت رکھی ہے دنیوی بھی کہ ہر قسم کے عمدہ پھل پھول بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس سے منتفع ہو سکتے ہیں اور دینی بھی کہ بکثرت انبیاء علیہم السلام وہاں ہوئے جن کے شرائع کی برکت دور دور عالم میں پھیلی یعنی انہوں نے ملک شام کی طرف باذن الٰہی ہجرت فرمائی اور ہجرت کے بعد ہم نے ان کو اسحٰق بیٹا اور یعقوب پوتا عطا کیا اور ہم نے ان سب باپ بیٹے پوتے کو اعلیٰ درجہ کا نیک کیا اعلیٰ درجہ کی نیکی کا مصداق عصمت ہے جو بشریت میں خواص نبوت سے ہے پس مراد یہ ہے کہ ان سب کو نبی بنایا اور ہم نے ان سب کو مقتدا بنایا جو کہ لوازم نبوت سے ہے کہ ہمارے حکم سے خلق کو ہدایت کیا کرتے تھے جو کہ مناصب نبوت سے ہے اور ہم نے

ان کے پاس نیک کاموں کے کرنے کا اور خصوصاً نماز کی پابندی کا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا یعنی یہ حکم بھیجا کہ ان کاموں کو کیا کرو اور وہ حضرات ہماری خوب عبادت کیا کرتے تھے یعنی ان کو جو حکم ہوا تھا اس کو اچھی طرح بجالاتے تھے پس صالحین میں کمال نبوت کی طرف اور وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ میں کمال علم کی طرف اور کانوا لنا عابدین میں کمال عمل کی طرف اور ائمۃ یھدون میں دوسروں کی ہدایت و تربیت کی طرف اشارہ کافیہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول جھوٹ نہیں بلکہ ایک کنایہ تھا اس کی تفصیل و تحقیق

جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کی برادری نے گرفتار کر کے بلایا اور ان سے اقرار لینے کے لئے سوال کیا کہ کیا آپ نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہے تم خود ان سے دریافت کر لو اگر یہ بول سکتے ہوں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کیا تھا پھر اس سے انکار اور ان کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے۔ اس کے جواب کے لئے حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کو خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہوگا اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ یعنی اگر اللہ رحمٰن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا۔ لیکن بے غبار اور بے تاویل وہ توجیہ ہے جس کو بحر محیط، قرطبی، روح المعانی وغیرہ میں اختیار کیا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے جو کام ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اس کو بڑے بت کی طرف بطور اسناد مجازی کے منسوب کر دیا کیونکہ اس کام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آمادہ کرنے والا یہی بت تھا اور اس کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہو کہ ان کی برادری اس بت کی تعظیم سب سے زیادہ کرتی تھی اس کی مثال ایسی ہوگی

جیسے کوئی چور کی سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ دے اور پھر کہے کہ یہ میں نے نہیں کاٹا بلکہ تیرے عمل اور تیری کج روی نے ہاتھ کاٹا ہے کیونکہ ہاتھ کٹنے کا سبب اس کا عمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر بھی بتوں کے توڑنے کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا تھا جیسا کہ روایت میں ہے کہ جس تبر یا کلہاڑے سے ان کے بت توڑے تھے یہ کلہاڑا بڑے بت کے مونڈھے پر یا اس کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ خیال پیدا ہو کہ اس نے ہی یہ کام کیا ہے اور قولاً بھی اس کی طرف منسوب فرمایا تو یہ ایک اسناد مجازی ہے جیسے عربی کا مشہور مقولہ انبت الربیع البقلة اس کی معروف مثال ہے (یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اگائی ہے) کہ اگرچہ اگانے والا درحقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اس کے ایک ظاہری سبب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اس کو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کر دینا جھوٹ ہرگز نہیں' البتہ بہت سی مصالح دینیہ کے لئے یہ توریہ اختیار فرمایا ان میں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ دیکھنے والوں کو اس طرف توجہ ہو جائے کہ شاید اس بڑے بت کو اس پر غصہ آ گیا ہو کہ میرے ساتھ عبادت میں ان چھوٹے بتوں کو کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال ان کے دلوں میں پیدا ہو تو توحید حق کا راستہ کھل جاتا ہے کہ جب ایک بڑا بت اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تو رب العالمین ان پتھروں کی شرکت اپنے ساتھ کیسے گوارا کرے۔

دوسرے یہ کہ ان کو یہ خیال اس وقت پیدا ہونا قریب عقل ہے کہ جن کو ہم خدا اور مختار کُل کہتے ہیں اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو کوئی ان کے توڑنے پر کیسے قادر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اس فعل کو وہ بڑے بت کی طرف منسوب کر دیں تو جو بت یہ کام کر سکے کہ دوسرے بتوں کو توڑ دے اس میں گویائی کی طاقت بھی ہونی چاہئے اس لئے فرمایا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ' خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول مذکور کو بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب فرمایا اور یہ اسناد مجازی کے طور پر فرمایا تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ کا شبہ نہیں رہتا صرف ایک قسم کا توریہ ہے۔

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ منسوب کرنے کی حقیقت

ایک سوال اب یہ رہ جاتا ہے کہ صحیح احادیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان ابراهيم عليه السلام لم يكذب غير ثلاث (رواہ البخاری ومسلم)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بجز تین جگہوں کے پھر ان تینوں کی تفصیل اسی حدیث میں اس طرح بیان فرمائی کہ ان میں سے دو جھوٹ تو خالص اللہ کے لئے بولے گئے ایک یہی جو اس آیت میں بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ فرمایا ہے دوسرا عید کے روز برادری سے یہ عذر کرنا کہ انی سقیم میں بیمار ہوں اور تیسرا اپنی زوجہ کی حفاظت کے لئے بولا گیا وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک ایسی بستی پر گذر ہوا جہاں کا رئیس ظالم بدکار تھا جب کسی شخص کے ساتھ اس کی بیوی کو دیکھتا تو بیوی کو پکڑ لیتا اور اس سے بدکاری کرتا۔ مگر یہ معاملہ اس صورت میں نہ کرتا تھا جبکہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ یا بہن اپنے بھائی کے ساتھ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بستی میں مع اہلیہ کے پہنچنے کی مخبری اس ظالم بدکار کے سامنے کر دی گئی تو اس نے حضرت سارہ کو گرفتار کر کے بلوالیا۔ پکڑنے والوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ عورت رشتہ میں تم سے کیا تعلق رکھتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے ظالم کے خوف سے بچنے کے لئے یہ فرما دیا کہ یہ میری بہن ہے (یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں تیسرے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) مگر اس کے باوجود وہ پکڑ کر لے گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کو بھی بتلا دیا کہ میں نے تم کو اپنی بہن کہا ہے تم بھی اس کے خلاف نہ کہنا اور وجہ یہ ہے کہ اسلامی رشتہ سے تم میری بہن ہو کیونکہ اس وقت اس زمین میں ہم دو ہی مسلمان ہیں اور اسلامی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مقابلے پر قدرت نہ تھی۔ اللہ کے سامنے الحاح وزاری کے لئے نماز پڑھنا شروع کر دیا حضرت سارہ اس کے پاس پہنچیں یہ ظالم بری نیت سے ان کی طرف بڑھا تو قدرت نے اس کو اپاہج ومعذور کر دیا اس پر اس نے

حضرت سارہ سے درخواست کی کہ تم دعا کرو کہ میری یہ معذوری دور ہو جاوے میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو صحیح سالم کر دیا مگر اس نے عہد شکنی کی اور پھر بری نیت سے ان پر ہاتھ ڈالنا چاہا پھر اللہ نے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا اسی طرح تین مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حضرت سارہ کو واپس کر دیا (یہ خلاصہ مضمون حدیث کا ہے)

بہر حال اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ کی نسبت صراحۃً کی گئی ہے جو شان نبوت و عصمت کے خلاف ہے مگر اس کا جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ دراصل ان میں سے ایک بھی حقیقی معنی جھوٹ نہ تھا یہ توریہ تھا جو ظلم سے بچنے کے لئے جائز وحلال ہوتا ہے وہ جھوٹ کے حکم میں نہیں ہوتا اس کی دلیل خود حدیث مذکور میں یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں اپنی بہن بتلایا ہے تم سے پوچھا جائے تو تم بھی مجھے بھائی بتلانا اور بہن کہنے کی وجہ بھی ان کو بتلا دی کہ ہم دونوں اسلامی برادری کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں اسی کا نام توریہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہو سکیں، سننے والا اس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو اور ظلم سے بچنے کے لئے یہ تدبیر توریہ کی باتفاق فقہاء جائز ہے یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تقیہ میں صریح جھوٹ بولا جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے توریہ میں صریح جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ جس معنے سے متکلم بول رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہوتے ہیں جیسے اسلامی برادری کے لحاظ سے بھائی بہن ہونا۔ یہ وجہ تو خود حدیث مذکور کے الفاظ میں صراحۃً مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا بلکہ ایک توریہ تھا۔ ٹھیک اسی طرح کی توجیہ پہلے دونوں کلاموں میں ہو سکتی ہے 'بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ' کی توجیہ ابھی اوپر لکھی گئی ہے کہ اس میں بطور اسناد مجازی اس فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح انی سقیم کا لفظ ہے کیونکہ سقیم کا لفظ جس طرح ظاہری طور پر بیمار کے معنے میں آتا ہے اسی طرح رنجیدہ و غمگین اور مضمحل ہونے کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے اسی دوسرے معنے کے لحاظ سے انی سقیم فرمایا تھا مخاطبوں نے اس کو بیماری کے معنے میں سمجھا اور اسی حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ان تین کذبات میں

دو اللہ کی ذات کے لئے تھے یہ خود قرینہ تو یہ اس کا ہے کہ یہ کوئی گناہ کا کام نہ تھا ورنہ گناہ کا کام اللہ کے لئے کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوسکتا اور گناہ کا کام نہ ہونا جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً کذب نہ ہو بلکہ ایسا کلام ہو جس کے دو معنی ہوسکتے ہوں ایک کذب اور دوسرا صحیح ہو۔

حدیث کذبات ابراہیم علیہ السلام کو غلط قرار دینا جہالت ہے

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اس لئے غلط اور باطل کہہ دیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی اور صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو وہ غلط قرار دی جائے یہ بات اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری امت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلم ہے مگر علماء امت نے تمام ذخیرہ احادیث میں اپنی عمریں صرف کر کے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہو گیا ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہوسکتی کہ جس کو قرآن کے خلاف کہا جاسکے بلکہ وہ اپنی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رد اور باطل کرنا چاہا اس کو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہو گئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے توریہ مراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو کذبات کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا تو اس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور لغزش کو عصیٰ اور غوی کے الفاظ سے تعبیر کرنے کی ابھی سورہ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گذر چکی ہے کہ مقربان بارگاہ حق تعالیٰ کے لئے ادنیٰ کمزوری اور محض رخصت اور جائز پر عمل کر لینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے حدیث شفاعت جو مشہور و معروف ہے کہ محشر میں ساری مخلوق جمع ہو کر حساب جلد ہونے کے متعلق انبیاء سے شفاعت کے طالب ہوں گے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء سے پہلے

تک تمام انبیاء کے پاس پہنچیں گے ہر پیغمبر اپنے کسی قصور اور کوتاہی کا ذکر کرکے شفاعت کی ہمت نہ کرے گا' آخر میں سب خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ اس شفاعت کبریٰ کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ان کلمات کو جو بطور توریہ کے کہے گئے تھے حقیقۃً کذب نہ تھے مگر پیغمبرانہ عزیمت کے خلاف تھے اپنا قصور اور کوتاہی قرار دے کر عذر کر دیں گے۔ اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حدیث میں ان کو بلفظ کذبات تعبیر کر دیا گیا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تھا اور آپ کی حدیث روایت کرنے اور بیان کرنے کی حد تک ہمیں بھی حق ہے مگر اپنی طرف سے کوئی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یوں کہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا یہ جائز نہیں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں قرطبی اور بحر محیط کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن یا حدیث میں جو اس طرح کے الفاظ کسی پیغمبر کے بارے میں آئے ہیں ان کا ذکر بطور تلاوت قرآن یا تعلیم قرآن یا روایت حدیث کے تو کیا جا سکتا ہے خود اپنی طرف سے ان الفاظ کا کسی پیغمبر کی طرف منسوب کرنا بے ادبی ہے جو کسی کے لئے جائز نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نارِ نمرود کا گلزار بننا

جو لوگ معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں انہوں نے تو اس میں عجیب و غریب تحریفات کی ہیں۔ بات یہ ہے کہ فلسفہ کا یہ ضابطہ کہ جو چیز کسی چیز کے لئے لازم ذات ہو وہ اس سے کسی وقت جدا نہیں ہو سکتی خود ایک باطل اور بے دلیل ضابطہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں اور تمام مخلوقات میں کوئی چیز کسی کے لازم ذات نہیں بلکہ صرف عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ آگ کے لئے حرارت اور جلانا لازم ہے' پانی کے لئے ٹھنڈا کرنا اور بجھانا لازم ہے۔ مگر یہ لازم صرف عادی ہے عقلی نہیں کیونکہ فلاسفہ بھی اس کے عقلی ہونے کی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کر سکے اور جب یہ لازم عادی ہوا تو جب اللہ تعالیٰ کسی خاص حکمت سے کسی عادت کو بدلنا چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں اس کے بدلنے میں کوئی عقلی محال لازم نہیں آتا جب اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کا کام کرنے لگتی ہے اور پانی جلانے کا حالانکہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی ہوتی ہے اور پانی بھی پانی ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص

فردیا جماعت کے حق میں بحکم خداوندی وہ اپنی خاصیت چھوڑ دیتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے ثبوت میں جو معجزات حق تعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں ان سب کا حاصل یہی ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حکم دے دیا کہ ٹھنڈی ہو جا وہ ٹھنڈی ہو گئی اور اگر برداً کے ساتھ وسلاماً کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف کی طرح ٹھنڈی ہو کر سبب ایذا بن جاتی۔ اور قوم نوحؑ جو پانی میں ڈوبی تھی ان کے بارے میں قرآن نے فرمایا اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا' یعنی یہ لوگ پانی میں غرق ہو کر آگ میں داخل ہو گئے۔ حرقوہ' یعنی پوری برادری اور نمرود نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ اس کام کے لئے لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے پھر اس میں آگ لگا کر سات دن تک اس کو دھونکتے اور بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ اس کے شعلے فضائی آسمان میں اتنے اونچے ہو گئے کہ اگر کوئی پرندہ اس پر گذرے تو جل جائے۔ اس وقت ارادہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا جائے تو فکر ہوئی کہ ڈالیں کیسے اس کے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا شیطان نے ان کو منجنیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتلائی۔ جس وقت اللہ کے خلیل منجنیق کے ذریعہ اس آگ کے سمندر میں پھینکے جا رہے تھے تو سب فرشتے بلکہ زمین و آسمان اور ان کی مخلوقات سب چیخ اٹھے کہ یارب آپ کے خلیل پر کیا گذر رہی ہے حق تعالیٰ نے ان سب کو ابراہیمؑ کی مدد کرنے کی اجازت دے دی۔ فرشتوں نے مدد کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے وہ میرا حال دیکھ رہا ہے۔ جبرئیل امین نے عرض کیا کہ آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت انجام دوں' جواب دیا کہ حاجت تو ہے مگر آپ کی طرف نہیں بلکہ اپنے رب کی طرف۔ (مظہری)

بیٹے کی قربانی

سورۃ الصافات میں ہے کہ: اور ابراہیم علیہ السلام جب ان لوگوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو کہنے لگے کہ میں تو تم سے ہجرت کر کے اپنے رب کی راہ میں کسی طرف چلا جاتا ہوں' وہ مجھ کو اچھی جگہ پہنچا ہی دے گا' چنانچہ ملک شام میں جا پہنچے اور یہ دعا کی کہ اے

میرے رب مجھ کو ایک نیک فرزند دے' سو ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی اور وہ فرزند پیدا ہوا اور ہوشیار ہوا سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے لگا' تو ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ میں اس فرزند کو خدا کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں' اور یہ ثابت نہیں کہ حلقوم کٹا ہوا بھی دیکھا یا نہیں' غرض آنکھ کھلی تو اسے اللہ کا حکم سمجھے' کیونکہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ پھر یہ سوچ کر کہ خدا جانے میرے فرزند کی اس بارے میں کیا رائے ہو' اس کو اطلاع کرنا ضروری سمجھا' اس لئے اس سے فرمایا کہ برخوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامر الٰہی) ذبح کر رہا ہوں' سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابا جان اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے' جب آپ کو خدا کی طرف سے حکم کیا گیا ہے تو آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ بلا تامل کیجئے' ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے' غرض جب دونوں نے خدا کے حکم کو تسلیم کر لیا' اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کروٹ پر لٹایا اور چاہتے تھے کہ گلا کاٹ ڈالیں اور اس وقت ہم نے ان کو آواز دی کہ ابراہیم شاباش ہے' تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا' یعنی خواب میں جو حکم ہوا تھا اپنی طرف سے اس پر پورا عمل کیا اب ہم اس حکم کو منسوخ کرتے ہیں بس ان کو چھوڑ دو' غرض ان کو چھوڑ دیا' جان کی جان بچ گئی' اور بلند درجات مزید برآں عطا ہوئے' ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں کہ دونوں جہاں کی راحت انہیں عطا کرتے ہیں' حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان جس کو بجز مخلص کامل کے دوسرا برداشت نہیں کر سکتا تھا تو ہم نے ایسے امتحان میں پورا اترنے پر صلہ بھی بڑا بھاری دیا' اور اس میں جیسا امتحان ابراہیم علیہ السلام کا تھا' اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کا بھی تھا' تو وہ صلہ میں شریک ہوں گے' اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا' کہ ابراہیم علیہ السلام سے وہ ذبح کرایا گیا اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو چنانچہ ان کے نام کے ساتھ اب تک ''علیہ السلام'' کہا جا رہا ہے ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں' کہ انہیں لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنا دیتے ہیں' بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے اور ہم نے ایک انعام ان پر یہ کیا کہ ان کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بختوں میں ہوں گے اور ہم نے

ابراہیم علیہ السلام پر اور اسحٰق علیہ السلام پر برکتیں نازل کیں ان برکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی نسل بہت پھیلی اور اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے' اور پھر آگے ان دونوں کی نسل میں بعضے اچھے بھی ہیں اور بعضے ایسے بھی جو بدیاں کر کے صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کا ایک دوسرا اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے' جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی پیش کی' واقعہ کے بنیادی اجزاء خلاصہ تفسیر سے واضح ہو جاتے ہیں' بعض تاریخی تفصیلات آیتوں کی تفسیر کے ذیل میں آ جائیں گی:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (اور ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ میں تو اپنے رب کی طرف چلا جاتا ہوں) یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ اپنے اہل وطن سے بالکل مایوس ہو گئے' اور وہاں آپ کے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔ "رب کی طرف چلے جانے" سے مراد یہ ہے کہ میں دارالکفر کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں کا مجھے اپنے رب کی طرف سے حکم ہوا ہے' اور جہاں میں اپنے پروردگار کی عبادت کر سکوں گا' چنانچہ آپ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اور اپنے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کو لے کر سفر پر روانہ ہوئے' اور عراق کے مختلف حصوں سے ہوتے ہوئے بالآخر شام تشریف لے آئے۔ اس تمام عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی' اس لئے آپ نے وہ دعاء فرمائی جس کا اگلی آیت میں ذکر ہے' یعنی:

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (اے میرے پروردگار! مجھے ایک نیک فرزند عطا فرما) چنانچہ آپ کی یہ دعاء قبول ہوئی' اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک فرزند کی پیدائش کی خوشخبری سنائی:۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ (پس ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی) "حلیم المزاج" فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ یہ نومولود اپنی زندگی میں ایسے صبر وضبط اور بردباری کا مظاہرہ کرے گا کہ دنیا اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ اس فرزند کی ولادت کا واقعہ یہ ہوا کہ جب حضرت سارہؓ نے یہ دیکھا کہ مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تو وہ سمجھیں کہ میں بانجھ ہو چکی ہوں ادھر فرعونِ مصر نے حضرت سارہؓ کو اپنی بیٹی جن کا نام ہاجرہؓ تھا' خدمت

گزاری کے لئے دے دی تھی، حضرت سارہؓ نے یہی ہاجرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کردیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کرلیا، انہی ہاجرہؓ کے بطن سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے اور ان کا نام اسمٰعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔

بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ (سو جب وہ فرزند ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے فرمایا: برخوردار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کررہا ہوں) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین روز متواتر دکھایا گیا (قرطبی) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اس لئے اس خواب کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کردو۔ یوں یہ حکم براہ راست کسی فرشتے وغیرہ کے ذریعہ بھی نازل کیا جاسکتا تھا، لیکن خواب میں دکھانے کی حکمت بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب کے ذریعہ دیئے ہوئے حکم میں انسانی نفس کیلئے تاویلات کی بڑی گنجائش تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاویلات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کردیا (تفسیر کبیر)

اس کے علاوہ یہاں باری تعالیٰ کا اصل مقصد نہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرانا تھا، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دینا کہ انہیں ذبح کرہی ڈالو، بلکہ منشاء یہ حکم دینا تھا کہ اپنی طرف سے انہیں ذبح کرنے کے سارے سامان کرکے ان کے ذبح کا اقدام کرگزرو۔ اب یہ حکم اگر زبانی دیا جاتا تو اس میں آزمائش نہ ہوتی، اس لئے انہیں خواب میں دکھلایا کہ وہ بیٹے کو ذبح کررہے ہیں، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ ذبح کا حکم ہوا ہے، اور وہ پوری طرح ذبح کرنے پر آمادہ ہوگئے، اس طرح آزمائش بھی پوری ہوگئی اور خواب بھی سچا ہوگیا، یہ بات زبانی حکم کے ذریعہ آتی تو یہ آزمائش نہ ہوتی، یا حکم کو بعد میں منسوخ کرنا پڑتا، یہ امتحان کس قدر سخت تھا؟ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ نے فلما بلغ معه السعی کے الفاظ بڑھائے ہیں، یعنی ارمانوں سے مانگے ہوئے اس بیٹے کو قربان

کرنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا' اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوت بازو بن کر باپ کا سہارا ثابت ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی' اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ بالغ ہو چکے تھے (تفسیر مظہری)

بیٹے سے مشورہ

فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے اس لئے نہیں پوچھی کہ آپ کو حکم الٰہی کی تعمیل میں کوئی تردد تھا' بلکہ ایک تو وہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ وہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اترتا ہے؟ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا طرز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ احکام الٰہی کی اطاعت کے لئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں' لیکن اطاعت کے لئے ہمیشہ راستہ وہ اختیار کرتے ہیں جو حکمت اور حتی المقدور سہولت پر مبنی ہو۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے کچھ کہے بغیر بیٹے کو ذبح کرنے لگتے' تو یہ دونوں کے لئے مشکل کا سبب ہوتا' اب یہ بات آپ نے مشورہ کے انداز میں بیٹے سے اس لئے ذکر کی کہ بیٹے سے اللہ کا یہ حکم معلوم ہو جائے گا تو وہ ذبح ہونے کی اذیت سہنے کے لئے پہلے سے تیار ہو سکے گا' نیز اگر بیٹے کے دل میں کچھ تذبذب ہوا بھی تو اسے سمجھایا جا سکے گا۔ (روح المعانی و بیان القرآن)

بیٹے کا جواب

وہ بیٹا بھی اللہ کے خلیل علیہ السلام کا بیٹا تھا اور اسے خود منصب رسالت پر فائز ہونا تھا' اس نے جواب میں کہا: یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (ابا جان جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریئے) اس سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بے مثال جذبہ جاں سپاری کی تو شہادت ملتی ہی ہے اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کم سنی ہی میں اللہ نے انہیں کیسی ذہانت اور کیسا علم عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا تھا' بلکہ محض ایک خواب کا تذکرہ فرمایا تھا' لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سمجھ گئے' کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اور یہ خواب بھی درحقیقت حکم الٰہی کی ہی ایک

شکل ہے‘ چنانچہ انہوں نے جواب میں خواب کے بجائے حکم الٰہی کا تذکرہ فرمایا۔

یہیں سے ان منکرین حدیث کی واضح تردید ہو جاتی ہے جو وحی غیر متلو کے وجود کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ وحی صرف وہ ہے جو آسمانی کتاب میں نازل ہو گئی‘ اس کے علاوہ وحی کی کوئی دوسری قسم موجود نہیں ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم خواب کے ذریعہ دیا گیا‘ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے صریح الفاظ میں اسے اللہ کا حکم قرار دیا‘ اگر وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں ہے تو یہ حکم کون سی آسمانی کتاب میں اترا تھا؟

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا صبر

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنی طرف سے اپنے والد بزرگوار کو یہ یقین بھی دلایا کہ:۔

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے) اس جملے میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی غایت ادب اور غایت تواضع کو دیکھئے۔ ایک تو ان شاء اللہ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا اور اس وعدے میں دعوے کی جو ظاہری صورت پیدا ہو سکتی تھی اسے ختم فرما دیا۔ دوسرے آپ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ ”آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے“ لیکن اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ ”آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے“ جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ صبر و ضبط تنہا میرا کمال نہیں ہے بلکہ دنیا میں اور بھی بہت سے صبر کرنے والے ہوئے ہیں‘ ان شاء اللہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس طرح آپ نے اس جملے میں فخر و تکبر‘ خود پسندی اور پندار کے ہر ادنیٰ شائبے کو ختم کر کے اس میں انتہا درجے کی تواضع اور انکسار کا اظہار فرما دیا (روح المعانی) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو کسی معاملے میں اپنے اوپر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو‘ لیکن اسے ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہئیں جن سے غرور و تکبر ٹپکتا ہو‘ اگر کہیں ایسی کوئی بات کہنے کی ضرورت ہو تو الفاظ میں اس کی رعایت ہونی چاہئے‘ کہ ان میں اپنے بجائے اللہ پر بھروسہ کا اظہار ہو‘ اور جس حد تک ممکن ہو تواضع کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔

باپ اور بیٹے کی فداکاری

فلما اسلما (پس جب وہ دونوں جھک گئے) اسلم کے معنی ہیں جھک جانا‘ مطیع

ہو جانا' رام ہو جانا' مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے' یعنی باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا اور بیٹے نے ذبح ہو جانے کا ارادہ کر لیا' یہاں لما (جب) کا الفاظ استعمال کیا گیا ہے' لیکن اس کا جواب مذکور نہیں ہے' یعنی آگے یہ نہیں بتایا گیا کہ جب یہ واقعات پیش آ چکے تو کیا ہوا؟ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باپ بیٹے کا یہ اقدامِ فداکاری اس قدر عجیب و غریب تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو بیان کر ہی نہیں سکتے۔

بعض تاریخی اور تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی' ہر بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ آج تک منیٰ کے تین جمرات پر اسی محبوب عمل کی یاد کنکریاں مار کر منائی جاتی ہے' بالآخر جب دونوں باپ بیٹے یہ انوکھی عبادت انجام دینے کے لئے قربان گاہ پر پہنچے تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان مجھے خوب اچھی طرح باندھ دیجئے' تاکہ میں زیادہ تڑپ نہ سکوں' اور اپنے کپڑوں کو بھی مجھ سے بچایئے' ایسا نہ ہو کہ ان پر میرے خون کی چھینٹیں پڑیں تو میرا ثواب گھٹ جائے اس کے علاوہ میری والدہ خون دیکھیں گی تو انہیں غم زیادہ ہوگا' اور اپنی چھری بھی تیز کر لیجئے اور اسے میرے حلق پر ذرا جلدی جلدی پھیریئے گا تاکہ آسانی سے میرا دم نکل سکے' کیونکہ موت بڑی سخت چیز ہے' اور جب آپ میری والدہ کے پاس جائیں تو ان سے میرا اسلام کہہ دیجئے گا' اور اگر آپ میرا قمیض والدہ کے پاس لے جانا چاہیں تو لے جائیں شاید اس سے انہیں کچھ تسلی ہو' اکلوتے بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایک باپ کے دل پر کیا گذر سکتی ہے؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام استقامت کے پہاڑ بن کر جواب یہ دیتے ہیں کہ: "بیٹے! تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے میرے کتنے اچھے مدد گار ہو۔" یہ کہہ کر انہوں نے بیٹے کو بوسہ دیا' پُر نم آنکھوں سے انہیں باندھا۔ (مظہری)

بیٹے کو لٹا کر گردن پر چھری چلانا

وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (انہیں پیشانی کے بل خاک پر لٹا دیا) حضرت ابن عباسؓ سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ انہیں اس طرح کروٹ پر لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین سے چھونے لگا (مظہری) لغت کے اعتبار سے یہ تفسیر راجح ہے۔ اس لئے کہ جبین عربی زبان

میں پیشانی کی دونوں کروٹوں کو کہتے ہیں' اور پیشانی کا درمیانی حصہ جبهة کہلاتا ہے۔ اسی لئے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کروٹ پر لٹانے سے کیا ہے لیکن بعض دوسرے حضرات مفسرین نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اوندھے منہ زمین پر لٹا دیا۔ بہر صورت تاریخی روایات میں اس طرح لٹانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں سیدھا لٹایا تھا' لیکن جب چھری چلانے لگا تو بار بار چلانے کے باوجود گلا کٹتا نہیں تھا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیتل کا ایک ٹکڑا بیچ میں حائل کر دیا تھا' اس موقع پر بیٹے نے خود یہ فرمائش کی کہ ابا جان: مجھے چہرے کے بل کروٹ سے لٹا دیجئے' اس لئے کہ جب آپ کو میرا چہرہ نظر آتا ہے تو شفقت پدری جوش مارنے لگتی ہے' اور گلا پوری طرح کٹ نہیں پاتا' اس کے علاوہ چھری مجھے نظر آتی ہے تو مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے' چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اسی طرح لٹا کر چھری چلانی شروع کی (تفسیر مظہری وغیرہ) واللہ اعلم

امتحان میں کامیابی

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا (اور ہم نے انہیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا) یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جو کام تمہارے کرنے کا تھا اس میں تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (خواب میں بھی غالباً صرف یہی دکھایا گیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں ذبح کرنے کے لئے چھری چلا رہے ہیں) اب یہ آزمائش پوری ہو چکی اس لئے اب انہیں چھوڑ دو۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) یعنی جب کوئی اللہ کا بندہ اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر کے اپنے تمام جذبات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو ہم بالآخر اسے دنیوی تکلیف سے بھی بچا لیتے ہیں' اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔

جنتی مینڈھے کا اترنا

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا) روایات میں

ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آسمانی آواز سن کر اوپر کی طرف دیکھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک مینڈھا لئے کھڑے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مینڈھا تھا جس کی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہابیل نے پیش کی تھی۔ واللہ اعلم

بہر حال یہ جنتی مینڈھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا اور انہوں نے اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے کے بجائے اس کو قربان کیا۔ اس ذبیحہ کو "عظیم" اس لئے کہا گیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا تھا اور اس کی قربانی کے مقبول ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر مظہری وغیرہ)

ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے یا حضرت اسحٰق علیہ السلام

اوپر آیات کی تفسیر یہ تسلیم کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے، لیکن درحقیقت اس معاملہ میں مفسرین اور مؤرخین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، کعب الاحبار رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ، مسروق رحمہ اللہ، عکرمہ رحمہ اللہ، عطاء رحمہ اللہ، مقاتل رحمہ اللہ، زہری رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے، اس کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رحمہ اللہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ، سعید بن المسیب رحمہ اللہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ، حسن بصری رحمہ اللہ، مجاہد رحمہ اللہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، شعبی رحمہ اللہ، محمد بن کعب قرظی رحمہم اللہ اور دوسرے بہت سے تابعین سے منقول ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔

بعد کے مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ وغیرہ نے دوسرے قول کو اختیار کر کے پہلے قول کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے۔ یہاں فریقین کے دلائل پر مکمل تبصرہ ممکن نہیں، تاہم قرآن کریم کے اسلوب بیان اور روایات کی قوت کے لحاظ سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن صاحبزادے کے ذبح کا حکم دیا گیا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن کریم نے بیٹے کی قربانی کا پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (اور ہم نے ان کو اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی کہ نبی اور نیک لوگوں میں سے ہوں گے) اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور تھے' اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت ان کی قربانی کے واقعہ کے بعد دی گئی۔

(۲) حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اسی بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام نبی ہوں گے' اس کے علاوہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے' کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ یہ بشارت بھی دے دی گئی تھی کہ ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوں گے' (فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ) اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ بڑی عمر تک زندہ رہیں گے' یہاں تک کہ صاحب اولاد ہوں گے' پھر انہی کو بچپن میں ذبح کرنے کا حکم کیونکر دیا جا سکتا تھا اور اگر انہی کو بچپن میں نبوت سے قبل ذبح کرنے کا حکم دیا جاتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ جاتے کہ انہیں تو ابھی نبوت کے منصب پر فائز ہونا ہے اور ان کی صلب سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش مقدر ہے' اس لئے ذبح کرنے سے انہیں موت نہیں آ سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ یہ کوئی بڑا امتحان ہوتا اور نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی انجام دہی میں کسی تعریف کے مستحق ہوتے' امتحان تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری طرح یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ میرا یہ بیٹا ذبح کرنے سے ختم ہو جائے گا اور اسکے بعد وہ ذبح کرنے کا اقدام کریں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے زندہ رہنے اور نبی بننے کی کوئی پیشین گوئی نہیں فرمائی تھی۔

(۳) قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا بچہ تھا' اس لئے کہ انہوں نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت ایک بیٹے کی دعاء کی تھی' اسی دعاء کے جواب میں انہیں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے یہاں ایک حلیم لڑکا پیدا ہو گا' اور پھر اسی لڑکے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سارا سلسلہ واقعات بتا رہا ہے کہ وہ لڑکا حضرت

ابراہیم کا پہلا بیٹا تھا، ادھر یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، اور حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے دوسرے صاحبزادے ہیں، اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔

(۴) یہ بات بھی تقریباً طے شدہ ہے کہ بیٹے کی قربانی کا یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے آس پاس پیش آیا ہے، اسی لئے اہل عرب میں برابر حج کے دوران قربانی کا طریقہ رائج رہا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے فدیہ میں جو مینڈھا جنت سے بھیجا گیا اس کے سینگ سالہا سال تک کعبہ شریف کے اندر لٹکے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی تائید میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، اور حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ: ''میں نے اس مینڈھے کے سینگ کعبہ میں خود دیکھے ہیں۔'' (ابن کثیر، ص ۱۸ ج ۴) اور حضرت سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اس مینڈھے کے سینگ مسلسل کعبہ میں لٹکے رہے، یہاں تک کہ جب (حجاج بن یوسف کے زمانہ میں) کعبۃ اللہ میں آتشزدگی ہوئی تو یہ سینگ بھی جل گئے۔'' (ایضاً، ص ۱۷ ج ۲) اب ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تشریف فرما رہے ہیں، نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام، اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ذبح کا حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی سے متعلق تھا، نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام سے۔

رہیں وہ روایات جن میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام کو قرار دیا، سو ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبارؒ سے ماخوذ ہیں، اس لئے کہ جب وہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلام لائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی پرانی کتابوں کی باتیں سنانے لگے، بعض اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی باتیں سن لیتے تھے، اس سے اور لوگوں کو بھی گنجائش ملی، اور انہوں نے بھی ان کی روایات سن کر انہیں نقل کرنا شروع کر دیا، ان روایات میں ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ علم (تفسیر ابن کثیرؒ، ص ۱۷ ج ۴)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ

حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے کی بنیاد اسرائیلی روایات ہی پر ہے' اسی لئے یہود و نصاریٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں' موجودہ بائبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام:
اس نے کہا میں حاضر ہوں' تب اس نے کہا کہ تُو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے
اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے
ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔'' (پیدائش ۲۲:۱و۲)

اس میں ذبیح کا واقعہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے' لیکن اگر انصاف سے اور تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یہودیوں نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر تورات کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے' اس لئے کہ کتاب پیدائش کی مذکورہ عبارت ہی میں ''جو تیرا اکلوتا ہے'' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا' اسی باب میں آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ:۔

''تُو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔'' (پیدائش ۲۲:۱۲)

اس جملے میں بھی یہ تصریح موجود ہے کہ وہ بیٹا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا تھا' ادھر یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے اکلوتے بیٹے نہ تھے' اگر ''اکلوتے'' کا اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں' خود کتاب پیدائش ہی کی دوسری کئی عبارتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش حضرت اسحٰق علیہ السلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی' ملاحظہ فرمائیے:۔

''اور ابرام کی بیوی ساریٰ کے کوئی اولاد نہ ہوئی' اس کی ایک مصری لونڈی تھی' جس کا نام ہاجرہ تھا' اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی' اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تُو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا' اس کا نام اسمٰعیل رکھنا اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا'' (پیدائش باب ۱۶ آیات ۱و۴و۱۰و۱۶)

نیز اگلے باب میں لکھا ہے:۔

قدر صحیح ہے کہ:۔ ''یہودیوں کی کتب مقدمہ میں تصریح ہے کہ جب اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال تھی اور جب اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی عمر سو سال تھی اور انہی کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اکلوتے بیٹے کے ذبح کا حکم دیا تھا اور ایک اور نسخہ میں ''اکلوتے'' کے بجائے ''پہلوٹھے'' کا لفظ ہے' پس یہودیوں نے یہاں ''اسحٰق'' کا لفظ اپنی طرف سے بہتانا بڑھا دیا' اور اس کو درست قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں کی تصریحات کے خلاف ہے اور یہ لفظ انہوں نے اس لئے بڑھایا کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے جد امجد ہیں' اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عربوں کے' پس یہودیوں نے حسد کی وجہ سے یہ لفظ بڑھا دیا اور اب ''اکلوتے'' کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ وہ ''بیٹا جس کے سوا اس وقت کوئی اور تمہارے پاس موجود نہیں ہے'' کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ اس وقت وہاں نہیں تھیں (اس لئے حضرت اسحٰقؑ کو اس معنی میں اکلوتا کہا جا سکتا ہے) لیکن یہ بالکل غلط تاویل ہے اور باطل تحریف ہے' اس لئے کہ ''اکلوتا'' اس بیٹے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا اس کے سوا کوئی بیٹا نہ ہو'' (تفسیر ابن کثیر' ص ۱۴' ج ۴)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ علماء یہود میں سے ایک شخص حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانے میں مسلمان ہو گیا تھا' حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس سے پوچھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے کون سے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا؟ تو اس نے کہا کہ ''خدا کی قسم! امیر المؤمنین! وہ اسمٰعیل علیہ السلام تھے' یہودی اس بات کو خوب جانتے ہیں' لیکن وہ آپ عرب لوگوں سے حسد کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں'' (ص ۱۸ ج ۴)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم

خاندان ابراہیمی کے انبیائے کرام علیہم السلام

سورۂ انعام کی چھ آیتوں میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی ہے جن میں سے بعض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباء واجداد ہیں' اور اکثر ان کی اولاد ہیں' اور بعض ان

کے بھائی بھتیجے ہیں، ان آیتوں میں ایک طرف تو ان حضرات کا ہدایت پر ہونا، صالحین ہونا، صراط مستقیم پر ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اور یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب اور قبول فرمالیا ہے، اور دوسری طرف یہ جتلایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں اپنے باپ اور برادری اور وطن کو چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخرت کے درجات عالیہ اور دائمی اور بے مثال راحتوں سے پہلے دنیا میں بھی ان کو اپنی برادری سے بہتر برادری اور وطن سے بہتر وطن عطا فرمایا، اور یہ شرف عظیم عطا فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد قیامت تک جتنے انبیاء ورسل مبعوث فرمائے گئے وہ سب ان کی اولاد میں ہیں، ایک شاخ جو حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی اس میں تمام انبیاء بنی اسرائیل آئے اور دوسری شاخ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چلی اس میں سید الاولین والآخرین نبی الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اور یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ عزت وذلت اور نجات وعذاب کا اصل مدار انسان کے اپنے ذاتی اعمال پر ہے، لیکن آباء واجداد میں کسی نبی، ولی کا ہونا یا اولاد میں علماء، صلحاء کا ہونا بھی ایک بڑی نعمت ہے، اور اس سے بھی انسان کو فائدہ پہنچتا ہے۔

ان سترہ انبیاء علیہم السلام میں جن کی فہرست آیات مذکورہ میں دی گئی ہے ایک حضرت نوح علیہ السلام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جد امجد ہیں، باقی سب کو ان کی ذریت فرمایا ہے۔

آٹھویں آیت میں یہی مضمون ارشاد فرمایا گیا اور اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا کہ: فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ، یعنی اگر آپ کے کچھ مخاطب آپ کی بات نہیں مانتے اور تمام انبیاء سابقین کی ہدایت پیش کر دینے کے باوجود وہ انکار ہی پر تلے ہوئے ہیں، تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ ہم نے آپ کی دعوت وہدایت کو ماننے اور اپنانے کے لئے ایک بڑی قوم کو مقدر کر رکھا ہے، وہ کفر وانکار کے پاس نہ جائیں گے اس میں عہد مبارک کے موجودین مہاجرین وانصار بھی داخل ہیں، اور قیامت تک آنے والے مسلمان بھی، اور یہ آیت ان سب لوگوں کے لئے مایہ فخر ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے، اللھم اجعلنا منھم واحشر نافی زمرتھم

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت

سورۂ ھود میں ہے کہ: اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے (بشکل بشر) ابراہیم علیہ السلام کے پاس ان کے فرزند اسحٰق علیہ السلام کی بشارت لے کر آئے گو مقصود اعظم ان کے آنے کا قوم لُوط پر عذاب واقع کرنا تھا' لقولہ تعالیٰ فَمَا خَطْبُكُمْ الخ) اور آنے کے وقت انہوں نے سلام کیا' ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کیا اور پہچانا نہیں کہ یہ فرشتے ہیں' معمولی مہمان سمجھے پھر دیر نہیں لگائی کہ ایک تلا ہوا (فربہ لقولہ تعالی سمین) بچھڑا لائے اور ان کے سامنے رکھ دیا یہ تو فرشتے تھے کیوں کھانے لگے تھے' سو جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے تک نہیں بڑھتے تو ان سے متوحش ہوئے اور ان سے دل میں خوفزدہ ہوئے کہ یہ مہمان تو نہیں کوئی مخالف نہ ہوں کہ بارادہ فاسد آئے ہوں اور میں گھر میں ہوں احباب واصحاب پاس نہیں یہاں تک کہ بے تکلفی سے اس کو زبان سے بھی ظاہر کر دیا' لقولہ تعالیٰ قَالَ اِنَّا مِنكُمْ وَجِلُوْنَ) وہ فرشتے کہنے لگے ڈرومت ہم آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں آپ کے پاس بشارت لے کر آئے ہیں کہ آپ کے ایک فرزند پیدا ہوگا اسحٰق اور اس کے پیچھے ایک فرزند ہوگا یعقوب' اور بشارت اس لئے کہا کہ اول تو اولاد خوشی کی چیز ہے' پھر ابراہیم علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تھے بی بی بھی بہت بوڑھی تھیں امید اولاد کی نہ رہی تھی؛ آپ نے نور نبوت سے توجہ کر کے پہچان لیا کہ واقعی فرشتے ہیں لیکن فراست نبوت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے سوا اور بھی کسی بڑے کام کے لئے آئے ہیں اس لئے اس کی تعیین کے ساتھ سوال کیا فما خطبکم یعنی کس کام کے لئے آئے ہیں؟ اس وقت انہوں نے کہا کہ ہم قوم لُوط کی طرف بھیجے گئے ہیں کہ ان کو سزاء کفر میں ہلاک کریں' ان میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی بی بی حضرت سارہ کہیں کھڑی سن رہی تھیں پس اولاد کی خبر سن کر جس کی ان کو بعد میں اس کے کہ اسمٰعیل علیہ السلام بطن ہاجرہ سے متولد ہوئے تمنا بھی تھی؛ خوشی سے ہنسیں اور بولتی پکارتی آئیں اور تعجب سے ماتھے پر ہاتھ مارا' لقولہ تعالیٰ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا سو ہم نے یعنی ہمارے فرشتوں نے ان کو مکرر بشارت دی اسحٰق کے پیدا ہونے کی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کی جو کہ اسحٰق کے فرزند ہوں گے جس سے

معلوم ہو گیا کہ تمہارے ہاں فرزند ہو گا اور زندہ رہے گا یہاں تک کہ وہ بھی صاحب اولاد ہو گا اس وقت کہنے لگیں کہ ہائے خاک پڑے اب میں بچہ جنوں گی بڑھیا ہو کر اور یہ میرے میاں بیٹھے ہیں بالکل بوڑھے واقعی یہ بھی عجیب بات ہے فرشتوں نے کہا کہ کیا خاندان نبوت میں رہ کر اور ہمیشہ معجزات و معاملات عجیبہ دیکھ دیکھ کر تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو اور خصوصاً اس خاندان کے لوگوں پر تو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور اس کی انواع و اقسام کی برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں بیشک وہ اللہ تعالیٰ تعریف کے لائق اور بڑی شان والا ہے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے پس بجائے تعجب کے اس کی تعریف اور شکر میں مشغول ہو۔ (۶۹-۷۳)

حضرت ابراہیم کی دعائیں

قرآن کریم میں ہے کہ: اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کو بحکم الٰہی میدان مکہ میں لا کر رکھنے کے وقت دعاء کے طور پر کہا کہ اے میرے رب اس شہر مکہ کو امن والا بنا دیجئے اور اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں یعنی حرم کر دیجئے، اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے جو کہ اس وقت جہلاء میں شائع ہے بچائے رکھئے جیسا اب تک بچائے رکھا اے میرے پروردگار میں بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعاء اس لئے کرتا ہوں کہ ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہو گئے اس لئے ڈر کر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد کے بچنے کی دعاء کرتا ہوں اسی طرح ان کو بھی کہتا سنتا رہوں گا، پھر میرے کہنے سننے کے بعد جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے اور اس کے لئے وعدہ مغفرت ہے ہی اور جو شخص اس باب میں میرا کہنا نہ مانے سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے، کیونکہ آپ تو کثیر المغفرت اور کثیر الرحمۃ ہیں ان کی مغفرت اور رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں، مقصود اس دعاء سے شفاعت مؤمنین کے لئے اور طلب ہدایت غیر مؤمنین کے لئے ہے اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کو اور ان کے واسطے سے ان کی نسل کو آپ کے معظم گھر یعنی خانہ کعبہ کے قریب جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس کا ادب کرتے آئے تھے ایک چھوٹے سے میدان میں جو بوجہ سنگستان ہونے کے زراعت کے قابل بھی نہیں آباد کرتا

ہوں اے ہمارے رب بیت الحرام کے پاس اس لئے آباد کرتا ہوں تا کہ وہ لوگ نماز کا خاص اہتمام رکھیں اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان ہے تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے کہ یہاں آ کر رہیں سہیں تا کہ آبادی پُر رونق ہو جاوے اور چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے ان کو محض اپنی قدرت سے پھل کھانے کو دیجئے تا کہ یہ لوگ ان نعمتوں کا شکر کریں' اے ہمارے رب یہ دعائیں محض اپنی بندگی اور حاجت مندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجت کی اطلاع کے لئے نہیں' کیونکہ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور ہمارے ظاہر و باطن پر کیا حصر ہے' اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں' کچھ دعائیں آگے آئیں گی اور بیچ میں بعض نعم سابقہ پر حمد و شکر کیا' تا کہ شکر کی برکت سے یہ دعائیں اقرب الی القبول ہو جائیں' چنانچہ فرمایا تمام حمد و ثناء خدا کے لئے سزاوار ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق دو بیٹے عطا فرمائے حقیقت میں میرا رب دعاء کا بڑا سننے والا یعنی قبول کرنے والا ہے کہ عطائے اولاد کے متعلق میری یہ دعاء رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ قبول کر لی' پھر اس نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ دعائیں پیش کرتے ہیں کہ اے میرے رب جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسانے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے' اور جیسا ان کے لئے اہتمام نماز میرا مطلوب ہے اس طرح اپنے لئے بھی مطلوب ہے اس لئے اپنے اور ان کے' دونوں کے لئے دعاء کرتا ہوں اور چونکہ مجھ کو وحی سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں بعض غیر مؤمن بھی ہوں گے اس لئے دعاء سب کے لئے نہیں کر سکتا ہوں' پس ان مضامین پر نظر کر کے یہ دعاء کرتا ہوں کہ مجھ کو بھی نماز کا خاص اہتمام کرنے والا رکھئے' اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے' اے ہمارے رب اور میری یہ دعا قبول کیجئے اور اے ہمارے رب میری مغفرت کر دیجئے اور میرے ماں باپ کی بھی اور کل مؤمنین کی بھی حساب قائم ہونے کے دن یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے۔ (۳۵-۴۱)

شہر مکہ کے لئے دعا

اس جگہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی دو دعائیں مذکور ہیں' اول رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا

البلد آمناً "یعنی اے میرے پروردگار اس شہر مکہ کو جائے امن بنا دیجئے" سورہ بقرہ میں بھی یہی دعا مذکور ہے' مگر اس میں لفظ بلد بغیر الف لام کے بلداً فرمایا ہے' جس کے معنی غیر معین شہر کے ہیں' وجہ یہ ہے کہ وہ دعاء اس وقت کی تھی جبکہ شہر مکہ کی بستی آباد نہ تھی' اس لئے عام الفاظ میں یہ دعاء کی کہ اس جگہ کو ایک شہر مامون بنا دیجئے۔

اولاد کے لئے دعا

دوسری دعاء یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے۔

انبیاء علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے شرک و بت پرستی بلکہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا' مگر یہاں حضرت خلیل علیہ السلام نے اس دعاء میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ طبعی خوف کے اثر سے انبیاء بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں' یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچانے کی دعاء کرنا تھا' اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شامل دعاء فرمالیا۔

اللہ جل شانہ نے اپنے خلیل کی دعاء قبول فرمائی ان کی اولاد شرک و بت پرستی سے محفوظ رہی' اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اہل مکہ تو عموماً اولاد ابراہیم علیہ السلام ہیں' ان میں تو بت پرستی موجود تھی' بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عیینہ دیا ہے کہ اولاد اسمٰعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بت پرستی نہیں کی' بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کرکے اولاد اسمٰعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا' تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت و عظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنے ساتھ اٹھا لے گئے تھے' ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے' جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رخ نہ تھا' بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے' اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے اس کے بعد یہی طریقہ کار بت پرستی کا سبب بن گیا۔

دوسری آیت میں اپنی اس دعاء کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بت پرستی سے ہم اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے' یہ اس لئے فرمایا کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد اور قوم کا تجربہ کر چکے تھے کہ بت پرستی کی رسم نے ان کو ہر خیر و صلاح سے محروم کر دیا۔

سبق آموز دعائیں

دعاء تو ہر انسان مانگتا ہے، مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے، اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں، ایک شہر مکہ کو خوف و خطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔

غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح و فلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف و خطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن و اطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے دنیا کے سارے کاموں اور راحتوں کا مدار تو امن و اطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے، جو شخص دشمنوں کے نرغوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا ہو اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت، کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے مال و دولت کی بہتات سب تلخ ہو جاتی ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت و عبادت اور احکام الٰہیہ کی تعمیل انسان اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کو کچھ سکون و اطمینان نصیب ہو۔

اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعاء میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی و اقتصادی اور دینی و اخروی سب داخل ہو گئیں، اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔

اس دعاء سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی ہمدردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسب قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترک دنیا کے منافی نہیں۔

دوسری دعاء میں بھی بڑی جامعیت ہے، کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک و بت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دعاء فرما دی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو

جائے تو اس کا کفارہ دوسرے اعمال سے بھی ہو سکتا ہے اور کسی کی شفاعت سے بھی معاف کئے جا سکتے ہیں' اور اگر عبادت اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے' تو اس دعاء یعنی عبادت اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آ جاتا ہے' بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت و معصیت پر ملامت کی ہے۔

سودہ گشت از سجدہ راہ بتاں پیشانیم چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم

اور عارف رومی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے

ہر خیال شہوتے دررہ بتے ست

تیسری دعاء

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور حکیمانہ دعاء اس طرح مذکور ہے کہ ربنا انی اسکنت الآیۃ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی کچھ ذریت یعنی آل عیال کو ایک ایسے دامن کوہ میں ٹھہرا دیا ہے جس میں کوئی کھیتی وغیرہ نہیں ہو سکتی اور بظاہر وہاں زندگی کا کوئی سامان نہیں یہ دامن کوہ آپ کے عظمت والے گھر کے پاس ہے' تاکہ یہ لوگ نماز قائم کریں اس لئے آپ کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیں' کہ ان کے انس اور آبادی کا سامان ہو جائے اور ان کو ثمرات (پھل) عطا فرمایئے تاکہ یہ لوگ شکر گزار ہوں۔

اس دعاء کا پس منظر

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعاء کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفان نوح میں بے نشان ہو گئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرمایا کہ ان کو ملک شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہؑ اور صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب و گیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسب حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہ علیہا السلام کو موجودہ بیت اللہ اور چاہ زمزم کے قریب ٹھہرادیا' اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی' دور دور تک نہ پانی نہ آبادی' ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملک شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا' جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیل حکم کے لئے روانہ ہو گئے' بیوی اور شیر خوار بچہ کو اس لق ودق جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعاء سے ہوگا جو بعد میں کی گئی مگر حکم ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہ کو خبر دے دیں' اور کچھ تسلی کے الفاظ کہہ دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں' جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان' مگر خلیل اللہ نے مڑ کر نہیں دیکھا' تب حضرت ہاجرہ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کر سکتا' شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے' تو آواز دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے' تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر جواب دیا کہ ہاں' حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے یہ سن کر فرمایا اذاً لا یضیعنا ''یعنی اب کوئی پرواہ نہیں' جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے' یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہنچ گئے' جہاں ہاجرہ واسمٰعیل علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہو گئے' تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعاء مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے۔

پیغمبرانہ استقامت

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقام خلیل اللہی کا حق ادا کیا کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملک شام واپس چلے جائیں اس بے آب وگیاہ

لق ودق میدان میں اہلیہ اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی' اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جا کر تسلی کر دیں' اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گھبرائیں نہیں بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف اہل وعیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن واطمینان کے ساتھ رہنے کی دعاء فرمائی' ان کی راحت کا سامان کر دیا' کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعاء کی جائے گی بارگاہ کریم سے وہ ہرگز رد نہ ہوگی' اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بے کس و بے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریات زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہل مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسن انتظام' کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا' وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوب الحال نہیں ہوتے' اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے ایک انسان انسان کامل بنتا ہے۔

کامل یقین

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملک شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرماویں گے بلکہ ان کے لئے پانی ضرور مہیا کیا جائے گا اس لئے بواد غیر ذی ماء نہیں کہا' بلکہ غیر ذی زرع فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں' یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں' مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

بیت اللہ کی بناء

امام قرطبی رحمہ اللہ نے تفسیر سورہ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے' جب ان کو زمین پر اتارا گیا تو بطور معجزہ جبل سر اندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہنچایا گیا اور جبرئیل امین نے بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی بھی کی' اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی' وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے یہاں تک کہ طوفان نوح میں بیت اللہ کو اٹھالیا گیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا' حضرت جبریل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی' پھر یہ بناء ابراہیمی عہد جاہلیت عرب میں منہدم ہوگئی' تو قریش جاہلیت نے از سر نو تعمیر کی' جس کی تعمیر میں ابوطالب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔ اس میں بیت اللہ کی صفت محرم ذکر کی گئی ہے' محرم کے معنی معزز کے بھی ہو سکتے ہیں اور محفوظ کے بھی' بیت اللہ شریف میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں کہ ہمیشہ معزز اور مکرم رہا ہے اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

مغفرت کی دعاء

آخر میں ایک جامع دعاء فرمائی رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ''یعنی اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے والدین کی اور تمام مومنین کی مغفرت فرما' اس دن جب کہ محشر میں تمام زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔

اس میں والدین کے لئے بھی مغفرت کی دعاء فرمائی' حالانکہ والد یعنی آزر کا کافر ہونا قرآن میں مذکور ہے' ہوسکتا ہے کہ یہ دعاء اس وقت کی ہو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں کی سفارش اور دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا تھا' جیسے دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے وَاغْفِرْ لِاَبِیْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ آیت مذکورہ سے دعاء کے آداب یہ معلوم ہوئے کہ بار بار الحاح وزاری کے ساتھ کی جائے' اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بھی کی جائے اس طرح دعاء کی قبولیت کی بڑی امید ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جامع صفات

سورۂ نحل میں حضرت ابراہیم کے لئے اُمت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ امت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے' مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس جگہ یہی معنی منقول ہیں اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک امت اور قوم کے کمالات وفضائل کے جامع ہیں' اور ایک معنی لفظ امت کے مقتدائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں' بعض مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں اور قانت کے معنی تابع فرمان کے ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں' مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشہور مذاہب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ کی ملت کے اتباع کو عزت وفخر جانتے ہیں' یہود' نصاریٰ' مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں' مشرکین عرب بت پرستی کے باوجود اس بت شکن کے معتقد اور ان کی ملت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں اور قانت و مطیع ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہو جاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گذرے ہیں' آتش نمرود' اہل وعیال کو لق ودق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم' پھر آرزوؤں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی قربانی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔

عین الیقین کی طلب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا اور وہ ہر شے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ ذات واحد (اللہ جل جلالہ) کی ہستی' اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کر سکیں۔

آزر' جمہور اور نمرود کے ساتھ مناظروں میں ان کے اس طبعی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''حیات بعد الممات'' یعنی مر جانے کے بعد جی اٹھنے کے متعلق اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے

ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا' اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین و ایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کیوں نہیں! میں بلاتوقف اس پر ایمان رکھتا ہوں لیکن میرا یہ سوال ایمان و یقین کے خلاف اس لئے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین کا خواستگار ہوں میری تمنا یہ ہے کہ تُو مجھ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرادے کہ ''حیات بعد الممات'' کی شکل کیا ہوگی' تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا اگر تم کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرندے لو اور ان کے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر ان کو پکارو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کو آواز دی تو ان سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آ گئے اور زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورہ بقرہ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى ط قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ط قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ۲' آیت ۲۶۰)

(یاد کر) جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے پروردگار! مجھے دکھلا تو کس طرح مُردوں کو زندہ کر دے گا' کہا کیا تُو ایمان نہیں رکھتا؟ کہا کیوں نہیں لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں' کہا پس چار پرندے لے پھر ان کو اپنے ساتھ مانوس کر پھر رکھ دے ہر ہر پہاڑ پر ان کے جزء جز ڈال کر پھر ان کو بلا وہ آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تُو جان بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا۔

سلف صالحین سے ان آیات کی تفسیر یہی ثابت ہے اور بعض روایات حدیثی بھی اس کی تائید کرتی ہیں' اس لئے جن حضرات نے اس مسئلہ کی غرابت کے پیش نظر ان آیات میں طرح طرح کی تاویلات کر کے دور از کار باتیں بیان کی ہیں وہ ناقابل التفات ہیں' ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح یہ راہ غلط ہے کہ ہر موقع پر اچنبھوں اور عجوبہ کاریوں کی داستان

سرائی ہو اور رطب و یابس روایات کے اعتماد پر بے اصل باتوں پر یقین کیا جائے اسی طرح یہ بھی گمراہی کی راہ ہے کہ انبیاء سے متعلق جن خوارق عادات (معجزات) کا ذکر نصوص قرآنی اور صحیح روایات سے معلوم ہو جائے ان کا بھی اس لئے انکار کیا جائے یا باطل تاویلات گھڑی جائیں کہ مدعیان عقل و فلسفہ (مادئین) ہمارے اس یقین و علم پر ٹھٹھا کریں اور اس کا مذاق اڑائیں۔

یقین:

مضبوط اعتقاد اور اذعان محکم کو کہتے ہیں جو کسی بھی حالت میں شک و شبہ کی راہ سے متزلزل نہ ہو سکے اس لئے یہ (یقین) ایمان بالحق کے لئے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے البتہ اعتقاد جازم کے باوجود مراتب و درجات کے لحاظ سے اس میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے جس کو علم اصطلاح میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کہا جاتا ہے اگر کسی مسئلہ میں جہل و نادانی کے خلاف دلیل و برہان کے ذریعہ علم و دانش اس حد تک حاصل ہو جائے کہ تردد اور تذبذب کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں تو اس کا نام علم الیقین ہے اور اگر یہ علم دلیل و برہان سے آگے مشاہدہ محسوس کی حد میں داخل ہو جائے اور دلیل کے ساتھ پوری پوری مطابقت نظر آ جائے تو پھر اس حاصل شدہ یقین کو عین الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علم الیقین اور عین الیقین تک رسائی کے باوجود فطرت انسانی ابھی مزید یقین کی طالب ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جس شے کو محکم دلیل کی روشنی میں سمجھا جانا نیز مشاہدہ و حس کے ذریعہ اس کو مزید تقویت بھی مل گیا اچھا ہو کہ اس کا کیف و کم سب ہی سامنے آ جائے اور حقیقت حال تک پہنچنے کی راہ نکل آئے پس جب فطرت انسانی یقین کے اس درجہ پر قابو پا لیتی ہے تو اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے...... مثلاً سیب ایک بہترین پھل ہے اس کے جاننے و معلوم کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ عوام و خواص اور ثقہ و غیر ثقہ سے تواتر اور شہرت کی اس حد تک اس کے وجود اس کی تعریف کو سنا کہ جس کے انکار کے لئے کوئی تردد تذبذب اور شک و شبہ باقی نہیں رہا تو سیب کے متعلق اس یقین کا نام علم الیقین ہے اور حسن اتفاق سے کشمیر جا کر آنکھوں سے اس کو دیکھ لیا تو یقین کا یہ درجہ عین الیقین، کے نام سے موسوم ہے اور اگر آنکھ سے رنگ و روپ کا مشاہدہ کیا ناک سے اس کی خوشبو کو پہچانا اور زبان پر رکھ کر ذائقہ کی مدد سے اس کی لطافت، خستگی، شیرینی غرض اس کی حقیقت کے تمام اوصاف کو حاصل کر لیا

تو یہ حق الیقین ہے اور یقین کا یہ آخری درجہ ہے جو فطرت انسانی کے تقاضائے تشنگی کی سیرابی کے لئے کافی ووافی ہوتا اور حضرت انسان کی دسترس کی معراج سمجھا جاتا ہے۔

البتہ یہ الگ بات ہے کہ مختلف انسانوں کی صلاحیت واستعداد اور خود شے مطلوب کی حقیقت وکنہ کے پیش نظر حق الیقین کے بھی مختلف مراتب ودرجات ہیں جن کی تشریح وتوضیح کا یہ مقام نہیں ہے۔

بنی قطورہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ ایک اور شادی کی تھی ان بی بی کا نام قطورہ تھا ان کے بطن سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔

اور ابراہیمؑ نے ایک اور جورو کی جس کا نام قتورہ تھا' اور اس سے زمران' یقسان' مدان' مدیان' یشباق' شوحا پیدا ہوئے اور یقسان سے صبا اور دوان پیدا ہوئے' اور ان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لوی تھے اور مدیان کے فرزند عیفہ' عفر' خیوک' ابیداع اور دعا تھے یہ سب بنی قطورہ تھے (پیدائش ۲۵۔ آیت ۱۔۴)

"مدین یا مدیان" کی نسل نے اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحاب مدین کہلائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ودان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی یہی اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں ہیں جن میں ہدایت وسعادت کی پیغمبری کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا یہ قتادہ کی روایت اور بعض مؤرخین حاضر کی تحقیق ہے' اس کے خلاف حافظ ابن کثیر اصحاب مدین وایکہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے' تفصیل حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گی۔

آزمائش پر آزمائش

ان مسلسل واقعات سے بہت سے بصائر وعبر وغیرہ حاصل ہونے کے علاوہ ایک سب سے اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم کی شخصیت منصب نبوت ورسالت میں بھی خاص امتیازی شان رکھتی ہے یوں تو اللہ کا ہر ایک پیغمبر توحید کا داعی اور شرک کا دشمن ہے اور اس لئے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ دو باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ روحانی دعوت وارشاد کی اساس وبنیاد صرف انہی دو مسلموں پر قائم ہے مگر یہ خصوصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ اس دنیا میں وہ پہلی ہستی ہیں جنہیں اس

راہ عزیمت میں سخت سے سخت آزمائشوں اور کڑی سے کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ان مصائب کے مقابلے میں کامران وکامیاب ثابت ہوئے۔

(ا) غور کیجئے بڑھاپے اور یاس کی عمر میں ہزاروں دعاؤں اور لاکھوں آرزوؤں کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور ابھی بچہ شیر خوار ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آتا ہے ''ابراہیم اس کو اور اسکی والدہ کو اپنے گھر سے جدا کرو اور ایک لق ودق بیابان اور بن کھیتی کی زمین میں ''جہاں نہ پانی ہے نہ سبزہ'' ان دونوں کو چھوڑ آؤ'' پھر کیا ہوا؟ کیا ابراہیم علیہ السلام نے ایک لمحہ بھی تامل کیا؟ اور تعمیل ارشاد میں کسی قسم کا کوئی عذر سامنے آیا؟ نہیں ہرگز نہیں' بلکہ بے چوں وچرا ان دونوں کو مکہ کی سرزمین پر چھوڑ آئے۔

اور اس کے بعد جب وہ سن رشد کو پہنچتا اور ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنتا ہے تو اب پھر ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ کا حکم ملتا ہے کہ اس کو ہمارے نام پر قربان کرو اور اپنی فداکاری واطاعت شعاری کا ثبوت دو۔

اس نازک وقت میں ایک مطیع سے مطیع اور فرمانبردار سے فرمانبردار ہستی کے ایمان و یقین کی کشتی کس طرح بھنور میں آجاتی ہے اس کا اندازہ خود کرو' اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب دیکھو کہ نہ اللہ کی وحی کی جو ''خواب اور رویا کی شکل میں'' دکھائی گئی تھی' انہوں نے کوئی تاویل نہ کی' نہ اس کے لئے حیلہ بہانہ سوچا اور نہ اس کو ٹالنے کے لئے کوئی فکر وتردد کیا' صبح اٹھے اور اپنے لخت جگر کو لیا اور تعمیل ارشاد الٰہی میں وہ سب کچھ کیا جو ان کے انسانی ہاتھ کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی محیر العقول وفاکشی کا ثبوت دیا۔

اور تیسری سخت آزمائش کا وہ وقت تھا کہ جب باپ' قوم اور بادشاہ وقت سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابراہیم علیہ السلام یا اپنے پیغام حق سے باز آجائے ورنہ تو اس کو دہکتی آگ میں ڈال کر خاکستر کر دیا جائے تب ظالموں کا یہ فیصلہ اور اتحاد السلام کیا ابراہیم کے قدم ڈگمگا سکے؟ نہیں! بلکہ وہ ایک عزم کا پہاڑ بن کر اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور پیغام حق اور اللہ کی رشد وہدایت کو اسی عزم وثبات کے ساتھ سناتا رہا جس طرح شروع سے کرتا رہا پھر دشمنوں نے جو کچھ کہا تھا آخر کر دکھایا اور اس کو دہکتی آگ میں جھونک دیا مگر ابراہیم علیہ السلام کے سکون واطمینان میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا البتہ دشمنوں کی دشمنی اور ان کے

تمام مکروفریب کو ابراہیم علیہ السلام کے اللہ نے پادر ہوا کردیا اور خاک میں ملا دیا اور آگ کے شعلے اس کے لئے ''بردوسلام'' بن گئے اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے قوی تر نگہبان کے زیرسایہ سعادت وہدایت کے فیضان سے بندگان خدا کو برابر منور وروشن کرتا رہا اور اس کی جرات حق اور دعوت الی اللہ تیز تر ہوگئی۔

ملت ابراہیمی

تمام سخت امتحانوں اور آزمائشوں اور پھران میں ثابت قدمی اور استقامت کے علاوہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے شرک اور توحید کی متضاد زندگی کے لئے ایک ایسا امتیاز قائم کردیا جو انہی جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان تھا۔

یعنی انہوں نے اصنام پرستی اور کواکب پرستی کی تردید وتذلیل اور ان کی شناعت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تصریح فرمائی۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام ۶ آیت ۷۹)

بلاشبہ میں نے اپنا رخ اسی ذات کی طرف جھکا دیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے خالص اس کا ہوکر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تصور کی دو راہیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غلط' غلط راہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ قائم کرلیا جائے کہ اللہ کو راضی کرنے اس کو خوش رکھنے اور اس کی عبادت وپرستش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بتوں اور ستاروں کی پوجا کی جائے کیونکہ جب یہ ارواح ہم سے خوش ہوجائیں گی تو یہ اللہ کو ہم سے راضی کردیں گی' اس عقیدہ کا نام ''شرک اور صابئیت ہے'' کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق عبودیت وپرستش کے تمام وہ خصوصی امتیازات جو صرف ''ذات واحد'' کے لئے مخصوص رہنے چاہئے تھے دوسروں کے لئے بھی مشترک ہوجاتے ہیں اور یہی شرک کی حقیقت ہے۔

اس کے مقابلہ میں صحیح راہ یہ ہے کہ اس علم ویقین کو عقیدہ بنایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کا طریقہ اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہے کہ خود اسی کی پرستش کی

جائے اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، نفع وضرر، صحت ومرض، افلاس وتمول، رزق کا قبض وبسط اور موت وزیست غرض تمام امور میں اسی کو اور صرف اسی کو مالک ومختار مطلق تسلیم کیا جائے اور اس کی رضاء وعدم رضاء کی معرفت کے لئے اس کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں اور رسولوں کی ہی ہدایت ورشد پر عمل کیا جائے گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیا جائے کہ اللہ کو راضی رکھنے اور اس سے قربت حاصل کرنے کے لئے دیوی دیوتاؤں کو ذریعہ بنانے کی حاجت نہیں بلکہ صرف اس ذات احدیت کی عبودیت وبندگی کو سرمایہ حیات بنایا جائے، اسی عقیدہ کا نام ''اسلام'' اور ''حنیفیت'' ہے۔

اس لئے یہ پہلا دن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی راہ کو شرک وصابئیت اور دوسری راہ کو اسلام وحنیفیت کا نام دے کر دونوں راہوں کے درمیان مستقل امتیاز قائم کر دیا اور یہ امتیاز ایسا مقبول ہوا کہ آنے والی تمام پیغمبرانہ تعلیم ودعوت کی بنیاد واساس اسی نام سے موسوم کی گئی حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحبہ وبارک وسلم کے آخری پیغام کا نام بھی ''ملت حنیف'' اور اس کے پیرو کا نام ''مسلم'' قرار پایا۔

اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (النحل ۲۲ آیت ۷۸)

''اور پیروی کر ملت ابراہیم کی جو حنیف تھا''

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج ۲۲، آیت ۷۸)

اس ابراہیم نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی (یہی نام پسند رہا)

یہی وجہ ہے کہ ''سورہ ابراہیم'' کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام کے ظہور اور ان کے حالات وتشخصات اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوت رشد وہدایت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ خیر وشر طاعت وبغاوت اور تسلیم انکار میں کیا غیر اللہ کی خوشنودی کو بھی کوئی مقام حاصل ہے یا صرف رضاء عدم رضاء الٰہی ہی میں اصل ایمان ہے؟

حضرت ابراہیم کا سبق آموز اسوہ

(۱) جب انسان کسی عقیدہ کو علم ویقین کی روشنی میں قائم کر لیتا ہے اور وہ اس کے قلب

میں جاگزیں اس کی روح میں پیوست اور اس کے سینہ میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے تو اس کا فکر و خیال اس کا سوچ بچار اور اس کے استغراق اس بارہ میں اس درجہ زبردست اور ثابت وراسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی حادثہ اور دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی وہ اس کے لئے آگ میں بے خطر کود پڑتا سمندر میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا اور سولی کے تختہ پر بے خوف جان دے دیتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزم و ثبات کی مثال اس کے لئے ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔

(۲) حمایت حق کے لئے ایسے دلائل و براہین پیش کرنے چاہئیں جو دشمن اور باطل پرست کے تہ قلب میں اتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرار حق نہ کرے لیکن اس کا ضمیر اور اس کا قلب حق کے اقرار پر مجبور ہو جائے بلکہ بعض مرتبہ زبان بھی بے اختیار اعلان حق سے باز نہ رہ سکے آیت قرآن وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔

(۳) پیغمبروں اور رسولوں کی راہ یہی ہے وہ جدل ومخاصمت کی منطقانہ راہوں پر نہیں چلتے ان کے دلائل و براہین کی بنیاد محسوسات و مشاہدات پر ہوتی ہے یا سادہ وجدانیات و عقلیات پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصنام پرستی و کواکب پرستی کے متعلق جمہور سے مناظرہ اور مناظرہ نمرود اس کی واضح اور روشن مثال ہے۔

(۴) کسی امر حق کو ثابت کرنے کے لئے دلیل میں مخالف کے باطل عقیدہ کو فرضی طور پر تسلیم کر لینا جھوٹ یا اس باطل عقیدہ کا اقرار نہیں ہے بلکہ اس کو ''فرض الباطل مع الخصم'' یا ''معاریض'' کہا جاتا ہے اور یہ طریقہ استدلال مخالف کو اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جمہور کے ساتھ مناظرہ میں دلیل کا یہی پہلو اختیار کیا تھا جس نے صنم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اقرار کر لیں کہ بیشک بت کسی حال میں بھی نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔

(۵) اگر ایک مسلم کے والدین مشرک ہوں اور کسی طرح شرک سے باز نہ آتے ہوں

تو ان کی مشرکانہ زندگی سے بیزار اور علیحدہ رہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ دنیوی معاملات اور آخرت کی پند ونصائح میں عزت وحرمت کا معاملہ کرنا چاہئے اور سختی اور درشتی کو کام میں نہ لانا چاہئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طرز عمل آزر کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل ابوطالب کے ساتھ اس مسئلہ کے لئے قطعی اور یقینی شہادت ہے۔

(۶) اگر قلب مومن صحیح عقائد پر اطمینان قلب اور زبان وقلب کی مطابقت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے، مگر عینی اور حقیقی مشاہدہ ومحسوس کے لئے یا اس کو حق الیقین کے درجہ تک حاصل کرنے کے لئے کسی ایمانی یا اعتقادی مسئلہ میں بھی سوال وجستجو کی راہ اختیار کرتا اور طمانیت قلب کا طالب ہوتا ہے تو یہ جستجو ریب وکفر نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب و لکن لیطمئن قلبی سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

مہمان نوازی

دستر خوان کی وسعت اگر ریاء ونمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیش نظر مہمان نوازی میں وسعت قلب اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہو تو اخلاق کریمانہ میں بہت فضیلت شمار ہوتی ہے اور ''سخاء نفس'' اور ''کرم'' کے نام سے موسوم ہے۔

یہ وصف گرامی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی حقیقت نفس بن چکا تھا اور فطری تھا۔ مہمان نوازی دستر خوان کی وسعت آنے والوں کا احترام ایسے اوصاف تھے جو ابراہیم علیہ السلام میں ''مثل اعلیٰ'' کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

بعض کتابوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسب دستور حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی مہمان کے انتظار میں جنگل میں کھڑے تھے کیونکہ بغیر مہمان کے نہ ان کا دستر خوان بچھتا تھا اور نہ وہ کھاتے تھے سامنے سے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جس کی کمر بھی کج ہو گئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا' ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھے اور مسرت کے ساتھ اس کو سہارا دیتے ہوئے گھر لائے' دستر خوان بچھا اور کھانا چنا گیا جب سب فارغ ہو گئے تو

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی ولادت

حضرت ابراہیم ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور ان کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد الیعزر دمشقی تھا' ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لئے دعاء کی' اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور ان کو تسلی دی۔

"ابراہیم نے کہا اے خداوند اللہ تُو مجھ کو کیا دے گا میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعزر رہے پھر ابراہیم نے کہا کہ تُو نے مجھے فرزند نہ دیا اور دیکھ میرا خان زاد میرا وارث ہو گا (۱) تورات پیدائش باب ۱۵ آیت ۲-۴) تب خداوند کا کلام اس پر اترا اور اس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا بلکہ جو تیری صلب سے پیدا ہو وہی تیرا وارث ہوگا۔"

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی حضرت ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔

"اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی" (ایضاً باب ۱۶ آیت ۴)

جب حضرت سارہ کو یہ پتہ چلا تو انہیں بتقاضائے بشریت ہاجرہ سے رشک پیدا ہو گیا اور انہوں نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا' حضرت ہاجرہ مجبور ہو کر ان کے پاس سے چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا یعنی اس چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے اور اس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی؟ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا تُو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اس کے تابع رہ' پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے

اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تُو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا اور وہ وحشی (بدوی) آدمی ہوگا اور اس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بودوباش کرے گا

(۳) تورات پیدائش باب ۱۶ آیت ۷۔۱۲

حضرت ہاجرہ جس مقام پر فرشتہ سے ہمکلام ہوئیں اس جگہ ایک کنواں تھا' ہاجرہ نے یادگار کے طور پر اس کا نام "زندہ نظر آنے والے کا کنواں" رکھا' تھوڑے عرصے کے بعد ہاجرہ کے بیٹا پیدا ہوا اور فرشتہ کی بشارت کے مطابق اس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

"اور ہاجرہ ابرام کے لئے بیٹا جنی اور ابرام نے اپنے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل رکھا اور جب ابرام کے لئے ہاجرہ سے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام ۸۶ برس کا تھا"

(۴) تورات پیدائش ۱۶ آیت ۱۵'۱۶

اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق کی بشارت دی جیسا کہ ابھی مفصل ذکر آئے گا مگر ابراہیم علیہ السلام نے اس بشارت پر چنداں مسرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کی جگہ یہ دعا مانگی۔

"اور ابرام نے اللہ سے کہا کہ کاش اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ا" (ایضاً باب ۱۷ آیت نمبر ۱۸) اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا یہ جواب دیا۔

"اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی' دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا" (ایضاً باب ۱۷ آیت ۲۰) اسمٰعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے' عبرانی میں "ایل" اللہ کے مراد ہے اور عربی میں اسمع اور عبرانی میں "شماع" کے معنی ہیں "سن" چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی اس لئے ان کا یہ نام رکھا گیا' عبرانی میں اس کا تلفظ "شماع ایل" ہے۔

وادی غیر ذی زرع اور ہاجرہ اسمٰعیل علیہما السلام

حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل کا پیدا ہو جانا حضرت سارہ پر بے حد شاق گزرا'

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی، قدیم سے گھر کی مالکہ ہاجرہ چھوٹی بیوی اور ان کی خدمت گزار، یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضے کے پیش نظر اسمٰعیل کی ولادت کو حضرت سارہ کے لئے سوہان روح بنا دیا تھا، اس لئے سارہؓ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اس کا بچہ اسمٰعیل میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں ان کو علیحدہ کسی جگہ لے جاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اصرار بے حد ناگوار گزرا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا کہ ہاجرہ، اسمٰعیل اور تیرے لئے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے اس کو مان لے۔

اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیم سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحٰق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابراہیم کی نظر میں نہایت بری معلوم ہوئی اللہ نے ابراہیم سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بری نہ معلوم ہو، ہر ایک بات کے حق میں جو سارہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ، کیونکہ تیری نسل اسحٰق سے کہلائے گی اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے۔ (تورات پیدائش ۲۱ آیت ۹، ۱۳)

تورات کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسحٰق پیدا ہو چکے تھے اس لحاظ سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے ہوں گے کیونکہ تورات کی دوسری روایت کے مطابق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے ہیں۔

لیکن اسی واقعہ میں تورات کی دوسری آیات مسطورہ بالا آیت کے خلاف یہ کہتی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل ابھی شیر خوار بچہ تھے۔

"تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اسے رخصت کیا وہ روانہ ہوئی اور بیرسبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے لڑکے کو ایک پہاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں (۲۱ آیت ۱۴، ۱۶)

اس لئے تورات کے ان مخالف و متضاد بیانات کے مقابلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ

واسمٰعیل کے خروج کے وقت اسمٰعیل شیر خوار بچہ تھے اور اسحٰق ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت منقول ہے وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے اس روایت کا مضمر یہ ہے۔

"ابراہیم (علیہ السلام) ہاجرہ اور اس کے شیر خوار بچہ اسمٰعیل کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے اس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر ان کو چھوڑ گئے وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام ونشان نہ تھا' اس لئے ابراہیم نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور بھی ان کے پاس چھوڑ دیں اور پھر منہ پھیر کر روانہ ہوگئے' ہاجرہ ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم تم ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دیئے جہاں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس وغمخوار' ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے' آخر ہاجرہ نے دریافت کیا' کیا تیرے اللہ نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "ہاں یہ اللہ کے حکم سے ہے' ہاجرہ نے جب یہ سنا تو کہنے لگیں' اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کرے گا اور پھر واپس لوٹ آئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

حضرت ابراہیم چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ ان کے اہل وعیال نگاہ سے اوجھل ہوگئے تو اس جانب جہاں کعبہ ہے رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ (ابراہیم ۱۴' آیت ۳۷)

اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام ونشان نہیں' میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تا کہ یہ محترم گھر عبادت گزاران توحید سے خالی نہ رہے) پس تو اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کے لئے زمین کی پیداوار سے

سامان رزق مہیا کر دے تا کہ تیرے شکر گزار رہوں!

زمزم کے چشمہ کا پھوٹنا

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسمٰعیل کو دودھ پلاتی رہیں، لیکن وہ وقت بھی آ گیا کہ پانی رہا نہ کھجوریں تب وہ سخت پریشان ہوئیں چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لئے دودھ بھی نہ اترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا جب حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ، اسمٰعیل کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں تا کہ اس حالت زار میں اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آ جائے یا پانی نظر آ جائے مگر کچھ نظر نہ آیا، پھر بچہ کی محبت میں دوڑ کر وادی میں گئیں، اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں اور وہاں بھی جب کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچہ کے پاس آ گئیں اور اس طرح سات مرتبہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ "سعی بین الصفا والمروہ" ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں، آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے کان لگایا تو پھر آواز آئی ہاجرہ...... لگیں اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز سنی گئی دیکھا تو اللہ کا فرشتہ (جبریل) ہے فرشتہ نے اپنا پیر (یا ایڑی) اس جگہ مارا جہاں زمزم ہے اس جگہ سے پانی ابلنے لگا ہاجرہ نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر ابلتا رہا، اس جگہ پہنچ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ام اسمٰعیل پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں اور اس کی چار جانب باڑ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا ہاجرہ نے پانی پیا اور پھر اسماعیل کو دودھ پلایا، فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا خوف اور غم نہ کر، اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچہ کو ضائع نہ کرے گا، یہ مقام "بیت اللہ" ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسماعیل) اور اس کے باپ ابراہیم کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا بیت اللہ کی یہ جگہ قریب

کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب داہنے بائیں اس حصہ کو برابر کرتا جارہا تھا۔

قبیلہ جرہم کی آبادی

اسی دوران میں ہی بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آ کر ٹھہرا' دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرند اڑ رہے ہیں جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے' وہاں ضرور پانی موجود ہے جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی' ہاجرہ نے فرمایا قیام کر سکتے ہو' لیکن پانی میں ملکیت کے حصہ دار نہیں ہو سکتے' جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کر لی اور وہیں مقیم ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ خود بھی باہمی انس و رفاقت کے لئے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آ کر مقیم ہو' اس لئے انہوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دے دی' جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بلا لیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے سہنے لگے ان ہی میں اسمٰعیل بھی رہتے اور کھیلتے اور ان سے ان کی زبان سیکھتے۔

حضرت اسمٰعیل کی شادی

جب اسمٰعیل بڑے ہو گئے تو ان کا طرز و انداز اور ان کی خوبصورتی بنی جرہم کو بھائی اور انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی' اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہاجرہ کا انتقال ہو گیا' ابراہیم برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے آتے رہتے تھے' ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسمٰعیل گھر پر نہ تھے ان کی اہلیہ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا کہ گزران کی کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگی، سخت مصیبت و پریشانی میں ہیں اور سخت دکھ اور تکلیف میں، ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا اسمٰعیل سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر دو' اسمٰعیل علیہ السلام واپس آئے تو ابراہیم علیہ السلام کے نور نبوت کے اثرات پائے' پوچھا کہ کوئی شخص یہاں آیا تھا' بی بی نے سارا قصہ سنایا اور پیغام بھی' اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ابراہیم تھے اور ان کا یہ مشورہ ہے کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں لہٰذا میں تجھ کو جدا کرتا ہوں۔

اسمٰعیل نے پھر دوسری شادی کر لی' ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام پھر اسمٰعیل علیہ السلام

کی غیبت میں آئے اور اسی طرح ان کی بی بی سے سوالات کئے' بی بی نے کہا اللہ کا شکر و احسان ہے اچھی طرح گزر رہی ہے' دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسمٰعیل کی بی بی نے جواب دیا' گوشت' ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اور پینے کو؟ اس نے جواب دیا پانی تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی۔

اللہ تعالیٰ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا' حضرت اسمٰعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بی بی نے تمام واقعہ دہرایا اور پیغام بھی سنایا' اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ تو میری زندگی بھر رفیقہ حیات رہے (الخ)

حضرت اسماعیل وادی میں کس عمر میں گئے تھے

مذکورہ بالا یہ طویل روایت بخاری کتاب الرویا اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں سے یہی ثابت ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام وادی غیر ذی زرع بن کھیتی کی سرزمین یعنی مکہ میں بحالت شیر خوارگی پہنچے تھے۔

مگر سید سلیمان ندوی' ارض القرآن میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت سن رشد کو پہنچ چکے تھے اور قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ط قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا. اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ

الصّٰلِحِیْنَ وَبٰرَکْنَا عَلَیْہِ وَعَلٰی اِسْحٰقَ (الصافات ۳۷ آیت ۱۰۰-۱۱۳)

اے پروردگار! عطا کر مجھ کو نیک لڑکا پس بشارت دی ہم نے اس کو بردبار لڑکے کی پھر جب پہنچا وہ اس سن کو کہ باپ کے ساتھ دوڑے تو باپ نے کہا' میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں دیکھو تم کیا سمجھتے ہو بیٹے نے کہا' میرے باپ جو حکم کیا گیا ہے کہ گزرو مجھے صابر پاؤ گے اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی بشارت دی جو نبی ہوگا اور نیکو کاروں میں سے ہوگا اور اس پر اسحٰق پر برکت نازل کی۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ (ابراہیم ۱۴' آیت ۳۷)

اے ہمارے پروردگار! میں نے بسا دیا ہے اپنی اولاد میں سے بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس (اور آخر میں ہے)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ (ابراہیم ۱۴' آیت ۳۹)

سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے بخشا مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق کو۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں "**بلغ معه السعی**" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) سن رشد تک حضرت ابراہیم کے ساتھ رہے اور آخر کی آیت بتاتی ہے کہ اسحٰق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام اسحٰق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے۔

اور سورہ ابراہیم کی آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل جب مکہ میں لائے گئے ہیں تو وہ سن رشد کو پہنچ چکے تھے تب ہی تو ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔

اس استدلال کے بعد سید صاحب بخاری کی روایت کو ابن عباس رضی اللہ عنہ پر موقوف اور اسرائیلیات سے قرار دیتے ہیں مگر سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

اول' اس لئے کہ صافات میں "**بلغ معه السعی**" کا یہ مطلب لینا کہ اسمٰعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر سایہ فلسطین ہی میں پرورش پاتے رہے' تب صحیح ہو سکتا تھا کہ اس جملہ کے بعد آیت میں کوئی دوسرا جملہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مکہ پہنچنے کے متعلق مذکور ہوتا کہ ذبح اسمٰعیل کے واقعہ کے ساتھ صحیح جوڑ لگ سکتا' کیونکہ اس پر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے اور سید صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذبح اسمٰعیل کا واقعہ مکہ کی زندگی سے وابستہ ہے اور آیت یہ کہتی ہے کہ "جب اسمٰعیل علیہ السلام سن رشد کو پہنچے تو ان کے باپ نے ان سے اپنا خواب بیان کیا" پس سید صاحب کی توجیہ کے مطابق اس آیت میں سخت ابہام ہے' حالانکہ قرآن عزیز کے طرز خطابت اور اصول بیان کے یہ قطعاً خلاف ہے کہ ایک آیت کے اندر اس طرح کا ابہام پیدا کر دے جس سے دو اہم زندگیوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہ ہو سکے۔

دوم۔ اس لئے کہ صافات میں اسمٰعیل علیہ السلام سے متعلق جس واقعہ کا ذکر ہے' وہ "ذبح عظیم" کا تذکرہ ہے نہ کہ مکہ پہنچنے کا اور وہ بلاشبہ اسمٰعیل علیہ السلام کے سن رشد کا زمانہ ہے اور اسحٰق علیہ السلام اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ ہاجرہ اور اسمٰعیل کو مکہ کے بیابان وصحراء میں چھوڑ آئے تھے لیکن باپ تھے' نبی و پیغمبر تھے اہلیہ اور بیٹے کو کیسے بھول سکتے' اور ان کی نگہداشت سے کیسے بے پرواہ ہو سکتے تھے' وہ برابر اس بے آب و گیاہ صحراء میں آتے رہتے اور اپنے خاندان کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور آیت "**بلغ معه السعی**" سے یہی مراد ہے لہٰذا اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر بالکل برمحل ہے خود سید صاحب تورات کے ایک فقرہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تورات میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ آئے تھے لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے نرینہ بچہ کو جس کی پیدائش کی اس نے خود دعا کی ہو' جس کے لئے زندگی اس نے اللہ سے مانگی ہو' اس کو تنہا بے آب وگیاہ مقام میں ہمیشہ کے لئے جانے دے (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۷)

اسی طرح سورہ ابراہیم کی آیت میں "**عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ**" کے بعد یہ جملہ ہے۔

رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ

(ابراہیم ۱۴' آیت ۳۷)

اے ہمارے پروردگار (میں نے کعبہ کے پاس ان کو اس لئے بسایا) تا کہ یہ نماز کو قائم کریں پس تُو لوگوں کو ان کی طرف پھیر دے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد سے متعلق ہے اور آیت کا سیاق وسباق صاف صاف اسی پر دلالت کرتا ہے' اس میں قیام صلوٰۃ کا ذکر ہے اس میں حج کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہاں کے بسنے والوں کے لئے رزق کی وسعت کی تمنا جھلکتی ہے اور یہ سب باتیں جب ہی موزوں ہو سکتی ہیں کہ بیت اللہ اپنی تعمیر کے ساتھ موجود ہو' البتہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی اس دعاء کا ذکر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کو یہاں چھوڑتے وقت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی وہ اسی کے قریب قریب تھی اس لئے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس آیت کو بطور استشہاد نقل کر دیا گیا ہے' یہ مطلب نہیں ہے کہ بعینہ یہی وہ دعا ہے جو اس وقت انہوں نے مانگی تھی اور اس میں اسحٰق کا بھی ذکر تھا' جب ابن عباس رضی اللہ خود روایت کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ اسمٰعیل کی شیرخوارگی کا ہے تو وہ کس طرح یہ کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ایسی دعا مانگی کہ جس کے آخر میں اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اسحٰق کی ولادت کا بھی ذکر تھا۔

سوم۔ اس بن کھیتی کی سرزمین (مکہ) کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں شور پانی کے سوائے شیریں پانی کا نام ونشان نہیں ہے اور آج بھی آلات جدیدہ کی اعانت کے باوجود اس زمین سے شیریں پانی کا اخراج ناممکن بنا ہوا ہے تو ''زمزم'' کا وجود یہاں کیسے ہوا؟ یہ مذہبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے اہم سوال ہے' سو اس کے متعلق اگرچہ آیات قرآنی کوئی تصریح نہیں کرتیں' مگر بخاری کی یہی ابن عباسؓ والی ہر دو روایات اس کے وجود کی تاریخ بیان کرتی ہیں جس میں حضرت اسمٰعیل کو شیرخوار ظاہر کرتی ہیں۔

بہرحال اگرچہ قرآن عزیز کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس سرزمین (مکہ) میں کس سن میں پہنچائے گئے مگر بخاری کی روایات کہتی ہیں کہ یہ زمانہ

اسمٰعیل کی شیر خوارگی کا تھا اور یہی صحیح ہے پس ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اسرائیلیات میں سے نہیں ہے بلکہ زبانِ وحی ترجمان کی بیان کردہ تفصیلات کی صحیح ترجمانی ہے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بشارت

قرآن عزیز نے حضرت اسمٰعیل کی ولادت کے متعلق ان کا نام لے کر صاف صاف کوئی ذکر نہیں کیا' البتہ بغیر نام لئے ہوئے ان کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ موجود ہے۔

ابراہیم علیہ السلام ابھی تک اولاد سے محروم ہیں اس لئے درگاہ الٰہی میں ایک نیک اور صالح فرزند کے لئے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ولادت فرزند کی بشارت دیتا ہے۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ

(الصافات ۳۷' آیت ۱۰۰۔۱۰۱)

اے پروردگار مجھ کو ایک نیکو کار لڑکا عطا کر پس ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

یہ ''غلام حلیم'' کون ہے؟ وہی اسمٰعیل جو ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوا اس لئے کہ قرآن عزیز کی اس آیت سے دوسری آیت کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر ہے۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰٓی اِسْحٰقَ

(الصافات ۳۷' آیت ۱۱۲۔۱۱۳)

اور بشارت دی ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی جو نیکو کاروں میں سے ہوگا نبی ہوگا اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحٰق پر

پس جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابھی دو بیٹے تھے اسمٰعیل اور اسحٰق اور تورات و تاریخ کی متفقہ نقول کے پیش نظر اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے تو صاف ظاہر ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں جس لڑکے کی بشارت مذکور ہے اس سے حضرت اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کون مراد ہو سکتا ہے؟

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو مکہ میں آباد کیا تھا تو ان کے لئے دعا

کرتے ہوئے اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراہیم ۱۴ آیت ۳۹)

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق عطا کئے یہ آیت بھی اسی بات کی تصدیق کرتی ہے کہ الصافات کی آیت میں جس بشارت کا ذکر ہے اس سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

ختنہ

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال ہوئی اور حضرت اسمٰعیل کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو، ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم میں پہلے اپنی ختنہ کیں اور اس کے بعد اسمٰعیل علیہ السلام اور تمام خانہ زادوں اور غلاموں کی ختنہ کرائیں۔

"تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زرخریدوں کو یعنی ابراہام کے گھر کے لوگوں میں جتنے مرد تھے سب کو لیا اور اسی روز ان کا ختنہ کیا جس طرح اللہ نے اس کو فرمایا تھا جس وقت ابراہام کا ختنہ ہوا وہ ننانوے برس کا تھا اور جب اس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا (پیدائش باب نمبر ۱۷ آیات ۲۳، ۲۵) یہی رسم ختنہ آج بھی ملت ابراہیمی کا شعار ہے اور سنت ابراہیمی کے نام سے مشہور ہے۔

ذبح عظیم

مقربین بارگاہ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے ان کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گزرنا پڑتا اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم گروہ انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لئے ان کو بھی مختلف آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا، اور اپنی جلالت قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و

مکمل ثابت ہوئے۔

جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت جس صبر اور رضاء بہ قضاء الٰہی کا انہوں نے ثبوت دیا اور جس عزم واستقامت کو پیش کیا وہ انہیں کا حصہ تھا اس کے بعد جب اسمٰعیل اور ہاجرہ کو فاران کے بیابان میں چھوڑنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا' آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا' بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز' راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم وچراغ اسمٰعیل کو صرف حکم الٰہی کی تعمیل وامتثال میں ایک بے آب وگیاہ جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھے پھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقت پدری جوش میں آ جائے اور امتثال امر الٰہی میں کوئی لغزش ہو جائے۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے' جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گزار اور جاں گسل امتحان ہے' یعنی حضرت ابراہیم تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابراہیم! تُو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء علیہم السلام کا خواب

''رویاء صادقہ'' اور وحی الٰہی ہوتا ہے اس لئے ابراہیم علیہ السلام رضاء وتسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے کہ اللہ کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کریں مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزو ''بیٹا'' تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا' اس لئے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور اللہ کا حکم سنایا' بیٹا ابراہیم جیسے مجدد انبیاء ورسل کا بیٹا تھا فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا کہ اللہ کی یہی مرضی ہے تو ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے جنگل روانہ ہو گئے باپ نے بیٹے کی مرضی پا کر مذبوح جانوروں کی طرح ہاتھ پیر باندھے' چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے' فوراً اللہ کی وحی ابراہیم پر نازل ہوئی اے ابراہیم! تُو نے اپنا خواب سچ کر دکھلایا' بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس

جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے میں ذبح کر' ہم نیکو کاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں' ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس مینڈھے کو ذبح کیا۔

(یہی وہ "قربانی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے لئے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ "شعار" اسی طرح منایا جاتا ہے۔)

ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے "ذبیح" کون ہے اسمٰعیل علیہ السلام یا اسحٰق علیہ السلام؟

قرآن عزیز نے اگرچہ "ذبیح" کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے بغیر کسی کج و کاوٗ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نص قرآن اسمٰعیل کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے۔

والصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ط قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْ يَا. اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ (الصافات ۳۷ آیت ۱۰۰۔۱۱۳)

اے پروردگار! مجھ کو ایک نیکو کار لڑکا عطا کر' پس بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے

کی' پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے ابراہیم نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے؟ کہا ''اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ کر' اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضاء و تسلیم کو اختیار کر لیا اور پیشانی کے بل اس (بیٹے) کو پچھاڑ دیا' ہم نے اس کو پکارا' اے ابراہیم! تُو نے خواب سچ کر دکھایا' بیشک ہم اسی طرح نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں' بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (مینڈھے) کے ساتھ اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو' اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں' بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔ اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحٰق کی جو نبی ہوگا اور نیکو کاروں میں سے ہوگا اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحٰق پر۔

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا نام نہیں لیا اور ''غلام حلیم'' کہہ کر اس کے ذبح عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں اسمٰعیل و اسحٰق میں سے اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے' پس جبکہ چھوٹے لڑکے کا ذکر بعد کی آیات میں نام لیکر کر دیا گیا تو پہلی آیت میں اسمٰعیل کے علاوہ اور کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہیں جنہوں نے سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ کہہ کر اور وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ کا مظاہرہ کر کے وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کا اعزاز حاصل کیا' علاوہ ازیں صرف قرآن عزیز ہی اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح نہیں کہتا بلکہ تورات کی عبارت کا اگر غور سے مطالعہ کیجئے تو وہ بھی یہی بتاتی ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اور صرف اسمٰعیل ہی ذبیح ہیں۔

''ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ اللہ نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا کہ تُو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے جس کو تُو پیار کرتا ہے ''لے'' اور زمین موریا میں جا اور اسے

وہاں پہاڑوں میں سے ایک جو میں تجھے بتاؤں گا' سوختنی قربانی کے لئے چڑھا۔"
(تورات پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۔۲)

"تب خداوند کے فرشتے نے دوبارہ آسمان پر سے ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے اس لئے کہ تُو نے ایسا کام کیا اور اپنا اکلوتا ہی بیٹا" دریغ نہ رکھا' میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا" (ایضاً باب ۲۲۔آیت ۱۵۔۱۶)

تورات کی ان ہر دو عبارات کے نشان زدہ فقروں "اپنے اکلوتے بیٹے" اور "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" کو دیکھیے اور پھر تورات کی ان گزشتہ کو پڑھیے کہ جس میں اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا بتایا گیا ہے کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام جب چودہ برس کے ہو چکے ہیں تب اسحٰق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے' کیا ان سے یہ صاف طور پر واضح نہیں ہوتا کہ "ذبیح" جیسے اعزاز کو بنی اسرائیل کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہ غلط حرص تھی جس نے یہود کو اس تحریف پر آمادہ کیا کہ انہوں نے اس عبارت میں "اکلوتے بیٹے" کے فقرے کے ساتھ اسحٰق" کا نام بے محل جوڑ دیا؟ پس یہ اضافہ تورات کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور نص قرآنی کے بھی اور واقعہ وحقیقت کے بھی خلاف ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذبیح اللہ" کا عظیم الشان شرف اسمٰعیل علیہ السلام ہی کے لئے مقسوم تھا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُوا لْفَضْلِ الْعَظِيْمِ
(الجمعۃ ۶۲۔آیت ۴)

یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اس کو دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

سخت تعجب ہے چند علماء اسلام بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ "ذبیح" اسمٰعیل نہ تھے اسحٰق تھے اور جو دلائل انہوں نے اس میں بیان کئے ہیں افسوس کہ ہم ان سے متفق نہیں ہو سکتے' کیونکہ ان کی بنیاد و اساس محض وہم وظن پر قائم ہے نہ کہ یقین کی روشنی پر۔

مثلاً ان کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ "والصافات" کی مسطورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ میں کوئی نام مذکور نہیں ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اس کے ذبح سے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ تو کیا "غلام حلیم" بھی یہی اسحٰق نہیں ہیں؟ مگر آپ خود اندازہ کیجئے کہ یہ کس قدر غلط استدلال ہے اول ان آیات کے سیاق وسباق کا مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ کے بعد "وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ" کو عطف کے ذریعے جس طرح جدا کیا گیا ہے عربی اصول نحو کے مطابق کون سی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جائے خصوصاً جب کہ دونوں کی بشارت کے ذکر کے ساتھ ساتھ جدا جدا ان کے اوصاف بھی بیان کئے گئے ہیں۔

صاحب قصص الانبیاء عبدالوہاب نجار نے اس موقع پر آیت "وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى اِسْحٰقَ میں علیه کی ضمیر "ذبیح" کی جانب راجع کی ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے "ہم نے برکت نازل کی اس "ذبیح" پر اور اسحٰق پر اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر اس بات کے لئے "نص" ہے کہ صاحب قصہ لڑکا اسحٰق کے علاوہ ہے اور وہ صرف اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ مکہ کے قریب منیٰ میں پیش آیا ہے اور تورات کا جملہ "اکلوتا بیٹا" اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ ابھی تک حضرت اسحٰق کی ولادت بھی نہیں ہوئی لہذا تورات کا اس واقعہ کو موریا کے قریب بتانا اسی قسم کی تحریف ہے جس سے تورات کا کوئی باب خالی نہیں اور جس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔

کعبہ کی تعمیر

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکہ میں ہاجرہ و اسمٰعیل کو دیکھنے آتے رہتے تھے اسی اثناء میں ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ "کعبۃ اللہ" کی تعمیر کرو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے "بیت اللہ" کی تعمیر شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ایک روایت نقل کی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اور ملائکۃ اللہ نے ان کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اس کو بے نشان کر دیا' البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا' یہی وہ مقام ہے جس کو وحی الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انہوں نے اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے اس کو کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں' انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی مگر قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

حاصل یہ کہ اس واقعہ سے قبل تمام کائنات اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لئے ہیکل اور مندر موجود تھے اور ان ہی کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

مگر ان سب کے برعکس صرف اللہ واحد کی پرستش اور اس کی یکتائی کے اقرار میں سر نیاز جھکانے کے لئے یا یوں کہیے کہ توحید الٰہی کی سربلندی کے اظہار کے لئے دنیا کے بت کدوں میں پہلا گھر جو اللہ کا گھر کہلایا وہ یہی "بیت اللہ" ہے

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا اللہ کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ۳' آیت ۹۶)

بیشک سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لئے (اللہ کی یاد کے لئے) بنایا گیا البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے' وہ سرتاپا برکت ہے اور جہاں والوں کے لئے ہدایات کا (سرچشمہ)

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اس کا معمار ہے اور اسمٰعیل جیسا نبی و ذبیح اس کا مزدور' باپ بیٹے برابر اس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اس کی دیواریں اوپر اٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے جس کو اسمٰعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ

سے سہارا دیتے اور ابراہیم علیہ السلام اس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں' یہی وہ یادگار ہے جو آج مقام ابراہیم کے نام سے موسوم ہے' جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبریل امین نے ان کی رہنمائی کی اور حجر اسود کو ان کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی دعا

بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ وہ ملت ابراہیمی کے لئے (قبلہ) اور ہمارے سامنے جھکنے کا نشان ہے' اس لئے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے تب ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی ذریت کو اقامت صلوٰۃ' زکوٰۃ کی ہدایت دے اور استقامت بخشے اور ان کے لئے پھلوں' میووں اور رزق میں برکت عطا فرمائے اور تمام اقطاع عالم کے بسنے والوں میں سے ہدایت یافتہ گروہ کو اس طرف متوجہ کرے کہ وہ دور دور سے آئیں اور مناسک حج ادا کریں اور ہدایت و رشد کے اس مرکز میں جمع ہو کر اپنی زندگی کی سعادتوں سے دامن بھریں۔

قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر' تعمیر کے وقت ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام کی مناجات' اقامت صلوٰۃ اور مناسک حج کے ادا کے لئے شوق و تمنا کے اظہار اور بیت اللہ کے مرکز توحید ہونے کے اعلان کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور نئے نئے اسلوب و طرز ادا سے اس کی عظمت اور جلالت و جبروت کو ان آیات میں واضح فرمایا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ

بلاشبہ پہلا گھر جو انسانوں کے لئے (اللہ پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے' برکت والا اور تمام انسانوں کے لئے سرچشمہ ہدایت اس میں (دین حق) کی روشن نشانیاں ہیں از انجملہ مقام ابراہیم ہے (یعنی ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ' جو اس وقت سے لے کر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے اور (از انجملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کی حدود میں داخل ہوا' وہ امن و حفاظت میں آ گیا اور (از انجملہ یہ کہ) اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے یہ بات ضروری ہو گئی کہ اگر اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں' بایں ہمہ جو کوئی (اس

حقیقت سے) انکار کرے (اور اس مقام کی پاکی وفضیلت کا اعتراف نہ کرے) تو یاد رکھو اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے (وہ اپنے کاموں کے لئے کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں!)

اور بقرہ میں ہے کہ: اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر (یعنی خانہ کعبہ) کو انسانوں کی گروہ آوری کا مرکز اور امن وحرکت کا مقام ٹھہرا دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لئے) نماز کی جگہ بنائی جائے اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں' عبادت کے لئے ٹھہرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے (ہمیشہ) پاک رکھنا اور ظلم و معصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا! اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے اللہ کے حضور دعا مانگی تھی اے پروردگار! اس جگہ کو جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی اور شادابی سے یک قلم محروم ہے امن وامان کا ایک آباد شہر بنا دے اور اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں ان کے رزق کے لئے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے! اس پر ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ تمہاری دعا قبول کی گئی اور یہاں کے باشندوں میں سے جو کوئی کفر کا شیوہ اختیار کرے گا' سو اسے بھی ہم سروسامان رزق سے فائدہ اٹھانے دیں گے البتہ یہ فائدہ اٹھانا بہت تھوڑا ہوگا' کیونکہ بالآخر اسے پاداش عمل میں چار و ناچار دوزخ میں جانا ہے اور جو بدبخت نعمت کی راہ چھوڑ کر عذاب کی راہ اختیار کر لے تو کیا ہی بری اس کی راہ ہے اور کیا ہی برا اس کا ٹھکانا ہے! اور پھر دیکھو وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا اور اسمٰعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا ان کے ہاتھ تو پتھر چن رہے تھے' اور دل وزبان پر یہ دعا طاری تھی! اے ''پروردگار! ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تُو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور مصالح عالم کا جاننے والا ہے اے پروردگار اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! اللہ ہماری عبادت کے سچے طور طریقے بنا دے اور ہمارے قصوروں

سے درگزر کر بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اے الٰہی اپنے فضل و کرم سے ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے کتاب اور حکمت کی انہیں تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے۔

اور سورۃ الحج میں ہے کہ: اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی ور حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر اور ان لوگوں کے لئے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! (اور حکم دیا کہ) ''لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے پاپیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر جو (مشقت سفر سے) تھکی ہوئی ہوں گی وہ اس لئے آئیں گے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر ہو جائیں اور ہم نے جو پالتو جانور پائے ان کے لئے مہیا کر دیئے ہیں ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور فقیروں کو بھی کھلاؤ پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم ولباس کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اتار دیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور اس خانہ قدیم (یعنی خانہ کعبہ) کے گرد پھیرے پھر لیں'' تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سنا دیا گیا ہے تمام چارپائے تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں پس چاہئے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو نیز جھوٹ بولنے سے صرف اللہ ہی کے ہو کر رہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا حال ایسا سمجھو جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا جو چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی پرندا اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لے جا کر پھینک دے گا! (مال حقیقت) یہ ہے پس یاد

رکھو جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے' ان چارپایوں میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لئے طرح طرح کے فائدے ہیں پھر اس خانہ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔

نیز سورہ حج کی آیت ۳۶' ۳۷ میں ہے کہ: اور دیکھو قربانی کے یہ اونٹ جنہیں دور دور سے حج کے موقع پر لایا جاتا ہے تو ہم نے اسے ان چیزوں میں سے ٹھہرا دیا ہے جو تمہارے لئے اللہ کی عبادت کی نشانیوں میں سے ہیں اس میں تمہارے لئے بہتری کی بات ہے پس چاہئے کہ انہیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو' پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں یعنی ذبح ہو جائیں تو ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ' اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ احسان الٰہی کے شکر گزار رہو! یاد رکھو اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون' اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تو صرف تمہارا تقویٰ ہے یعنی تمہارے دل کی نیکی ہے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ اللہ کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار رہو اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو اور نیک کرداروں کے لئے قبولیت حق کی خوش خبری ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن عزیز یا احادیث نبوی میں تفصیل کے ساتھ نہیں آتا' البتہ تورات نے ان کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے تورات کے قول کے مطابق اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جد قبیلہ بنے اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ یا محلاۃ تھا۔ اور ابراہام کے بیٹے اسمٰعیل کا جسے سری کی لونڈی مصری ہاجرہ ابراہیم کے لئے جنی تھی یہ نسب نامہ ہے اور یہ اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبایوت' قیدار' راوبئیل' ہشام' مشماع' رومہ' منشا' عدار' تیما' یطور' نافیش' قیدما یہ اسمٰعیل کے بیٹے ہیں اور ان کے نام کی بستیوں اور قلعوں میں یہ ہیں اور یہ اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے۔

ان میں دو بڑے بیٹے نابت یا نبایوت اور قیدار بہت مشہور ہیں اور ان کا ذکر تورات میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے اور عرب مؤرخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں یہی وہ نابت ہیں جن کی نسل اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئی ان کے علاوہ دوسرے بھائیوں اور ان کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

قرآن عزیز میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تذکرہ

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں متعدد بار ہوا ہے' ان میں سے ایک جگہ صرف اوصاف مذکور نہیں ہیں' یہ ''ذبح عظیم'' والی آیت ہے اور دو مقام پر اس بشارت کے موقع پر ذکر آیا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی پسری اولاد کی بشارت دی گئی ہے اور سورہ مریم میں ان کا نام لے کر ان کے اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا
وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا

(مریم ۱۹' آیت ۵۴-۵۵)

اور یاد کر کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر تھا وہ وعدہ کا سچا تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے اہل کو نماز کا اور زکوٰۃ کا اور تھا وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی وفات

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر جب ایک سو ۳۶ سال کی ہوئی تو ان کا انتقال ہو گیا' اس وقت ان کے سامنے ان کی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز' شام' عراق' فلسطین اور مصر تک پھیلی۔

تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قبر فلسطین ہی میں ہے اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور عرب مورخین کہتے ہیں کہ وہ اور ان کی والدہ ہاجرہ بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں۔

حضرت اسحاق علیہ السلام

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت سنائی کہ سارہ کے بطن سے بھی تیرے ایک بیٹا ہوگا اس کا نام اسحٰق رکھنا۔

"اور اللہ نے ابراہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اس کو سری مت کہا کر بلکہ اس کا نام سرہ ہے اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی' اور ملکوں کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے تب ابراہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کو بیٹا پیدا ہوگا اور کیا سارہ جو نوے برس کی ہے بیٹا جنے گی؟ اور ابراہیم نے اللہ سے کہا کہ کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے تب اللہ نے کہا کہ بے شک تیری جورو سرہ تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اسکا نام اضحق رکھنا" (باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹)

اور قرآن عزیز کی سورہ ہود آیت ۶۹ تا ۷۳ میں ہے کہ: اور بلا شبہ ہمارے ایلچی (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے انہوں نے ابراہیم کو سلام کیا اور ابراہیم نے سلام کہا' تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم بچھڑے کا بھنا گوشت لایا اور جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے تو ان کو اجنبی محسوس کیا اور ان سے خوف کھایا' وہ کہنے لگے خوف نہ کرو ہم لوط کی قوم پر عذاب کے لئے بھیجے گئے ہیں اور ابراہیم کی بیوی سارہ کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی پس ہم نے اس کو اسحٰق کی اور اس کے بعد اس کے بیٹے یعقوب کی بشارت دی' سارہ کہنے لگی کیا میں نگوڑی بڑھیا جنوں گی اور جب کہ یہ ابراہیم میرا شوہر بھی بوڑھا ہے واقعی یہ تو بہت عجیب بات ہے' فرشتوں نے کہا کیا تو اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہے اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمت و برکت ہو' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر طرح قابل حمد ہے اور بہت بزرگ۔

اور سورۃ الذاریات آیت ۵۱ میں ہے کہ: پس محسوس کیا ابراہیم نے ان سے خوف' وہ

فرشتے کہنے لگے خوف نہ کھا اور بشارت دی اس کو ایک سمجھ دار لڑکے کی' پس آئی بی بی سارہ ابراہیم کی سخت بے چینی کا اظہار کرتی ہوئی پھر پیٹ لیا اس نے اپنا منہ اور کہنے لگی بانجھ بڑھیا اور بچہ فرشتوں نے کہا تیرے پروردگار نے یہی کہا ہے' ایسا ہی ہوگا وہ دانا ہے' حکمت والا ہے۔

اور سورہ الحجر میں ہے کہ: ابراہیم نے کہا بے شک مجھ کو تم سے خوف معلوم ہوتا ہے' فرشتوں نے کہا ہم سے نہ ڈر بلاشبہ ہم تجھ کو ایک سمجھ دار لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں' اور ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ کو اس بڑھاپا آ جانے پر بھی بشارت دیتے ہو یہ کیسی بشارت دے رہے ہو؟ فرشتوں نے کہا کہ ہم تجھ کو حق بات کی بشارت دے رہے ہیں پس تُو ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو ابراہیم نے کہا اور نہیں ناامید ہوتے اپنے پروردگار کی رحمت سے مگر گمراہ۔

ختنہ: جب حضرت اسحٰق آٹھ دن کے ہوئے تو حضرت ابراہیم نے ان کی ختنہ کرا دیئے اور ابراہیم نے جیسا کہ اللہ نے اسے حکم دیا تھا اپنے بیٹے اسحٰق کا جب وہ آٹھ دن کا ہوا ختنہ کیا۔

اسحٰق نام کی وجہ

اسحٰق اصل تلفظ کے اعتبار سے "یصحق" ہے یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ "یضحک" (ہنستا ہے) ہوتا ہے۔

اللہ کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سو برس اور حضرت سارہ کو نوے سال کے سن میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اچنبھا سمجھا تھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آ گئی تھی اس لئے ان کا یہ نام تجویز ہوا' یا اس لئے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔

عربی قاعدہ سے "یصحق" مضارع کا صیغہ ہے' اہل عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں' چنانچہ یعرب' یملک جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔

اسحٰق علیہ السلام کی شادی

قرآن عزیز میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے' البتہ تورات میں اس سلسلہ میں ایک

طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحٰق کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہ کروں گا بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لئے تو ساز و سامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحٰق سے کر دے اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحٰق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کر دے' الیعزر حضرت ابراہیم کے حکم کے مطابق فوراً فدانِ آرام کو روانہ ہو گیا جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تا کہ حالات معلوم کرے' الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا' اسی کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا الیعزر بھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لئے جا رہی تھی۔ الیعزر نے اس سے پانی مانگا لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر دریافت کیا الیعزر نے بتوئیل کا پتہ کیا لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بنا کر لے گئی مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی لابان نے الیعزر کی بے حد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی' الیعزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام سنایا لابان کو اس پیغام سے بے حد مسرت ہوئی اور اس نے بہت سا ساز و سامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد

رفقہ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے توام دو لڑکے علی الترتیب عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے اس وقت حضرت اسحٰق علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال کی تھی اسحٰق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے زیادہ پیار رکھتی تھیں عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوب خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا اور یعقوب سے کہنے لگا میں ماندہ ہوں اور آج شکار بھی

ہاتھ نہ آیا تو اپنے کھانے مسور اور لپسی میں سے مجھے بھی کچھ دے' یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لئے باپ کا وارث تو ہوگا اگر تو اس حق سے دستبردار ہو جائے تو میں تجھ کو کھانا کھلاؤں گا عیسو نے کہا مجھے اس میراث کی کوئی پرواہ نہیں تو ہی وارث ہو جانا تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرت اسحٰق علیہ السلام نے جبکہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہو گئے تھے یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں' اور اس سے کہا کہ جا شکار کر کے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر رفقہ نے یہ سنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے' فوراً یعقوب کو بلا کر کہا کہ جلدی عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے لے جا اور دعاء برکت کا طالب ہو یعقوب نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحٰق سے دعاء برکت حاصل کر لی جب عیسو آیا اور اس نے سب قصہ سنا تو انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوب سے کینہ رکھنے لگا۔ تب رفقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لئے چلا جائے۔ یعقوب ماموں کے یہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گزاری اور یکے بعد دیگرے لابان کی دونوں لڑکیوں لیئہ اور راحیل سے شادی کر لی۔

یہ روایت اگر چہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ ناقابل اعتماد ہے اور اس میں جو اخلاقی زندگی پیش کی گئی ہے وہ تورات کی دوسری محرف روایات کی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاندان کے شایان شان بھی نہیں ہے' مگر اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شادی ان کے ماموں کے یہاں ہوئی اور وہ ایک عرصہ تک ان کے پاس رہے۔

اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں ان کی صاحبزادی بشامہ یا باسمہ یا محلاۃ (جو بھی نام صحیح ہو) سے شادی کر لی اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں' اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر (یا ساعیر) کو اپنا وطن بنا لیا اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لئے ان کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

نسب نامہ: حضرت یعقوب حضرت اسحٰق کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بتوئیل کے نواسہ' ان کی والدہ کا نام رفقہ یا ربقہ تھا یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے اور ان کا حقیقی بھائی عیسو والد کا محبوب اور پیارا اور دونوں حقیقی بھائی تھے۔

توراۃ سے ان دونوں بھائیوں کی باہم ناراضی کا واقعہ گزشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے حضرت یعقوب اپنی والدہ کے اشارہ پر جب فدان آرام چلے گئے تو ان کے ماموں لابان نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال تک ان کے یہاں رہ کر ان کی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے جب یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی بڑی لڑکی لئیہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رجحان طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا' اس لئے تم اس رشتہ کو منظور کرو اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کرو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جا سکے گی (کیونکہ اس زمانہ میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو بھی پورا کر دیا اور راحیل سے شادی کر لی اور ان دونوں کے علاوہ لئیہ کی خالہ زاد زلفا اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتہ میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے اولاد بھی ہوئی۔ اور بنیامین کے علاوہ یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہی یہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب علیہ السلام وطن واپس آ گئے تو یہاں بنیامین پیدا ہوئے لابان نے یعقوب علیہ السلام کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سا مال و متاع اور ریوڑ دے کر رخصت

کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دار الہجرت فلسطین میں آ کر مقیم ہو گئے۔

یعقوب علیہ السلام جس زمانہ میں فدان آرام چلے گئے تھے' اس زمانہ میں عیسو ناراض ہو کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس آ بسے تھے اور ان کی بیٹی سے شادی کر کے قریب ہی آباد ہو گئے تھے' یہ تاریخ میں ادوم کے نام سے مشہور ہیں' اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپقلش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ پھر استوار ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ تمام واقعات تورات کی کہانی اور داستان ہے قرآن عزیز ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرت یعقوب کے جلیل القدر نبی' صاحب صبر و عزیمت اور یوسف علیہ السلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسی ضمن میں نام لئے بغیر یوسف کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔

ذکر یعقوب قرآن مجید میں

قرآن عزیز میں حضرت یعقوب کا نام دس جگہ آتا ہے اور اگرچہ سورہ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے اور بعض دوسری سورتوں مثلاً ''مؤمنون'' میں اوصاف کے اعتبار سے ان کا تذکرہ موجود ہے مگر نام کے ساتھ صرف دو ہی جگہ ان کا ذکر کیا گیا ہے' مسطورہ ذیل جدول اس کی وضاحت کرتی ہے۔

سورہ	آیت	شمار	سورہ	آیت	شمار
بقرہ	۱۳۲' ۱۳۳' ۱۳۶' ۱۴۰	۴	انبیاء	۷۲	۱
انعام	۸۴	۱	نساء	۱۶۳	۱
مریم	۶' ۴۹	۲	یوسف	۶' ۳۸' ۶۸	۳
ص	۴۵	۱			

اسرائیل

حضرت یعقوب کا نام عبرانی میں اسرائیل ہے' یہ اسرار (عبد) اور ایل (اللہ) دو لفظوں سے مرکب ہے' اور عربی میں اس کا ترجمہ "عبداللہ" کیا جاتا ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ اسحاق خاندان جوان کی نسل سے ہے اسی لئے "بنی اسرائیل" کہلاتا ہے اور آج بھی یہودونصاری کے قدیم خاندان اسی نسبت کے ساتھ منسوب ہیں۔

اولاد یعقوب: یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے اور گزشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ ان کی تمام اولاد فدان آرام ہی میں پیدا ہو چکی تھی صرف بنیامین فلسطین (ارض کنعان) میں پیدا ہوئے حضرت یعقوب کی یہ اولاد چونکہ چند بیبیوں سے ہے اس لئے ان کی تفصیل یہ ہے۔

لئیہ یا لیا بنت لابان سے (۱) راوبین (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہودا (۵) ویسا کر (۶) زلوبون پیدا ہوئے۔

راحیل بنت لابان سے (۷) یوسف (۸) بنیامین پیدا ہوئے

بلہا جاریہ راحیل سے (۹) دان (۱۰) نفتالی

اور زلفا جاریہ لئیہ سے (۱۱) جاد اور (۱۲) اشیر پیدا ہوئے (۱)

پیغمبری

حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے انہوں نے برسوں اس خدمت حق کو انجام دیا قرآن عزیز میں چونکہ ان کا ذکر بیشتر حضرت یوسف کے ساتھ کیا گیا ہے اس لئے وہیں قابل مراجعت ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم کے برادرزادہ ہیں' ان کے والد کا نام ہاران تھا' حضرت لوط کا بچپن حضرت ابراہیم ہی کے زیر سایہ گزرا اور ان کی نشو ونما حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی آغوش تربیت کی رہین منت تھی۔ اسی لئے وہ اور حضرت سارہ ''ملت ابراہیمی'' کے پہلے مسلم اور (السابقون الاولون) میں داخل ہیں۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (آیت مهاجر الی ربی میں وطنی اور روحانی دونوں قسم کی ہجرتیں مراد ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خدا کے دین کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا وطنی ہجرت ہے اور باپ دادا کے قدیم مذہب (مظاہر پرستی) کو چھوڑ کر ملت حنفی کو اختیار کر لینا روحانی ہجرت ہے۔ (العنکبوت ۲۹ آیت ۲۶)

پس ایمان لایا لوط ابراہیم (کے دین) پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب۔

یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب ابراہیم علیہ السلام مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہم سفر تھے۔

تورات میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی ساز وسامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لئے ان کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے حضرت لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا اور دونوں کی صلاح سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت والفت کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی

تبلیغ کریں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت کا پیغام حق سناتے رہیں اور حضرت ابراہیم پھر واپس فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سر بلند کریں۔

شہر سدوم

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں' اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے' سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا' اسی لئے اس کا نام بحر میت اور بحر لوط ہے (بستانی جلد ۹ ص ۵۳۷)

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحر میت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قوم لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گزشتہ دو سو سال کی اثری تحقیق نے بحرِ میت کے ساحل پر لوط کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن عزیز نے کر دیا تھا۔

قوم لوط

لوط علیہ السلام نے جب سدوم میں آ کر قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے فواحش اور معصیتوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ الامان' الحفیظ' دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو ان میں موجود نہ ہو اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو ان میں پائی جاتی ہو' دنیا کی سرکش' متمرد اور بد اخلاق و بد اطوار اقوام کے دوسرے عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی یعنی اپنی نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ عورتوں کی بجائے امرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے' دنیا کی قوموں میں اس عمل کا اس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا' یہی بد بخت قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کی ایجاد کی' اس عمل کا نام ''لواطت'' مشہور ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شرارت' خباثت اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں سمجھتے تھے اور علی الاعلان فخر و مباہات کے ساتھ اس کو کرتے رہتے تھے۔

سورہ اعراف آیت ۸۱/۸۰ میں ہے کہ: ''اور یاد کرو لوط کا واقعہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا' یہ کہ بلاشبہ تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو یقیناً تم حد سے گزرنے والے ہو۔''

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بداعمالیوں کا حال پڑھا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے چنانچہ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آ کر سدوم میں مقیم ہوتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر بے چارہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا اب اگر اس نے اپنے ضیاع مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو ان لٹیروں میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا' لو تمہاری یہ چیز موجود ہے وہ رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اس کو لے کر کیا کروں گا جہاں میرا سارا مال لٹ گیا وہاں یہ بھی سہی' جا تو ہی اپنے پاس رکھ جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج و غم اور غصہ میں اس سے بھی پہلی بات لوٹا کر کہہ دیتا اسی طرح سب اس کا مال ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ کر بھگا دیتے۔

عجیب واقعہ

اسی کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ (رضی اللہ عنہما) نے ایک مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام کی عافیت و خیر کرنے کے لئے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم بھیجا' یہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اس کے سر پر پتھر کھینچ مارا' الیعزر کے سر سے خون جاری ہو گیا تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے یہ تیرا سر سرخ ہوا ہے لہذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر' اور اس مطالبہ کے لئے کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا حاکم سدوم نے مدعی کا بیان سن کر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اجرت دینی چاہیے' الیعزر سن کر غصہ میں آ گیا اور ایک

پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پر دے مارا اور کہنے لگا میرے پتھر مارنے کی جو اجرت ہے وہ تُو اس سدومی کو دے دینا اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہل سدوم اس قدر ظلم، فحش، بے حیائی اور بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اس زمانہ کی قوموں میں ان کی جانب اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کئے جاتے تھے۔

حضرت لوط کی تبلیغ اور قوم کا جواب

ان حالات میں حضرت لوط نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی اور حسن خطابت، لطافت اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے ان کو سمجھایا اور موعظت و نصیحت کی اور گزشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و ثمرات بتا کر عبرت دلائی، مگر ان بدبختوں پر مطلق اثر نہ پڑا بلکہ اس کا یہ الٹا اثر ہوا کہ کہنے لگے۔

مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (الاعراف ۷، آیت ۸۲)

لوط کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے ان (لوط اور اس کے خاندان کو) اپنے شہر سے نکال دو، یہ بیشک بہت ہی پاک لوگ ہیں۔

"بیشک یہ پاک لوگ ہیں" قوم لوط کا یہ مذاقیہ فقرہ تھا، گویا حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان پر طنز کرتے اور ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے کہ بڑے پاکباز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام یا ناصح مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ و غضب میں آ کر کہتے تھے کہ اگر ہم ناپاک اور بے حیا ہیں اور وہ بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی سے کیا واسطہ ان کو یہاں سے نکالو۔

حضرت لوط علیہ السلام نے پھر ایک مرتبہ بھری محفل میں ان کو نصیحت کی اور فرمایا تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق، لوٹ مار اور اسی قسم کی بداخلاقیاں بہت برے اعمال ہیں تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور بھری محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور شرمندہ ہونے کے بجائے بعد میں ان کا ذکر اس طرح سناتے ہو کہ گویا یہ کارنمایاں ہیں جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ. وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ
(العنکبوت ۲۹ آیت ۲۹)

کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تم مردوں سے بدعملی کرتے اور لوگوں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں اور اہل وعیال کے روبرو فواحش کرتے ہو۔

قوم نے اس نصیحت کو سنا تو غم وغصہ سے تلملا اٹھی اور کہنے لگی لوط! بس یہ نصیحتیں اور عبرتیں ختم کر اور اگر ہمارے ان اعمال سے تیرا اللہ ناراض ہے تو وہ عذاب لا کر دکھا جس کا ذکر کر کے بار بار ہم کو ڈراتا ہے اور اگر تُو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارا تیرا فیصلہ ہو جانا ہی اب ضروری ہے۔

فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (العنکبوت ۲۹ آیت ۲۹)

پس اس (لوط) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کہنے لگے تُو ہمارے پاس اللہ کا عذاب لے آ اگر تُو سچا ہے۔

حضرت ابراہیم کے پاس فرشتوں کا آنا

ادھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنگل میں سیر کر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ تین اشخاص سامنے کھڑے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت متواضع اور مہمان نواز تھے اور ہمیشہ ان کا دسترخوان مہمانوں کے لئے وسیع تھا اس لئے ان تینوں کو دیکھ کر وہ بے حد مسرور ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے اور بچھڑا ذبح کر کے تکے بنائے اور بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے مگر انہوں نے کھانے سے انکار کیا یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ کوئی دشمن ہیں جو حسب دستور کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور کچھ خائف ہوئے کہ آخر یہ کون ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب دیکھا تو ان سے ہنس کر کہا۔ کہ آپ گھبرائیں نہیں! ہم اللہ کے فرشتے ہیں اور قوم لوط کی تباہی کے لئے بھیجے گئے ہیں اس لئے سدوم جا رہے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں ہیں بلکہ ملائکۃ اللہ ہیں تو اب ان کی رقت' جذبہ ہمدردی اور محبت وشفقت کی فراوانی غالب آئی اور انہوں نے قوم لوط کی جانب سے جھگڑنا شروع کر دیا اور فرمانے لگے کہ تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جا رہے ہو جس میں لوط جیسا اللہ کا برگزیدہ نبی موجود ہے اور وہ میرا برادر زادہ بھی ہے اور ملت حنیف کا پیرو بھی فرشتوں نے کہا ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ قوم لوط اپنی سرکشی' بدعملی' بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ضرور ہلاک کی جائے گی اور لوط اور اس کا خاندان اس عذاب سے محفوظ رہے گا البتہ لوط کی بیوی قوم کی حمایت اور ان کی بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں شرکت کی وجہ سے قوم لوط کے ساتھ عذاب پائے گی۔

سورہ ہود آیت ۷۴ تا ۷۶ میں ہے کہ: ''پھر جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا اور اس کو ہماری بشارت (ولادت اسحٰق) پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق جھگڑنے لگا' بیشک ابراہیم بردبار' غمخوار' رحیم ہے اے ابراہیم! اس معاملہ میں نہ پڑ' بلاشبہ تیرے رب کا حکم آ چکا ہے اور بلاشبہ ان پر عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔''

اور سورہ ذاریات میں ہے کہ: ''ابراہیم نے کہا اے اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس لئے آئے ہو' انہوں نے کہا'' ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں' یہ نشان کر دیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گزرنے والوں کے لئے۔''

اور سورہ عنکبوت آیت ۳۱' ۳۲ میں ہے کہ: اور جب ہمارے فرشتے' ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے کہنے لگے بیشک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس (سدوم) قریہ کے بسنے والوں کو بلاشبہ اس کے باشندے ظالم ہیں' ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اس بستی میں تو لوط ہے فرشتوں نے کہا ہمیں خوب معلوم ہے جو اس بستی میں آباد ہیں' ہم البتہ لوط کو اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے مگر اس کی بی بی کو نہیں کہ وہ بھی بستی میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے۔

غرض حضرت لوط علیہ السلام کے ابلاغ حق' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قوم پر مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اسی طرح قائم رہی' حضرت لوط علیہ السلام نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن جو اسلام اور صراط مستقیم کی دعوت د

کے لئے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے اس سعی و کوشش کا پیغام کیا؟ کیا کوئی اجرت مانگی؟ کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا؟ میرے پیش نظر تو تمہاری کوئی ثمرہ طلب دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے مگر تم ہو کہ مطلق توجہ نہیں کرتے۔

سورۃ الشعراء آیت ۱۶۰ تا ۱۶۴ میں ہے کہ: ''جھٹلایا قوم لوط نے پیغمبروں کو جب کہ کہا ان کے بھائی لوط علیہ السلام نے کیا تم نہیں ڈرتے، بیشک میں تمہارے لئے پیغمبر ہوں امانت والا، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو اور میں تم سے اس نصیحت پر اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ رب العالمین کے سوائے کسی کے پاس نہیں ہے۔''

مگر ان کے تاریک دلوں پر اس کہنے کا بھی مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ حضرت لوط کو ''اخراج'' اور سنگساری کی دھمکیاں دیتے رہے جب نوبت یہاں تک پہنچی اور ان کی سیاہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا تب ان کو بھی وہی پیش آیا جو اللہ کے بنائے ہوئے قانون جزا کا یقینی اور حتمی فیصلہ ہے یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت۔

فرشتوں سے بدفعلی کے لئے کوشش

ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے روانہ ہو کر سدوم پہنچے اور لوط علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے یہ اپنی شکل و صورت میں حسین و خوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی شکل و صورت میں تھے، حضرت لوط علیہ السلام نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بدبخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی، کیونکہ ابھی تک ان کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ اللہ کے پاکی فرشتے ہیں۔

ابھی حضرت لوط اسی حیص و بیص میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ تم ان کو ہمارے حوالے کر دو، حضرت لوط علیہ السلام نے بہت سمجھایا اور کہا کیا تم میں کوئی بھی سلیم فطرت انسان ''رجل رشید'' نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو بوتے اور حق کو سمجھے؟ تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو اور خواہشات نفس کے ایفاء کے لئے فطرتی طریق عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقہ سے عورتوں کو رفیقہ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہوئے کاش میں ''رکن شدید'' کی زبردست حمایت حاصل کر سکتا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا آپ ہماری ظاہری صورتوں کو دیکھ کر گھبرایئے نہیں ہم ملائکہ عذاب ہیں اور اللہ کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں آپ اور آپ کا خاندان عذاب سے محفوظ رہے گا مگر آپ کی بیوی ان ہی بے حیاؤں کی رفاقت میں رہے گی اور تمہارا ساتھ نہ دے گی۔

عذاب الٰہی

آخر عذاب الٰہی کا وقت آ پہنچا' ابتدا شب ہوئی تو ملائکہ کے اشارہ پر حضرت لوط علیہ السلام اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے اور ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آ گئی آخر شب ہوئی تو اول ایک ہیبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہہ و بالا کر دیا اور پھر آبادی کا تختہ اوپر اٹھا کر الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور وہی ہوا جو گزشتہ قوم کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔

سورہ حجر آیت ۶۱ تا ۷۵ میں ہے کہ: اور پھر جب ایسا ہوا کہ بھیجے ہوئے فرشتے خاندان لوط کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا "تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو" انہوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ہلاکت کے ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امر حق کے لئے ہے اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں' پس چاہیے کہ کچھ رات رہے اپنے گھروں کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کے پیچھے قدم اٹھاؤ اور اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جہاں جانے کا حکم دیا گیا ہے (اسی طرف رخ کیے چلے جائیں) غرضیکہ ہم نے لوط پر حقیقت حال واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگان شہر کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے اور اس اثناء میں ایسا ہوا کہ شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ پہنچے' لوط نے کہا دیکھو یہ نئے آدمی میرے مہمان ہیں تم میری فضیحت نہ کرو' اللہ سے ڈرو تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہو گئے ہو؟ انہوں نے کہا کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ لوط نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو

دیکھو یہ میری بیٹیاں کھڑی ہیں یعنی باشندگان شہر کی بیویاں جن کی طرف وہ ملتفت نہیں ہوتے تھے ان کی طرف ملتفت ہو تب فرشتوں نے لوط سے کہا تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں تمہاری باتیں ماننے والے نہیں غرضیکہ سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے انہیں آ لیا' پس ہم نے وہ بستی زیر وزبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی ان پر بارش کی بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو حقیقت کی پہچان رکھنے والے ہیں۔اور سورۂ ہود آیت ۷۷ تا ۸۳ میں ہے کہ:

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ ان کے آنے سے خوش نہ ہوا اور ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا' وہ بولا ''آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے!'' اور اس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر دوڑتے ہوئے آئے وہ پہلے سے برے کاموں کے عادی ہو رہے تھے لوط علیہ السلام نے ان سے کہا ''لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں یعنی بستی کی عورتیں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں پس ان کی طرف ملتفت ہو' دوسری بات کا قصد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو' میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو' کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟'' ان لوگوں نے کہا تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں لوط نے کہا ''کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی اور سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا'' تب مہمانوں نے کہا اے لوط! ''ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پاسکیں گے تُو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل چل اور تم میں سے کوئی ادھر ادھر نہ دیکھے یعنی کسی بات کی فکر نہ کرے مگر ہاں تیری بیوی ساتھ دینے والی نہیں' وہ پیچھے رہ جائے گی اور جو کچھ ان لوگوں پر گزرتا ہے وہ اس پر بھی گزرے گا ان لوگوں کے لئے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں'' پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا تو اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے اس بستی کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں یعنی بستی کو الٹ دیا اور زمین کو

برابر کر دیا اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگا تار برسائے تیرے پروردگار کے حضور اس غرض سے نشانی کیے ہوئے تھے یہ بستی ان ظالموں سے یعنی اشرار مکہ سے کچھ دور نہیں ہے یہ اپنی سیر و سیاحت میں وہاں سے گزرتے رہتے ہیں اور اگر چاہیں تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں۔

اور سورہ شعراء میں ہے کہ: پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں پھر اٹھا مارا ہم نے ان دوسروں کو اور برسایا ان پر ایک برساؤ سو کیا برا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا' البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

سورہ تحریم میں ہے کہ: اللہ نے بتلائی ایک مثال منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی' گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے نیک بندوں میں سے' پھر انہوں نے ان سے خیانت کی پھر وہ کام نہ آئے ان کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔

حضرت لوط علیہ السلام کے ایک قول کی توجیہات

مسطورہ بالا آیات میں حضرت لوط کے یہ مقولے مذکور ہیں

هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْ هن اطهر لكم .هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ

یعنی حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی مزاحمت اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آ کر یہ فرمایا کہ "تم ان مہمانوں سے تعرض نہ کرو اگر نفس کی فطری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لیے پاک ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک با عصمت و باعزت انسان اور پھر وہ بھی نبی معصوم' کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی با عصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟ اس سوال کے حل میں علماء محققین نے مختلف جواب دیئے ہیں۔

(۱) حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور ہر ایک نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے' قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت گزار ثابت ہو یا انکار کر کے متمرد و منحرف' دونوں صورتوں میں

وہ اس کی ''امت'' میں داخل ہے' اگرچہ پہلی امت ''امت اجابت'' ہے اور دوسری ''امت دعوت'' اور اس لئے تمام امت اس کی اولاد ہوتی ہے اور نبی اور رسول اس کا روحانی باپ۔

لہٰذا حضرت لوط علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ بدبختو! تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقہ حیات ہیں اور تمہارے لئے حلال' پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو (العیاذ باللہ اس سے یہ مقصد نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں ان کو پیش فرما رہے تھے)

(ب) تورات اور دیگر روایات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''اسحٰق'' کی بشارت دے کر قوم لوط کو ہلاک کرنے آئے تھے تین تھے' اس لئے یہ ناممکن تھا کہ تین افراد کے لئے پوری بستی خواہش مند ہو جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے' بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس قوم میں دو سردار تھے اور انہوں نے ہی لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا' باقی قوم اپنی اس عام بدکرداری کی وجہ سے ان کی حمایت میں جمع ہو گئی تھی اور چونکہ حضرت لوطؑ کی دو بیٹیاں کنواری موجود تھیں اس لئے انہوں نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آ جاؤ اور میں اس کے لئے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہنے لگے لوط! تجھے معلوم ہے کہ ہم عورتوں کی جانب رغبت نہیں رکھتے۔

(ج) حضرت لوط علیہ السلام نے بیشک اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا مگر اس کی حیثیت اس بزرگ کے مقولہ کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا ہوا دیکھ کر ظالم مارنے والے سے یہ کہے کہ اس کو نہ مار اس کے عوض مجھ کو مار لے' حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کبھی ایسی جرات نہیں کر سکے گا کیونکہ وہ اس کا چھوٹا ہے یا ماتحت۔

پس جس طرح اس شخص کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو شرم اور عار دلانے اور اس قبیح فعل پر ذلیل اور نادم کرنے کے لئے یہ جملہ فرمایا اور ان کو یہ یقین تھا کہ نہ یہ بدبخت اس طرف راغب ہوں گے اور نہ وہ عملاً ایسا کریں گے۔

امام رازی' اصفہانی اور ابوالسعود اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں اور عبدالوہاب نجار مصری کی

بھی یہی رائے ہے مگر میرے نزدیک پہلی توجیہ زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے اور علامہ عبدالوہاب کا اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "یہ قول اس لئے کمزور ہے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام ان کافر عورتوں کے باپ تسلیم کئے جائیں" اس لئے کہ ہم شروع جواب ہی میں تصریح کر چکے ہیں کہ نبی معصوم اپنی اس تمام امت کا روحانی باپ ہوتا ہے جس کی جانب اس کو مبعوث کیا گیا ہے یہ جدا بات ہے کہ امت اجابت اس کی عطا کردہ سعادت وفلاح سے مستفید ہوتی ہے اور امت دعوت اس سے محروم رہتی ہے نیز آج بھی یہ دستور ہے کہ کافر و مسلم کے امتیاز کے بغیر بڑے بوڑھے بستی کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں۔

مقابلے کے لئے طاقت کی تمنا کا مطلب

حضرت لوط علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ قوم ان کے مہمانوں کے ساتھ بد اخلاقی پر تلی ہوئی ہے اور کسی طرح ان پر عار دلانے کا اثر ہوتا ہے نہ حیاء مروت اور اخلاق و انسانیت کے نام پر اپیل کا' تب پریشان خاطر ہو کر فرمایا

لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (ھود ۱۱ آیت ۸۰)

کاش میرے لئے تم سے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا پناہ ملتی کسی زبردست قوت پناہ کے ساتھ

اس "رکن شدید" سے کیا مراد ہے کیا حضرت لوط علیہ السلام "العیاذ اللہ" اللہ کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب تھے؟

اس مشکل کا حل بخاری کی روایت نے بخوبی کر دیا ہے اس روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

یغفر اللہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید و ھو ربہ و خالقہ

اللہ تعالیٰ لوط کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کئے گئے) کہ رکن شدید کی پناہ کے طالب ہوئے اور ان کے لئے رکن شدید ان کا پروردگار اور ان کا خالق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اللہ کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا

اور "رُکن شدید" یعنی اس کے پروردگار نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت گزرتا ہے کہ یہ اپنی بدکرداری کے عبرتناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

(۴) بعض مفسرین نے "بکم قوۃ" میں "کم" کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ ان کے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا اللہ کوئی ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ میں ان کو سزا دے سکتا اسی لئے حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کو سن کر فرشتوں نے کہا۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ (ھود ۱۱ آیت ۸۱)

فرشتوں نے کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں (مجبور انسان نہیں ہیں) یہ تجھ کو ہرگز گزند نہیں پہنچا سکتے۔

تورات میں ہے کہ حضرت لوط مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے ضوغر یا ضغر کی بستی میں چلے گئے جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی۔ آفتاب نکلنے کے بعد جب انہوں نے سدوم کی جانب دیکھا تو وہاں ہلاکت و بربادی کے نشانات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے پھر ضغر کو بھی چھوڑ دیا اور اس کے قریب ایک پہاڑی پر جا آباد ہوئے اور امن و امان سے رہنے سہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

صبر و استقامت

حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ اور ان کے پیرو تھے مگر شرف نبوت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے اور اللہ کے ایلچی بنا دیئے گئے تھے اس لئے سدوم اور عامورہ میں ہمہ قسم کے مصائب اور وطن سے دور دشمنوں کے نرغہ کی تکالیف کے باوجود انہوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور اپنے بزرگ چچا اور خاندان کی مدد کی طلب کی بجائے صرف اللہ عزوجل ہی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کے سامنے رضا و تسلیم کا ثبوت دیا۔ یہ مقام "مقربین و انبیاء" کا مقام ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام

قرآن کریم کی ایک پوری سورۃ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ پر مشتمل ہے۔ ہم نے تعارفی مضمون کے علاوہ باقی سارا مواد تفسیر ''معارف القرآن'' سے لیا ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ پہلے چند آیات کا خلاصہ تفسیر دے کر پھر اس کے مضامین کی تشریح اور متعلقہ وضاحتیں اور فوائد دیئے ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں اس واقعہ کو قرآن کریم کی ترتیب کے مطابق لکھا گیا ہے۔

نسب نامہ: یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام) حضرت ابراہیم کے پڑوتے ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے' حضرت یعقوب کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی بلکہ عشق تھا اور اس لئے کسی وقت بھی ان کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے۔

یہ بھی اپنے والد' دادا اور پردادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر اللہ برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور ملت ابراہیمی کی دعوت وتبلیغ کی خدمت سرانجام دی یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے ان کے دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا اور نمایاں تھی یعقوب علیہ السلام کے عشق ومحبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسفؑ کی پیشانی کا چمکتا ہوا نور نبوت پہچانتے اور وحی الٰہی کے ذریعے اس کی اطلاع پا چکے تھے۔

قرآن عزیز میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر

حضرت یوسف علیہ السلام کا نام قرآن عزیز نے چھبیس مرتبہ ذکر کیا ہے جن میں سے چوبیس جگہ صرف سورہ یوسف میں اور ایک جگہ سورہ انعام میں اور ایک جگہ سورہ غافر میں ذکر آیا ہے اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پردادا ابراہیم (علیہ السلام) کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن عزیز کی ایک سورت (سورہ یوسف) نازل ہوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت وموعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

قرآن عزیز نے یوسف (علیہ السلام) کے واقعہ کو ''احسن قصص'' کہا ہے اس لئے کہ

اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرت' حکمتیں اور مواعظ ونصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دلکش زمانہ کے عروج وزوال کی زندہ یادگار ہے' یہ ایک فرد کے ذریعے قوموں کے بننے اور بگڑنے اور ابھرنے کی ایسی بولتی ہوئی تصویر ہے جو کسی تشریح وتوضیح کی محتاج نہیں رہتی' یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زا تاریخ ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لئے چن لیا تھا اور شرف نبوی سے نوازا تھا۔

قرآن عزیز تورات کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص واقوام کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ وہ جن واقعات تاریخی کو بیان کرتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ عبرت وموعظت اور تذکیر وپند کا مقصد وحید ہے۔

پس جبکہ یوسف (علیہ السلام) کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں مثلاً رشد وہدایت کی اہمیت' ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر واستقامت' رضاء وتسلیم کے مظاہرے' افراد واقوام کے عروج واقبال کے وقائع' اللہ تعالیٰ کے عدل ورحم کی کرشمہ سازیاں' انسانی اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام ومآل' عصمت اور ضبط نفس کی عجوبہ کاریاں' تو بلاشبہ وہ "احسن قصص" ہے اور کتاب ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شان زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب

قرآن کریم میں ہے کہ وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) سے کہا کہ ابا میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے' انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا (کیونکہ وہ خاندان نبوت میں سے ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی اور سورج والد اور چاند ماں ہے' اور سجدہ کرتے سے مراد ان سب کا تمہارے لئے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے) تو وہ تمہارے (ایذاء رسانی کے) لئے کوئی خاص تدبیر کریں گے (یعنی

بھائیوں میں سے اکثر' کیونکہ دس بھائی علاتی تھے' ان سے خطرہ تھا' صرف ایک بھائی حقیقی بنیامین تھے جن سے کسی خلاف کا تو اندیشہ نہ تھا' مگر یہ احتمال تھا کہ ان کے منہ سے بات نکل جائے) بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے (اس لئے بھائیوں کے دل میں وسوسے ڈالے گا) اور (جس طرح اللہ تعالیٰ تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمہارے تابع و مطیع ہوں گے) اسی طرح تمہارا رب تم کو (دوسری عزت نبوت کے لئے بھی) منتخب کرے گا اور تم کو خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور (دوسری نعمتیں دے کر بھی) تم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا انعام کامل کرے گا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے دادا ابراہیم و اسحٰق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کر چکا ہے واقعی تمہارا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔

بھائیوں کا حسد

حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ لڑکے تھے' ان میں سے ہر لڑکا صاحب اولاد ہوا' سب کے خاندان پھیلے' چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا' اس لئے یہ سب بارہ خاندان بنی اسرائیل کہلائے۔

ان بارہ لڑکوں میں دس بڑے لڑکے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت لیا بنت لیان کے بطن سے تھے' ان کی وفات کے بعد یعقوب علیہ السلام نے لیا کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا' ان کے بطن سے دو لڑکے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے' اس لئے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی صرف بنیامین تھے' باقی دس بھائی علاتی یعنی باپ شریک تھے' یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں بنیامین کی ولادت کے ساتھ ہو گیا تھا (قرطبی)

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ یوسف علیہ السلام سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں جو ان کے بڑے بھائیوں کو حاصل نہیں' اس لئے ان پر حسد ہوا' اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی طرح ان کو یوسف علیہ السلام کا خواب بھی معلوم ہو گیا ہو جس سے انہوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ ان کی بڑی شان ہونے والی ہے اس سے حسد پیدا ہوا' اور آپس میں گفتگو کی کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والد کو بہ نسبت ہمارے یوسف اور

اس کے حقیقی بھائی بنیامین سے زیادہ محبت ہے' حالانکہ ہم دس ہیں اور ان سے بڑے ہیں' گھر کے کام کاج سنبھالنے کی قوت رکھتے ہیں' اور یہ دونوں چھوٹے بچے ہیں جو کچھ کام نہیں کر سکتے' ہمارے والد کو اس کا خیال کرنا اور ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہیئے تھا' مگر انہوں نے کھلی ہوئی بے انصافی کر رکھی ہے' اس لئے یا تو تم یوسف کو قتل کر ڈالو' یا پھر کسی دور زمین میں پھینک آؤ جہاں سے واپس نہ آ سکے۔

بھائیوں کا باہمی مشورہ

ان بھائیوں میں مشورہ ہوا' بعض نے یہ رائے دی کہ یوسف کو قتل کر ڈالو' بعض نے کہا کہ کسی غیر آباد کنویں کی گہرائی میں ڈال دو' تا کہ یہ کانٹا درمیان سے نکل جائے اور تمہارے باپ کی پوری توجہ تمہاری ہی طرف ہو جائے' رہا یہ گناہ جو اس کے قتل یا کنویں میں ڈالنے سے ہوگا سو بعد میں توبہ کر کے تم نیک ہو سکتے ہو' قرآن کے جملہ وَتَكُونُوا مِن م بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ کے یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف کے قتل کے بعد تمہارے حالات درست ہو جائیں گے' کیونکہ باپ کی توجہ کا یہ مرکز ختم ہو جائے گا' یا کہ قتل کے بعد باپ سے عذر معذرت کر کے تم پھر ویسے ہی ہو جاؤ گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے' کیونکہ انہوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا' ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ' باپ کی نافرمانی' اور ایذاء رسانی' معاہدہ کی خلاف ورزی' پھر جھوٹی سازش وغیرہ' انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہو سکتے۔

کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ

انہی بھائیوں میں سے ایک نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو کنویں کی گہرائی میں ایسی جگہ ڈال دو جہاں یہ زندہ رہے' اور راہ رو مسافر جب اس کنویں پر آئیں تو وہ اس کو اٹھا کر لے جائیں۔ اس طرح تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور اس کو لے کر تمہیں خود کسی دور مقام پر جانا بھی نہ پڑے گا' کوئی قافلہ آئے گا وہ خود اس کو

اپنے ساتھ کسی دور مقام پر پہنچادے گا۔

یہ رائے دینے والا ان کا سب سے بڑا بھائی یہودا تھا' اور بعض روایات میں ہے کہ روبیل سب سے بڑا تھا' اسی نے یہ رائے دی اور یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ جب مصر میں یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی بنیامین کو روک لیا گیا تو اس نے کہا کہ میں جا کر باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا' اس لئے میں واپس کنعان نہیں جاتا۔

جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ بچے تھے۔ نیز یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی ان کے بچہ ہونے کی طرف اشارہ ہے' کہ مجھے خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے' کیونکہ بھیڑیے کا کھا جانا بچوں ہی کے معاملہ میں متصور ہے' ابن جریر ابن المنذر ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر سات سال تھی۔ (مظہری)

حضرت یوسف کو ساتھ لے جانے کیلئے والد سے اجازت لینا

ان بھائیوں نے والد کے سامنے درخواست ان لفظوں میں پیش کر دی کہ ابا جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ کو یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں' حالانکہ ہم اس کے پورے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں' کل اس کو آپ ہمارے ساتھ (سیر و تفریح کے لئے) بھیج دیجئے کہ وہ بھی آزادی کے ساتھ کھائے پیئے اور کھیلے' اور ہم سب اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

بھائیوں کی اس درخواست سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس سے پہلے بھی ایسی درخواست کر چکے تھے' جس کو والد بزرگوار نے قبول نہ کیا تھا' اس لئے اس مرتبہ ذرا تاکید اور اصرار کے ساتھ والد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے خدشات

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو کل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے' تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا' اول تو مجھے اس نور نظر کے بغیر چین نہیں آتا' دوسرے یہ خطرہ ہے کہ

جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑیا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور یا اس وجہ سے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں' اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں' اچانک دس بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا' مگر ایک بھیڑیے ہی نے مدافعت کر کے چھڑا دیا' پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

جس کی تعبیر بعد میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ دس بھیڑیے یہ دس بھائی تھے اور جس بھیڑیے نے مدافعت کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا وہ بڑے بھائی یہودا تھے' اور زمین میں چھپ جانا کنویں کی گہرائی سے تعبیر تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا' مگر بمصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی (قرطبی)

بیٹوں کا جواب

بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کی یہ بات سن کر کہا کہ آپ کا یہ خوف و خطرہ عجیب ہے ہم دس آدمیوں کی قوی جماعت اس کی حفاظت کے لئے موجود ہے' اگر ہم سب کے ہوتے ہوئے اس کو بھیڑیا کھا جائے تو ہمارا نو وجود ہی بے کار ہو گیا' اور پھر ہم سے کسی کام کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکنی تھی' دوسرے باپ کے ایسا کہنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جائے گی' اور اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کر دیں گے' اس لئے اجازت دیدی' مگر بھائیوں کو مکمل عہد و پیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے اور بڑے بھائی روبیل یا یہودا کو خصوصیت سے سپرد کیا کہ تم ان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خبر گیری کرنا اور جلد واپس لانا' بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے

مونڈھوں پر اٹھالیا' اور باری باری سب اٹھاتے رہے' کچھ دور تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو رخصت کرنے کے لئے باہر گئے۔

راستہ میں بھائیوں کا ظلم

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے ان کو زمین پر پٹک دیا' یوسف علیہ السلام پیدل چلنے لگے' مگر کم عمر تھے' ان کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوئے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی' اس نے بھی کوئی ہمدردی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکارو' وہی تیری مدد کریں گے۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ و غضب کا سبب بنا۔

یہودا کے دل میں رحم آنا

آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہودا سے کہا کہ آپ بڑے ہیں' آپ میری کمزوری اور صغر سنی اور اپنے والد ضعیف کے حال پر رحم کریں' اور اس عہد کو یاد کریں جو والد سے آپ نے کئے ہیں' آپ نے کتنی جلدی اس عہد و پیمان کو بھلا دیا' یہ سن کر یہودا کو رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں گے۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صحیح عمل کی توفیق ڈال دی' تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے' خدا سے ڈرو اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہنچا دو' البتہ اس سے یہ عہد لے لو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ کریں۔

بھائیوں کی یہودا کو دھمکی

بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے' تم یہ چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کر لو' اس لئے سن لو کہ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزاحمت کی تو ہم تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔

کنویں میں پھینکنے پر اتفاق

یہودا نے دیکھا کہ نو بھائیوں کے مقابلہ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتے تو کہا کہ اچھا اگر تم یہی طے کر چکے ہو کہ اس بچہ کو ضائع کر دو تو میری بات سنو یہاں قریب ہی ایک پرانا کنواں ہے جس میں بہت سے جھاڑ نکل آئے ہیں، سانپ، بچھو اور طرح طرح کے موذی جانور اس میں رہتے ہیں تم اس کو کنویں میں ڈال دو، اگر اس کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس کر ختم کر دیا تو تمہاری مراد حاصل ہے اور تم اپنے ہاتھ سے اس کا خون بہانے سے بری رہے اور اگر یہ زندہ رہا تو کوئی قافلہ شاید یہاں آئے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈالے اور یہ نکل آئے تو وہ اس کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک میں پہنچادے گا' اس صورت میں بھی تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اس بات پر سب بھائیوں کا اتفاق ہو گیا' جس کا بیان قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے: فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ "یعنی جب یہ بھائی یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے' اور اس پر سب متفق ہو گئے کہ اس کو کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع دی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تم اپنے بھائیوں کو ان کے اس کرتوت پر تنبیہ کرو گے اور وہ کچھ نہ جانتے ہوں گے۔"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو تسلی

بھائیوں نے مل کر کنویں میں ڈالنے کا عزم کر ہی لیا' تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تسلی کے لئے وحی بھیج دی' جس میں کسی آئندہ زمانے میں بھائیوں سے ملاقات کی اور اس کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اس وقت آپ ان بھائیوں سے مستغنی اور بالادست ہوں گے' جس کی وجہ سے ان کے اس ظلم و ستم پر مواخذہ کریں گے' اور وہ اس سارے معاملہ سے بے خبر ہوں گے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں' ایک یہ کہ یہ وحی ان کو کنویں میں ڈالنے کے بعد ان کی تسلی اور یہاں سے نجات کی خوش خبری دینے کے لئے آئی ہو' دوسرے یہ کہ کنویں میں ڈالنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو پیش آنے والے

حالات و واقعات سے بذریعہ وحی باخبر کردیا' جس میں یہ بھی بتلا دیا کہ آپ اس ہلاکت سے سلامت رہیں گے' اور ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آپ کو ان بھائیوں پر سرزنش کرنے کا موقع ملے گا جبکہ وہ آپ کو پہچانیں گے بھی نہیں' کہ ان کے بھائی یوسف ہیں۔

یہ وحی جو حضرت یوسف علیہ السلام پر زمانہ طفولیت میں نازل ہوئی' تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ وحی نبوت نہ تھی' کیونکہ وہ چالیس سال کی عمر میں عطا ہوتی ہے' بلکہ یہ وحی ایسی ہی تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا' یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا سلسلہ مصر پہنچنے اور جوان ہونے کے بعد شروع ہوا' جیسا کہ ارشاد ہے ولما بلغ اشدہ اتینہ حکما و علما اور ابن جریر' ابن ابی حاتم وغیرہ نے اس کو استثنائی طور پر وحی نبوت ہی قرار دی ہے' جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت عطا کی گئی۔ (مظہری)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس بات سے منع کردیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھیجیں (قرطبی) یہی وجہ تھی کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبر خدا نے جیل سے رہائی اور ملک مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعے والد ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کردیتے۔

اللہ جل شانہ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے جو اس طرز میں مخفی تھیں' شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے' اور یہ کہ بھائیوں کا حاجت مند بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا توان کو بھی دینا مقصود ہو۔

حضرت یوسف کنویں میں

امام قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس جگہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ جب ان کو ڈالنے لگے تو وہ کنویں کی من سے چمٹ گئے' بھائیوں نے ان کا کرتہ نکال کر اس سے ہاتھ باندھے' اس وقت پھر یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے رحم کی

درخواست کی، مگر وہی جواب ملا کہ گیارہ ستارے جو تجھے سجدہ کرتے ہیں ان کو بلا وہی تیری مدد کریں گے، پھر ایک ڈول میں رکھ کر کنویں میں لٹکایا، جب نصف تک پہنچے تو اس کی رسی کاٹ دی، اللہ تعالیٰ نے اپنے یوسف کی حفاظت فرمائی، پانی میں گرنے کی وجہ سے کوئی چوٹ نہ آئی، اور قریب ہی ایک پتھر کی چٹان نکلی ہوئی نظر آئی، صحیح سالم اس پر بیٹھ گئے، بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا، انہوں نے چٹان پر بٹھادیا۔

یوسف علیہ السلام تین روز اس کنویں میں رہے، ان کا بھائی یہودا دوسرے بھائیوں سے چھپ کر روزانہ ان کے لئے کھانا پانی لاتا اور ڈول کے ذریعے ان تک پہنچادیتا تھا۔

باپ کے سامنے بھائیوں کا مکروفریب

عشاء کے وقت یہ بھائی روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس پہنچے، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے رونے کی آواز سن کر باہر آئے پوچھا کیا حادثہ ہے، کیا تمہاری بکریوں کے گلہ پر کسی نے حملہ کیا ہے؟ اور یوسف کہاں ہے؟ تو بھائیوں نے کہا:۔

يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ "یعنی ہم نے آپس میں دوڑ لگائی اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا اس درمیان میں یوسف کو بھیڑیا کھا گیا اور ہم کتنے ہی سچے ہوں آپکو ہمارا یقین تو آئیگا نہیں۔"

راز کا فاش ہونا

یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف علیہ السلام کے کُرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیے کے کھانے کا یقین دلائیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس سے غافل کر دیا، کہ کُرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے، جس سے بھیڑیے کا کھانا ثابت ہوتا، انہوں نے صحیح سالم کُرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کُرتا صحیح سالم دیکھ کر فرمایا میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کُرتہ کہیں سے نہیں پھٹا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا صبر

اس طرح۔ حضرت یعقوب علیہ السلام پر انکی جعل سازی کا راز فاش ہو گیا اور فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ''یعنی یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا بلکہ تمہارے ہی نفوس نے ایک بات بنائی ہے اب میرے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگوں۔''

پیراہن یوسف

ماوردی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے' تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ:۔ خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے۔ تیسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا' اس میں بھی ان کا کرتہ ہی اعجاز کا مظہر ثابت ہوا ہے۔

یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں کا لے جانا

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملک شام سے مصر جا رہا تھا راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہنچ گیا اور پانی لانے والوں کو کنویں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ راستہ بھول کر یہاں پہنچا اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا لیکن راز کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں' یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ کو راستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے یہی حال ہے ان تمام حالات و واقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں اور فلسفہ والے ان کو بخت و اتفاق کہا کرتے ہیں جو در حقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے ورنہ سلسلہ تکوین میں کوئی بخت و اتفاق نہیں' حق سبحانہ وتعالیٰ

جس کی شان فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے مخفی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہر حال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن دعبر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہنچا' ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ کیا اس ڈول کی رسی پکڑ لی' پانی کی بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا چہرہ سامنے آ گیا جس کی آئندہ ہونے والے عظمت شان سے بھی قطع نظر کی جائے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن و جمال اور معنوی کمالات۔ کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے۔ ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے اس کمسن حسین اور ہونہار بچہ کو دیکھ کر پکار اٹھا يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ " ارے بڑی خوشی کی بات ہے' یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا ہے صحیح مسلم میں شب معراج کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے اور باقی آدھا سارے جہاں میں تقسیم ہوا ہے۔

شروع میں تو مالک بن دعبر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکار اٹھا' مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے اس کو چھپا کر رکھے تا کہ اس کو فروخت کر کے رقم وصول کرے اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہو گیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہو جائے گا۔

بھائیوں کا یوسف کو فروخت کرنا

بعض روایات میں ہے کہ یہودا روزانہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا پہنچانے کے لئے جاتے تھے تیسرے روز جب ان کو کنویں میں نہ پایا تو واپس آ کر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا یہ سب بھائی جمع ہو کر وہاں پہنچے تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے' تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے بھاگ کر یہاں آ گیا ہے تم نے بہت برا کیا کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا مالک بن دعبر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جائیں گے اس لئے بھائیوں سے ان کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں

حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتدائی سرگذشت بیان ہو چکی ہے کہ قافلہ والوں نے جب ان کو کنویں سے نکال لیا تو برادران یوسف نے ان کو اپنا غلام گریختہ بنا کر تھوڑے سے درہموں میں ان کا سودا کر لیا' اول تو اس لئے کہ ان کو اس بزرگ ہستی کی قدر معلوم نہ تھی' دوسرے اس لئے کہ انکا اصل مقصدان سے پیسہ کمانا نہیں بلکہ باپ سے دور کر دینا تھا' اس لئے صرف فروخت کر دینے پر بس نہیں کی کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں قافلہ والے انکو یہیں نہ چھوڑ جائیں' اور پھر کسی طرح والد کے پاس پہنچ کر ہماری سازش کا راز فاش کر دے' اس لئے امام تفسیر مجاہد رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کیلئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دور تک قافلہ کے ساتھ چلے' اور ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس کو بھاگ جانے کی عادت ہے کھلا نہ چھوڑو' بلکہ باندھ کر رکھو' اس درشہوار کی قدر و قیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے (تفسیر ابن کثیر)

مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی فروخت

قافلہ والوں نے ان کو مصر لے جا کر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر قرطبی میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا' یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کے برابر سونا اور اسی کے برابر مشک اور اسی وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔

یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے لئے مقدر کی تھی اس نے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

عزیز مصر اور اس کی بیوی

یہ سب کچھ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں' بلکہ رب العزت کی بنائی ہوئی مستحکم تدبیر کے اجزاء ہیں' مصر میں یوسف علیہ السلام کی خریداری کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے عزت والے شخص کو مقدر فرمایا' ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملک مصر کا وزیر خزانہ تھا جس کا نام قطفیر یا اطفیر بتلایا جاتا ہے' اور بادشاہ مصر اس

زمانہ میں قوم عمالقہ کا ایک شخص ریان بن اسید تھا (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور مسلمان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا (مظہری) اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بتلایا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں

عزیز مصر قطفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا دے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے، ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دنیا میں تین آدمی بڑے عقلمند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے اول عزیز مصر جس نے انکے کمالات کو اپنے قیافہ سے معلوم کر کے بیوی کو یہ ہدایت دی دوسرے شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا یَآبَتِ اسْتَأْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ یعنی ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجئے اس لئے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی" تیسرے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اپنے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو خلافت کیلئے منتخب فرمایا (ابن کثیر)

جوانی اور علم و حکمت

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا "یعنی جب پہنچ گئے یوسف علیہ السلام اپنی پوری قوت اور جوانی پر تو دے دی ہم نے ان کو حکمت اور علم"

یہ قوت اور جوانی کس عمر میں حاصل ہوئی، اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی، ضحاکؒ نے بیس سال اور حسن بصری رحمہ اللہ نے چالیس سال بتلائی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطاء نبوت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوت مصر پہنچنے کے بھی کافی عرصہ بعد ملی ہے اور کنوئیں کی گہرائی میں جو وحی ان کو بھیجی گئی وہ وحی نبوت نہ تھی بلکہ لغوی وحی تھی جو غیر انبیاء کو بھی بھیجی جا سکتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ''اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو'' مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہنچانا یوسف علیہ السلام کی نیک چلنی' خدا ترسی اور اعمال صالح کا نتیجہ تھا یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں جو بھی ایسے عمل کرے گا ہمارے انعامات اسی طرح پائے گا۔

عزیز مصر کی بیوی کا حضرت یوسف کو بہکانا

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَفِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَکَ ''یعنی جس عورت کے گھر میں یوسف علیہ السلام رہتے تھے وہ ان پر مفتون ہو گئی' اور ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی' اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیئے' اور ان سے کہنے لگی کہ جلد آ جاؤ تمہی سے کہتی ہوں''۔

پہلی آیت میں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ عورت عزیز مصر کی بیوی تھی' مگر اس جگہ قرآن کریم نے زوجہ عزیز کا مختصر لفظ چھوڑ کر اَلَّتِیْ هُوَفِیْ بَیْتِهَا کے الفاظ اختیار کئے اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا کہ وہ اسی عورت کے گھر میں اسی کی پناہ میں رہتے تھے' اس کے کہنے کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی

اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب سے پہلے خدا کی پناہ مانگی قَالَ مَعَاذَاللّٰهِ محض اپنے عزم وارادہ پر بھروسہ نہیں کیا اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون صحیح راستہ سے ہٹا سکتا ہے اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت و موعظت کے ساتھ خود زلیخا کو نصیحت کرنا شروع کیا کہ وہ بھی خدا سے ڈرے' اور اپنے ارادہ سے باز آ جائے' فرمایا:

اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ''وہ میرا پالنے والا ہے اس نے مجھے آرام کی جگہ دی' خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی۔''

بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیز مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا' میرا محسن ہے میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں؟ یہ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے اس کے ضمن میں خود زلیخا کو بھی یہ سبق دے دیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا اتنا حق پہچانتا ہوں تو تجھے مجھ سے زیادہ پہچاننا چاہئے۔

فائدہ: اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو اپنا رب فرمایا' حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں' وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ موہم شرک اور مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں' اسی لئے شریعت محمدیہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا بھی ممنوع کر دیا گیا' صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ''کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے' اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے۔'' مگر یہ خصوصیت شریعت محمدیہ کی ہے' جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جن میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو' انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے تو سختی کے ساتھ روکا گیا ہے مگر اسباب و ذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی' اسی وجہ سے پچھلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی مگر شریعت محمدیہ چونکہ قیامت تک کے لئے آئی ہے اس کو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کے لئے ذرائع شرک' تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہو سکیں' بہرحال یوسف علیہ السلام کا اِنَّهٗ رَبِّیْ فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہ' کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو' اسی کو اپنا رب فرمایا اور اچھا ٹھکانا بھی درحقیقت اسی نے دیا' اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے' اور ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں۔

زلیخا سے ایک مکالمہ

بعض مفسرین سدی اور ابن اسحق وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اس خلوت میں زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو مائل کرنے کے لئے ان کے حسن و جمال کی تعریف شروع کی' کہا کہ تمہارے بال کس قدر حسین ہیں' یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بال موت کے بعد سب سے پہلے میرے جسم سے علیحدہ ہو جائیں گے' پھر کہا تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہیں تو فرمایا موت کے بعد یہ سب پانی ہو کر میرے چہرے پر بہہ جائیں گی' پھر کہا تمہارا چہرہ کتنا حسین

ہے' تو فرمایا کہ یہ سب مٹی کی غذا ہے' اللہ تعالیٰ نے فکر آخرت آپ پر اس طرح مسلط کر دی کہ نوجوانی کے عالم میں دنیا کی ساری لذتیں ان کے سامنے گرد ہو گئیں' صحیح ہے کہ فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ہر جگہ ہر شر سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اللھم ارزقنا ایاہ

حجت و برہان کا سامنے آنا

حضرت یوسف علیہ السلام کا عظیم ابتلاء و امتحان ہوا کہ عزیز مصر کی عورت نے گھر کے دروازے بند کر کے ان کو گناہ کی طرف بلانے کی کوشش کی' اور اپنی طرف راغب کرنے اور مبتلا کرنے کے سارے ہی اسباب جمع کر دیئے' مگر رب العزت نے اس نوجوان صالح کو ایسے شدید ابتلاء میں ثابت قدم رکھا' کہ زلیخا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی ہی' یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی انسانی فطرت کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر اختیاری میلان پیدا ہونے لگا' مگر اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت میں اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی' جس کی وجہ سے وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کی بجائے بالکل ختم ہو گیا' اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے۔

ھم بھا کا مطلب

آیت میں لفظ ھم بمعنی خیال زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا اور یہ معلوم ہے کہ زلیخا کا ھم یعنی خیال گناہ کا تھا' اس سے یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی خیال کا وہم ہو سکتا تھا اور یہ باجماع امت شان نبوت و رسالت کے خلاف ہے کیونکہ جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں' کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہو سکتا ہے نہ سہو و خطاء کی راہ سے ہو سکتا ہے' البتہ صغیرہ گناہ سہو و خطاء کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے' مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا' بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے (مسامرہ)

اور یہ مسئلہ عصمت قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے تو ان کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا' اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنے کا کوئی

فائدہ باقی نہیں رہتا' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

اس لئے اجمالی طور پر تو متعین ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا' تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ھم دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے' ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہو جانا' پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے' ہاں اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی درج فرما دیتے ہیں' اور دوسری صورت کے محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آ جائے' اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہو جاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا' اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کر دیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے (قرطبی) اور صحیحین میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو اور جب وہ یہ نیک عمل کر لے تو دس نیکیاں لکھو اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کی بجائے اسکے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو اور اگر وہ گناہ کر ہی گذرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ ھم کا ان دونوں معنی کے لئے استعمال عرب کے محاورات اور اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ ہم زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے بولا گیا مگر ان دونوں کے ہم یعنی خیال میں بڑا فرق ہے' پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ میں داخل نہیں' قرآن کریم کا

اسلوب بیان بھی خود اس پر شاہد ہے کیونکہ دونوں کا ہم وخیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغہ تثنیہ **ولقد ھما** کہہ دیا جاتا جو مختصر بھی تھا اس کو چھوڑ کر دونوں کے ہم وخیال کا بیان الگ الگ فرمایا هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا اور زلیخا کے ہم وخیال کے ساتھ تاکید کے الفاظ ولقد کا اضافہ کیا' یوسف علیہ السلام کے ہم کے ساتھ لام اور قد کی تاکید نہیں ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعے ہی جتلانا ہے کہ زلیخا کا ہم کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا دوسری طرح کا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ابتلاء پیش آیا تو فرشتوں نے اللہ جل شانہ سے عرض کی کہ آپ کا یہ مخلص بندہ گناہ کے خیال میں ہے حالانکہ وہ اس کے وبال کو خوب جانتا ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انتظار کرو اگر وہ یہ گناہ کر لے تو جیسا کیا ہے وہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو اور اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو گناہ کی بجائے اس کے نامہ اعمال میں نیکی درج کرو' کیونکہ اس نے صرف میرے خوف سے اپنی خواہش کو چھوڑا ہے' (جو بہت بڑی نیکی ہے) (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا جو گناہ میں داخل نہیں' پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ کلام میں تقدیم وتاخیر واقع ہوئی ہے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ جو بعد میں مذکور ہے وہ اصل میں مقدم ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہو جاتا اگر اللہ کی حجت وبرہان کو نہ دیکھ لیتے' لیکن برہان رب کو دیکھنے کی وجہ سے وہ اس ہم اور خیال سے بھی بچ گئے' مضمون یہ بھی درست ہے مگر بعض حضرات نے اس تقدیم وتاخیر کو قواعد زبان کے خلاف قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے بھی پہلی ہی تفسیر راجح ہے کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ و طہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے کہ طبعی اور بشری تقاضہ کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ اس کی جزا محذوف ہے اور معنی

یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان اور حجت کو نہ دیکھتے تو اس خیال میں مبتلا رہتے مگر برہان رب دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر اختیاری خیال اور وسوسہ بھی قلب سے نکل گیا۔

برہان ربی کیا تھی

قرآن کریم نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ وہ برہان ربی جو یوسف علیہ السلام کے سامنے آئی کیا چیز تھی؟ اسی لئے اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ' مجاہد رحمہ اللہ' سعید بن جبیر رحمہ اللہ' محمد بن سیرین رحمہ اللہ' حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس خلوت گاہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت اس طرح ان کے سامنے کر دی کہ وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ان کو متنبہ کر رہے ہیں اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ عزیز مصر کی صورت ان کے سامنے کر دی گئی' بعض نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نظر چھت کی طرف اٹھی تو اس میں یہ آیت قرآن لکھی ہوئی دیکھی' لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيْلًا یعنی زنا کے پاس نہ جاؤ کیونکہ وہ بڑی بے حیائی (اور قہر خداوندی کا سبب) اور (معاشرہ کے لئے) بہت برا راستہ ہے۔" بعض مفسرین نے فرمایا کہ زلیخا کے مکان میں ایک بت تھا' اس نے اس بت پر پردہ ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے وجہ پوچھی' اس نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے' اس کے سامنے گناہ کرنے کی جرأت نہیں' یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا معبود اس سے زیادہ حیاء کا مستحق ہے' اس کی نظر کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت اور معرفت الٰہیہ خود ہی برہان رب تھی۔

امام تفسیر ابن جریر رحمہ اللہ نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ سب اہل تحقیق کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور بے غبار ہے' وہ یہ ہے کہ جتنی بات قرآن کریم نے بتلا دی ہے صرف اسی پر اکتفاء کیا جائے' یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے وسوسہ انکے دل سے جاتا رہا اس چیز کی تعیین میں وہ سب احتمال ہو سکتے ہیں جو حضرات مفسرین نے ذکر کیے ہیں لیکن قطعی طور پر کسی کو متعین نہیں کیا جا سکتا' (ابن کثیر)

ہم نے یوسف علیہ السلام کو یہ برہان اس لئے دکھائی کہ ان سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں' برائی سے مراد صغیرہ گناہ اور بے حیائی سے کبیرہ گناہ ہے (مظہری)

برہان دکھلانے کا مقصد

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ برائی اور بے حیائی کو یوسف علیہ السلام سے ہٹا دینے کا ذکر فرمایا ہے' یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے ہٹانا نہیں فرمایا جس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام تو اپنی شان نبوت کی وجہ سے اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے' مگر برائی اور بے حیائی نے ان کو گھیر لیا تھا ہم نے اس کے جال کو توڑ دیا' قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں کہ یوسف علیہ السلام کسی ادنیٰ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوئے اور ان کے دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا وہ گناہ میں داخل نہ تھا ورنہ یہاں تعبیر اس طرح ہوتی کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا دیا نہ یہ کہ گناہ کو ان سے ہٹا دیا۔

کیونکہ یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں' لفظ مُخْلَصِیْنَ اس جگہ بفتح لام مخلص کی جمع ہے' جس کے معنی منتخب کے ہیں' مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کار رسالت اور اصلاح خلق کے لئے انتخاب فرمایا ہے ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے کہ وہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو سکیں' خود شیطان نے بھی اپنے بیان میں اس کا اقرار کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا اس نے کہا فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ "یعنی قسم ہے تیری عزت وقوت کی کہ میں ان سب انسانوں کو گمراہ کروں گا بجز ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرما لیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا محل سے بھاگنا

گذشتہ صفحات میں یہ بیان آیا ہے کہ جس وقت عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مشغول تھی' اور یوسف علیہ السلام اس سے بچ رہے تھے مگر فطری اور غیر اختیاری خیال کی کشمکش بھی تھی' تو حق تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی اعانت کے لئے بطور معجزہ کے کوئی ایسی چیز سامنے کردی جس نے دل سے وہ غیر اختیاری خیال بھی نکال

ڈالا خواہ وہ چیز اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت ہو یا وحی الٰہی کی کوئی آیت۔

یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برہان ربی کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور باہر نکلنے کے لئے دروازہ کی طرف دوڑے' عزیز کی بیوی ان کو پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑی' اور یوسف علیہ السلام کا کُرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا' وہ عزم کے مطابق نہ رُکے تو کُرتہ پیچھے سے پھٹ گیا مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے اور ان کے پیچھے زلیخا بھی' تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہنچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

زلیخا کا تہمت لگانا

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں ان کی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کے لئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ برے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈالا جائے' یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بناء پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انہوں نے حقیقت کا اظہار کیا کہ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي. یعنی یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

بچہ کی زبانی حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی شہادت دینا

معاملہ بڑا نازک اور عزیز مصر کے لئے اس کا فیصلہ سخت دشوار تھا کہ ان میں سے کسے سچا سمجھے' شہادت اور ثبوت کا کوئی موقع نہ تھا' مگر اللہ جل شانہ جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں اور ان کو معصوم و محفوظ رکھتے ہیں اسی طرح دنیا میں بھی ان کو رسوائی سے بچانے کا انتظام معجزانہ انداز سے فرما دیتے ہیں اور عموماً ایسے مواقع پر ایسے

چھوٹے بچوں سے کام لیا گیا ہے جو عادۃً بولنے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے مگر بطور معجزہ ان کو گویائی عطا فرما کر اپنے مقبول بندوں کی برأت کا اظہار فرما دیتے ہیں' جیسے حضرت مریمؑ پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن (اور راجح قول کے مطابق چالیس) کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر ان کی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی' اور قدرت خداوندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا' بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جُریج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچہ نے ان کی برأت کے لئے شہادت دی' حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی' اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما دی اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی' یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا یہ کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا' مگر قادر مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کے لئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے' میدان حشر میں حساب کتاب کے وقت انسان اپنی دنیا کی قدیم عادت کی بناء پر جب اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کرے گا تو اسی کے ہاتھ پاؤں اور کھال اور درودیوار کو اس کے خلاف گواہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا وہ اس کی ایک ایک حرکت کو محشر کے عظیم الشان مجمع کے سامنے کھول کر رکھ دے گا' اس وقت انسان کو پتہ لگے گا کہ ہاتھ پاؤں اور گھر کے درودیوار اور حفاظتی انتظامات میں سے کوئی بھی میرا نہ تھا بلکہ یہ سب رب العزت کے خفیہ کارندے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا بچہ جو گہوارہ میں بظاہر اس دنیا کی ہر چیز سے غافل و بے خبر پڑا تھا وہ یوسف علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر عین اس وقت بول اٹھا جبکہ عزیز مصر اس واقعہ سے کشمکش میں مبتلا تھا۔

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری ہیں زلیخا کا قصور ہے تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں برأت کی بڑی شہادت ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کی زبان پر ایک حکیمانہ بات کہلوائی کہ یوسف علیہ السلام کے کُرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تو تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہو سکتے ہیں اور اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچہ کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتی تھی اور جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق کُرتہ کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی برأت ظاہری علامت سے بھی ظاہر ہوگئی۔

شاہد کون تھا؟

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرما دی یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے مسند میں اور ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گہوارہ میں گویائی عطا فرمائی ہے یہ چاروں وہی ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں (مظہری) اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں مگر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔

عزیز مصر کا تبصرہ

بہر حال یہاں تک یہ ثابت ہوا کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت و الزام لگایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچہ کو خلاف عادت گویائی دے کر اس کی زبان سے یہ حکیمانہ فیصلہ

صادر فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے کُرتے کو دیکھو اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو یہ اس کی صاف علامت ہے کہ وہ بھاگ رہے تھے اور زلیخا پکڑ رہی تھی یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں۔

عزیز مصر بچہ کے اس طرح بولنے ہی سے یہ سمجھ چکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی برأت ظاہر کرنے کے لئے یہ مافوق العادۃ صورت پیش آئی ہے پھر اس کے کہنے کے مطابق جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کا کُرتہ بھی پیچھے سے ہی پھٹا ہے تو یقین ہو گیا کہ قصور زلیخا کا ہے یوسف علیہ السلام بری ہیں' تو اس نے پہلے تو زلیخا کو خطاب کر کے کہا انه من کیدکن' یعنی یہ سب تمہارا مکر وحیلہ ہے کہ اپنی خطا دوسرے کے سر ڈالنا چاہتی ہو' پھر کہا کہ عورتوں کا مکر وحیلہ بہت بڑا ہے' کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر ان کا نرم و نازک اور ضعیف ہوتا ہے دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آ جاتا ہے مگر عقل و دیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (مظہری)

عورتوں کا مکر

تفسیر قرطبی میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا کید اور مکر شیطان کے کید و مکر سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے شیطان کے کید کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ وہ ضعیف ہے اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا اور عورتوں کے کید کے متعلق یہ فرمایا کہ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ' یعنی تمہارا کید بہت بڑا ہے' اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سب عورتیں نہیں بلکہ وہ ہی ہے جو اس طرح کے مکر وحیلہ میں مبتلا ہوں۔

عزیز مصر کا فیصلہ

عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطا بتلانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظر انداز کرو' اور کسی سے نہ کہو تا کہ رسوائی نہ ہو پھر زلیخا کو خطاب کر کے کہا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِکِ. اِنَّکِ کُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِیْنَ' یعنی خطا سراسر تمہاری ہے تم اپنی غلطی کی معافی مانگو' اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے معافی مانگے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے' کہ خود خطاء کی

اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

فائدہ: یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور بے حیائی ثابت ہو جانے پر اس کا مشتعل نہ ہونا اور پورے سکون واطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو گناہ سے پھر رسوائی سے بچانے کا فوق العادت انتظام فرمایا' اسی انتظام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا' ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق وتفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو اشتعال ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے یا زبان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی یہ قدرت حق کے کرشمہ ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ

واقعہ کا چرچا شہر کی عورتوں میں

یہ واقعہ چھپانے کے باوجود درباری لوگوں کی عورتوں میں پھیل گیا ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو لعن طعن کرنا شروع کیا بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ پانچ عورتیں عزیز مصر کے قریبی افسروں کی بیویاں تھیں۔ (قرطبی' مظہری)

یہ عورتیں آپس میں کہنے لگیں کہ دیکھو کیسی حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اتنے بڑے مرتبہ پر ہوتے ہوئے اپنے نوجوان غلام پر فریفتہ ہو کر اس سے اپنی مطلب برآری چاہتی ہے ہم تو اس کو بڑی گمراہی پر سمجھتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کو زلیخا کا غلام یا تو اس وجہ سے کہا گیا کہ شوہر کی چیز کو بھی عادۃً بیوی کی چیز کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر سے بطور ہبہ اور تحفہ لے لیا تھا (قرطبی)

عورتوں کی دعوت کرنا

جب زلیخا نے ان عورتوں کے مکر کا حال سنا تو ان کو ایک کھانے کی دعوت پر بلا بھیجا۔

اوران کے لئے مسند تکیوں سے مجلس آراستہ کی اور جب یہ عورتیں آ گئیں اوران کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقوں سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے ہر ایک کو ایک ایک تیز چاقو بھی دے دیا' جس کا ظاہری مقصد تو پھل تراشنا تھا مگر دل میں وہ بات پوشیدہ تھی جو آگے آتی ہے' کہ یہ عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر حواس باختہ ہو جائیں گی اور چاقو سے اپنے ہاتھ زخمی کرلیں گی۔

یہ سب سامان درست کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام سے جو کسی دوسرے مکان میں تھے زلیخا نے کہا کہ ذرا باہر آ جاؤ' یوسف علیہ السلام کو چونکہ اس کی غرض فاسد معلوم نہ تھی اس لئے باہر اس مجلس میں تشریف لے آئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے عورتوں کا متاثر ہونا

ان عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے جمال سے حیران رہ گئیں' اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے یعنی پھل تراشتے وقت جب یہ حیرت انگیز واقعہ سامنے آیا تو چاقو ہاتھ پر چل گیا' جیسا کہ دوسری طرف خیال بٹ جانے سے اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا ہے اور کہنے لگیں کہ خدا کی پناہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے' مطلب یہ تھا کہ ایسا نورانی تو فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

زلیخا کی دھمکی

زلیخا بولی کہ (دیکھ لو) وہ شخص یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے برا بھلا کہتی تھیں' اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا' اور آئندہ یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو بے شک جیل خانے بھیجا جائے گا' اور بے عزت بھی ہو گا۔

اس عورت نے جب یہ دیکھا کہ میرا راز ان عورتوں پر فاش تو ہو ہی چکا ہے اس لئے ان کے سامنے ہی یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے لگی' بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس وقت یہ سب عورتیں بھی یوسف علیہ السلام کو کہنے لگیں کہ یہ عورت تمہاری محسن ہے اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورتیں بھی اس کی موافقت اور تائید

کر رہی ہیں اور ان کے مکر و کید سے بچنے کی ظاہری کوئی تدبیر نہ رہی تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف ہی رجوع فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں عرض کیا۔

''اے میرے پالنے والے یہ عورتیں مجھے جس کام کی طرف دعوت دیتی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ہی ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور نادانی کا کام کر بیٹھوں۔'' یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں بلکہ گناہ کے مقابلہ میں اس دنیوی مصیبت کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے اور بعض روایات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید میں ڈالے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے قید میں اپنے آپ کو خود ڈالا ہے کیونکہ آپ نے کہا تھا اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی اس کی نسبت مجھ کو جیل خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر آپ عافیت مانگتے تو آپ کو مکمل عافیت مل جاتی' اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے دعا میں یہ کہنا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ فلاں چھوٹی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دے مناسب نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر مصیبت اور بلا کے وقت عافیت ہی مانگنی چاہئے' اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی دعا مانگنے سے ایک شخص کو منع فرمایا کہ صبر تو بلا و مصیبت پر ہوتا ہے تو اللہ سے صبر کی دعا مانگنے کی بجائے عافیت کی دعا مانگو (ترمذی) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعا تلقین فرما دیجئے' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے رب سے عافیت کی دعا مانگا کریں' حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تلقین دعا کا سوال کیا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگا کریں (مظہری از طبرانی)

اور یہ فرمانا کہ اگر آپ ان کے مکر و کید کو دفع نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں یہ عصمت نبوت کے خلاف نہیں کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا تکوینی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچا لیں اور گو بمقتضاء نبوت یہ مقصد پہلے ہی سے حاصل تھا مگر پھر بھی غایت خوف ادب سے اس کی دعاء کرنے پر مجبور ہو گئے' اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت

کے گناہ سے نہیں بچ سکتا' اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے' علم کا تقاضا گناہوں سے اجتناب ہے (قرطبی)

دعا کی قبولیت اور جیل روانگی

''چنانچہ ان کی دعاء ان کے رب نے قبول فرمالی' اور ان عورتوں کے مکر وحیلہ کو ان سے دور رکھا' بے شک وہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے جال سے بچانے کے لئے یہ سامان فرمادیا کہ عزیز مصر اور اس کے دوستوں کو اگرچہ یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور تقویٰ وطہارت کی کھلی نشانیاں دیکھ کر ان کی پاکی کا یقین ہو چکا تھا' مگر شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا' اس کو ختم کرنے کے لئے ان کو مصلحت اس میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بند کردیا جائے' تاکہ اپنے گھر میں ان شبہات کا کوئی موقع بھی باقی نہ رہے اور لوگوں کی زبانوں سے اس کا یہ چرچا بھی ختم ہو جائے۔

جیل کے آفیسر اور قیدیوں کا معتقد ہونا

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی برأت اور پاکی بالکل واضح ہو جانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کرلیا' جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعاء اور خواہش کی تکمیل تھی' کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہو گیا تھا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ساتھ دو مجرم قیدی اور بھی داخل ہوئے ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا باورچی تھا' ابن کثیر نے بحوالہ ائمہ تفسیر لکھا ہے کہ یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے کہ انہوں نے بادشاہ کو کھانے وغیرہ میں زہر دینے کی کوشش کی تھی' مقدمہ زیر تحقیق تھا' اس لئے ان دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت وشفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبر گیری کرتے تھے جو بیمار ہو گیا اس کی عیادت اور

خدمت کرتے، جس کو غمگین و پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، ان کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی آپ کی بزرگی کے معتقد ہو گئے، جیل کا افسر بھی متاثر ہوا، اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

فائدہ عجیبہ

جیل کے افسر نے یا قیدیوں میں سے بعض نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا، کہ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے، تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کے لئے مجھ سے محبت نہ کرو، کیونکہ جب کسی نے مجھ سے محبت کی ہے تو مجھ پر آفت آئی ہے، بچپن میں میری پھوپھی کو مجھ سے محبت تھی اس کے نتیجہ میں مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو بھائیوں کے ہاتھوں کنویں کی قید پھر غلامی اور جلاوطنی میں مبتلا ہوا، عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو اس جیل میں پہنچا (ابن کثیر، مظہری)

ساقی اور باورچی کا خواب

یہ دو قیدی جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں گئے تھے ایک روز انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے آپ سے ہم اپنی خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ خواب انہوں نے حقیقۃً دیکھے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا محض یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کیلئے خواب بنایا تھا۔

بہرحال ان میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

خواب کی تعبیر اور دعوت توحید

حضرت یوسف علیہ السلام سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے' مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ و دعوت ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں' اور اصول دعوت کے ماتحت حکمت و دانشمندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمہارے لئے جو کھانا تمہارے گھروں سے یا کسی دوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا اور وہ ٹھیک اسی طرح نکلتا ہے۔

اور یہ کوئی رمل' جفر کا فن یا کہانت وغیرہ کا شعبدہ نہیں' بلکہ میرا رب بذریعہ وحی مجھے بتلا دیتا ہے' میں اس کی اطلاع دے دیتا ہوں' اور یہ ایک کھلا معجزہ تھا جو دلیل نبوت اور اعتماد کا بہت بڑا سبب ہے اس کے بعد اول کفر کی برائی اور ملت کفر سے اپنی بیزاری بیان کی' اور پھر یہ بھی جتلا دیا کہ میں خاندان نبوت ہی کا ایک فرد اور انہی کی ملت حق کا پابند ہوں' میرے آباء واجداد ابراہیم و اسحق و یعقوب ہیں' یہ خاندانی شرافت بھی عادۃً انسان کا اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے' اس کے بعد بتلایا کہ ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک سمجھیں' پھر فرمایا کہ یہ دین حق کی توفیق ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے سلامت فہم عطا فرما کر قبول حق ہمارے لئے آسان کر دیا مگر بہت سے لوگ اس نعمت کی قدر اور شکر نہیں کرتے' پھر انہی قیدیوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتلاؤ کہ انسان بہت سے پروردگاروں کا پرستار ہو یہ بہتر ہے یا یہ کہ صرف ایک اللہ کا بندہ بنے' جس کا قہر و قوت سب پر غالب ہے' پھر بت پرستی کی برائی ایک دوسرے طریقہ سے یہ بتلائی کہ تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے کچھ بتوں کو اپنا پروردگار سمجھا ہوا ہے یہ تو صرف نام ہی نام کے ہیں جو تم نے گھڑ لئے ہیں' نہ ان میں ذاتی صفات اس قبل ہیں کہ ان کو کسی ادنیٰ قوت و طاقت کا مالک سمجھا جائے کیونکہ وہ سب بے حس و حرکت ہیں' یہ بات تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہے' دوسرا راستہ ان کے معبود حق ہونے کا یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پرستش کے لئے احکام نازل فرمائے' تو اگرچہ مشاہدہ اور ظاہر عقل ان کی خدائی کو تسلیم نہ کرتے' مگر حکم خداوندی کی وجہ سے ہم اپنے مشاہدہ کو

چھوڑ کر اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے، مگر یہاں وہ بھی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کو عبادت کے لئے کوئی حجت و دلیل نازل نہیں فرمائی بلکہ اس نے یہی بتلایا کہ حکم اور حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا حق نہیں اور حکم یہ دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی وہ دین قیم ہے جو میرے آباء واجداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء ہوا مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یوسف علیہ السلام اپنی تبلیغ و دعوت کے بعد ان لوگوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا اور پھر اپنی ملازمت پر بھی برقرار رہ کر بادشاہ کو شراب پلائے گا اور دوسرے پر جرم ثابت ہو کر اس کو سولی دی جائے گی اور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی، اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہو گا اور باورچی کو سولی دی جائے گی مگر پیغمبرانہ شفقت و رافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کو سولی دی جائے گی تا کہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔

آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر جو دی ہے محض اٹکل اور تخمینہ سے نہیں بلکہ یہ خدائی فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا، جن حضرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بناوٹی کہا ہے انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو یہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا **قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ** چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہو گا جو بیان کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیر خواب میں بیان ہوئی۔

رہائی پانے والے کے ذمہ کام لگانا

پھر جس شخص کے متعلق یوسف علیہ السلام تعبیر خواب کے ذریعہ یہ سمجھے تھے کہ وہ رہا ہو

گا اس سے کہا کہ جب تم آزاد ہو کر جیل سے باہر جاؤ اور شاہی دربار میں رسائی ہو تو اپنے بادشاہ سے میرا بھی ذکر کر دینا کہ وہ بے گناہ قید میں پڑا ہے مگر اس شخص کو آزاد ہونے کے بعد یوسف علیہ السلام کی یہ بات یاد نہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی آزادی کو اور دیر لگی اور اس واقعہ کے بعد چند سال مزید قید میں رہے' یہاں قرآن میں لفظ بضع سنین آیا ہے' یہ لفظ تین سے لے کر نو تک صادق آتا ہے' بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد سات سال مزید قید میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

بادشاہ کا خواب

حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی رہائی کے لئے پردہ غیب سے ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ بادشاہ مصر نے ایک خواب دیکھا جس سے وہ پریشان ہوا اپنی مملکت کے تعبیر دینے والے اہل علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیر خواب دریافت کی' وہ خواب کسی کی سمجھ میں نہ آیا سب نے یہ جواب دے دیا کہ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ. وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ' ضغث کی جمع ہے' جو ایسی گٹھڑی کو کہا جاتا ہے جس میں مختلف قسم کے خس و خاشاک گھاس پھونس جمع ہوں معنی یہ تھے کہ یہ خواب کچھ ملی جلی ہے جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے' کوئی صحیح خواب ہوتا تو تعبیر بیان کر دیتے۔

دربار میں حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ

اس واقعہ کو دیکھ کر مدت مدید کے بعد اس رہا شدہ قیدی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ کو اس خواب کی تعبیر بتلا سکوں گا اس وقت اس نے یوسف علیہ السلام کے کمالات اور تعبیر خواب میں مہارت اور پھر مظلوم ہو کر قید میں گرفتار ہونے کا ذکر کر کے یہ چاہا کہ مجھے جیل خانہ میں ان سے ملنے کی اجازت دی جائے' بادشاہ نے اس کا انتظام کیا وہ یوسف علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا' قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو صرف ایک لفظ فارسلون فرما کر بیان کیا ہے جس کے معنی ہیں مجھے بھیج دو' یوسف علیہ السلام کا تذکرہ پھر سرکاری منظوری اور پھر جیل خانہ تک پہنچنا یہ واقعات خود ضمنی طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں اس لئے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ بیان شروع کیا۔

شاہی قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس

اس شخص نے جیل خانہ پہنچ کر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول وفعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلایئے' خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فربہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر و کمزور ہیں' نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سرسبز ہرے بھرے ہیں اور سات خشک ہیں۔

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا' لَعَلِّیٓ اَرۡجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ یعنی آپ تعبیر بتلا دیں گے تو ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کو تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل وکمالات سے واقف ہو جائیں۔

خواب کی تعبیر بتلانا

تفسیر مظہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالم مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں' اس عالم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں' فن تعبیر خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس عالم میں کیا مراد ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا آپ نے خواب سن کر سمجھ لیا کہ سات بیل فربہ اور سات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگانے میں خاص دخل ہے اسی طرح سات بیل لاغر کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہے کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے اور کمزور سات بیلوں کے فربہ بیلوں کے کھا لینے سے یہ مراد ہے کہ پچھلے سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہوگا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہو جائے گا صرف بیج کے لئے کچھ غلہ بچے گا۔

تعبیر بھی اور تدبیر بھی

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہوں

گے پھر سات سال قحط کے مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا' اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کے سال کُل سات ہی ہیں تو عادۃ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کر دیا تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہنچے جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل وکمال ظاہر ہو کر ان کی رہائی کا سبب بنے' اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور ہمدردانہ مشورہ بھی دیا وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا تاکہ گندم کو پرانا ہونے کے بعد کیڑا نہ لگ جائے یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کیڑا نہیں لگتا۔

رہائی کا حکم

یہ شخص تعبیر خواب یوسف علیہ السلام سے معلوم کر کے لوٹا اور بادشاہ کو خبر دی وہ اس سے مطمئن اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل وکمال کا معتقد ہوگا' مگر قرآن کریم نے ان سب چیزوں کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ یہ خود بخود مفہوم ہو سکتی ہیں' اس کے بعد کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ یعنی بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ سے نکالا جائے اور دربار میں لایا جائے چنانچہ بادشاہ کا کوئی قاصد بادشاہ کا یہ پیغام لیکر جیل خانہ پہنچا۔

واقعہ کی تحقیق اور فیصلہ کی شرط لگانا

موقع بظاہر اس کا تھا کہ یوسف علیہ السلام جیل خانہ کی طویل مدت سے عاجز آ رہے تھے اور خلاصی چاہتے تھے جب بادشاہ کا پیغام بلانے کے لئے پہنچا تو فوراً تیار ہو کر ساتھ چل دیتے' مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جو مقام بلند عطا فرماتے ہیں اس کو دوسرے لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے' اس قاصد کو جواب دیا: کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جا کر پہلے یہ دریافت کرو

کہ آپ کے نزدیک ان عورتوں کا معاملہ کس طرح ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے کیا اس واقعہ میں وہ مجھے مشتبہ سمجھتے ہیں اور میرا کوئی قصور قرار دیتے ہیں۔

صبر و تحمل اور اعلیٰ اخلاق

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا جو اصل سبب تھی اس میں اس حق کی رعایت تھی جو عزیز کے گھر میں پرورش پانے سے فطرۃً شریف انسان کے لئے قابل لحاظ ہوتا ہے۔ (قرطبی)

اور ایک بات یہ بھی ہے کہ اصل مقصود اپنی برأت کا ثبوت تھا وہ ان عورتوں سے بھی ہو سکتا تھا اور اس میں عورتوں کی بھی کوئی زیادہ رسوائی نہ تھی اگر وہ سچی بات کا اقرار بھی کر لیتیں تو صرف مشورہ ہی کی مجرم ٹھہرتیں' بخلاف عزیز کی بیوی کے کہ اس کو تحقیقات کا ہدف بنایا جاتا تو اس کی رسوائی زیادہ تھی اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِھِنَّ عَلِیْمٌ یعنی میرا پروردگار تو ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو جانتا ہی ہے میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ بھی حقیقت واقعہ سے واقف ہو جائیں جس میں ایک لطیف انداز سے اپنی برأت کا اظہار بھی ہے۔

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کے لئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبری رحمہ اللہ کے روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا صبر و تحمل اور مکارم اخلاق قابل تعجب ہیں جب ان سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں انکی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا' پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں انکی جگہ ہوتا تو فوراً جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا (قرطبی)

اس حدیث میں یہ بات قابل غور ہے کہ منشاء حدیث کا یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل اور مکارم اخلاق کی تعبیر و مدح کرنا ہے مگر اس کے بالمقابل جس صورت حال کو رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس طرز عمل کو افضل فرما رہے ہیں اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس افضل پر عمل نہ کر پاتا' بلکہ اس کے مقابلہ میں مفضول کو اختیار کر لیتا جو بظاہر افضل الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان نہیں تو اس کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریق کار میں ان کے صبر و تحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے اور وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کیلئے وہی مناسب اور افضل ہے کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کیلئے مناسب نہیں ہوتا' احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسول خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہو سکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج و مذاق میں عامہ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔

تحقیق کی شرط اور حکمتیں

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب شاہی قاصد رہائی کا پیغام دے کر بلانے کے لئے آیا اور انہوں نے قاصد کو یہ جواب دیا کہ پہلے ان عورتوں سے میرے معاملہ کی تحقیق کر لو جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے اس میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں' اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جیسے دین کامل عطا فرماتے ہیں ایسے ہی عقل کامل اور معاملات و حالات کی پوری بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے شاہی پیغام سے یہ اندازہ کر لیا کہ اب جیل سے رہائی کے بعد بادشاہ مصر مجھے کوئی اعزاز دیں گے اس وقت دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ جس عیب کی

تہمت ان پر لگائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے جیل میں ڈالا گیا تھا اس کی حقیقت بادشاہ اور سب لوگوں پر پوری طرح واضح ہو اور ان کی برأت میں کسی کو شبہ نہ رہے ورنہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ شاہی اعزاز سے لوگوں کی زبانیں تو بند ہو جائیں گی مگر ان کے دلوں میں یہ خیالات کھٹکتے رہیں گے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اپنے آقا کی بیوی پر دست درازی کی تھی اور ایسے حالات کا پیدا ہو جانا بھی شاہی درباروں میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت بادشاہ بھی لوگوں کے ایسے خیالات سے متاثر ہو جائے اس لئے رہائی سے پہلے اس معاملہ کی صفائی اور تحقیق کو ضروری سمجھا اور مذکور الصدر دو آیتوں میں سے دوسری آیت میں خود یوسف علیہ السلام نے اپنے اس عمل اور رہائی میں تاخیر کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

اول یہ کہ ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ یعنی یہ تاخیر میں نے اس لئے کی کہ عزیز مصر کو یقین ہو جائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اسکے حق میں کوئی خیانت نہیں کی۔

عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ یہ بہت بری صورت ہوگی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہوگا اور اس پر سکوت ان کے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگا وہ چونکہ ایک زمانہ تک آقا کی حیثیت میں رہ چکا تھا اس لئے یوسف علیہ السلام کی شرافت نفس نے اس کی اذیت کو گوارا نہ کیا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ جب عزیز مصر کو برأت کا یقین ہو جائے گا تو دوسرے لوگوں کی زبانیں خود بند ہو جائیں گی۔

دوسری حکمت یہ ارشاد فرمائی وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ یعنی یہ تحقیقات اس لئے کرائی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تحقیقات کے ذریعہ خیانت کرنے والوں کی خیانت ظاہر ہو کہ سب لوگ متنبہ ہو جائیں کہ خیانت کرنے والوں کا انجام آخر کار رسوائی ہوتا ہے تاکہ آئندہ سب لوگ ایسے کاموں سے بچنے کا اہتمام کریں دوسرے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس

سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا اور خیانت کی برائی دلوں سے نکل جاتی بہر حال مذکورہ
حکمتوں کے پیش نظر یوسف علیہ السلام نے رہائی کا پیغام پاتے ہی فوراً نکل جانا پسند نہیں کیا
بلکہ شاہی انداز سے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

خواتین شہر کی صفائی اور زلیخا کا اعتراف جرم کرنا

بادشاہ نے ان عورتوں کو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے حاضر کر کے سوال کیا کہ
کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف علیہ السلام سے اپنے مطلب کی خواہش کی۔" بادشاہ کے
اس سوال سے معلوم ہوا کہ اس کو اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ قصور یوسف علیہ السلام کا نہیں'
ان عورتوں ہی کا ہے اسی لئے یہ کہا تم نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی اس کے بعد
عورتوں کا جواب قرآن کریم میں مذکور ہے۔

سب عورتوں نے کہا کہ حاش للہ! ہمیں ان میں ذرا بھی کوئی برائی کی بات نہیں معلوم
ہوئی' عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی میں نے ان سے اپنے مطلب
کی خواہش کی تھی اور بے شک وہی سچے ہیں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل
شانہ جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق و صفائی
کے لئے کھل جاتی ہیں اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہار حق کا اعلان خود کر دیا
یہاں تک جو حالات و واقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سنے ہیں ان میں بہت سے
فوائد اور مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کے لئے خود ہی
غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں' ان کو کسی مخلوق کا ممنون احسان کرنا پسند نہیں فرماتے یہی وجہ
ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا
اس کو تو بھلا دیا گیا اور پھر پردہ غیب سے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی
کے ممنون بھی نہ ہوں اور پوری عزت و شان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔
اس کا یہ سامان کیا کہ بادشاہ مصر کو ایک پریشان کن خواب دکھلایا جس کی تعبیر سے

اس کے درباری اہل علم وفن عاجز ہوئے اس طرح ضرورت مند ہو کر یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا پڑا (ابن کثیر)

حضرت یوسف علیہ السلام کا وزیر بننا

آیت ۵۳ تا ۵۷ میں ہے کہ اور میں اپنے نفس کو بھی بالذات بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس تو ہر ایک کا بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس نفس کے جس پر میرا رب رحم کرے اور اس میں برائی کا مادہ نہ رکھے جیسا انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں مطمئنہ جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ میری نزہت وعصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں بلکہ رحمت وعنایت الٰہیہ کا اثر ہے اس لئے میرا نفس برائی کا حکم نہیں کرتا ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا ہوتا' بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے' یعنی اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوئیں امارہ اور مطمئنہ' سو امارہ اگر توبہ کر لے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے اور مرتبہ توبہ میں وہ لوامہ کہلاتا ہے اور جو مطمئنہ ہے کمال اس کا لازم ذات نہیں بلکہ عنایت ورحمت کا اثر ہے پس امارہ کے لوامہ ہونے پر صفت غفور کا ظہور ہوتا ہے اور مطمئنہ میں صفت رحیم کا۔

یہ تمام تر مضمون ہوا یوسفؑ کی تقریر کا باقی یہ امر کہ یہ صورت اثبات نزاہت کی بعد رہائی کے بھی تو ممکن تھی پھر رہائی پر اس کو مقدم کیوں رکھا' اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جتنا یقین اس ترتیب میں ہو سکتا ہے اس کے خلاف میں نہیں ہو سکتا کیونکہ دلائل کی دلالت تو مشترک ہے لیکن اس صورت مجوزہ میں یہ امر زائد ہے کہ بادشاہ اور عزیز سمجھ سکتے ہیں کہ جب بدون تمریہ کے یہ رہا ہونا نہیں چاہتے حالانکہ ایسی حالت میں رہائی قیدی کی انتہائی تمنا ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی نزاہت وبرأت کا کامل یقین ہے اس لئے اس کے ثابت ہو جانے کا پورا اطمینان ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل یقین بری ہی کو ہو سکتا ہے نہ کہ ملوث کو' یہ ساری باتیں بادشاہ نے سنیں اور یہ سن کر اس بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا اور عزیز سے ان کو لے لوں گا کہ اس کے ماتحت نہ رہیں گے چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لائے پس جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں اور

باتوں سے زیادہ فضل وکمال آپ کا ظاہر ہوا تو بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم ہمارے نزدیک آج سے بڑے معزز اور معتبر ہو بعد اس کے اس خواب کی تعبیر کا ذکر آیا اور بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے قحط کا اہتمام بڑا بھاری کام ہے یہ انتظام کس کے سپرد کیا جاوے یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کردو میں ان کی حفاظت بھی رکھوں گا اور آمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب کتاب کے طریقہ سے بھی خوب واقف ہوں چنانچہ بجائے اس کے کہ ان کو کوئی خاص منصب دیتا مثل اپنے پورے اختیارات ہر قسم کے دے دیئے' گویا حقیقت میں بادشاہ یہی ہو گئے گو برائے نام وہ بادشاہ رہا' اور یہ عزیز کے عہدہ سے مشہور ہو گئے چنانچہ ارشاد ہے اور ہم نے ایسے عجیب طور پر یوسف علیہ السلام کو ملک مصر میں باختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں جیسا کہ بادشاہوں کو آزادی ہوتی ہے یعنی یا تو وہ وقت تھا کہ کنویں میں محبوس تھے پھر عزیز کی ماتحتی میں مقید رہے اور یا آج یہ خود مختاری اور آزادی عنایت ہوئی بات یہ ہے کہ ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے یعنی دنیا میں بھی نیکی کا اجر ملتا ہے اور خواہ بغیر مالداری کے قناعت و رضا عطا کر کے جس سے عیش لذیذ میسر ہوتا ہے یہ تو آج دنیا میں ہوا اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے۔"

باعزت رہائی اور شاہی دربار میں تشریف آوری

بادشاہ مصر نے جب یوسف علیہ السلام کے فرمانے کے مطابق عورتوں سے واقعہ کی تحقیق فرمائی اور زلیخا اور دوسری سب عورتوں نے حقیقت واقعہ کا اقرار کر لیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے پاس لایا جائے تاکہ میں ان کو اپنا مشیر خاص بنا لوں حکم کے مطابق یوسف علیہ السلام کو اعزاز کے ساتھ جیل خانہ سے دربار میں لایا گیا اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو گیا تو بادشاہ نے کہا کہ آپ آج ہمارے نزدیک بڑے معزز اور معتمد ہیں۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہنچا اور بادشاہ کی دعوت پہنچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کیلئے

دعاء کی اور غسل کرکے نئے کپڑے پہنے جب دربار شاہی پر پہنچے تو یہ دعا کی' حسبی ربی من دنیای و حسبی ربی من خلقه عز جاره وجل ثناء ہ و لا اله غیره ''یعنی میری دنیا کیلئے میرا رب مجھے کافی ہے اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے جو اس کی پناہ میں آ گیا وہ بالکل محفوظ ہے اور اس کی بڑی تعریف ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

جب دربار میں پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعا کی اور عربی زبان میں سلام کیا' السلام علیکم و رحمة الله اور بادشاہ کے لئے دعا عبرانی زبان میں کی' بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا' یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعاء عبرانی زبان میں۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کیں' یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں جن سے بادشاہ واقف نہ تھا اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کردی۔

شاہ مصر سے بالمشافہ گفتگو

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلاواسطہ سن لوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتائیں جو اب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں' پھر تعبیر بتلائی۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں اس کے بعد شاہ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کرا کر غلہ اگانے کا انتظام کریں' اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں اور جتنا غلہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی تجویز

اس طرح اہل مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے حکومت کو جس قدر غلہ سرکاری محاصل سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں' کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلہ دے کر خلق خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا جمع ہو جائے گا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا شاہ مصر اس مشورہ سے بے حد مسرور اور مطمئن ہوا' مگر کہنے لگا کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ. اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ "یعنی ملک کے خزانے جن میں زمین کی پیداوار بھی شامل ہے آپ میرے سپرد کر دیں میں انکی حفاظت بھی پوری کر سکتا ہوں اور خرچ کرنیکے مواقع اور مقدار خرچ کے اندازہ سے بھی پورا واقف ہوں (قرطبی ومظہری)

ان دو لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا جو ایک وزیر خزانہ میں ہونے چاہئیں کیونکہ پہلی ضرورت تو امین خزانہ کے لئے اس کی ہے کہ وہ سرکاری اموال کو ضائع نہ ہونے دے بلکہ پوری حفاظت سے جمع کرے' پھر غیر مستحق لوگوں اور غلط قسم کے مصارف میں خرچ نہ ہونے دے اور دوسری ضرورت اس کی ہے کہ جہاں جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے اس میں نہ کوتاہی کرے اور نہ مقدار ضرورت سے زائد خرچ کرے' لفظ "حفیظ" پہلی ضرورت کی پوری ضمانت ہے اور لفظ "علیم" دوسری ضرورت کی۔

امور مملکت کی سربراہی

شاہ مصر اگرچہ یوسف علیہ السلام کے کمالات کا گرویدہ اور ان کی دیانت اور عقل کامل کا پورا معتقد ہو چکا تھا مگر بالفعل وزارت خزانہ کا منصب ان کو سپرد نہیں کیا بلکہ ایک سال تک ایک معزز مہمان کی طرح رکھا۔

سال بھر پورا ہونے کے بعد نہ صرف وزارت خزانہ بلکہ پورے امور مملکت ان کے

سپرد کردیئے شاید مقصد یہ تھا کہ جب تک گھر میں رکھ کر انکے اخلاق و عادات کا پورا تجربہ نہ ہوجائے اتنا بڑا منصب سپرد کرنا مناسب نہیں' جیسا کہ سعدی شیرازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے

چو یوسف کسے در صلاح و تمیز
بیک سال باید کہ گردد عزیز

عزیز کی وفات کے بعد زلیخا سے نکاح

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر قطفیر کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کردی اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا یہ صورا س سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں' زلیخا نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گذری' تاریخی روایات کے مطابق دولڑکے بھی پیدا ہوئے جن کا نام افرائیم اور منشا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کردی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی' یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی' زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوگئی' اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات مضمحل ہوگئے' یہ واقعہ بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ تفسیر قرطبی اور مظہری میں بیان ہوا ہے۔

فائدہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ میں نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہوجائے تو اس پر ناز نہ کریں اور اس کے بالمقابل گناہ گاروں کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ ارشاد یوسفی کے مطابق اس بات کو اپنے دل میں جمائیں کہ یہ ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے نفس امارہ کو ہم پر غالب نہیں آنے دیا ورنہ ہر انسان کا نفس اس کو طبعی طور پر برے ہی کاموں کی طرف کھینچتا ہے۔

حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنا جائز نہیں مگر چند شرائط کے ساتھ اجازت ہے

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے خزائن ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی۔

مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کر سکے گا اور اپنے بارہ میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کر لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ حُب جاہ و مال اس کا سبب نہ ہو بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو عہدہ نہیں دیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے فرمایا کہ کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدہ امارت حاصل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کر سکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا انا لن نستعمل علیٰ عملنا من ارادہ "یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کا طلب عہدہ خاص حکمت پر مبنی تھا

مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بادشاہ

مصر کافر ہے اس کا عملہ بھی ایسا ہی ہے اور ملک پر ایک طوفانی قحط آنے والا ہے اس وقت خود غرض لوگ عام خلق اللہ پر رحم نہ کھائیں گے اور لاکھوں انسان بھوک سے مر جائیں گے کوئی دوسرا آدمی ایسا موجود نہ تھا جو غریبوں کے حقوق میں انصاف کر سکے اس لئے خود اس عہدہ کی درخواست کی اگرچہ اس کے ساتھ کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی بضرورت کرنا پڑا تاکہ بادشاہ مطمئن ہو کر عہدہ ان کو سپرد کر دے۔ اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لئے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے مگر اپنے جاہ و مال کے لئے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لئے جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھا لینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا صحابہ کرام، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ و حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہم کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اسی پر مبنی تھے کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فرائض خلافت کو میں اپنے مقابل سے زیادہ حکمت و قوت کیساتھ پورا کر سکوں گا جاہ و مال کی طلب کسی کا مقصد اصلی نہ تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی تاج پوشی کی تقریب

جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو بادشاہ مصر کے دربار میں عزت و منزلت عطا کی اسی طرح ہم نے ان کو پورے ملک مصر پر اقتدار کامل عطا کر دیا کہ اس کی زمین میں جس طرح چاہیں احکام جاری کریں ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت و نعمت سے یونہی نوازا کرتے ہیں اور ہم نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔"

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک جشن منایا جس میں تمام عمال دولت اور معززین حکومت کو جمع کیا اور یوسف علیہ السلام کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امور مملکت کو عملاً ان کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا (قرطبی و مظہری وغیرہ)

بے مثال حکومت

حضرت یوسف علیہ السلام نے امور سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت باقی نہ رہی سارا ملک آپ کا گرویدہ ہو گیا اور پورے ملک میں امن اور خوشحالی عام ہو گئی خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا رنج و تکلیف پیش نہیں آئی۔ امام تفسیر مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیش نظر چونکہ اس سارے جاہ و جلال سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اسکے دین کی اقامت تھی اس لئے وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہوئے کہ شاہ مصر کو اسلام و ایمان کی دعوت دیں یہاں تک کہ مسلسل دعوت و کوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہ مصر بھی مسلمان ہو گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانہ حکومت میں عوام کی راحت رسانی کے وہ کام کئے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے جب تعبیر خواب کے مطابق سات سال خوشحالی کے گذر گئے اور قحط شروع ہوا تو یوسف علیہ السلام نے پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دیا' لوگوں نے کہا کہ ملک مصر کے سارے خزانے آپ کے قبضہ میں ہیں اور آپ بھوکے رہتے ہیں تو فرمایا کہ میں یہ اس لئے کرتا ہوں تا کہ عام لوگوں کی بھوک کا احساس میرے دل سے غائب نہ ہو اور شاہی باورچیوں کو بھی حکم دے دیا کہ دن میں صرف ایک مرتبہ دوپہر کو کھانا پکا کرے' تا کہ شاہی محل کے سب افراد بی عوام کی بھوک میں کچھ حصہ لے سکیں۔

قحط کے زمانے کا بہترین انتظام

یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کی وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیر خواب کے مطابق پورے ملک کے لئے بڑی خوشحالی اور رفاہیت کے آئے' پیداوار خوب ہوئی اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی' اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جزء سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا جو سات سال تک جاری رہا اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجودہ ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدر ان کی ضرورت کے پہلے سے جمع کرا دیا گیا اب قحط

عام ہوا اور اطراف واکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے جس کی مقدار قرطبی نے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دوسو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

مصر میں غلہ کی فراوانی کی شہرت

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے' یہ قحط صرف ملک مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا ارض کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پُر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے' یہی حضرت ابراہیم واسحٰق اور یعقوب و یوسف علیہما السلام کے مزارات معروف ہیں' یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا' اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی' ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہوگئی تھی کہ وہاں غلہ قیمتاً مل جاتا ہے۔

حضرت یعقوب کا بیٹوں کو مصر بھیجنا

حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہنچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلق خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ' مصر سے غلہ لے کر آؤ۔ اور چونکہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں دیا جاتا اس لئے سب ہی صاحبزادوں کو بھیجنے کی تجویز ہوئی مگر سب سے چھوٹے بھائی بنیامین جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے اور یوسف علیہ السلام کی گم شدگی کے بعد سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت وشفقت ان کے ساتھ زیادہ متعلق ہوگئی تھی ان کو اپنے پاس اپنی تسلی اور خبر گیری کے لئے روک لیا۔

بھائیوں کا مصر پہنچنا اور حضرت یوسف کا پہچان لینا

دس بھائی کنعان سے سفر کر کے مصر پہنچے' یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت وتاج کے مالک ہونے کی حیثیت میں سامنے آئے اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات

سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق چالیس سال ہو چکے تھے (قرطبی، مظہری)

ظاہر ہے کہ اتنے عرصہ میں انسان کا حلیہ بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور ان کا یہ وہم وخیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ جس بچہ کو غلام بنا کر بیچا گیا تھا وہ کسی ملک کا وزیر یا بادشاہ ہوسکتا ہے اس لئے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا، مگر یوسف علیہ السلام نے پہچان لیا۔ آیت مذکورہ میں **فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ** کے یہی معنی ہیں، عربی زبان میں انکار کے اصلی معنی اجنبی سمجھنے ہی کے آتے ہیں اس لئے منکرون کے معنی ناواقف اور انجان کے ہو گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے سوالات

یوسف علیہ السلام کے پہچان لینے کے متعلق ابن کثیر نے بحوالہ سدی یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب یہ دس بھائی دربار میں پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے مزید اطمینان کے لئے ان سے ایسے سوالات کئے جیسے مشتبہ لوگوں سے کئے جاتے ہیں تاکہ وہ پوری حقیقت واضح کر کے بیان کر دیں، اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے آپ یہاں کیسے پہنچے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے اور ہم نے آپ کی تعریف سنی اس لئے غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو، تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کر دیں تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمہارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمہارے سوا ہے؟ تو انہوں نے بتلایا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا تاکہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

غلہ کی ادائیگی، قیمت کی واپسی اور سگے بھائی کو لانے کی ہدایت

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سن کر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں، اور قاعدہ کے موافق غلہ دے دیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دے دیتے تھے۔

بھائیوں سے ساری تفصیلات معلوم کر لینے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال آنا طبعی امر تھا کہ یہ پھر دوبارہ بھی آئیں، اس کے لئے ایک انتظام تو ظاہراً یہ کیا کہ خود ان بھائیوں سے کہا ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ. أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ "یعنی جب تم دوبارہ آؤ تو اپنے سوتیلے بھائی باپ شریک کو بھی لے کر آنا تم دیکھ رہے ہو کہ میں کس طرح پورا پورا غلہ دیتا ہوں اور کس طرح مہمانی کرتا ہوں"

اور پھر ایک دھمکی بھی دے دی فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ "یعنی اگر تم اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو پھر میں تم میں سے کسی کو بھی غلہ نہ دوں گا کیونکہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے اس طرح تم میرے پاس نہ آنا۔

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کیا تھا اس کے متعلق کارندوں کو حکم دے دیا کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح باندھ دو کہ ان کو اس وقت پتہ نہ لگے تاکہ جب یہ گھر پہنچ کر سامان کھولیں اور اپنا نقد و زیور بھی ان کو واپس ملے تو یہ پھر دوبارہ لینے کے لئے آسکیں۔

ابن کثیر نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل میں کئی احتمال بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ یوسف علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کے پاس اس نقد و زیور وغیرہ کے سوا اور کچھ موجود ہی نہ ہو تو پھر دوبارہ غلہ لینے کے لئے نہیں آسکیں گے دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد اور بھائیوں سے کھانے کی قیمت لینا گوارا نہ ہو اس لئے شاہی خزانہ میں اپنے پاس سے جمع کر دیا ان کی رقم ان کو واپس کر دی، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان ان کے پاس واپس

پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں اس واپس شدہ سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے اس لئے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

بہر حال یوسف علیہ السلام نے یہ سب انتظامات اس لئے کئے کہ آئندہ بھی بھائیوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہے اور چھوٹے حقیقی بھائی سے ملاقات بھی ہو جائے۔

یوسف علیہ السلام کا والد کو اطلاع نہ دینا بامر الٰہی تھا

یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایک بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو ان کے والد ماجد پیغمبر خدا یعقوب علیہ السلام ان کی مفارقت سے اتنے متاثر کہ روتے روتے نابینا ہو گئے اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو خود بھی نبی و رسول ہیں باپ سے فطری اور طبعی محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں لیکن چالیس سال کے طویل زمانہ میں ایک مرتبہ بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میرے والد میری جدائی سے بے چین ہیں اپنی خیریت کی خبر کسی ذریعہ سے ان تک پہنچوا دیتا تو اس حالت میں بھی کچھ بعید نہ تھا جب وہ غلامی کی صورت میں مصر پہنچ گئے تھے پھر عزیز مصر کے گھر میں تو ہر طرح کی آزادی اور آسائش کے سامان بھی تھے اس وقت کسی ذریعہ سے گھر تک خط یا خبر پہنچوا دینا کچھ مشکل نہ تھا اسی طرح جیل کی زندگی میں دنیا جانتی ہے کہ سب خبریں ادھر کی ادھر پہنچتی ہی رہتی ہیں، خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے عزت کے ساتھ جیل سے رہا فرمایا اور ملک مصر کا اقتدار ہاتھ میں آیا اس وقت تو خود چل کر والد کی خدمت میں حاضر ہونا سب سے پہلا کام ہونا چاہئے تھا اور یہ کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف ہوتا تو کم از کم قاصد بھیج کر والد کو مطمئن کر دینا تو معمولی بات تھی۔

لیکن پیغمبر خدا یوسف علیہ السلام سے کہیں منقول نہیں کہ اس کا ارادہ بھی کیا ہو اور خود کیا ارادہ کرتے جب بھائی غلہ لینے کے لئے آئے تو ان کو بھی اصل واقعہ کے اظہار کے بغیر رخصت کر دیا۔

یہ تمام حالات کسی ادنیٰ انسان سے بھی متصور نہیں ہو سکتے اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی۔

اس حیرت انگیز خاموشی کا ہمیشہ یہی جواب دل میں آیا کرتا تھا کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت یوسف علیہ السلام کو اپنے اظہار سے روک دیا ہوگا، تفسیر قرطبی

میں اس کی تصریح مل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو وہی جانتے ہیں' انسان ان کا کیا احاطہ کرسکتا ہے' کبھی کوئی چیز کسی کے سمجھ میں بھی آجاتی ہے' یہاں بظاہر اس کی اصل حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو یعقوب علیہ السلام کا لیا جارہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتداء ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کا لیا جارہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتداء ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو یہ انداز ہو چکا تھا کہ یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہے تو اس کا طبعی اقتضاء یہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہنچتے' تحقیق کرتے' مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا دھیان اس طرف نہ جانے دیا اور پھر مدتوں کے بعد انہوں نے بھائیوں سے یہ بھی فرمایا کہ "جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو" جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرمادیتے ہیں۔

والد سے بات چیت

جب برادران یوسف علیہ السلام مصر سے غلہ لے کر گھر واپس آئے تو مصر کے معاملہ کا تذکرہ والد ماجد سے کرتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ عزیز مصر نے آئندہ کے لئے ہمیں غلہ دینے کے لئے یہ شرط کردی ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لاؤ گے تو ملے گا ورنہ نہیں' اس لئے آپ آئندہ بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہمیں آئندہ بھی غلہ مل سکے اور ہم اس بھائی کی تو پوری حفاظت کرنے والے ہیں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔

والد ماجد نے فرمایا کہ کیا ان کے بارے میں تم پر ایسا ہی اطمینان کروں یسا اس سے پہلے ان کے بھائی یوسف کے بارہ میں کیا تھا مطلب ظاہر ہے کہ اب تمہاری بات کا اعتبار کیا ہے ایک مرتبہ تم پر اطمینان کر کے مصیبت اٹھا چکا ہوں تم نے یہی الفاظ حفاظت کرنے کے اس وقت بھی بولے تھے۔

یہ تو ان کی بات کا جواب تھا مگر پھر خاندان کی ضرورت کے پیش نظر پیغمبرانہ توکل اور اس حقیقت کو اصل قرار دیا کہ کوئی نفع نقصان کسی بندہ کے ہاتھ میں نہیں جب تک اللہ تعالیٰ

ہی کی مشیت وارادہ نہ ہو اور جب ان کا ارادہ ہو جائے تو پھر اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا اس لئے مخلوق پر بھروسہ بھی غلط ہے اور ان کی شکایات پر معاملہ کا مدار رکھنا بھی نامناسب ہے۔

اس لئے فرمایا فَاللّٰہُ خَیْرٌ حٰفِظًا ''یعنی تمہاری حفاظت کا نتیجہ تو پہلے دیکھ چکا ہوں، اب تو میں اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کرتا ہوں وَّھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ اور وہ سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے اسی سے امید ہے کہ وہ میری ضعیفی اور موجودہ غم واندوہ پر نظر فرما کر مجھ پر دوہرے صدمے نہ ڈالے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ظاہری حالات اور اپنی اولاد کے عہد و پیمان پر بھروسہ نہ کیا مگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر چھوٹے بیٹے کو بھی ساتھ بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔

چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے کی اجازت

اب تک تو برادران یوسف علیہ السلام کی یہ ابتدائی گفتگو حالات سفر بیان کرنے کے دوران میں ہو رہی تھی ابھی سامان کھولا نہ تھا اس کے بعد جب سامان کھولا اور دیکھا کہ ان کی وہ پونجی جو غلہ کی قیمت میں ادا کر کے آئے تھے وہ بھی سامان کے اندر موجود ہے تو اس وقت انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام سہواً نہیں ہوا بلکہ قصداً ہماری پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے اسی لئے ردت الینا کہا یعنی یہ پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے اور پھر والد محترم سے عرض کیا مانبغی یعنی ہمیں اور کیا چاہئے کہ غلہ بھی آ گیا اور اس کی قیمت بھی واپس مل گئی اب تو ہمیں ضرور دوبارہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اطمینان سے جانا چاہئے کیونکہ اس معاملہ سے معلوم ہوا کہ عزیز مصر ہم پر بہت مہربان ہے اس لئے کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم اپنے خاندان کے لئے غلہ لائیں اور بھائی کو بھی حفاظت سے رکھیں، اور بھائی کے حصہ کا غلہ مزید مل جائے کیونکہ ہم جو کچھ لائے ہیں یہ تو ہمارے اخراجات کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے چند روز میں ختم ہو جائے گا۔

والد محترم نے یہ سب باتیں سن کر جواب دیا لن ارسلہ معکم حتی تؤتون مو ثقا من اللہ لتا تننی بہ ''یعنی میں بنیامین کو تمہارے ساتھ اس وقت تک نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ تعالیٰ کی قسم اور یہ عہد و پیمان مجھے نہ دے دو کہ تم اس کو ضرور اپنے ساتھ واپس لاؤ گے۔'' مگر چونکہ حقیقت نظروں سے یہ بات کسی وقت غائب نہیں ہوتی کہ انسان بے چارہ ظاہری قوت وقدرت

کتنی ہی رکھتا ہو پھر بھی ہر چیز میں مجبور اور قدرت حق جل شانہ کے سامنے عاجز ہے وہ کسی شخص کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کا عہد و پیمان ہی کیا کر سکتا ہے کیونکہ وہ اس پر مکمل قدرت نہیں رکھتا اس لئے اس عہد و پیمان کے ساتھ ایک استثناء بھی لگا دیا: اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ، یعنی بجز اس صورت کے کہ تم سب کسی گھیرے میں آ جاؤ' امام تفسیر مجاہد رحمہ اللہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ اور قتادہؒ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم بالکل عاجز اور مغلوب ہو جاؤ۔

جب صاحبزادوں نے مطلوبہ طریقہ پر عہد و پیمان کر لیا یعنی سب نے قسمیں کھائیں اور والد کو اطمینان دلانے کے لئے بڑی شدت سے حلف کئے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کی حفاظت کے لئے حلف دینے اور حلف اٹھانے کا جو کام ہم کر رہے ہیں اس سب معاملہ کا بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہے اس کی توفیق سے کوئی کسی کی حفاظت کر سکتا ہے اور اپنے عہد کو پورا کر سکتا ہے ورنہ انسان بے بس ہے اس کے ذاتی قبضہ قدرت میں کچھ نہیں۔

حضرت یعقوب کی نصیحت

برادران کا یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ارادہ کیا تو اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جا رہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازے سے سب داخل نہ ہو بلکہ شہر پناہ کے پاس پہنچ کر متفرق ہو جانا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند قد آور صاحب جمال و صاحب وجاہت ہیں ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بدنظر کی نظر لگ جائے جس سے ان کو کوئی تکلیف پہنچے یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں' اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ

تھا مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا جس سے عام ارکان دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہو گیا تو اب یہ خطرہ قوی ہو گیا کہ کسی کی نظر لگ جائے یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر ذاتی نہیں

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں' دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا جس سے غفلت کی بناء پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام جاہلانہ خیالات واوہام کے شکار ہو جاتے ہیں' وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان ومال میں ایک قسم کا مسمریزم ہے' اور وہ ایسا ہے جیسے مضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کر دیتی ہے' گرمی' سردی کی شدت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں' اسی طرح نظر بد یا مسمریزم کے تصرفات بھی انہی اسباب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوت سے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی بلکہ سب اسباب عالم حق جل شانہ کی قدرت کاملہ اور مشیت وارادہ کے تابع ہیں' تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہو سکتی ہے نہ مضر تدبیر کی مضرت اثر انداز ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ نظر بد سے بچنے کی جو تدبیر میں نے بتلائی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کو نہیں ٹال سکتی' حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے' البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے' اس لئے یہ وصیت کی گئی مگر میرا بھروسہ اس تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہے اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرے' ظاہری اور مادی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

تدبیروں کا ناکام ہونا

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا' اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کر لینے

کے باوجود سب چیزیں ناکام ہوگئیں اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر ناکام ہوگئی اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا مگر بتقدیر الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کر سکے مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا اور بڑی عافیت وعزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

صاحبزادوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی شہر کے متفرق دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہوگیا ان کی یہ تدبیر اللہ کے کسی حکم کو ٹال نہ سکتی تھی مگر یعقوب علیہ السلام کی پدرانہ شفقت ومحبت کا تقاضا تھا جو انہوں نے پورا کر لیا۔

حضرت یوسف کا بنیامین کو حقیقت سے آگاہ کرنا

جب شہر مصر پہنچنے کے بعد یہ سب بھائی یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے انہوں نے دیکھا کہ یہ وعدہ کے مطابق انکے حقیقی بھائی کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھہرایا امام تفسیر قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا تو بنیامین تنہا رہ گئے انکو اپنے ساتھ ٹھہرنے کیلئے فرمایا جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام نے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں اب تم کوئی فکر نہ کرو اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا جس سے غفلت کی بناء پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام

جاہلانہ خیالات واوہام کے شکار ہوجاتے ہیں وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان ومال میں ایک قسم کا مسمریزم ہے' اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کردیتی ہے' گرمی' سردی کی شدت سے امراض پیدا ہوجاتے ہیں' اسی طرح نظر بد یا مسمریزم کے تصرفات بھی انہی اسباب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوت سے اس کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی بلکہ سب اسباب عالم حق جل شانہ کی قدرت کاملہ اور مشیت وارده کے تابع ہیں تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہوسکتی ہے نہ مضر تدبیر کی مضرت اثر انداز ہوسکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ط اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ ط یعنی نظر بد سے بچنے کی جو تدبیر میں نے بتلائی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت وارده کو نہیں ٹال سکتی حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے اس لئے یہ وصیت کی گئی مگر میرا بھروسہ اس تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہے اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرے ظاہری اور مادی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کرلینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہوگئیں' اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر ناکام ہوگئی اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا مگر بتقدیر الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی' اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کرسکے مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا اور بڑی عافیت وعزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

اسی مضمون کا بیان اس کے بعد کی آیت میں اس طرح آیا کہ صاحبزادوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی، شہر کے متفرق دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا ان کی یہ تدبیر اللہ کے کسی حکم کو ٹال نہ سکتی تھی مگر یعقوب علیہ السلام کی پدرانہ شفقت و محبت کا تقاضا تھا جو انہوں نے پورا کرلیا۔

اس آیت کے آخر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی یعقوب علیہ السلام بڑے علم والے تھے کیونکہ ان کو ہم نے علم دیا تھا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح ان کا علم کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ بلا واسطہ عطاء خداوندی اور وہبی علم تھا اسی لئے انہوں نے ظاہری تدبیر جو شرعاً مشروع اور محمود ہے وہ تو کرلی، مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا، مگر بہت سے لوگ اس بات کی حقیقت کو نہیں جانتے اور ناواقفیت سے یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ایسے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ تدبیریں پیغمبر کی شان کے شایان نہ تھیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ پہلے لفظ علم سے مراد علم کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو علم ان کو عطا کیا وہ اس پر عامل اور اس کے پابند تھے اسی لئے ظاہری تدبیروں پر بھروسہ نہیں فرمایا بلکہ اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر فرمایا۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی جب شہر مصر پہنچنے کے بعد یہ سب بھائی یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ یہ وعدہ کے مطابق ان کے حقیقی بھائی کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھہرایا، امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کے لئے فرمایا جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام نے حقیقی بھائی پر راز فاش کردیا اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں، اب تم کوئی فکر نہ کرو اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

بنیامین کے غلہ میں برتن چھپانا

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قاعدہ کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔

بنیامین کے لئے جو غلہ اونٹ پر لادا گیا اس میں ایک برتن چھپا دیا گیا' اس برتن کو قرآن کریم نے ایک جگہ بلفظ سقایہ اور دوسری جگہ صواع الملک کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے' سقایہ کے معنی پانی پینے کا برتن اور صواع بھی اسی طرح کے برتن کو کہتے ہیں اس کو ملک کی طرف سے منسوب کرنے سے اتنی بات اور معلوم ہوئی کہ یہ برتن کوئی خاص قیمت اور حیثیت رکھتا تھا بعض روایات میں ہے کہ زبرجد کا بنا ہوا تھا' بعض نے سونے کا بعض نے چاندی کا بتلایا ہے بہر حال یہ برتن جو بنیامین کے سامان میں چھپا دیا گیا تھا خاصہ قیمتی برتن ہونے کے علاوہ ملک مصر سے کوئی اختصاص بھی رکھتا تھا خواہ یہ کہ وہ خود اس کو استعمال کرتے تھے یا یہ کہ ملک نے بامر خود اس برتن کو غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا تھا۔

بھائیوں پر چوری کا الزام لگنا

''کچھ دیر کے بعد ایک منادی کرنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو''

یہاں لفظ ثم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منادی فوراً ہی نہیں کی گئی بلکہ کچھ مہلت دی گئی' یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہو گیا اس کے بعد یہ منادی کی گئی تا کہ کسی کو جعلسازی کا شبہ نہ ہو جائے بہر حال اس منادی کرنے والے نے برادران یوسفؑ کے قافلہ کو چور قرار دے دیا۔

برادران یوسف منادی کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تم ہمیں چور بنا رہے ہو یہ تو کہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے۔

منادی کرنے والوں نے کہا کہ بادشاہ کا صواع یعنی برتن گم ہو گیا ہے اور جو شخص اس کو کہیں سے برآمد کرے گا اس کو ایک اونٹ بھر غلہ انعام میں ملے گا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی تدبیریں

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس

روکنے کا یہ حیلہ بھی کیوں کیا جبکہ ان کو معلوم تھا کہ والد ماجد پر خود ان کی مفارقت کا صدمہ ناقابل برداشت تھا اب دوسرے بھائی کو روک کر ان کو دوسرا صدمہ دینا کیسے گوارا کیا؟

دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگانا اور اس کے لئے یہ جعلسازی کہ ان کے سامان میں خفیہ طور سے کوئی چیز رکھ دی اور پھر علانیہ ان کی رسوائی ظاہر ہو یہ سب کام ناجائز ہیں اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام نے ان کو کیسے گوارا کیا؟

بعض مفسرین قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب بنیامین نے یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور وہ مطمئن ہو گئے تو بھائی سے یہ درخواست کی کہ اب آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجئے مجھے اپنے پاس رکھئے' یوسف علیہ السلام نے اول یہی عذر کیا کہ اگر تم یہاں رک گئے تو والد کو صدمہ شدید ہوگا دوسرے تمہیں اپنے پاس روکنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں تم پر چوری کا الزام لگاؤں' اور اس الزام میں گرفتار کر کے اپنے پاس رکھ لوں بنیامین ان بھائیوں کی معاشرت سے کچھ ایسے دل تنگ تھے کہ ان سب باتوں کے لئے تیار ہو گئے۔

لیکن یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو والد کی دل آزاری اور سب بھائیوں کی رسوائی اور ان کو چور کہنا صرف بنیامین کے راضی ہو جانے سے تو جائز نہیں ہو سکتا' اور بعض حضرات کی یہ توجیہ کہ منادی کا ان کو چور کہنا یوسف علیہ السلام کے علم و اجازت سے نہ ہوگا ایک بے دلیل دعوٰی اور صورت واقعہ کے لحاظ سے بے جوڑ بات ہے' اسی طرح یہ تاویل کہ ان بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو والد سے چرایا اور فروخت کیا تھا اس لئے ان کو چور کہا گیا' یہ بھی ایک تاویل ہے اس لئے ان سب سوالوں کا صحیح جواب وہی ہے جو قرطبی اور مظہری وغیرہ نے دیا ہے' کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا' نہ یوسف علیہ السلام کی اپنی تجویز کا' بلکہ یہ سب کام بامر الٰہی اسی کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل ہو رہی تھی اس جواب کی طرف خود قرآن کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ یعنی ہم نے اسی طرح تدبیر کی یوسف کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کی۔

اس آیت میں واضح طور پر اس حیلہ و تدبیر کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے'

کہ یہ سب کام جب کہ بامر خداوندی ہوئے تو ان کو ناجائز کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے' ان کی مثال ایسی ہی ہو گی جیسے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں کشتی توڑنا' لڑکا کو قتل کرنا وغیرہ' جو بظاہر گناہ تھے اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان پر نکیر کیا' مگر خضر علیہ السلام یہ سب کام باذن خداوندی خاص مصالح کے تحت کر رہے تھے اس لئے ان کا کوئی گناہ نہ تھا۔

برادران یوسف کا اپنی صفائی دینا

جب شاہی منادی نے برادران یوسف پر چوری کا الزام لگایا تو انہوں نے کہا کہ ارکان دولت بھی خود ہمارے حالات سے واقف ہیں کہ ہم کوئی فساد کرنے یہاں نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔

''شاہی ملازمین نے کہا کہ اگر تمہارا جھوٹ ثابت ہو جائے تو بتلاؤ کہ چور کی کیا سزا ہے''

برادران یوسف نے کہا کہ جس شخص کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو وہ شخص خود ہی اس کی جزا ہے ہم چوروں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ شریعت یعقوب علیہ السلام میں چور کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کا مال چرایا ہے وہ شخص اس چور کو اپنا غلام بنا کر رکھے۔

بنیامین کے سامان سے برتن کی برآمدگی

سرکاری ملازمین نے اس طرح خود برادران یوسف سے چور کی سزا شریعت یعقوبی کے مطابق معلوم کر کے ان کو اس کا پابند کر دیا کہ بنیامین کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو تو وہ اپنے ہی فیصلہ کے مطابق بنیامین کو یوسف علیہ السلام کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

''سرکاری تفتیش کرنے والوں نے اصل سازش پر پردہ ڈالنے کے لئے پہلے سب بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی' پہلے ہی بنیامین کا سامان نہیں کھولا تا کہ ان کو شبہ نہ ہو جائے''

آخر میں بنیامین کا سامان کھولا گیا تو اس میں سے صواع الملک کو برآمد کر لیا' اس وقت تو سب بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں اور بنیامین کو سخت سست کہنے لگے کہ تو نے ہمارا منہ کالا کر دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی کامیابی

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ط مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ یعنی اسی طرح ہم نے تدبیر کی یوسف کے لئے' وہ اپنے بھائی کو شاہ مصر کے قانون کے ماتحت گرفتار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مصر کا قانون چور کے متعلق یہ تھا کہ چور کو مار پیٹ کی سزا دی جائے اور مال مسروقہ سے دوگنی قیمت وصول کر کے چھوڑ دیا جائے مگر انہوں نے یہاں برادران یوسف ہی سے چور کا حکم شریعت یعقوبی کے مطابق دریافت کر لیا تھا اس کی رُو سے بنیامین کو اپنے پاس روک لینا صحیح ہو گیا' اس طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے یوسف علیہ السلام کی یہ مراد بھی پوری ہو گئی۔

بھائیوں کی بنیامین کو ملامت اور واپسی

آیت ۷۷ تا ۸۲ میں ہے کہ "کہنے لگے کہ صاحب اگر اس نے چوری کی تو تعجب نہیں کیونکہ اس کا ایک بھائی تھا وہ بھی اسی طرح اس کے پہلے چوری کر چکا ہے جس کا قصہ درمنثور میں اس طرح لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ان کی پھوپھی پرورش کرتی تھیں جب ہوشیار ہوئے تو یعقوب علیہ السلام نے لینا چاہا وہ ان کو چاہتی بہت تھیں' انہوں نے ان کو رکھنا چاہا اس لئے انہوں نے ان کی کمر میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر مشہور کر دیا کہ پٹکا گم ہو گیا اور سب کی تلاشی لی تو ان کی کمر میں نکلا اور اس شریعت کے قانون کے موافق ان کو پھوپھی کے قبضہ میں رہنا پڑا یہاں تک کہ ان کی پھوپھی نے وفات پائی پھر یعقوب علیہ السلام کے پاس آ گئے اور ممکن ہے یہ صورت استرقاق کی بھی یوسف علیہ السلام کی رضامندی سے ہوئی ہو' اس لئے یہاں بھی آزاد کا غلام بنانا لازم نہیں آیا اور ہر چند کہ قرائن و اخلاق یوسفیہ میں ذرا تامل کرنے سے آپ کی برأت اس فعل سے یقیناً معلوم تھی مگر بنیامین پر جو بھائیوں کو غصہ تھا اس میں یہ بات بھی کہہ دی پس یوسف علیہ السلام نے اس بات کو جو آگے آتی ہے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو ان کے سامنے زبان سے ظاہر نہیں کیا یعنی دل میں' یوں کہا کہ اس چوری کے درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ برے ہو یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقت سرقہ صادر نہیں ہوا

اور تم نے تو اتنا بڑا کام کیا کہ کوئی مال غائب کرتا ہے تم نے آدمی غائب کر دیا کہ مجھ کو باپ سے بچھڑا دیا اور ظاہر ہے کہ آدمی کی چوری مال کی چوری سے زیادہ سخت جرم ہے اور جو کچھ تم ہم دونوں بھائیوں کے متعلق بیان کر رہے ہو کہ ہم چور ہیں اس کی حقیقت کا اللہ ہی کو خوب علم ہے کہ ہم چور نہیں ہیں جب بھائیوں نے دیکھا کہ انہوں نے بنیامین کو ماخوذ کر لیا اور اس پر قابض ہو گئے تو براہ خوشامد کہنے لگے اے عزیز اس بنیامین کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے اور اس کو بہت چاہتا ہے اس کے غم میں خدا جانے کیا حال ہو اور ہم سے اس قدر محبت نہیں سو آپ ایسا کیجئے کہ اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لیجئے اور اپنا مملوک بنا لیجئے ہم آپ کو نیک مزاج دیکھتے ہیں امید ہے کہ اس درخواست کو منظور فرما لیں گے' یوسف علیہ السلام نے کہا ایسی بے انصافی کی بات سے خدا بچائے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا دوسرے شخص کو پکڑ کر رکھ لیں اگر ہم ایسا کریں تو اس حالت میں تو ہم بڑے بے انصاف سمجھے جائیں گے کسی آزاد آدمی کو غلام بنا لینا اور غلاموں کا معاملہ کرنا اس کی رضا مندی سے بھی حرام ہے پھر جب ان کو یوسف علیہ السلام سے تو ان کے صاف جواب کے سبب بالکل امید نہ رہی کہ بنیامین کو دیں گے تو اس جگہ سے علیحدہ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہئے' پھر زیادہ کی یہ رائے ہوئی کہ مجبوری ہے سب کو واپس چلنا چاہئے مگر ان سب میں جو بڑا تھا اس نے کہا کہ تم جو سب کے سب واپس چلنے کی صلاح کر رہے ہو تو کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ تم سے خدا کی قسم کھلا کر پکا قول لے چکے ہیں کہ تم اس کو اپنے ہمراہ لانا' لیکن اگر گھر جاؤ تو مجبوری ہے' سو ہم سب کے سب تو گھرے نہیں کہ تدبیر کی گنجائش نہ رہتی' اس لئے حتی الامکان کچھ تدبیر کرنا چاہئے' اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں کس قدر کوتاہی کر چکے ہو کہ ان کے ساتھ جو کچھ برتاؤ ہوا اس سے باپ کے حقوق بالکل ضائع ہوئے سو وہ پرانی ہی شرمندگی کیا کم ہے جو ایک نئی شرمندگی لے کر جائیں' سو میں تو اس زمین سے ٹلتا نہیں' تاوقتیکہ میرے باپ مجھ کو حاضری کی اجازت نہ دیں یا اللہ تعالیٰ اس مشکل کو سلجھا دے اور وہی خود سلجھانے والا ہے یعنی کسی تدبیر سے بنیامین چھوٹ جائے' غرض میں یا اس کو لے کر جاؤں گا یا بلایا ہوا جاؤں گا' سو مجھ کو تو یہاں چھوڑ دو اور تم

واپس اپنے باپ کے پاس جاؤ اور جا کر ان سے کہو کہ اے ابا آپ کے صاحبزادے بنیامین نے چوری کی اس لئے گرفتار ہوئے' اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو ہم کو مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے' اور ہم قول وقرار دینے کے وقت غیب کی باتوں کے تو حافظ تھے نہیں کہ یہ چوری کرے گا' ورنہ ہم کبھی قول نہ دیتے اور اگر ہمارے کہنے کا یقین نہ ہو تو اس بستی یعنی مصر والوں سے کسی اپنے معتمد کی معرفت پوچھ لیجئے جہاں ہم اس وقت موجود تھے جب چوری برآمد ہوئی ہے اور اس قافلہ والوں سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر یہاں آئے ہیں' معلوم ہوتا ہے اور بھی کنعان کے یا آس پاس کے لوگ غلہ لینے گئے ہوں گے اور یقین جانئے ہم بالکل سچ کہتے ہیں چنانچہ سب نے بڑے بھائی کو وہاں چھوڑا اور خود آ کر سارا ماجرا بیان کیا۔

بھائیوں کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام

جب برادران یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا اور شرم سے ان کی آنکھیں جھک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے:

''اگر اس نے چوری کر لی تو کچھ زیادہ تعجب نہیں اس کا ایک بھائی تھا اس نے بھی اسی طرح اس سے پہلے چوری کی تھی۔'' مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں' علاتی ہے اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اس نے بھی چوری کی تھی۔

واقعہ کی حقیقت

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت خود یوسف علیہ السلام پر بھی چوری کا الزام لگا دیا' جس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بچپن میں پیش آیا تھا جس میں ٹھیک اسی طرح جیسے یہاں بنیامین پر چوری کا الزام لگانے کی سازش کی گئی ہے اس وقت یوسف علیہ السلام پر ان کی بے خبری میں ایسی ہی سازش کی گئی تھی اور یہ سب بھائیوں کو پوری طرح معلوم تھا کہ یوسف علیہ السلام اس الزام سے بالکل بری ہیں مگر اس وقت بنیامین پر غصہ کی وجہ سے اس واقعہ کو بھی چوری کا قرار دے کر اس کا الزام ان کے بھائی یوسف علیہ السلام پر لگا دیا ہے۔

وہ واقعہ کیا تھا اس میں روایات مختلف ہیں' ابن کثیر رحمہ اللہ نے بحوالہ محمد بن اسحاق مجاہد رحمہ اللہ امام تفسیر سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنیامین پیدا ہوئے تو یہ ولادت ہی والدہ کی موت کا سبب بن گئی' یوسف علیہ السلام اور بنیامین دونوں بھائی بغیر ماں کے رہ گئے' تو ان کی تربیت و حضانت ان کی پھوپھی کی گود میں ہوئی' اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بچپن سے ہی کچھ ایسی شان عطاء فرمائی تھی کہ جو دیکھتا ان سے بے حد محبت کرنے لگتا تھا پھوپھی کا بھی یہی حال تھا کہ کسی وقت ان کو نظروں سے غائب کرنے پر قادر نہ تھیں' دوسری طرف والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا مگر بہت چھوٹا ہونے کی بناء پر ضرورت اس کی تھی کہ کسی عورت کی نگرانی میں رکھا جائے اس لئے پھوپھی کے حوالے کر دیا تھا اب جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کا ارادہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھیں پھوپھی سے کہا تو انہوں نے عذر کیا پھر زیادہ اصرار پر مجبور ہو کر یوسف علیہ السلام کو ان کے والد کے حوالے تو کر دیا مگر ایک تدبیر ان کو واپس لینے کی یہ کر دی کہ پھوپھی کے پاس ایک پٹکا تھا جو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی طرف سے ان کو پہنچا تھا اور اس کی بڑی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی یہ پٹکا پھوپھی نے یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے کمر پر باندھ دیا۔

یوسف علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ شہرت دی کہ میرا پٹکا چوری ہو گیا پھر تلاشی لی گئی تو وہ یوسف علیہ السلام کے پاس نکلا' شریعت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے مطابق اب پھوپھی کو یہ حق ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنا مملوک بنا کر رکھیں' یعقوب علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ شرعی حکم کے اعتبار سے پھوپھی یوسف علیہ السلام کی مالک بن گئی تو ان کے حوالے کر دیا اور جب تک پھوپھی زندہ رہیں یوسف علیہ السلام انہی کی تربیت میں رہے۔

یہ واقعہ تھا جس میں چوری کا الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر لگا اور پھر ہر شخص پر حقیقت حال روشن ہو گئی کہ یوسف علیہ السلام چوری کے ادنیٰ شبہ سے بھی بری ہیں پھوپھی کی محبت نے ان سے یہ سازش کا جال پھیلوایا تھا بھائیوں کو بھی یہ حقیقت معلوم تھی اس کی بناء پر کسی طرح زیبا نہ تھا کہ ان کی طرف سے چوری کو منسوب کرتے مگر ان کے حق میں بھائیوں کی جو زیادتی اور بے راہ روی اب تک ہوتی چلی آئی تھی یہ بھی اسی کا ایک آخری جز تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب

یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی یہ بات سن کر اپنے دل میں رکھی' کہ یہ لوگ اب تک بھی میرے درپے ہیں کہ چوری کا الزام لگا رہے ہیں مگر اس کا اظہار بھائیوں پر نہیں ہونے دیا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کی یہ بات سنی ہے اور اس سے کچھ اثر لیا ہے اور یوسف علیہ السلام نے اپنے دل میں کہا کہ تم لوگ ہی برے درجہ اور برے حال میں ہو کہ بھائی پر چوری کی تہمت جان بوجھ کر لگاتے ہو اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط' پہلا جملہ تو دل میں کہا گیا ہے' یہ دوسرا جملہ ممکن ہے کہ بھائیوں کے جواب میں اعلاناً کہہ دیا ہو۔

بھائیوں کی طرف سے منت وخوشامد

برادران یوسف نے جب دیکھا کہ کوئی بات چلتی نہیں اور بنیامین کو یہاں چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تو عزیز مصر کی خوشامد شروع کی اور یہ درخواست کی کہ اس کے والد بہت بوڑھے ہیں اور ضعیف ہیں اس کی مفارقت ان سے برداشت نہ ہوگی اس لئے آپ اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی کو گرفتار کرلیں یہ درخواست آپ سے ہم اس امید پر کر رہے ہیں کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بہت احساس کرنے والے ہیں یا یہ کہ آپ نے اس سے پہلے بھی ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمایا ہے۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی درخواست کا جواب ضابطہ کے مطابق یہ دیا کہ یہ بات تو ہمارے اختیار میں نہیں کہ جس کو چاہیں پکڑ لیں بلکہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہوا اگر اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں تو ہم تمہارے ہی فتویٰ اور فیصلے کے مطابق ظالم ہو جائیں گے کیونکہ تم نے ہی یہ کہا ہے کہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہو وہ ہی اس کی جزاء ہے۔

آپس میں مشورہ

جب برادران یوسف بنیامین کی رہائی سے مایوس ہوگئے تو باہم مشورہ کے لئے کسی علیحدہ جگہ میں جمع ہوگئے۔

ان کے بڑے بھائی نے کہا کہ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم سے بنیامین کے واپس لانے کا پختہ عہد لیا تھا اور یہ کہ تم اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے معاملہ میں ایک کوتاہی اور غلطی کر چکے ہو اس لئے میں تو اب مصر کی زمین کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک میرے والد خود ہی مجھے یہاں سے واپس آنے کا حکم نہ دیں' یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی مجھے یہاں سے نکلنے کا حکم ہو اور اللہ تعالیٰ ہی بہترین حکم کرنے والے ہیں۔

یہ بڑے بھائی جن کا کلام بیان ہوا ہے بعض نے فرمایا کہ یہودا ہیں اور یہ اگرچہ عمر میں سب سے بڑے نہیں مگر علم و فضل میں بڑے تھے اور بعض مفسرین نے کہا کہ روبیل ہیں جو عمر میں سب سے بڑے ہیں اور یوسف علیہ السلام کے قتل نہ کرنے کا مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا اور بعض نے کہا کہ یہ بڑے بھائی شمعون ہیں جو جاہ و رتبہ کے اعتبار سے سب بھائیوں میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔

واپسی اور والد کو جواب

بڑے بھائی نے کہا کہ میں تو یہیں رہوں گا آپ سب لوگ اپنے والد کے پاس واپس جائیں اور ان کو بتلائیں کہ آپ کے صاحبزادے نے چوری کی' اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنے چشم دید حالات ہیں کہ مال مسروقہ ان کے سامان سے ہمارے سامنے برآمد ہوا۔

ہم نے جو آپ سے عہد کیا تھا کہ ہم بنیامین کو ضرور واپس لائیں گے یہ عہد ظاہری حالات کے اعتبار سے تھا' غیب کا حال تو ہم نہ جانتے تھے کہ یہ چوری کر کے گرفتار اور ہم مجبور ہو جائیں گے' اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے آپ کے بھائی بنیامین کی پوری حفاظت کی کہ کوئی ایسا کام ان سے نہ ہو جائے جس کے باعث وہ تکلیف میں پڑیں' مگر ہماری یہ کوشش ظاہری احوال ہی کی حد تک ہو سکتی تھی' ہماری نظروں سے غائب لاعلمی میں ان سے یہ کام ہو جائے گا ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ چونکہ برادران یوسف اس سے پہلے ایک فریب اپنے والد کو دے چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہمارے مذکور الصدر بیان سے والد کا ہرگز اطمینان نہ ہوگا' اور وہ ہماری بات پر یقین نہ کریں گے اس لئے مزید تاکید کے لئے کہا کہ آپ کو ہمارا یقین نہ آئے تو آپ اس شہر کے لوگوں سے تحقیق کر لیں جس میں ہم تھے یعنی شہر مصر' اور آپ اس قافلہ سے بھی تحقیق کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہی مصر سے کنعان آیا ہے اور ہم اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

حضرت یعقوب کا بیٹوں کو جواب

یعقوب علیہ السلام کے چھوٹے صاحبزادے بنیامین کی مصر میں گرفتاری کے بعد ان کے بھائی وطن واپس آئے اور یعقوب علیہ السلام کو یہ ماجرا سنایا' اور یقین دلانا چاہا کہ ہم اس واقعہ میں بالکل سچے ہیں آپ اس بات کی تصدیق مصر کے لوگوں سے بھی کر سکتے ہیں اور جو قافلہ ہمارے ساتھ مصر سے کنعان آیا ہے اس سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بنیامین کی چوری پکڑی گئی اس لئے وہ گرفتار ہو گئے' یعقوب علیہ السلام کو چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان صاحبزادوں کا جھوٹ ثابت ہو چکا تھا اس لئے اس مرتبہ بھی یقین نہیں آیا اگرچہ فی الواقع اس وقت انہوں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا اس لئے اس موقع پر بھی وہی کلمات فرمائے جو یوسف علیہ السلام کی گم شدگی کے وقت فرمائے تھے' بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ' فصبر جمیل ''یعنی یہ بات جو تم کہہ رہے ہو صحیح نہیں' تم نے خود بات بنائی ہے مگر میں اب بھی صبر ہی کرتا ہوں' وہی میرے لئے بہتر ہے۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں بات بنانے سے مراد وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھلا کر بنیامین کو گرفتار کیا گیا جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا اس آیت کے اگلے جملے سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِھِمْ جَمِیْعًا ط یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا اس کا حاصل یہ تھا کہ درحقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہوئے ہیں بات کچھ اور ہے یہ اپنی جگہ صحیح تھا مگر صاحبزادوں نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

حضرت یعقوب کا صدمہ

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس دوسرے صدمے کے بعد صاحبزادوں سے اس معاملہ میں گفتگو کو چھوڑ کر اپنے رب کے سامنے فریاد شروع کی اور فرمایا کہ مجھے سخت رنج و غم ہے

یوسف پر اور اس رنج و غم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں، یعنی بینائی جاتی رہی یا بہت ضعیف ہو گئی، مقاتل امام تفسیر نے فرمایا کہ یہ کیفیت یعقوب علیہ السلام کی چھ سال رہی کہ بینائی تقریباً جاتی رہی تھی فھو کظیم یعنی پھر وہ خاموش ہو گئے، کسی سے اپنا دکھ نہ کہتے تھے کظیم کظم سے بنا ہے جس کے معنی بند ہو جانے اور بھر جانے کے ہیں مراد یہ ہے کہ غم واندوہ سے ان کا دل بھر گیا اور زبان بند ہو گئی کہ کسی سے اپنا رنج و غم بیان نہ کرتے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مجمع عام کے سامنے لا کر جنت کی نعمتوں میں اختیار دیں گے کہ جو چاہیں لے لیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک حدیث نقل کی ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ، پڑھنے کی تلقین اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ کلمہ انسان کو رنج و غم کی تکلیف سے نجات دینے میں بڑا موثر ہے خصوصیت امت محمدیہ کی اس سے معلوم ہوئی کہ اس شدید غم و صدمہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کلمہ کے بجائے یا سفی علی یوسف فرمایا، بیہقی نے شعیب الایمان میں بھی یہ حدیث ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا شغف محبت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیوں تھا

اس مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ غیر معمولی محبت اور ان کے گم ہونے پر اتنا اثر کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بناء پر چالیس سال اور بعض کی بناء پر ۸۰ سال بتلائی جاتی ہے مسلسل روتے رہنا یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی بظاہر ان کے پیغمبرانہ شان کے شایاں نہیں کہ اولاد سے اتنی محبت کریں جبکہ قرآن کریم نے اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے ارشاد ہے: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ "یعنی تمہارے مال اور اولاد فتنہ اور آزمائش ہیں" اور انبیاء علیہم السلام کی شان قرآن کریم نے یہ بتلائی ہے کہ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ "یعنی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص صفت کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے وہ صفت ہے دار آخرت کی یاد" مالک بن دینار

رحمہ اللہ نے اس کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال دی اور صرف آخرت کی محبت سے ان کے قلوب کو معمور کر دیا ان کا مطمح نظر کسی چیز کے لینے یا چھوڑنے میں صرف آخرت ہوتی ہے۔

اس مجموعہ سے یہ اشکال قوی ہو کر سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں ایسا مشغول ہونا کس طرح صحیح ہوا؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس اشکال کو ذکر کر کے حضرت مجدد الف ثانی کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے قرآن و حدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے' یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حسن صورت ہی نہیں بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسن سیرت بھی ہیں' اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی' انتہیٰ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا امتحان

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ یہ محبت اگرچہ درحقیقت دنیا کی محبت نہ تھی مگر بہر حال اس میں ایک حیثیت دنیوی بھی تھی' اسی وجہ سے یہ محبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء اور امتحان کا ذریعہ بنی' اور چالیس سال کی مفارقت کا ناقابل برداشت صدمہ برداشت کرنا پڑا اور اس واقعہ کے اجزاء اول سے آخر تک اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ ایسی صورتیں بنتی چلی گئیں کہ یہ صدمہ طویل سے طویل ہوتا چلا گیا ورنہ واقعہ کے شروع میں اتنی شدید محبت والے باپ سے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ بیٹوں کی بات سن کر گھر میں بیٹھ رہتے' بلکہ موقع پر پہنچ کر تفتیش و تلاش کرتے تو اسی وقت پتہ چل جاتا' مگر اللہ ہی کی طرف سے ایسی صورتیں بن گئیں کہ اس وقت یہ دھیان نہ آیا' پھر یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس سے روک دیا گیا کہ وہ اپنے حال کی اپنے والد کو خبر بھیجیں' یہاں تک کہ مصر کی حکومت و اقتدار ملنے کے بعد بھی انہوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں فرمایا' اور اس سے یہ بھی زیادہ صبر آزما وہ واقعات تھے جو بار بار ان کے بھائیوں کے مصر جانے کے متعلق پیش

آتے رہے اس وقت بھی نہ بھائیوں پر اظہار فرمایا نہ والد کو خبر بھیجنے کی کوشش فرمائی بلکہ دوسرے بھائی کو بھی اپنے پاس ایک تدبیر کے ذریعے روک کر والد کے صدمہ کو دوہرا کر دیا یہ سب چیزیں یوسف علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر سے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کو بذریعہ وحی اس سے نہ روک دیا گیا ہو اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے اس سارے عمل کو وحی خداوندی کی تلقین قرار دیا ہے اور كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ کے قرآنی ارشاد میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بیٹوں کا طعنہ اور اس کا جواب

صاحبزادے والد کے اس شدید غم واندوہ اور اس پر صبر جمیل کو دیکھ کر کہنے لگے کہ بخدا آپ تو یوسفؑ کو ہمیشہ یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ بیمار پڑ جائیں اور ہلاک ہونے والوں میں داخل ہو جائیں، آخر ہر صدمہ اور غم کی کوئی انتہا ہوتی ہے مرور ایام سے انسان اس کو بھول جاتا ہے مگر آپ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی اسی روز اول میں ہیں اور آپ کا غم اسی طرح تازہ ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی بات سن کر فرمایا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ، یعنی میں تو اپنی فریاد اور رنج وغم کا اظہار تم سے یا کسی دوسرے سے نہیں کرتا بلکہ اللہ جل شانہ کی ذات سے کرتا ہوں اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرمایا کہ میرا یہ یاد کرنا خالی نہ جائیگا میں اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وہ پھر مجھے ان سب سے ملائیں گے۔

حضرت یعقوب کا بنیامین کی تلاش کا حکم

اور دونوں کی تلاش کا رخ مصر ہی کی طرف قرار دیا جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے مناسب اسباب جمع فرما دیتے ہیں، اس لئے اس مرتبہ تلاش وتفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ

ہے کہ ان کی پونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہو گیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف وکریم ہے شاید یوسف علیہ السلام ہی ہوں۔

صبر کا اجر

امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ واقعہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبر جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونے سے کرے' اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتدا کرے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہے ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں' ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے غصہ کو پی جانا۔

اور حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہ رحمہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

من بث لم یصبر' یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کریگا اسکو ایسا ہی اجر ملے گا

حضرت یعقوب کی آزمائش کی وجہ

امام قرطبی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس شدید ابتلاء وامتحان کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ جو بعض روایات میں آئی ہے کہ ایک روز حضرت یعقوب علیہ السلام نماز تہجد پڑھ رہے تھے اور یوسف علیہ السلام ان کے سامنے سو رہے تھے اچانک یوسف علیہ السلام سے کچھ خراٹے کی آواز نکلی تو ان کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف چلی گئی پھر دوسری اور تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا دیکھو یہ میرا دوست اور مقبول بندہ مجھ سے خطاب اور عرض معروض کرنے کے درمیان میرے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے' قسم ہے میری عزت وجلال کی کہ میں ان کی یہ دونوں آنکھیں نکال لوں گا جن سے میرے غیر کی طرف توجہ کی ہے اور جس کی طرف توجہ کی ہے اس کو ان سے مدت دراز کے لئے جدا کر دوں گا۔

اسی لئے بخاری کی حدیث میں بروایت عائشہؓ وارد ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نماز میں کسی دوسری طرف دیکھنا کیسا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسکے ذریعہ شیطان بندہ کی نماز کو اچک لیتا ہے نعوذ باللہ سبحانہ و تعالیٰ۔

حضرت یوسف کی منت خوشامد

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو تو انہوں نے تیسری مرتبہ مصر کا سفر کیا' کیونکہ بنیامین کا تو وہاں ہونا معلوم تھا پہلی کوشش اس کی خلاصی کے لئے کرنا تھی اور یوسف علیہ السلام کا وجود اگرچہ مصر میں معلوم نہ تھا مگر جب کسی کام کا وقت آجاتا ہے تو انسان کی تدبیریں غیر شعوری طور پر بھی درست ہوتی چلی جاتی ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرمالیتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود جمع کردیتے ہیں' اس لئے تلاش یوسف کے لئے بھی غیر شعوری طور پر مصر ہی کا سفر مناسب تھا اور غلہ کی ضرورت بھی تھی اور یہ بات بھی تھی کہ غلہ طلب کرنے کے بہانے سے عزیز مصر سے ملاقات ہوگی اور ان سے اپنے بھائی بنیامین کی خلاصی کے متعلق عرض معروض کرسکیں گے۔

جب برادران یوسف والد کے حکم کے مطابق مصر پہنچے اور عزیز مصر سے ملے تو خوشامد کی گفتگو شروع کی' اپنی محتاجی اور بے کسی کا اظہار کیا کہ اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے یہاں تک کہ اب ہمارے پاس غلہ خریدنے کے لئے بھی کوئی مناسب قیمت موجود نہیں' ہم مجبور ہو کر کچھ نکمی چیزیں غلہ خریدنے کے لئے لے آئے ہیں' آپ اپنے کریمانہ اخلاق سے انہی نکمی چیزیوں کو قبول کرلیں' اور ان کے بدلے میں غلہ پورا اتنا ہی دے دیں جتنا اچھی قیمتی چیزوں کے بالمقابل دیا جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں آپ ہم کو خیرات سمجھ کر دے دیجئے بے شک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

حقیقت کا آشکارا ہونا

یہ نکمی چیزیں کیا تھیں؟ قرآن و حدیث میں ان کی کوئی تصریح نہیں' مفسرین کے

اقوال مختلف ہیں' بعض نے کہا کہ کھوٹے دراہم تھے جو بازار میں نہ چل سکتے تھے' بعض نے کہا کہ کچھ گھریلو سامان تھا' یہ لفظ مزجاۃ کا ترجمہ ہے اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو خود نہ چلے بلکہ اس کو زبردستی چلایا جائے۔

یوسف علیہ السلام نے جب بھائیوں کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے اور شکستہ حالت دیکھی تو طبعی طور پر اب حقیقت حال ظاہر کر دینے پر مجبور ہو رہے تھے اور واقعات کی رفتار کا انداز یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر جو اظہار حال کی پابندی منجانب اللہ تھی اب اس کے خاتمہ کا وقت بھی آ چکا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا خط

اور تفسیر قرطبی و مظہری میں بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا۔

''من جانب یعقوب صفی اللہ ابن اسحٰق ذبیح اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ بخدمت عزیز مصر' اما بعد' ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے' میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا' پھر میرے والد اسحٰق کا شدید امتحان لیا گیا' پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا' یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولاد انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا۔ والسلام''

حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائیوں کو اپنا تعارف کرانا

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے' اور بے اختیار رونے لگے اور اپنے راز کو ظاہر کر دیا اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا کہ بھلے برے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے۔

برادران یوسف نے جب یہ سوال سنا تو چکرا گئے کہ عزیز مصر کو یوسف کے قصہ سے کیا واسطہ، پھر ادھر بھی دھیان گیا کہ یوسفؑ نے جو بچپن میں خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر یہی تھی کہ ان کو کوئی بلند مرتبہ حاصل ہوگا کہ ہم سب کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا، کہیں یہ عزیز مصر خود یوسف ہی نہ ہوں، پھر جب اور غور و تامل کیا تو کچھ علامات سے پہچان لیا اور مزید تحقیق کے لئے ان سے کہا "کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو؟" تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں ہی یوسف ہوں، اور یہ بنیامین میرا حقیقی بھائی ہے، بھائی کا ذکر اس لئے بڑھا دیا کہ ان کو اچھی طرح یقین آ جائے، نیز اس لئے بھی کہ ان پر اس وقت اپنے مقصد کی مکمل کامیابی واضح ہو جائے کہ جن دو کی تلاش میں تم نکلے تھے وہ دونوں بیک جا تمہیں مل گئے، پھر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان و کرم فرمایا کہ اول ہم دونوں کو صبر و تقویٰ کی دو صفتیں عطا فرمائیں، جو کلید کامیابی اور ہر مصیبت سے امان ہیں، پھر ہماری تکلیف کو راحت سے افتراق کو اجتماع سے مال و جاہ کی قلت کو ان سب کی کثرت سے تبدیل فرما دیا، بے شک جو شخص گناہوں سے بچتا اور مصائب پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے ہیں۔

برادران کا اعتراف جرم

اب تو برادران یوسف کے پاس بجز جرم و خطا کے اعتراف اور یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کے اقرار کے چارہ نہ تھا، سب نے یک زبان ہو کر کہا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ "بخدا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم سب پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور آپ اسی کے مستحق تھے اور ہم نے جو کچھ کیا بے شک ہم اس میں خطاوار تھے لللہ معاف کر دیجئے۔

حضرت یوسفؑ کی طرف سے معافی کا اعلان

یوسف علیہ السلام نے جواب میں اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق فرمایا:

لا تثریب علیکم، "یعنی میں تم سے تمہارے مظالم کا انتقام تو کیا لیتا، آج تم پر کوئی ملامت بھی نہیں کرتا" یہ تو اپنی طرف سے معافی کی خوش خبری سنا دی، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا

کی! یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ”یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دیں‘ وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔“

والد صاحب کی خدمت میں کرتہ بھیجنا

جب باذن خداوندی اس کا وقت آ گیا کہ یوسف علیہ السلام اپنا راز بھائیوں پر ظاہر کر دیں تو انہوں نے حقیقت ظاہر کر دی‘ بھائیوں نے معافی مانگی‘ انہوں نے نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا بلکہ گذشتہ واقعات پر کوئی ملامت کرنا بھی پسند نہ کیا‘ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اب والد سے ملاقات کی فکر ہوئی‘ حالات کے لحاظ سے مناسب یہ سمجھا کہ والد صاحب ہی مع خاندان کے یہاں تشریف لائیں مگر معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی بینائی اس مفارقت میں جاتی رہی‘ اس لئے سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی اور بھائیوں سے کہا:

”تم میرا یہ کُرتہ لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی عود کر آئے گی“ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے کُرتے کا چہرہ پر ڈال دینا بینائی کے عود کرنے کا کوئی مادی سبب نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ایک معجزہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کا کہ ان کو باذن خداوندی معلوم ہو گیا کہ جب ان کا کُرتہ والد کے چہرے پر ڈالا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی بینائی بحال فرما دیں گے۔

اور ضحاک اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ اس کُرتے کی خصوصیت تھی‘ کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہ تھا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے اس وقت لایا گیا تھا جب ان کو برہنہ کر کے نمرود نے آگ میں ڈالا تھا‘ پھر یہ جنت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پاس رہا‘ ان کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا‘ آپ نے اس کو ایک بڑی متبرک شے کی حیثیت سے ایک نلکی میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گلے میں بطور تعویذ کے ڈال دیا تھا تا کہ نظر بد سے محفوظ رہیں‘ برادران یوسف نے جب ان کا کُرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اتار لیا اور وہ برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیئے گئے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور گلے میں پڑی ہوئی نلکی کھول کر اس سے یہ کُرتہ برآمد کیا‘ اور یوسف علیہ السلام کو پہنا

دیا اور یہ ان کے پاس برابر محفوظ چلا آیا' اس وقت بھی جبرئیل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جاتا ہے' اور فرمایا کہ اس کو اپنے والد کے پاس بھیج دیجئے تو وہ بینا ہو جائیں گے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال اور ان کا وجود خود جنت ہی کی ایک چیز تھی' اس لئے ان کے جسم سے متصل ہونے والے ہر کرتے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے (مظہری)

خاندان کو مصر میں منگوانا

اْتُوْنِیْ بِاَھْلِکُمْ اَجْمَعِیْنَ "یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس مصر لے آؤ" اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا' مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا' اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بینائی عود کر آئے گی اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی ضرور تشریف لائیں گے' قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام میں سے یہودا نے کہا کہ یہ کرتہ میں لے جاؤں گا کیونکہ ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے' اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو پانا

جب قافلہ شہر سے باہر نکلا ہی تھا تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے کہا کہ اگر تم مجھے بے وقوف نہ کہو تو میں تمہیں بتلاؤں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے' شہر مصر سے کنعان تک ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی مسافت کا راستہ تھا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ۸۰ فرسخ یعنی تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا' اللہ تعالیٰ نے اتنی دور سے قمیص یوسف علیہ السلام کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہنچا دی' اور یہ عجائب میں سے ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعان ہی کے ایک کنویں میں تین روز تک پڑے رہے تو اس وقت یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت معجزہ پیغمبر کا اپنا فعل و عمل بھی نہیں ہوتا' یہ براہ راست فعل اللہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں تو معجزہ ظاہر کر دیتے ہیں اور جب اذن خداوندی نہیں ہوتا تو قریب سے قریب بھی بعید ہو جاتا ہے۔

حاضرین مجلس نے یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر کہا کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں" کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کی واپسی

جب یہ بشارت دینے والا کنعان پہنچا" اور قمیص یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا تو فوراً ان کی بینائی عود کر آئی' بشارت دینے والا وہی حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائی یہودا تھا جو ان کا کُرتہ مصر سے لایا تھا۔ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کیا میں نہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے جس کی آپ لوگوں کو خبر نہیں' کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

بھائیوں کی درخواست

اب جبکہ حقیقت حال واضح ہو کر سامنے آ گئی تو برادران یوسف علیہ السلام نے والد سے اپنی خطاؤں کی معافی اس شان سے مانگی کہ والد سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ان کی خطا معاف کرنے کی دعا کرے گا وہ خود بھی ان کی خطا معاف کر دے گا۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کروں گا۔

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فوراً ہی دعاء کرنے کی بجائے وعدہ کیا کہ عنقریب دعا کروں گا اس کی وجہ عام مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اہتمام کے ساتھ آخر شب کے وقت میں دعاء کریں' کیونکہ اس وقت کی دعاء خصوصیت سے قبول کی جاتی ہے' جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں زمین سے قریب تر آسمان پر نزول اجلال فرماتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ

کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے، تو میں اس کو قبول کرلوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کردوں۔

خاندان کا مصر میں استقبال

بعض روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس مرتبہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دو سو اونٹوں پر لدا ہوا بہت سا سامان کپڑوں اور دوسری ضروریات کا بھیجا تھا، تاکہ پورا خاندان مصر آنے کے لئے عمدہ تیاری کرسکے، اس کے مطابق یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد اور تمام متعلقین مصر کے لئے تیار ہوکر نکلے تو ایک روایت میں ان کی تعداد ۷۲ اور دوسری میں ۹۳ نفوس مرد و عورت پر مشتمل تھی۔

دوسری طرف جب مصر پہنچنے کا وقت قریب آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اور ملک مصر کے لوگ استقبال کے لئے شہر سے باہر تشریف لائے اور چار ہزار سپاہی ان کے ساتھ سلامی دینے کے لئے نکلے، جب یہ حضرات مصر میں یوسف علیہ السلام کے مکان میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھہرایا۔

یہاں ذکر والدین کا ہے حالانکہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال بچپن ہی میں ہوچکا تھا مگر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے مرحومہ کی بہن "لیا" سے نکاح کرلیا تھا جو یوسف علیہ السلام کی خالہ ہونے کی حیثیت سے بھی مثل والدہ کے تھیں اور والد کے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے بھی والدہ کہلانے کی مستحق تھیں۔ (۱) یہ توجیہ اس روایت کے مطابق ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ بنیامین کی ولادت کے وقت وفات پاگئی تھیں اسی بناء پر یہاں حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت صفحہ ۲۹ و ۳۰ ج ۵ کی عبارت سے متضاد معلوم ہوتی ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کو قرار دیا گیا ہے لیکن دراصل اس معاملے میں کوئی مستند روایت تو ہے نہیں، اسرائیلی روایات ہیں اور ان میں بھی تعارض ہے خود صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہودی حضرات حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کے بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال کے قائل نہیں ہیں اگر اس روایت کو لیا جائے تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا، اس صورت میں ورفع ابویہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ مراد ہوں گی ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ

اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔قال ابن جریر ولم یقم دلیل علی موت امه (ای ام یوسف علیه السلام) و ظاهر القراٰن یدل علی حیاها. محمد تقی عثمانی)

خصوصی اعزاز

یوسف علیہ السلام نے سب خاندان کے لوگوں سے کہا کہ آپ سب باذن خداوندی مصر میں بے خوف وخطر بغیر کسی پابندی کے داخل ہو جائیں مطلب یہ تھا کہ دوسرے ملک میں داخل ہونے والے مسافروں پر جو پابندیاں عادۃً ہوا کرتی ہیں آپ ان سب پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔

خواب کا حقیقت کے روپ میں ظاہر ہونا

یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تخت شاہی پر بٹھایا۔

والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کیلئے کیا گیا تھا' یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا' اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا لیکن سجدہ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعت اسلام میں ذریعہ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہو گیا ہے' جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی غیر اللہ کیلئے سجدہ حلال نہیں۔

یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں ماں باپ اور گیارہ بھائیوں نے بیک وقت سجدہ کیا تو ان کو اپنا وہ بچپن کا خواب یاد آ گیا اور فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں' اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو آنکھوں سے دکھلا دیا۔

یوسف علیہ السلام کا مقام صبر و شکر

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کے سامنے کچھ اپنی سرگذشت بیان کرنا شروع کی یہاں ایک منٹ ٹھہر کر غور کیجئے کہ آج اگر کسی کو اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے جتنے یوسف علیہ السلام پر گذرے اور والدین سے اتنی طویل مفارقت اور مایوسی کے بعد ملنے کا اتفاق ہو تو وہ والدین کے سامنے اپنی سرگذشت کیا بیان کرے گا کتنا روئے گا اور رلائے گا اور

کتنے دن رات مصائب کی داستان سنانے میں صرف کرے گا مگر یہاں طرفین میں اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں ان کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیے' یعقوب علیہ السلام کے بچھڑے ہوئے محبوب فرزند ہزاروں مصائب کے دور سے گذرنے کے بعد جب والد سے ملتے ہیں تو کیا فرماتے ہیں'

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ م بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا جبکہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا' اور آپ کو باہر سے یہاں لے آیا' بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصائب ترتیب وار تین بابوں میں تقسیم ہوئی ہیں' اول بھائیوں کا ظلم و جور' دوسرے والدین سے طویل جدائی' تیسرے قید خانے کی تکالیف' خدا تعالیٰ کے اس برگزیدہ پیغمبر نے اپنے بیان میں پہلے تو واقعات کی ترتیب کو بدل کر قید خانے سے بات شروع کی اور اس میں قید خانے میں داخل ہونے اور وہاں کی تکالیف کا نام نہیں لیا بلکہ قید خانہ سے نکلنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ بیان کیا' قید خانہ سے نجات اور اس پر شکر الٰہی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ میں کسی وقت قید خانہ میں بھی رہا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل خانے سے نکلنے کا ذکر کیا' بھائیوں نے جس کنویں میں ڈالا تھا اس کا اس حیثیت سے بھی ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کنویں سے نکالا' وجہ یہ ہے کہ بھائیوں کی خطا پہلے معاف کر چکے تھے اور فرما چکے تھے **لا تثریب علیکم الیوم**' اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اب اس کنویں کا کسی طرح سے بھی ذکر آئے' تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں (قرطبی)

اس کے بعد والدین کی طویل اور صبر آزما مفارقت اور اس کے تاثرات کا ذکر کرنا تھا تو ان سب باتوں کو چھوڑ کر اس کے آخری انجام اور والدین سے ملاقات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ کیا' کہ آپ کو بدو یعنی دیہات سے شہر مصر میں پہنچا دیا' اس میں اس نعمت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا وطن دیہات میں تھا جہاں معیشت کی آسانیاں کم ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے شہر میں شاہی اعزازات کے ساتھ اندر پہنچا دیا۔

اب پہلی بات رہ گئی' بھائیوں کا ظلم و جور' سو اس کو بھی شیطان کے حوالہ کر کے اس طرح بیباق کر

دیا کہ میرے بھائی تو ایسے نہ تھے جو یہ کام کرتے' شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر یہ فساد کرا دیا۔

یہ ہے شان نبوت کہ مصائب اور تکالیف پر صرف صبر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ شکر کا پہلو نکال لیتے ہیں' اسی لئے ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار نہ ہوں' بخلاف عام انسانوں کے کہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں برستی رہیں تو بھی کسی کا ذکر نہ کریں اور کسی وقت کوئی مصیبت پڑ جائے تو اس کو عمر بھر گاتے رہیں' قرآن میں اسی کی شکایت کی گئی ہے' ان الانسان لربه لکنود "یعنی انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔"

یوسف علیہ السلام نے داستان مصائب کو تین لفظوں میں مختصر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ "یعنی میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے' بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے۔"

شکر اور دعا

آیت ۱۰۱ میں ہے کہ: اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہتے یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کی عمر ختم پر پہنچی' اور بعد وفات ان کی وصیت کے مطابق ملک شام میں لے جا کر اپنے بزرگوں کے پاس دفن کئے گئے' پھر یوسف علیہ السلام کو بھی آخرت کا اشتیاق ہوا اور دعاء کی کہ اے میرے پروردگار آپ نے مجھ کو ہر طرح کی نعمتیں دیں' ظاہری بھی باطنی بھی' ظاہری یہ کہ مثلاً سلطنت کا بڑا حصہ دیا' اور باطنی یہ کہ مثلاً مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا جو کہ علم عظیم ہے خصوصاً جب کہ وہ یقینی ہو جو موقوف ہے وحی پر پس اس کا وجود مستلزم ہوگا عطاء نبوت کو' اے خالق آسمانوں اور زمین کے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی پس جس طرح دنیا میں میرے سارے کام بنا دیئے کہ سلطنت دی' علم دیا' اسی طرح آخرت کے کام بھی بنا دیجئے کہ مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے' اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے' یعنی میرے بزرگوں میں جو انبیاء عظام ہوئے ہیں ان میں مجھ کو بھی پہنچا دیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہ راست حق تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دعاء میں مشغول ہو گئے' فرمایا

اے میرے پروردگار آپ نے ہی مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا' اے آسمان وزمین کے خالق آپ ہی دنیا وآخرت میں میرے کارساز ہیں مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے' اور مجھ کو کامل نیک بندوں میں شامل رکھئے'' کامل نیک بندے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں جو ہر گناہ سے معصوم ہیں (مظہری)

اس دعاء میں حسن خاتمہ کی دعاء خالص طور پر قابل نظر ہے' کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا وآخرت کے ان کو نصیب ہوں اور کتنے ہی جاہ و منصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت ان پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہو جائیں' اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے۔

حضرت یعقوبؑ کی وفات

اور محمد بن اسحٰق نے فرمایا کہ اہل کتاب کی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی مفارقت کا زمانہ چالیس سال تھا' پھر یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لانے کے بعد یوسف علیہ السلام کے ساتھ ۱۷ سال زندہ رہے اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

تفسیر قرطبی میں اہل تاریخ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مصر میں چوبیس سال رہنے کے بعد یعقوب علیہ السلام کی وفات ہوئی' اور وفات سے پہلے یوسف علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش کو میرے وطن بھیج کر میرے والد اسحٰق علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے۔

سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سال کی لکڑی کے تابوت میں رکھ کر بیت المقدس کی طرف منتقل کیا گیا اسی وجہ سے عام یہود میں یہ رسم چل گئی کہ اپنے مردوں کو دور دور سے بیت المقدس میں لے جا کر دفن کرتے ہیں' حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر وفات کے وقت ۱۴۷ سال تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام مع اپنی اولاد کے جب مصر میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد ۹۳ مرد وعورت پر مشتمل تھی اور جب یہ اولاد یعقوب یعنی بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تو ان کی تعداد ۶ لاکھ ۷۰ ہزار تھی۔ (قرطبی وابن کثیر)

حضرت یوسفؑ کا انتقال

یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سابق عزیز مصر کے انتقال کے بعد شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا کے ساتھ کرادی تھی۔

تورات اور اہل کتاب کی تاریخ میں ہے کہ ان سے یوسف علیہ السلام کے دو لڑکے افرائیم اور منشا اور ایک لڑکی رحمت بنت یوسف پیدا ہوئے' رحمت کا نکاح حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ ہوا' اور افرائیم کی اولاد میں یوشع بن نون پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تھے (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ۱۲۰ سال کی عمر میں ہوا' اور دریائے نیل کے کنارے پر دفن کئے گئے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی' پھر ۸۰ سال والد سے غائب رہے' اور والدین کی ملاقات کے بعد ۲۳ سال زندہ رہے اور ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

ابن اسحٰق نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں' تو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کی لاش کو مصر میں نہ چھوڑیں' اس کو اپنے ساتھ لے کر ملک شام چلے جائیں' اور ان کے آباء واجداد کے پاس دفن کریں اس حکم کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تفتیش کرکے ان کی قبر دریافت کی جو ایک سنگ مرمر کے تابوت میں تھی اس کو اپنے ساتھ ارض کنعان فلسطین میں لے گئے' اور حضرت اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کردیا (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دین یوسف علیہ السلام پر قائم رہے' مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں' یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عذاب سے نکالا (تفسیر مظہری)

حضرت شعیب علیہ السلام

قرآن میں ذکر

قرآن حکیم میں حضرت شعیب اور ان کی قوم کا تذکرہ اعراف ہود اور شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور حجر اور عنکبوت میں مختصر ہے ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیبؑ کا نام دس جگہ مذکور ہے ذیل کا نقشہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔

سورة	آیات	شمار
اعراف	۸۵۔۸۸۔۹۰۔۹۲	۴
ہود	۸۴۔۸۷۔۹۰۔۹۱۔۹۵	۵
شعراء	۱۷۷	۱
عنکبوت	۳۶	۱۱

قوم شعیب

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی بعثت مدین یا مدیان میں ہوئی تھی مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ "قبیلہ" (اسی قبیلہ کے نام پر بستی کا نام مدین مشہور رہا) کا نام ہے یہ قبیلہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا جو ان کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔

"مدین" اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے پہلو ہی میں حجاز میں آباد ہو گیا تھا یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا اور شعیب علیہ السلام بھی چونکہ اسی نسل اور اسی قبیلہ سے تھے اس لئے ان کی بعثت کے بعد یہ "قوم شعیب" کہلایا۔

مدین یا اصحاب ایکہ

یہ قبیلہ کس مقام پر آباد تھا؟ اس کے متعلق عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل ایسی جگہ آباد تھا کہ جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شام کے متصل معان کے حصہ زمین پر آباد تھا۔

قرآن عزیز نے اس قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہم کو دو باتوں سے تعارف کرایا ہے۔

ایک یہ کہ وہ ''امام مبین'' پر آباد تھا۔

وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (الحجر ۱۵، آیت ۷۹)

اور لوط علیہ السلام کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔

عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام، فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لے جاتی اور بحر قلزم کے مشرقی کنارے سے ہوکر گزرتی تھی قرآن اسی کو ''امام مبین'' (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے کیونکہ صیف (گرمی) اور شتاء سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لئے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ بری مسافت کے ساتھ بحری کے بھی ڈانڈے ملا دیتا تھا۔

دوسرے وہ یہ کہ ''اصحاب ایکہ'' (جھنڈ والے) تھے، عربی میں ''ایکہ'' ان سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اگی رہتی ہیں اور جھاندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ان دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحر قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جاسکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔ (معجم البلدان ۵ ص ۴۱۸)

کیا مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے؟

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں

یا دو جدا جدا قبیلے ہیں بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور ''اصحاب ایکہ'' دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا اس لئے اس کو ''بن والا'' یا ''جنگل والا'' کہا گیا اور آیت وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ میں ''هما'' ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں نہ کہ مدین اور قوم لوط۔ اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پر فضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھلوں کے اس قدر باغات اور چمن تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے اسی وجہ سے قرآن عزیز نے اس کو ''ایکہ'' کہہ کر تعارف کرایا۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں ''ایکہ'' نام ایک درخت تھا اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے ''مدین'' کو ''اصحاب ایکہ'' کہا گیا، نیز چونکہ یہ نسبت نسبی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی اس لئے جن آیات میں ان کو اس لقب سے یاد کیا گیا ہے ان میں حضرت شعیب کو ''اخوهم'' ان کا بھائی یا اسی قسم کے نسبی علاقہ سے یاد نہیں کیا البتہ جن آیات میں، قوم شعیب کو مدین کہہ کر یاد کیا ہے ان میں حضرت شعیب کو بھی ان کے نسبی رشتہ میں منسلک ظاہر کیا ہے۔

بہر حال راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے ''اصحاب ایکہ'' کے لقب سے مشہور ہوا۔

زمانہ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ

عبد الوہاب نجار اپنی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابو العباس احمد قلقشندی نے ''صبح الاعشیٰ'' جلد ۴ ص ۱۶ میں یہ تحریر کیا ہے۔

ثم ملک بعده یعنی یوثام ابنه احازست عسرة سنة ایضا وکانت الحرب بینه وبین ملک دمشق وفی زمنه کان شعیب علیه السلام

پھر یوثام کے بعد آحاز نے بھی سولہ سال تک حکومت کی اور اس کے اور دمشق کے بادشاہ کے درمیان جنگ رہی اور اسی زمانہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔

قلقشندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صدیوں بعد پیدا ہوئے یعنی سات سو برس بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں کیونکہ آحاز کی حکومت کا یہی زمانہ تھا حالانکہ یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے اس لئے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بڑے ہیں اور حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کا زمانہ پایا ہے یا نہیں یہ بات البتہ اختلافی ہے۔

اسی بناء پر قرآن عزیز نے سورۂ اعراف میں حضرت نوحؑ، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیہم السلام) کے ذکر کے بعد فرمایا ''ثُمَّ بَعَثْنَامِنْ م بَعْدِهِمْ موسٰی'' اور اسی طرح سورۂ یونس، سورۂ حج، سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت میں بیان کیا گیا ہے۔

تو قلقشندی سے اس جگہ لغزش ہوگئی ہے کہ اس نے شعیاء (علیہ السلام) کی جگہ شعیب علیہ السلام تحریر کردیا، بلاشبہ آحاز کی حکومت کا زمانہ شعیاء نبی کا زمانہ ہے۔ (قصص الانبیاء للنجار ص ۱۸۵)

حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تعارف

حضرت شعیب علیہ السلام محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادہ مدین کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی رشتہ قرابت رکھتے ہیں۔ مدین حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ان کی نسل واولاد بھی مدین کے نام سے معروف ہوگئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اس کو بھی مدین کہتے ہیں۔ گویا مدین ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہے وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ۔ اس میں یہی بستی مراد ہے۔ (ابن کثیر)۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے حسن بیان کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا۔ (ابن کثیر بحرمحیط)

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں قرآن کریم نے کہیں ان کا اہل مدین اور اصحاب مدین کے نام سے ذکر کیا ہے اور کہیں اصحاب ایکہ کے نام سے۔

ایکہ کے معنی جنگل اور بن کے ہیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں قومیں الگ الگ تھیں دونوں کی بستیاں بھی الگ تھیں حضرت شعیب علیہ السلام ان میں سے پہلے ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ان کی ہلاکت کے بعد دوسری قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ دونوں قوموں پر جو عذاب آیا اس کے الفاظ بھی مختلف ہیں اصحاب مدین پر کہیں صیحہ اور کہیں رجفہ مذکور ہے اور اصحاب ایکہ پر عذاب ظلہ ذکر کیا گیا ہے۔ صیحہ کے معنی چنگھاڑ اور سخت آواز کے اور رجفہ کے معنی زلزلہ ہیں اور ظلہ سائبان کو کہا جاتا ہے۔ اصحاب ایکہ پر عذاب کی یہ صورت ہوئی کہ اول چند روز ان کی پوری بستی میں سخت گرمی پڑی جس سے ساری قوم بلبلا اٹھی۔ پھر ان کے قریب جنگل پر ایک گہرا بادل آیا جس سے اس جنگل میں سایہ ہو گیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر سارے بستی کے آدمی اس بادل کے سایہ میں جمع ہو گئے۔ اس طرح یہ خدائی مجرم بغیر کسی وارنٹ اور سپاہی کے اپنے پاؤں چل کر اپنی ہلاکت کی جگہ پہنچ گئے۔ جب سب جمع ہو گئے تو بادل سے آگ برسی اور زمین میں بھی زلزلہ آیا جس سے یہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم کا نام ہے اور عذاب کی جو تین قسمیں ابھی ذکر کی گئی ہیں۔ تینوں اس قوم پر جمع ہو گئیں۔ پہلے بادل سے آگ برسی پھر اس کے ساتھ سخت آواز چنگھاڑ کی شکل میں آئی پھر زمین میں زلزلہ آیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

قوم شعیب کی گمراہیاں

بہرحال یہ دونوں قومیں الگ الگ ہوں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جو پیغام حق ان کو دیا وہ پہلی اور دوسری آیات میں مذکور ہے۔ اس پیغام کی تفسیر سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اسلام جو تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک دعوت ہے۔ اس کا خلاصہ ادائے حقوق ہے۔ پھر حقوق دو قسم کے ہیں ایک براہِ راست اللہ تعالیٰ کا حق جس کے کرنے یا چھوڑنے سے انسانوں کا کوئی معتد بہ نفع نقصان متعلق نہیں جیسے عبادات نماز روزہ وغیرہ۔ دوسرے حقوق العباد جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اور یہ قوم ان دونوں

حقوق سے بے خبر اور دونوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان نہ لا کر حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور اس کے ساتھ خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق کو ضائع کر رہے تھے اور اس پر مزید یہ کہ راستوں اور سڑکوں کے دھانوں پر بیٹھ جاتے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر لوٹتے اور شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ اس طرح روئے زمین پر فساد مچا رکھا تھا۔ یہ ان کے شدید جرائم تھے جن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

توحید کی دعوت

اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے پہلے پہل تین باتیں فرمائیں، اول یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود بننے کے لائق نہیں۔ یہ وہی دعوت توحید ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقائد و اعمال کی روح ہے چونکہ یہ قوم بھی مخلوق پرستی میں مبتلا اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق سے غافل تھی اس لئے ان کو بھی سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا۔ اور فرمایا قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ چکی ہے یہاں واضح دلیل سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ تفسیر بحر محیط میں مختلف صورتیں ان کے معجزات کی ذکر کی ہیں۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت

دوسری بات یہ فرمائی فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اس میں کیل کے معنی ناپ اور میزان بمعنی وزن تولنے کے معنی میں ہے اور بخس کے معنی اسی کے حق میں کمی کر کے نقصان پہنچانے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی کر کے ان کو نقصان نہ پہنچایا کرو۔

اس میں پہلے تو ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید و فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت سے کیا جاتا تھا۔ بعد میں لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ فرما کر ہر طرح کے حقوق

میں کتر بیونت اور کمی کوتاہی کو عام کردیا۔ خواہ وہ مال سے متعلق ہو یا عزت وآبروسے یا کسی دوسری چیز سے۔ (بحر محیط)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ناپ تول میں حق سے کم دینا حرام ہے اسی طرح دوسرے حقوق انسانی میں کمی کرنا بھی حرام ہے۔ کسی کی عزت وآبرو پر حملہ کرنا۔ یا کسی کے درجہ اور رتبہ کے موافق اس کا احترام نہ کرنا جس جس کی اطاعت واجب ہے ان کی اطاعت میں کوتاہی کرنا یا جس شخص کی تعظیم وتکریم واجب ہے اس میں کوتاہی برتنا۔ یہ سب امور اسی جرم میں داخل ہیں جو شعیب علیہ السلام کی قوم کیا کرتی تھی۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی آبرو کو ان کے خون کے برابر واجب الاحترام اور قابل حفاظت قرار دیا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں مطففین اور تطفیف کا ذکر آیا ہے اس میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جلدی جلدی رکوع سجدے کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا قد طفّفت یعنی تو نے ناپ تول میں کمی کردی (مؤطا امام مالک) مراد یہ ہے کہ نماز کا جو حق تھا وہ تو نے پورا نہ کیا۔ اس میں حق نماز پورا ادا نہ کرنے کو تطفیف کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

متکبروں کی دھمکی

شعیب علیہ السلام سے جب ان کی قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ حق پر ہوتے تو آپ کے ماننے والے پھلتے پھولتے اور نہ ماننے والوں پر عذاب آتا مگر ہو یہ رہا ہے کہ دونوں فریق برابر درجہ میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں تو ہم آپ کو کیسے سچا مان لیں۔ اس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ جلد بازی نہ کرو عنقریب اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ فرمادیں گے۔ اس پر قوم کے متکبر سرداروں نے وہی بات کہی جو ہمیشہ ظالم متکبر کہا کرتے ہیں کہ اے شعیب یا تو تم اور جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں وہ سب ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ۔ ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔

ان کے مذہب میں واپس آنا قوم شعیب علیہ السلام کے مومنین کے متعلق تو اس لئے صادق ہے کہ وہ سب پہلے انہیں کے مذہب اور طریقہ پر تھے۔ پھر شعیب علیہ السلام کی دعوت پر مسلمان ہو گئے۔ مگر حضرت شعیب علیہ السلام تو ایک دن بھی ان کے باطل مذہب وطریقہ پر نہ رہے تھے اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کبھی کسی مشرکانہ باطل مذہب کی پیروی کر سکتا ہے تو پھر ان کے لئے یہ کہنا کہ ہمارے مذہب میں واپس آ جاؤ غالباً اس وجہ سے تھا کہ نبوت عطا ہونے سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام ان لوگوں کے باطل اقوال واعمال پر سکوت فرماتے تھے اور قوم کے اندر رلے ملے رہتے تھے اس کے سبب ان کا خیال حضرت شعیب علیہ السلام کے بارہ میں بھی یہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم خیال اور ہمارے مذہب کے پیرو ہیں۔ دعوت ایمان کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ ان کا مذہب ہم سے مختلف ہے اور خیال کیا کہ یہ ہمارے مذہب سے پھر گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب دیا اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۔ یعنی کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تمہارے مذہب کو نا پسند اور باطل سمجھنے کے باوجود ہم تمہارے مذہب میں داخل ہو جائیں اور مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا جواب

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارے باطل مذہب سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دے دی۔ اس کے بعد اگر ہم تمہارے مذہب میں واپس ہو جائیں تو یہ ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ پر سخت جھوٹا بہتان ہوگا۔

کیونکہ اوّل تو خود کفر و شرک کو مذہب بتانا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس پر افتراء اور بہتان ہے۔ اس کے علاوہ ایمان لانے اور علم وبصیرت حاصل ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹنا گویا یہ کہنا ہے کہ پہلا طریقہ باطل اور غلط تھا حق اور صحیح وہ طریق ہے جس کو اب اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دوسرا جھوٹ اور بہتان ہے کہ حق کو باطل کہا اور باطل کو حق۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمہارے مذہب میں پھر واپس نہیں ہو سکتے۔ اور ایسا دعویٰ کرنا بظاہر عبدیت کے خلاف ہے جو مقربان بارگاہِ الٰہی اور اہل معرفت کی شایان شان نہیں اس لئے فرمایا ما كان لنا اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ یعنی ہم تمہارے مذہب میں

ہرگز واپس نہیں ہو سکتے۔ بجز اس کے کہ (خدانخواستہ) ہمارے پروردگار ہی کی مشیت وارادہ ہماری گمراہی کا ہو جائے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم نے اسی اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔

اس میں اپنے عجز وضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل وتفویض ہے جو کمالات نبوت میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اس سے بچنے کا دعویٰ کر سکیں۔ کسی نیکی کا کرنا یا برائی سے بچنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے۔ جیسا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لو لا الله ماا ھتدینا و لا تصدقنا و لا صلینا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہم کو صحیح راستہ کی ہدایت نہ ہوتی اور نہ ہم صدقہ خیرات کر پاتے نہ نماز پڑھ سکتے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعا

یہاں تک کہ قوم کے متکبر سرداروں سے گفتگو کرنے کے بعد جب حضرت شعیب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اب ان کو خطاب چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لفظ فتح کے معنی اس جگہ فیصلہ کرنے کے ہیں اسی معنی سے فاتح بمعنی قاضی آتا ہے۔ (بحر محیط)

اور درحقیقت ان الفاظ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے کفار کے لئے ہلاکت کی دعا کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان لوگوں کو زلزلہ کے ذریعہ ہلاک کر دیا۔ دوسری آیت کا مضمون ختم ہوا۔

عذاب

قوم شعیب علیہ السلام کا عذاب اس آیت میں زلزلہ کو بتلایا ہے اور دوسری آیات میں فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ آیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو یوم الظلة کے عذاب نے پکڑ لیا۔ یوم الظلة کے معنی ہیں سایہ کا دن جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ان پر گہرے بادل کا سایہ آیا، جب سب اس کے نیچے جمع ہو گئے تو اسی بادل سے ان پر پتھر یا آگ برسائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے لئے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم پر اوّل تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو جس سے ان کا دم گھٹنے لگا نہ کسی سایہ میں چین آتا تھا نہ پانی میں۔ یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہ خانوں میں گھس گئے تو وہاں اوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی۔ پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی۔ یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر ان پر برسا۔ اور زلزلہ بھی آیا جس سے یہ سب لوگ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ اس طرح اس قوم پر زلزلہ اور عذاب ظلہ دونوں جمع ہو گئے (بحر محیط)

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ قوم شعیب علیہ السلام کے مختلف حصے ہو کر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذاب ظلہ سے ہلاک کئے گئے ہوں۔

حضرت شعیب کا مکہ معظّمہ آنا

قوم پر عذاب آتا ہوا دیکھ کر شعیب اور ان کے ساتھی یہاں سے چل دیئے۔ جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ حضرات یہاں سے مکہ معظّمہ آ گئے۔ اور پھر آخر تک یہیں قیام رہا۔

قوم کی انتہائی سرکشی اور نافرمانی سے مایوس ہو کر شعیب علیہ السلام نے بددعا تو کر دی مگر جب اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب آیا تو پیغمبرانہ شفقت و رحمت کے سبب دل دکھا تو اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے قوم کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے تو تم کو تمہارے رب کے احکام پہنچا دیئے تھے اور تمہاری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا مگر میں کافر قوم کا کہاں تک غم کروں۔

مدین

مدین اصل میں ایک شہر کا نام تھا جس کو مدین بن ابراہیم نے بسایا تھا اس کا محل وقوع ملک شام کے موجودہ مقام "معان" کو بتلایا جاتا ہے، اس شہر کے باشندوں کو بھی بجائے اہل مدین کے مدین کہہ دیا جاتا ہے، شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں جو اسی قوم مدین میں سے ہیں اسی لئے ان کو مدین کا بھائی فرما کر اس نعمت کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس قوم کے رسول کو اللہ تعالیٰ نے اسی قوم سے بنایا تا کہ ان سے مانوس ہو کر ان کی ہدایات کو با آسانی قبول کر سکیں۔

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام

نام و نسب:

حضرت موسیٰ بن عمران بن قامت بن لاوی بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام بنی اسرائیل کے اولو العزم پیغمبر۔ آپ حضرت یعقوب علیہ السلام (جن کا عبرانی نام اسرائیل ہے) کے پوتے کے پوتے تھے۔ آپ کے اور حضرت یعقوب کے درمیان تقریباً ۴ سو سال کی مدت تھی اور آپ شریعت حکومت دونوں کے جامع تھے۔ آپ نے ایک ظالم و متکبر قوم اور اس کے مغرور بادشاہ کے مقابلہ میں ایک نہتی اور مظلوم قوم کو ساتھ لے کر طاغوتی طاقت کا مقابلہ کیا اور وقت کے سب سے بڑی ظالم طاقت کا تختہ الٹ کر حکومت الٰہی کا پرچم لہرایا۔

قرآن کریم میں ذکر:

آپ کی زندگی سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے اور اس میں امت محمدیہ کے لئے بہت سے ہدایت وعبرت کے پہلو پنہاں ہیں اس لئے آپ کی حیات مقدسہ کے مختلف پہلوؤں کو قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں واضح کیا گیا ہے۔ آپ کا اسم گرامی قرآن کریم میں ۱۲۸ بار آیا ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام

حضرت ہارون علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں متعدد بار ہوا ہے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی دعا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو نبوت بخشی اور بنی اسرائیل کی آزادی اور تعلیم و تربیت کے کام میں انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شریک کار بنایا۔ لہٰذا حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ اور ان کے واقعات زندگی حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے حالات ہی کا حصہ ہیں اسلئے ان کا واقعہ ایک ساتھ ہی ذکر کیا جاتا ہے۔

فرعونیوں کے قتل سے حفاظت

کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کردی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کردیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا، کہ اُن عورتوں سے ماماگری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو انعامات وعنایات حق اس وقت مبذول ہوئیں کہ شرف ہمکلامی سے نوازا گیا، نبوت ورسالت عطا ہوئی، خاص معجزات عطا ہوئے اس کے ساتھ یہاں حق تعالیٰ اپنی وہ نعمتیں بھی ان کو یاد دلائیں جو شروع پیدائش سے اس وقت تک زندگی کے ہر دور میں آپ پر مبذول ہوتی رہیں اور مسلسل آزمائشوں اور جان کے خطروں کے درمیان قدرت حق نے کن حیرت انگیز طریقوں سے ان کی حفاظت فرمائی۔

فرعونی سپاہی جو اسرائیلی لڑکوں کو قتل کرنے پر مامور تھے ان سے بچانے کے لئے ان کی والدہ کو بذریعہ وحی الٰہی بتلایا گیا کہ ان کو ایک تابوت میں بند کرکے دریا میں ڈال دیں اور ان کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہ کریں ہم ان کو حفاظت سے رکھیں گے اور پھر آپ کے پاس ہی واپس پہنچا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں عقل وقیاس کی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور ان کی حفاظت کا ناقابل قیاس انتظام صرف اسی کی طرف سے بتلانے پر کسی کو معلوم ہوسکتا ہے۔

اُم موسیٰ علیہا السلام کا نام

روح المعانی میں ہے کہ ان کا مشہور نام "یوحانذ" ہے۔ اور اتقان میں ان کا نام حیانہ بنت یصمد بن لادی لکھا ہے، اور بعض لوگوں نے ان کا نام بارخا بعض نے بازخت بتلایا ہے۔ بعض تعویذ گنڈے والے ان کے نام کی عجیب خصوصیات بیان کیا کرتے ہیں صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ ہمیں اس کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوئی اور غالب یہ ہے کہ خرافات میں سے ہے۔

فرعون کے گھر میں پرورش

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ اس تابوت اور اس میں بند کئے ہوئے بچے کو ساحل دریا سے ایسا شخص اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ کا بھی، مراد اس سے فرعون ہے۔ فرعون کا اللہ کا دشمن ہونا تو اس کے کفر کی وجہ سے ظاہر ہے مگر موسیٰ علیہ السلام کا دشمن کہنا اس لئے محل غور ہے کہ اس وقت تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن نہیں تھا بلکہ ان کی پرورش پر زرِ کثیر خرچ کررہا تھا پھر اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن فرمانا یا تو انجام کار کے اعتبار سے ہے کہ بالآخر فرعون کا دشمن ہو جانا اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور یہ کہا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں کہ جہاں تک فرعون کی ذات کا تعلق ہے وہ فی نفسہٖ اس وقت بھی دشمن ہی تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ کی تربیت صرف بیوی آسیہ کی خاطر گوارا کی تھی اور اس میں بھی جب اس کو شبہ ہوا تو اسی وقت قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا جو حضرت آسیہ کی دانشمندی کے ذریعہ ختم ہوا (روح و مظہری)

آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی عنایت و رحمت سے آپ کے وجود میں ایک محبوبیت کی شان رکھ دی تھی کہ جو آپ کو دیکھے آپ سے محبت کرنے لگے۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ (مظہری)

اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہترین تربیت براہ راست حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہو اس لئے مصر کی سب سے بڑی ہستی یعنی فرعون کے ہاتھوں ہی اس کے گھر میں یہ کام اس طرح لیا گیا کہ وہ اس سے بے خبر تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے دشمن کو پال رہا ہوں۔ (مظہری)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملنا

قرآن کریم میں ہے کہ اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ) کی خبر پہنچی ہے (یعنی وہ سننے کے قابل ہے کہ اس میں توحید و نبوت کے متعلق علوم ہیں جن کی تبلیغ نافع ہوگی وہ قصہ یہ ہے کہ) جب کہ انہوں نے (مدین سے آتے ہوئے ایک رات کو جس میں سردی بھی تھی اور راستہ بھی بھول گئے تھے کوہ طور پر) ایک آگ دیکھی (کہ

واقع میں وہ نور تھا مگر شکل آگ کی سی تھی) سوا پنے گھر والوں سے (جو صرف بی بی تھی یا خادم وغیرہ بھی) فرمایا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو (یعنی میرے پیچھے پیچھے مت آنا کیونکہ یہ تو احتمال ہی نہ تھا کہ بدوں ان کے آگے سفر کرنے لگیں گے) میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ (کسی لکڑی وغیرہ میں لگا کر) لاؤں (تا کہ سردی کا علاج ہو) یا (وہاں) آگ کے پاس راستہ کا پتہ (جاننے والا کوئی آدمی بھی) مجھ کو مل جاوے سو وہ جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو (ان کو منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو، (کیونکہ) تم ایک پاک میدان میں یعنی طویٰ میں ہو (یہ اس میدان کا نام ہے) اور میں نے تم کو (نبی بنانے کے لئے منجملہ دیگر خلائق کے) منتخب فرمایا ہے سو (اس وقت) جو کچھ وحی کی جارہی ہے اس کو (غور سے) سن لو (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، تو تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو (دوسری بات یہ سنو کہ) بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو (تمام خلائق سے) پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں (اور قیامت اس لئے آوے گی) تا کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جاوے سو (جب قیامت کا آنا یقینی ہے تو) تم کو قیامت (کے لئے مستعد رہنے) سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پاوے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی (نفسانی) خواہشوں پر چلتا ہے (یعنی تم ایسے شخص کے اثر سے قیامت کے لئے تیاری کرنے سے بے فکر نہ ہو جانا، کہیں تم (اس بے فکری کی وجہ سے) تباہ نہ ہو جاوَ۔ (طٰہٰ: ۱-۱۶)

مدین سے مصر واپسی

موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ جو یہاں مذکور ہے اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب وہ مدین پہنچ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر اس معاہدہ کے ساتھ مقیم ہو گئے کہ آٹھ یا دس سال تک ان کی خدمت کریں گے اور انہوں نے تفسیر بحر محیط وغیرہ کی روایت کے مطابق ابعد الاجلین یعنی دس سال پورے کر لئے تو شعیب علیہ السلام سے رخصت چاہی کہ میں اب اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لئے مصر جاتا ہوں اور جس خطرہ کی وجہ سے مصر چھوڑا تھا کہ فرعونی سپاہی ان کی گرفتاری اور قتل کے درپے تھے عرصہ دراز گزر جانے کے بعد اب وہ

خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ شعیب علیہ السلام نے ان کو مع اہلیہ یعنی اپنی صاحبزادی کے کچھ مال اور سامان دے کر رخصت فرما دیا راستہ میں ملک شام کے بادشاہوں سے خطرہ تھا اس لئے عام راستہ چھوڑ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ موسم سردی کا تھا اور اہلیہ محترمہ حاملہ قریب الولادت تھیں کہ صبح شام میں ولادت کا احتمال تھا۔ غیر معروف راستہ اور جنگل میں راستہ سے ہٹ کر طور پہاڑ کی مغربی اور داہنی سمت میں جا نکلے، رات اندھیری سردی برفانی تھی اسی حال میں اہلیہ کو درد زہ شروع ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سردی سے حفاظت کے لئے آگ جلانا چاہا۔ اس زمانے میں دیا سلائی (ماچس) کے بجائے چقماق پتھر استعمال کیا جاتا تھا جس کو مارنے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی اس کو استعمال کیا مگر اس سے آگ نہ نکلی۔ اسی حیرانی و پریشانی کے عالم میں کوہ طور پر آگ نظر آئی جو درحقیقت نور تھا تو گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے آگ لاؤں اور ممکن ہے کہ آگ کے پاس کوئی راستہ جاننے والا مل جائے تو راستہ بھی معلوم کرلوں۔ گھر والوں میں اہلیہ محترمہ کا ہونا تو متعین ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خادم بھی ساتھ تھا۔ وہ بھی اس خطاب میں داخل ہے بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ رفیق سفر بھی ساتھ تھے مگر راستہ بھولنے میں یہ ان سے جدا ہو گئے تھے۔ (بحر محیط)

آگ نظر آنا

مسند احمد وغیرہ میں وہب بن منبہ رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف چلے اور اس کے قریب پہنچے تو ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ایک بڑی آگ ہے جو ایک ہرے بھرے درخت کے اوپر شعلے مار رہی ہے مگر حیرت یہ ہے کہ اس درخت کی کوئی شاخ یا پتہ جلتا نہیں بلکہ آگ نے درخت کے حسن اور تری و تازگی اور رونق میں اور زیادتی کر دی ہے۔ یہ حیرت انگیز منظر کچھ دیر تک اس انتظار میں دیکھتے رہے کہ شاید کوئی چنگاری آگ کی زمین پر گرے تو یہ اٹھالیں۔ جب دیر تک ایسا نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے گھاس وغیرہ کے کچھ تنکے جمع کر کے اس آگ کے قریب کیا کہ ان میں آگ لگ جائے گی تو ان کا کام ہو جائے گا مگر جب یہ گھاس پھوس آگ کے قریب کئے تو آگ پیچھے

ہٹ گئی، اور بعض روایات میں ہے کہ آگ ان کی طرف بڑھی یہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، بہر حال آگ حاصل کرنے کا مطلب پورا نہ ہوا۔ یہ عجیب وغریب آگ سے حیرت کے عالم میں تھے کہ ایک غیبی آواز آئی (روح) یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کے دامن میں پیش آیا جوان کی داہنی جانب تھا اور جس کا نام طویٰ تھا۔

غیبی آواز

بحر محیط، روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ آواز اس طرح سنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی اس کی کوئی جہت متعین نہیں تھی اور سننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کانوں سے نہیں بلکہ تمام اعضاء بدن سے سنا گیا جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آواز کا حاصل یہ تھا کہ جس چیز کو آپ آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ نہیں اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی ہے اور اس میں فرمایا کہ میں ہی آپ کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس آواز کے متعلق یہ یقین کس طرح ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی آواز ہے؟ اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیا کہ وہ یقین کرلیں کہ یہ آواز حق تعالیٰ ہی کی ہے دوسرے اس آگ کے حیرت انگیز حالات کہ درخت کو جلانے کے بجائے اس کی تازگی اور حسن بڑھا رہی ہے اور آواز بھی عام لوگوں کی آواز کی طرح نہیں کہ ایک سمت سے آئے بلکہ ہر طرف سے یہ آواز یکساں سنی گئی دوسرے صرف کانوں نے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء جو سننے کے لئے وضع نہیں ہوئے سب اس کی سماعت میں شریک تھے اس سے بھی سمجھا گیا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا کلام لفظی بلا واسطہ سنا

روح المعانی میں بحوالہ مسند احمد وہب کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب نداء یاموسیٰ کے لفظ سے دی گئی تو انہوں نے لبیک کہہ کر جواب دیا اور عرض کیا کہ میں آواز سن رہا ہوں مگر آواز دینے والے کی جگہ معلوم نہیں، آپ کہاں ہیں تو جواب آیا کہ میں تیرے اوپر، سامنے، پیچھے اور تیرے ساتھ ہوں پھر عرض کیا کہ میں یہ کلام خود آپ سے سن

رہا ہوں یا آپ کے بھیجے ہوئے کسی فرشتہ کا؟ تو جواب آیا کہ میں خود ہی آپ سے کلام کر رہا ہوں۔ اس پر صاحب روح فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ کلام لفظی بلا واسطہ فرشتہ کے خود سنا ہے جیسا کہ اہل السنۃ والجماعت میں سے ایک جماعت کا مسلک یہی ہے کہ کلام لفظی بھی قدیم ہونے کے باوجود سنا جا سکتا ہے اس پر جو شبہ حدوث کا کیا جاتا ہے اس کا جواب ان کی طرف سے یہ ہے کہ کلام لفظی اس وقت حادث ہوتا ہے جبکہ وہ مادی زبان سے ادا کیا جائے جس کے لئے جسم، سمت، جہت شرط ہے، نیز سننے کے لئے صرف کان مخصوص ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح سنا کہ نہ آواز کی کوئی جہت و سمت تھی اور نہ سننے کے لئے صرف کان مخصوص تھے سارے اعضاء سن رہے تھے، ظاہر ہے یہ صورت احتمال حدوث سے پاک ہے۔ واللہ اعلم۔

دو معجزے ملنا اور فرعون کے پاس جانے کا حکم

قرآن کریم میں ہے کہ اور (حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انہوں نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس پر سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام (نکلتے) ہیں (مثلاً کندھے پر رکھ کر اسباب وغیرہ لٹکا لینا یا اس سے موذی جانوروں کو دفع کرنا وغیرہ وغیرہ) ارشاد ہوا کہ اس (عصا) کو (زمین پر) ڈال دو اے موسیٰ سو انہوں نے اس کو (زمین پر) ڈال دیا تو یکایک وہ (خدا کی قدرت سے) ایک دوڑتا ہوں سانپ بن گیا (جس سے موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے) ارشاد ہوا کہ اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں ہم ابھی (پکڑتے ہی) اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے (یعنی یہ پھر عصا بن جاوے گا اور تم کو کئی گزند نہ پہنچے گا، ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا معجزہ اور دیا جاتا ہے کہ) تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بلا کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا کہ یہ دوسری نشانی (ہماری قدرت اور تمہاری نبوت کی) ہوگی (اور یہ حکم لاٹھی کے ڈال دینے اور ہاتھ کو گریبان میں دینے کا اس لئے ہے) تا کہ ہم تم کو اپنی

(قدرت کی) بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھلائیں (تو اب یہ نشانیاں لے کر) تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے (کہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کو تبلیغ توحید کرو اور اگر نبوت میں شبہ کرے تو یہی معجزے دکھلادو) (طٰہٰ ۱۷-۲۴)

لاٹھی کا سانپ بن جانا

بارگاہِ رب العالمین کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کرنا کہ آپ کے ہاتھ میں کیا چیز ہے موسیٰ علیہ السلام پر لطف و کرم اور خاص مہربانی کا آغاز ہے تاکہ حیرت انگیز مناظر کے دیکھنے اور کلام ربانی کے سننے سے جو ہیبت اور دہشت ان پر طاری تھی وہ دور ہو جائے یہ ایک دوستانہ انداز کا خطاب ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے اس کے علاوہ اس سوال میں یہ حکمت بھی ہے کہ آگے اس عصا کو جو ان کے ہاتھ میں تھی ایک سانپ اور اژدھا بنانا تھا۔ اس لئے پہلے ان کو متنبہ کر دیا کہ دیکھ لو تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے جب انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ لکڑی کا عصا ہے تب اس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا گیا ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ میں رات کے اندھیرے میں شاید لاٹھی کی جگہ سانپ ہی پکڑ لایا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال صرف اتنا ہوا تھا کہ ہاتھ میں کیا چیز ہے اس کا اتنا جواب کافی تھا کہ لاٹھی ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ تین باتیں اصل سوال کے جواب سے زیادہ عرض کیں اوّل یہ کہ یہ عصا میری ہے، دوسرے یہ کہ میں اس سے بہت سے کام لیتا ہوں ایک یہ کہ اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں دوسرے یہ کہ اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں تیسرے یہ کہ اس سے اور بھی میرے بہت سے کام نکلتے ہیں، اس طویل اور تفصیل جواب میں عشق و محبت اور اس کے ساتھ رعایت ادب کی جامعیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ عشق و محبت کا تقاضا ہے کہ جب محبوب مہربان ہو کر متوجہ ہے تو بات دراز کی جائے تاکہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ادب کا مقتضاء یہ بھی ہے کہ بہت بے تکلف ہو کر کلام زیادہ طویل بھی نہ ہو۔ اس دوسرے مقتضاء پر عمل کرنے کے لئے اخیر میں اختصار کر دیا کہ میں اس سے اور بھی بہت سے کام لیا کرتا ہوں اور ان کاموں کی تفصیل بیان نہیں کی (روح و مظہری)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں جو عصا تھی بحکم ربانی اس کو ڈال دیا تو وہ سانپ بن گئی، اس سانپ کے بارے میں قرآن کریم کی آیات میں ایک جگہ تو یہ آیا ہے کَاَنَّھَا جَآنٌّ ، جان عربی لغت میں چھوٹے اور پتلے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور دوسری جگہ آیا ہے فَاِذَا ھِیَ ثُعْبَانٌ ، ثعبان کے معنے اژدھا اور بڑے موٹے سانپ کے ہیں، اور اس آیت میں جو لفظ حیۃ آیا ہے یہ عام ہے ہر چھوٹے بڑے اور پتلے موٹے سانپ کو حیہ کہا جاتا ہے۔ تطبیق ان آیات کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ یہ سانپ شروع میں پتلا اور چھوٹا ہو پھر موٹا اور بڑا ہو گیا، یا یہ کہ سانپ تو بڑا اور اژدھا ہی تھا مگر اس کو جان یعنی ہلکا چھوٹا سانپ اس مناسبت سے کہا گیا کہ یہ عظیم الشان اژدھا سرعت سیر کے اعتبار سے چھوٹے سانپ کی طرح تھا یعنی عام عادت کے خلاف کہ بڑے اژدھے تیز نہیں چل سکتے یہ بڑی تیزی سے چلتا تھا۔ (مظہری)

ید بیضا کا معجزہ

اس جگہ اپنے بازو کے یعنی بغل میں ہاتھ لگا لینے کا حکم ہوا ہے تا کہ یہ دوسرا معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا جاوے کہ جب بغل کے نیچے ہاتھ ڈال کر نکالیں تو آفتاب کی طرح چمکنے لگے حضرت ابن عباسؓ سے تخرج بیضاء کی یہی تفسیر منقول ہے۔ (مظہری)

اپنے رسول کو دو عظیم الشان معجزوں سے مسلح کرنے کے بعد ان کو حکم دیا گیا کہ فرعون سرکش کو دعوت ایمان دینے کے لئے چلے جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ دعائیں

قرآن کریم میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ مجھ کو پیغمبر بنا کر فرعون کی فہمائش کے لئے بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت اس منصب عظیم کے مشکلات کی آسانی کے لئے درخواست کی اور) عرض کیا کہ اے میرے رب میرا حوصلہ (اور زیادہ) فراخ کر دیجئے (کہ تبلیغ میں انقباض یا تکذیب ومخالفت میں ضیق نہ ہو) اور میرا (یہ) کام (تبلیغ کا) آسان فرما دیجئے (کہ اسباب تبلیغ کے مجتمع اور موانع تبلیغ کے مرتفع ہو جاویں) اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت کی) ہٹا دیجئے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے واسطے

میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے (اس تبلیغ کے) کام میں شریک کر دیجئے (یعنی ان کو بھی نبی بنا کر مامور بالتبلیغ کیجئے کہ ہم دونوں تبلیغ کریں اور میرے قلب کو قوت پہنچے) تاکہ ہم دونوں (ملکر تبلیغ و دعوت کے وقت) آپ کی خوب کثرت سے پاکی (شرک و نقائص سے) بیان کریں اور آپ (کے اوصاف و کمال) کا خوب کثرت سے ذکر کریں (کیونکہ اگر دو شخص مبلغ ہونگے تو ہر شخص کا بیان دوسرے کی تائید سے وافر اور متکاثر ہوگا) بیشک آپ ہم کو (اور ہمارے حال کو) خوب دیکھ رہے ہیں (اس حالت سے ہماری احتیاج اس امر کی کہ ایک دوسرے کے معاون ہوں آپ کو معلوم ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری (ہر) درخواست (جو کہ (رب اشرح لی) الخ میں مذکور ہے) منظور کی گئی اے موسیٰ۔

شرح صدر اور تیسیر امر کی دعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کلام الٰہی کا شرف خاص حاصل ہوا اور منصب نبوت و رسالت عطا ہوا تو اپنی ذات اور اپنی طاقت پر بھروسہ چھوڑ کر خود حق تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ اس منصب عظیم کی ذمہ داریاں اسی کی مدد سے پوری ہو سکتی ہیں اور ان پر جو مصائب اور شدائد آنا لازمی ہیں ان کی برداشت کا حوصلہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطاء ہو سکتا ہے اس لئے اس وقت پانچ دعائیں مانگیں پہلی دعا اشرح لی صدری، یعنی میرا سینہ کھول دے۔ اس میں ایسی وسعت عطا فرمادے جو علوم نبوت کا متحمل ہو سکے اور دعوت ایمان لوگوں تک پہنچانے میں جو ان کی طرف سے سخت سست سننا پڑتا ہے اس کو برداشت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

دوسری دعا ویسرلی امری (یعنی میرا کام میرے لئے آسان کر دے) یہ فہم و فراست بھی نبوت ہی کا ثمرہ تھا کہ کسی کام کا مشکل یا آسان ہونا بھی ظاہری تدبیروں کے تابع نہیں یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطیہ ہوتا ہے وہ اگر چاہتے ہیں تو کسی کے لئے مشکل سے مشکل بھاری سے بھاری کام آسان کر دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تو آسان سے آسان کام مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں مسلمانوں کو اس دعا کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے کاموں

کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگا کریں۔ اللّٰھم الطف بنافی تیسیر کل عسیر فان تیسیر کل عسیر علیک یسیر، یعنی یا اللہ ہم پر مہربانی فرما ہر مشکل کام کو آسان کرنے کے لئے کیونکہ ہر مشکل کام کا آسان کر دینا آپ کے قبضہ میں ہے۔

زبان کی بندش کھولنے کی دعا

تیسری دعا، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي، یعنی کھولدے میری زبان کی بندش تاکہ لوگ میرا کلام سمجھنے لگیں۔ اس بندش کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دودھ پینے کے زمانے میں تو اپنی والدہ ہی کے پاس رہے اور دربار فرعون سے ان کو دودھ پلانے کا وظیفہ اور صلہ ملتا رہا۔ جب دودھ چھڑایا گیا تو فرعون اور اس کی بیوی آسیہ نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا تھا اس لئے والدہ سے واپس لے کر اپنے یہاں پالنے لگے۔ اسی عرصہ میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ لی اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور بعض روایات میں ہے کہ ایک چھڑی ہاتھ میں تھی جس سے کھیل رہے تھے وہ فرعون کے سر پر ماری، فرعون کو غصہ آیا اور اسکے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ بیوی آسیہ نے کہا کہ شاہا، آپ بچے کی بات پر خیال کرتے ہیں جس کو کسی چیز کی عقل نہیں اور اگر آپ چاہیں تو تجربہ کرلیں کہ اس کو کسی بھلے برے کا امتیاز نہیں۔ فرعون کو تجربہ کرانے کے لئے ایک طشت میں آگ کے انگارے اور دوسرے میں جواہرات لاکر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھ دیئے خیال یہ تھا کہ بچہ ہے یہ بچوں کی عادت کے مطابق آگ کے انگارے کو روشن خوبصورت سمجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا جواہرات کی رونق بچوں کی نظر میں ایسی نہیں ہوتی کہ اس طرف توجہ دیں، اس سے فرعون کو تجربہ ہوجائے گا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ بچپن کی نادانی سے کیا۔ مگر یہاں تو کوئی عام بچہ نہیں تھا، خدا تعالیٰ کا ہونے والا رسول تھا جن کی فطرت اوّل پیدائش سے ہی غیر معمولی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام نے آگ کے بجائے جواہرات پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر جبرئیل امین نے ان کا ہاتھ آگ کے طشت میں ڈال دیا اور انہوں نے آگ کا انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، جس سے زبان جل گئی اور فرعون کو یقین آگیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل کسی شرارت سے نہیں بچپن کی بے خبری کے سبب سے تھا۔ اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام

کی زبان میں ایک قسم کی تکلیف پیدا ہوگئی اور اسی کو قرآن میں عقدہ کہا گیا ہے اور اسی کو کھولنے کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مانگی (مظہری و قرطبی)

حضرت ہارون کو ساتھ ملانے کی دعا

پہلی دو دعائیں تو عام تھیں سب کام میں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لئے، تیسری دعا میں اپنی ایک محسوس کمزوری کے ازالہ کی درخواست کی گئی کہ رسالت و دعوت کے لئے زبان کی طلاقت اور فصاحت بھی ایک ضروری چیز ہے۔ آگے ایک آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ سب دعائیں قبول کرلی گئیں جس کا ظاہر یہ ہے کہ زبان کی یہ لکنت بھی ختم ہوگئی ہوگی مگر خود موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ رسالت میں شریک کرنے کی جو دعا کی ہے اس میں یہ بھی فرمایا ہے کہ هو افصح منی لسانا یعنی ہارون علیہ السلام زبان کے اعتبار سے بہ نسبت میرے زیادہ فصیح ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر لکنت کا کچھ باقی تھا۔ نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عیوب لگائے ان میں یہ بھی کہا کہ ولا یکاد یبین، یعنی یہ اپنی بات کو صاف بیان نہیں کرسکتے۔ بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی دعاء میں اتنی ہی بات مانگی تھی کہ زبان کی بندش اتنی کھل جائے کہ لوگ میری بات سمجھ لیا کریں، اتنی لکنت دور کردی گئی کچھ معمولی اثر پھر بھی رہا ہو تو وہ اس دعا کی قبولیت کے منافی نہیں، چوتھی دعا وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ (یعنی بنادے میرا ایک وزیر میرے ہی خاندان میں سے) پچھلی تین دعائیں اپنے نفس اور ذات سے متعلق تھیں یہ چوتھی دعا اعمال رسالت کو انجام دینے کے لئے اسباب جمع کرنے سے متعلق ہے اور ان اسباب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اور اہم اس کو قرار دیا کہ ان کا کوئی نائب اور وزیر ہو جو ان کی مدد کرسکے۔ وزیر کے معنی ہی لغت میں بوجھ اٹھانے والے کے ہیں، وزیر سلطنت چونکہ اپنے امیر و بادشاہ کا بار ذمہ داری سے اٹھاتا ہے اس لئے اس کو وزیر کہتے ہیں۔ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمال عقل معلوم ہوا کہ کسی کام یا تحریک کے چلانے کے لئے سب سے پہلی چیز انسان کے اعوان و انصار ہیں وہ منشاء کے مطابق مل جائیں تو آگے سب کام آسان ہوجاتے ہیں اور وہ غلط ہوں تو سارے

اسباب وسامان بھی بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آج کل کی سلطنتوں اور حکومتوں میں جتنی خرابیاں مشاہدہ میں آئی ہیں غور کریں تو ان سب کا اصلی سبب امیر ریاست کے اعوان وانصار اور وزراء وامراء کی خرابی بے عملی یا بد عملی یا عدم صلاحیت ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی شخص کو کوئی حکومت وامارت سپرد فرماتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ یہ اچھے کام کرے حکومت کو اچھی طرح چلائے تو اس کو نیک وزیر دے دیتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے اگر یہ کسی ضروری کام کو بھول جائے تو وزیر یاد دلا دیتا ہے۔ اور جس کام کا وہ ارادہ کرے وزیر اس میں اس کی مدد کرتا ہے۔
(رواہ النسائی عن القاسم بن محمد)

اس دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا اس کے ساتھ ایک قید من اہلی کی بھی لگادی کہ یہ وزیر میرے خاندان واقارب میں سے ہو کیونکہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات واخلاق دیکھے بھالے اور طبائع میں باہم الفت ومناسبت ہوتی ہے جس سے اس کام میں مدد ملتی ہے بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق دیکھ کر لیا گیا ہو۔ محض اقربا پروری کا داعیہ نہ ہو۔ اس زمانے میں چونکہ عام طور پر دیانت واخلاص مفقود اور اصل کام کی فکر غائب نظر آتی ہے اس لئے کسی امیر کے ساتھ اس کے خویش وعزیز کو وزیر یا نائب بنانے کو مذموم سمجھا جاتا ہے اور جہاں دیانتداری پر بھروسہ پورا ہو تو کسی صالح واصلح خویش وعزیز کو کوئی عہدہ سپرد کر دینا کوئی عیب نہیں بلکہ مہمات امور کی تکمیل کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین عموماً وہی حضرات ہوئے جو بیت نبوت کے ساتھ رشتہ داریوں کے تعلقات رکھتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں پہلے تو عام بات فرمائی کہ میرے خاندان و اہل میں سے ہو، پھر متعین کر کے فرمایا کہ وہ میرا بھائی ہارون ہے جس کو میں وزیر بنانا چاہتا ہوں تا کہ میں اس سے مہمات رسالت میں قوت حاصل کر سکوں۔

حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین چار سال بڑے تھے، اور تین سال پہلے ہی وفات پائی۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی وہ مصر میں تھے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر ان کو بھی نبی بنا دیا تو بذریعہ فرشتہ ان کو بھی مصر ہی میں اس کی اطلاع مل گئی جب موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں فرعون کی تبلیغ کے لئے روانہ کیا گیا تو ان کو یہ

ہدایت کردی گئی کہ وہ مصر سے باہران کا استقبال کریں اور ایسا ہی واقع ہوا۔ (قرطبی)

واشرکہ فی امری، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا وزیر بنانا چاہا تو یہ اختیار خود ان کو حاصل تھا تبرکاً حق تعالیٰ کی طرف سے کرنے کی دعا کی مگر ساتھ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کو نبوت ورسالت میں اپنا شریک قرار دیں یہ اختیار کسی رسول و نبی کو خود نہیں ہوتا اس لئے اس کی جداگانہ دعا کی کہ ان کو میرے کار رسالت میں شریک فرمادے۔

صالح رفقاء ذکر وعبادت میں بھی مددگار ہوتے ہیں

آخر میں فرمایا کی حضرت ہارونؑ کو وزیر اور شریک نبوت بنانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم کثرت سے آپ کی تسبیح وذکر کیا کریں گے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ تسبیح وذکر تو ایسی چیز ہے کہ ہر انسان تنہا بھی جتنا چاہے کرسکتا ہے اس کے لئے کسی ساتھی کے عمل کا کیا دخل لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر وتسبیح میں بھی سازگار ماحول اور اللہ والے ساتھیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جس کے ساتھی اللہ والے نہ ہوں وہ اتنی عبادت نہیں کرسکتا جتنی وہ کرسکتا ہے جس کا ماحول اللہ والوں کا اور ساتھی ذاکر شاغل ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ذکر اللہ میں مشغول رہنا چاہے اس کو سازگار ماحول کی بھی تلاش کرنا چاہئے۔

ماضی کے احسانات کی یاددہانی اور فرعون کو دعوت بارے میں ہدایات

قرآن کریم میں ہے کہ ہم تو اور دفعہ اور بھی (اس کے قبل بے درخواست ہی) تم پر احسان کرچکے ہیں جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام سے بتلائی جو (بوجہ مہتم بالشان ہونے کے) الہام سے بتلانے کے (قابل) تھی (وہ) یہ کہ موسیٰ کو (جلادوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے) ایک صندوق میں رکھو، پھر ان کو (مع صندوق کے) دریا میں (جس کی ایک شاخ فرعون کے محل تک بھی گئی تھی) ڈال دو پھر دریا ان کو (مع صندوق کے) کنارہ (کے پاس) تک لے آوے گا کہ (آخرکار) ان کو ایک ایسا شخص پکڑے گا جو (کافر ہونے کی وجہ سے) میرا بھی دشمن ہے اور ان کا بھی دشمن ہے (خواہ فی الحال بوجہ اس کے کہ سب بچوں کو قتل کرتا تھا خواہ آئندہ ان کا خاص طور پر دشمن ہوگا) اور (جب صندوق پکڑا گیا اور تم اس میں سے نکالے گئے تو) میں

نے تمہارے (چہرے کے) اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈال دیا تاکہ جو تم کو دیکھے پیار کرے) اور تاکہ تم میری (خاص) نگرانی میں پرورش پاؤ۔ (یہ اس وقت کا قصہ ہے) جبکہ تمہاری بہن (تمہاری تلاش میں (فرعون کے گھر) چلتی ہوئی آئیں، پھر (تم کو دیکھ کر اجنبی بن کر) کہنے لگیں (جبکہ تم کسی انّا کا دودھ نہ پیتے تھے) کیا تم لوگوں کو ایسے شخص کا پتہ دوں جو اس کو (اچھی طرح) پالے رکھے (چنانچہ ان لوگوں نے چونکہ ان کو تلاش تھی منظور کیا اور تمہاری بہن تمہاری ماں کو بلا کر لائیں) پھر (اس تدبیر سے) ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کو غم نہ رہے (جیسا تھوڑے عرصہ تک فراق سے مغموم رہیں) اور (بڑے ہونے کے بعد ایک اور احسان کیا کہ) تم نے (غلطی سے) ایک شخص (قبطی) کو جان سے مار ڈالا (جس کا قصہ سورۂ قصص میں ہے اور مار کر غم ہوا خوف عقاب سے بھی اور خوف انتقام سے بھی) پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی (خوفِ عقاب سے تو اس طرح کہ استغفار کی توفیق دی اور اس کو قبول کیا اور خوف انتقام سے اس طرح کہ مصر سے مدین پہنچا دیا) اور (مدین پہنچنے تک) ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا (اور پھر ان سے خلاصی دی جن کا ذکر سورۂ قصص میں ہے کہ خلاصی دینا بھی منت ہے اور خود ابتلاء بھی بوجہ اس کے کہ وہ سبب ہے حصول اخلاق حمیدہ و ملکات فاضلہ کا مستقل احسان ہے)

پھر (مدین پہنچے اور مدین والوں میں کئی سال رہے پھر ایک خاص وقت پر (جو میرے علم میں تمہاری نبوت اور ہمکلامی کے لئے مقدر تھا) تم (یہاں) آئے اے موسیٰ اور (یہاں آنے پر) میں نے تم کو اپنے (نبی بنانے کے) لئے منتخب کیا (سو اب) تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں (یعنی معجزات کہ اصل دو معجزے ہیں عصاء و ید بیضا اور ہر ایک میں وجوہ اعجاز متعدد ہیں لے کر (جس موقع کے لئے حکم ہوتا ہے) جاؤ اور میری یادگاری میں (خواہ خلوت میں خواہ تبلیغ کے وقت) سستی مت کرنا (اب موقع جانے کا بتلایا جاتا ہے کہ) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چلا ہے پھر (اس کے پاس جا کر) اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (رغبت سے) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جاوے (اور اس سے مان جاوے) (طٰہٰ: ۳۷-۴۴)

فرعون کو دعوت اور اس کا جواب

قرآن کریم میں ہے کہ جب فرعون کو دعوت دینے کا حکم حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے سنا تو) دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم تبلیغ کے لئے حاضر ہیں لیکن) ہم کو اندیشہ ہے کہ (کہیں) وہ ہم پر (تبلیغ سے پہلے ہی) زیادتی نہ کر بیٹھے (کہ تبلیغ ہی رہ جاوے) یا یہ کہ (عین تبلیغ کے وقت اپنے کفر میں) زیادہ شرارت نہ کرنے لگے (کہ اپنی بک بک میں تبلیغ نہ سنے نہ سننے دے جس سے وہ عدم تبلیغ کے برابر ہو جاوے) ارشاد ہوا کہ (اس امر سے مطلق) اندیشہ نہ کرو (کیونکہ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں (میں تمہاری حفاظت کروں گا اور اس کو مرعوب کردوں گا جس سے پوری تبلیغ کرسکو گے جیسا دوسری آیت میں ہے وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا) سو تم (بے خوف وخطر) اس کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادے ہیں (کہ ہم کو نبی بنا کر بھیجا ہے) سو (تو ہماری اطاعت کر اصلاح عقیدہ میں بھی کہ توحید کی تصدیق کر اور اصلاح اخلاق میں بھی کہ ظلم وغیرہ سے باز آ اور) بنی اسرائیل کو (جن پر تو ناحق ظلم کرتا ہے اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر کے) ہمارے ساتھ جانے دے (کہ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں رہیں) اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا (اور) ہم (جو دعویٰ نبوت کا کرتے ہیں تو خالی خولی نہیں بلکہ ہم) تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے (اپنی نبوت کا) نشان (یعنی معجزہ بھی) لائے ہیں اور تصدیق اور قبول حق کا ثمرہ اس قاعدہ کلیہ سے معلوم ہوگا کہ) ایسے شخص کے لئے (عذاب الٰہی سے) سلامتی ہے جو (سیدھی) راہ پر چلے (اور تکذیب ورد حق کے باب میں) ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب (قہر کا) اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلادے اور (اس سے) روگردانی کرے (غرض یہ سارا مضمون جا کر اس سے کہو چنانچہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور جا کر اس سے سب کہہ دیا) وہ کہنے لگا کہ پھر (یہ تو بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رب کون ہے (جس کے تم اپنے کو فرستادہ بتلاتے ہو) اے موسیٰ (جواب میں) موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہمارا (دونوں کا بلکہ سب کا) رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان میں جو جاندار چیزیں تھیں ان کو ان کے منافع و

مصالح کی طرف) رہنمائی فرمائی (چنانچہ ہر جانور اپنی مناسب غذا اور جوڑہ اور مسکن وغیرہ ڈھونڈ لیتا ہے پس وہی ہمارا بھی رب ہے) (طٰہٰ: ۴۵-۵۰)

حضرت موسیٰؑ کو خوف کیوں ہوا

حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دو طرح کے خوف کا اظہار کیا۔ ایک ان یفرط کے لفظ سے جس کے اصلی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ شاید فرعون ہماری بات سننے سے پہلے ہی ہم پر حملہ کر دے، دوسرا خوف ان یطغٰی کے لفظ سے بیان فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ سرکشی پر اتر آئے کہ آپ کی شان میں نامناسب کلمات بکنے لگے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتداء کلام میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت و رسالت عطا فرمایا گیا اور انہوں نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی درخواست کی اور یہ درخواست قبول ہوئی تو اسی وقت حق تعالیٰ نے ان کو یہ بتلا دیا تھا کہ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِاَخِیْکَ وَنَجْعَلُ لَکُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْکُمَا نیز یہ بھی اطمینان دلایا گیا تھا کہ آپ کی درخواست میں جو جو چیزیں طلب کی گئی ہیں وہ سب ہم نے آپ کو دے دیں قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی، ان مطلوب چیزوں میں شرح صدر بھی تھا جس کا حاصل یہی تھا کہ مخالف سے کوئی دل تنگی اور خوف وہراس پیدا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے بعد پھر یہ خوف اور اس کا اظہار کیسا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ پہلا وعدہ کہ ہم آپ کو غلبہ عطا کریں گے اور وہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے یہ ایک مبہم وعدہ ہے کہ مراد غلبہ سے حجت ودلیل کا غلبہ بھی ہوسکتا ہے اور مادی غلبہ بھی۔ نیز یہ خیال بھی ہوسکتا ہے کہ ان پر غلبہ تو جب ہوگا کہ وہ ان کے دلائل سنیں معجزات دیکھیں مگر خطرہ یہ ہے کہ وہ کلام سننے سے پہلے ہی ان پر حملہ کر بیٹھے اور شرح صدر کے لئے یہ لازم نہیں کہ طبعی خوف بھی جاتا رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خوف کی چیزوں سے طبعی خوف تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے جو وعدوں پر پورا ایمان ویقین ہونے کے باوجود بھی ہوتا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام

اپنی ہی لاٹھی کے سانپ بن جانے کے بعد اسکے پکڑنے سے ڈرنے لگے تو حق تعالیٰ نے فرمایا لا تخف ڈرو نہیں اور دوسرے تمام مواقع خوف میں ایسا ہی ہوتا رہا کہ طبعی اور بشری خوف لاحق ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے بشارت کے ذریعہ اس کو زائل فرمایا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت ایمان کے ساتھ اپنی قوم کو معاشی مصیبت سے بھی چھڑانے کی دعوت دی

انبیاء علیہم السلام، جیسے خلق خدا کو ہدایت ایمان دینے کا منصب رکھتے ہیں اسی طرح اپنی امت کو دنیوی اور معاشی مصائب سے آزاد کرنا بھی ان کے منصب میں شامل ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت فرعون میں دونوں چیزیں شامل ہیں اول اللہ پر ایمان، دوسرے بنی اسرائیل کی آزادی۔

قوم فرعون پر عذاب اور معجزات موسوی

قرآن کریم میں ہے کہ اور (جب فرعون اور اس کے تابعین نے انکار و مخالفت پر کمر باندھی تو) ہم نے فرعون والوں کو (مع فرعون کے حسب عادت مذکورہ، ان بلیات میں) مبتلا کیا (1) قحط سالی میں (2) پھلوں کی کم پیداواری میں تا کہ وہ (حق بات کو) سمجھ جائیں (اور سمجھ کر قبول کر لیں) سو (وہ پھر بھی نہ سمجھے بلکہ یہ کیفیت تھی کہ) جب ان پر خوشحالی (یعنی ارزانی و پیداواری) آ جاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہیے (یعنی ہم مبارک طالع ہیں یہ ہماری خوش بختی کا اثر ہے، یہ نہ تھا کہ اس کو خدا کی نعمت سمجھ کر شکر بجالاتے اور اطاعت اختیار کرتے) اور اگر ان کو کوئی بدحالی (جیسے قحط و کم پیداواری مذکور) پیش آتی تو موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے (کہ یہ ان کی نحوست سے ہوا، یہ نہ ہوا کہ اس کو اپنے اعمال بد کفر و تکذیب کی شامت اور سزا سمجھ کر تائب ہو جاتے حالانکہ یہ سب ان کی شامت اعمال تھی۔

روایات میں ہے کہ یہ قحط ان پر سات سال مسلسل رہا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا کہ قحط اور خشک سالی کا عذاب تو گاؤں والوں کیلئے تھا اور پھلوں کی کمی شہر والوں کیلئے، کیونکہ عموماً دیہات میں غلہ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور شہروں میں پھلوں کے باغات

ہوتے ہیں تو اشارہ اس طرف ہوا کہ نہ غلہ کے کھیت باقی رہے نہ پھلوں کے باغات۔ لیکن جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا قہر ہوتا ہے تو صحیح بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، قوم فرعون بھی اسی قہر میں مبتلا تھی، عذاب کے اس ابتدائی جھٹکا سے بھی ان کو کوئی تنبیہ نہ ہوئی بلکہ اس کو اور ہر آنے والی مصیبت کو یہ کہنے لگے کہ یہ نحوست حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات

جب فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ہار گئے اور ایمان لائے، مگر قوم فرعون اسی طرح اپنی سرکشی اور کفر پر جمی رہی۔ اس واقعہ کے بعد تاریخی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام بیس سال مصر میں مقیم رہ کر ان لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے اور حق کی طرف دعوت دیتے رہے، اور اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ اسلام کو نو معجزات عطاء فرمائے، جن کے ذریعہ قوم فرعون کو متنبہ کر کے راستہ پر لانا مقصود تھا، قرآن کریم میں

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ

میں انہی نو معجزات کا بیان ہے۔ ان نو معجزات میں سے سب سے پہلے دو معجزے، عصا اور ید بیضاء کا ظہور فرعون کے دربار میں ہوا اور انہی دو معجزوں کے ذریعہ جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے فتح حاصل کی، اس کے بعد ایک معجزہ وہ تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ قوم فرعون پر ان کی ضد اور کجروی کے سبب قحط مسلط کر دیا گیا، ان کی زمینوں اور باغوں میں پیداوار بہت گھٹ گئی جس سے یہ سخت پریشان ہوئے اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قحط رفع ہونے کے لئے دعا کرائی، مگر جب قحط رفع ہو گیا تو پھر اپنی سرکشی میں مبتلا ہو گئے اور لگے یہ کہنے کہ یہ قحط تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے سبب ہوا تھا، اب جو قحط رفع ہوا یہ ہمارے حال کا تقاضا ہے۔

چھ قسم کے عذاب

قرآن کریم میں ہے کہ "پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کا کیڑا اور مینڈک اور خون"

اس میں قوم فرعون پر مسلط ہونے والے پانچ قسم کے عذابوں کا ذکر ہے اور ان کو اس آیت میں ایٰت مفصلت فرمایا ہے۔ جس کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ ان میں سے ہر عذاب ایک معین وقت تک رہا پھر موقوف ہو گیا، اور کچھ مہلت دی گئی، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا عذاب، اسی طرح الگ الگ ہو کر ان پر آیا، ابن منذر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ان میں سے ہر عذاب قوم فرعون پر سات روز تک مسلط رہتا تھا، ہفتہ کے دن شروع ہو کر دوسرے ہفتہ کے دن رفع ہو جاتا اور پھر تین ہفتے کی مہلت ان کو دی جاتی تھی۔

طوفان کا عذاب

امام بغوی نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ جب پہلی مرتبہ قوم فرعون پر قحط کا عذاب مسلط ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے رفع ہو گیا مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ عذاب قحط سے بھی متاثر نہ ہوئے اور معاہدہ کر کے پھر گئے اب ان پر کوئی ایسا عذاب مسلط فرما دیجئے جو ان کیلئے دردناک ہو، اور ہماری قوم کیلئے ایک وعظ کا کام دے اور بعد میں آنے والوں کیلئے درس عبرت بنے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا، مشہور مفسرین کے نزدیک طوفان سے مراد پانی کا طوفان ہے، قوم فرعون کے سب گھروں اور زمینوں کو پانی کے طوفان نے گھیر لیا نہ کہیں بیٹھنے لیٹنے کی جگہ رہی نہ زمین میں کچھ کاشت وغیرہ کرنے کے، اور عجیب بات یہ تھی کہ قوم فرعون کے مکانات اور زمینوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں تھیں، بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں سب بدستور خشک تھیں کہیں طوفان کا پانی نہ تھا اور قوم فرعون کے سارے گھر اور زمین اس طوفان سے لبریز تھے۔

ٹڈیوں کا عذاب

اس طوفان سے گھبرا کر قوم فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے دور فرما دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو

آزاد کردیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ طوفان دور ہوا اور اس کے بعد ان کی کھیتیاں پہلے سے زیادہ ہری بھری ہوگئیں، تو اب یہ کہنے لگے کہ درحقیقت یہ طوفان کوئی عذاب نہیں تھا بلکہ ہمارے فائدے کیلئے آیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری زمینوں کی پیداوار بڑھ گئی، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کا اس میں کچھ دخل نہیں اور یہ کہہ کر سب عہد و پیمان نظر انداز کردیئے۔ اس طرح یہ لوگ ایک مہینہ امن وعافیت سے رہتے، اللہ نے ان کو غور و فکر کی مہلت دی مگر یہ ہوش میں نہ آئے تو اب دوسرا عذاب ٹڈیوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، ٹڈی دل نے ان کی ساری کھیتوں اور باغوں کو کھالیا، بعض روایات میں ہے کہ لکڑی کے دروازوں اور چھتوں کو اور گھریلو سب سامان کو ٹڈیاں کھا گئیں، اور اس عذاب کے وقت بھی موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ سامنے تھا کہ یہ سارا ٹڈی دل صرف قبطی یعنی قوم فرعون کے باغوں، کھیتوں، گھروں پر چھایا ہوا تھا، پاس ملے ہوئے اسرائیلیوں کے مکانات، زمینیں، باغ سب اس سے محفوظ تھے۔

مختلف قسم کے کیڑوں کا عذاب

اس وقت پھر قوم فرعون چلا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اس مرتبہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کردیں یہ عذاب ہٹ جائے تو ہم پختہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کردیں گے، موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی اور یہ عذاب ہٹ گیا، مگر عذاب کے ہٹنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس اب بھی اتنا ذخیرہ غلہ کا موجود ہے کہ ہم سال بھر کھا سکتے ہیں تو پھر سرکشی اور عہد شکنی پر آمادہ ہوگئے، نہ ایمان لائے نہ بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔ ایک مہینہ پھر اللہ تعالیٰ نے مہلت دی، اس مہلت کے بعد تیسرا عذاب قمل کا مسلط ہوا لفظ قمل اس جوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو انسان کے بالوں اور کپڑوں میں پیدا ہوجاتی ہے اور اس کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو غلہ میں لگ جاتا ہے جس کو گھن بھی کہا جاتا ہے قمل کا یہ عذاب ممکن ہے کہ دونوں قسم کے کیڑوں پر مشتمل ہو کہ

غلوں میں گھن لگ گیا اور انسانوں کے بدن اور کپڑوں میں جوؤں کا طوفان اُمڈ آیا۔ غلوں کا حال اس گھن نے ایسا کر دیا کہ دس سیر گیہوں پیسنے کے لئے نکالیں تو اس میں تین سیر آٹا بھی نہ نکلے، اور جوؤں نے ان کے بال اور پلکیں اور بھویں تک کھا لیں۔

مینڈکوں کا عذاب

آخر پھر قوم فرعون بلبلا اٹھی اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ اب کی مرتبہ ہم ہرگز وعدہ سے نہ پھریں گے آپ دعا کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی ٹل گیا، مگر جن بدنصیبوں کو ہلاک ہی ہونا تھا وہ کہاں عہد کو پورا کرتے، پھر عافیت ملتے ہی سب کچھ بھول گئے اور منکر ہو گئے۔ پھر ایک ماہ کی مہلت ایسی آرام وراحت کے ساتھ ان کو دی گئی مگر اس مہلت سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو چوتھا عذاب مینڈکوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا اور اس کثرت سے مینڈک ان کے گھروں میں پیدا ہو گئے کہ جہاں بیٹھتے تو ان کے گلے تک مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا، سونے کے لئے لیٹتے تو سارا بدن ان سے دب جاتا کروٹ لینا ناممکن ہو جاتا، پکتی ہوئی ہنڈیا میں، رکھے ہوئے کھانے میں آٹے میں اور ہر چیز میں مینڈک بھر جاتے، اس عذاب سے عاجز آ کر سب رونے لگے اور پہلے سے پختہ وعدوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی رفع ہو گیا۔

خون کا عذاب

مگر جب قوم پر قہر الٰہی مسلط ہو اس کی عقل اور ہوش وحواس کام نہیں دیتے، اس واقعہ کے بعد بھی عذاب سے نجات پا کر یہ پھر اپنی ہٹ دھرمی پر جم گئے اور کہنے لگے کہ اب تو ہمیں اور بھی یقین ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام بڑے جادوگر ہیں یہ سب ان کے جادو کے کرشمے ہیں رسول نبی کچھ نہیں۔

پھر ایک ماہ کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی مگر اس مہلت سے بھی کوئی کام نہ لیا تو پانچواں عذاب خون کا مسلط کر دیا گیا کہ ان کے ہر کھانے اور پینے کی چیز خون بن گئی، کنویں سے، حوض سے، جہاں کہیں سے پانی نکالیں خون بن جائے، کھانا پکانے کیلئے رکھیں خون

بن جائے اوران سب عذابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ مسلسل تھا کہ ہر عذاب سے اسرائیلی حضرات بالکل مامون و محفوظ تھے، خون کے عذاب کے وقت قوم فرعون کے لوگوں نے بنی اسرائیل کے گھروں سے پانی مانگا جب وہ ان کے ہاتھ میں گیا تو خون ہوگیا، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر قبطی اور اسرائیلی کھانا کھاتے تو جو لقمہ اسرائیلی اٹھاتا وہ اپنی حالت پر کھانا ہوتا اور جو لقمہ یا پانی کا گھونٹ قبطی کے منہ میں جاتا خون بن جاتا، یہ عذاب بھی بدستور سابق سات روز رہا بالآخر پھر یہ بدکار بدعہد قوم چلا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اور پہلے سے زیادہ موثق وعدے کئے، دعا کی گئی عذاب ہٹ گیا مگر یہ لوگ اپنی اسی ہٹ دھرمی پر جمے رہے، اس طرح یہ پانچ عذاب مسلسل ان پر آتے رہے مگر یہ لوگ اپنی گمراہی پر قائم رہے اسی کو قرآن کریم نے فرمایا:

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ

یعنی ان لوگوں نے تکبر سے کام لیا اور یہ لوگ بڑے عادی مجرم تھے۔

وبائی امراض کا عذاب

اس کے بعد ایک چھٹے عذاب کا ذکر بعد کی آیت میں رجز کے نام سے آیا ہے، یہ لفظ اکثر طاعون کیلئے بولا جاتا ہے، چیچک وغیرہ وبائی امراض کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، تفسیری روایات میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وباء مسلط کر دی گئی، جس میں ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔ اس وقت پھر ان لوگوں نے فریاد کی اور پھر دعا کرنے پر یہ عذاب ہٹا اور پھر بدستور ان لوگوں نے عہد شکنی کی، اتنی مسلسل آزمائشوں اور مہلتوں کے بعد جب ان میں کوئی احساس پیدا ہی نہ ہوا تو اب آخری عذاب آگیا کہ سب کے سب اپنے مکان زمینیں سامان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلے اور بالآخر دریائے قلزم کا لقمہ بن گئے۔

فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ

بنی اسرائیل کی آزادی

قرآن کریم میں ہے کہ اور (فرعون اور اہل فرعون کو غرق کر کے) ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے (یعنی بنی اسرائیل) اس سرزمین کے پورب پچھم (یعنی تمام حدود) کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے (ظاہری برکت کثرت پیداوار سے اور باطنی برکت ذی فضائل و مدفن و مسکن انبیاء علیہم السلام ہونے سے) اور آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا (جس کا حکم انہیں دیا گیا تھا اصبروا) اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا اور (جس دریا میں فرعون کو غرق کیا گیا) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار اتار دیا (جس کا قصہ سورۃ شعراء میں ہے) پھر (پار ہونے کے بعد) ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھے تھے (یعنی ان کی پوجا پاٹ کر رہے تھے) کہنے لگے، اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک (مجسم) معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں (یہ من جانب اللہ بھی) تباہ کیا جائے گا (جیسا کہ عادۃ اللہ ہمیشہ سے جاری ہے کہ حق کو باطل پر غالب کر کے اس کو درہم برہم کر دیتے ہیں) اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے (کیونکہ شرک کا بطلان یقینی و بدیہی ہے، اور فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو تمہارا معبود بنا دوں حالانکہ اس نے تم کو (بعض نعمتوں میں) تمام دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی تائید کیلئے ارشاد فرمایا کہ) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں (کے ظلم و ایذاء) سے بچا لیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے کہ تمہارے بیٹوں کو بکثرت قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (اپنی بیگار اور خدمت کیلئے) زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔ (اعراف: ۱۳۷ تا ۱۴۱)

بنی اسرائیل کیلئے سرزمین مصر وشام کی حکومت

قرآن کریم میں پہلے قوم فرعون کی مسلسل سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف عذابوں کے ذریعہ ان کی تنبیہات کا بیان تھا، مذکورہ آیات میں ان کے انجام بد اور بنی اسرائیل کی فتح وکامرانی کا ذکر ہے۔ الفاظ قرآن میں غور کیجئے، یہ نہیں فرمایا کہ جو قوم ضعیف وکمزور تھی بلکہ یہ فرمایا کہ جس کو قوم فرعون نے ضعیف وکمزور سمجھا تھا، اشارہ اس کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ جس قوم کی مدد پر ہوں وہ حقیقت میں کبھی کمزور وذلیل نہیں ہوتی گو کسی وقت اس کے ظاہر حال سے دوسرے لوگ دھوکہ کھائیں اور ان کو کمزور سمجھیں مگر انجام کار پر سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کمزور وذلیل نہ تھے، کیونکہ درحقیقت قوت وعزت حق تعالیٰ شانہ کے قبضہ میں ہے۔

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ اور زمین کا مالک بنا دینے کیلئے لفظ اورثنا ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو وارث بنا دیا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ جس طرح وارث ہی اپنے مورث کے مال کا مستحق ہوتا ہے، باپ کی حیات ہی میں ہر شخص یہ جان لیتا ہے کہ اس کے مال وجائیداد کی مالک آخر کار اس کی اولاد ہے اسی طرح علم الٰہی میں بنی اسرائیل پہلے ہی قوم فرعون کے ملک ومال کے مستحق تھے۔ اور زمین سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے قول کے مطابق ملک شام اور مصر کی زمین ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قوم فرعون اور قوم عمالقہ کے ہلاک ہونے کے بعد قبضہ اور حکومت عطا فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مکالمہ

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، میرے حال اور منصب نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات بجز سچ کے منسوب نہ کروں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو جو پیغام حق تعالیٰ کی طرف سے دیئے جاتے ہیں وہ ان کے پاس خدائی امانت ہوتے ہیں، اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرنا خیانت ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام خیانت اور ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگوں کو میری بات پر اس لئے یقین کرنا چاہئے کہ میری سچائی تم سب کے سامنے ہے، میں نے کبھی نہ جھوٹ بولا ہے اور نہ

بول سکتا ہوں، اسکے علاوہ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ، یعنی صرف یہی بات نہیں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بلکہ میرے دعوے پر دلیل میرے معجزات بھی ہیں۔ اس لئے ان سب چیزوں کا تقاضایہ ہے کہ آپ میری بات سنیں اور مانیں، بنی اسرائیل کو مصنوعی غلامی سے نجات دے کر میرے ساتھ کردیں۔ (سورۂ اعراف دیکھئے)

فرعون کا مطالبہ

فرعون کا مطالبہ پر تو کان نہ دھرا، معجزہ دیکھنے کا مطالبہ کرنے لگا اور کہا اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ، یعنی اگر تم واقعی کوئی معجزہ لائے ہو تو پیش کرو اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مطالبہ کو مانتے ہوئے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی وہ اژدہا بن گئی فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ، ثعبان بڑے اژدھا کو کہا جاتا ہے اور اس کی صفت مبین ذکر کر کے بتلا دیا کہ اس لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کسی اندھیرے یا گوشہ پردہ میں واقع ہوا ہو جس کو کوئی دیکھے کوئی نہ دیکھے، جیسے عموماً شعبدہ بازوں یا جادوگروں کا طرز ہوتا ہے، بلکہ یہ واقعہ بھرے دربار میں سب کے سامنے پیش آیا۔

بعض تاریخی روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس اژدھا نے فرعون کی طرف منہ پھیلایا تو گھبرا کر تخت شاہی سے کود کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پناہ لی اور دربار کے ہزاروں آدمی اس کی دہشت سے مر گئے (تفسیر کبیر)

لاٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی ناممکن یا محال چیز نہیں، ہاں عادت عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور قابل تعجب ضرور ہے، اور معجزہ و کرامت کا منشاء ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کرسکیں وہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کردیا جاتا ہے تاکہ عوام سمجھ لیں کہ ان کے ساتھ کوئی خدائی طاقت کام کر رہی ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی قابل تعجب و انکار نہیں ہوسکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا معجزہ

ایک جگہ وَاَدْخِلْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ دوسری جگہ واضمم یدک الی جناحک مذکور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے دبا لو ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہاتھ نکالنا گریبان کے اندر سے یا بازو کے نیچے سے ہوتا تھا۔ یعنی کبھی گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالنے سے اور کبھی بازو کے نیچے دبا کر نکالنے سے یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا کہ فَاِذَا ھِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ یعنی وہ ہاتھ چمکنے والا ہو جاتا ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

بیضاء کے لفظی معنی سفید کے ہیں اور ہاتھ کا سفید ہو جانا کبھی برص کی بیماری کے سبب بھی ہوا کرتا ہے، اس لئے ایک دوسری آیت میں اس جگہ من غیر سوء کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کے سبب نہ تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفیدی بھی معمولی سفیدی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ روشنی ہوتی تھی جس سے ساری فضا روشن ہو جاتی تھی۔ (قرطبی)

اس وقت فرعون کے مطالبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو معجزے دکھلائے، ایک لاٹھی کا اژدھا بن جانا دوسرے ہاتھ کو گریبان یا بغل میں ڈال کر نکالنے سے اس میں روشنی پیدا ہو جانا۔ پہلا معجزہ مخالفین کے ترہیب اور ڈرانے کے لئے، اور دوسرا معجزہ ان کی ترغیب اور قریب کرنے کے لئے ہے، جس میں اشارہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم ایک نور ہدایت رکھتی ہے اس کا اتباع باعث فلاح ہے۔

قوم فرعون کے سردار یہ معجزات دیکھ کر اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے وجہ یہ تھی کہ

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ان بیچاروں کو خدائے تعالیٰ اور اس کی قدرت کاملہ کی کیا خبر تھی جنہوں نے ساری عمر فرعون کو اپنا خدا اور جادوگروں کو اپنا رہبر سمجھا اور جادوگروں کے شعبدوں ہی کو دیکھا تھا، وہ اس حیرت انگیز واقعہ کو دیکھ کر اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ یہ بھی کوئی بڑا جادو ہے لیکن ان لوگوں

نے بھی یہاں ساحر کے ساتھ علیم کا لفظ بڑھا کر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے متعلق یہ احساس ان کو بھی ہو گیا تھا کہ یہ کام عام جادوگروں کے کام سے ممتاز اور مختلف ہے اسی لئے اتنا اقرار کیا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں۔ پھر کہا کہ یہ ماہر جادوگر یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے، تو اب بتلا دو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا مشورہ دیتے ہو؟

معجزہ اور جادو میں فرق

اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو اسی انداز سے ظاہر فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ لیں۔ سحر کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ طہارت و نظافت ان کی طبیعت ثانیہ ہوتی ہے، اور یہ بھی کھلا ہوا فرق من جانب اللہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہل بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرہ اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ مخفی اسباب ہوتے ہیں، اس لئے وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہو گیا، بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کا مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ براہ راست قدرت حق کا فعل ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، ولکن اللہ رمیٰ۔

اس سے معلوم ہوا کہ معجزہ اور سحر کی حقیقتیں بالکل مختلف اور متباین ہیں، حقیقت شناس کے لئے تو کوئی التباس کی وجہ ہی نہیں، عوام کو التباس ہو سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس التباس کو دور کرنے کے لئے بھی ایسے امتیازات رکھ دیئے ہیں کہ جس کی وجہ سے لوگ دھوکہ سے بچ جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قوم فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو اپنے جادوگروں کے افعال سے کچھ ممتاز و مختلف پایا، اس لئے اس پر مجبور ہوئے کہ یہ کہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے

کہ عام جادوگر اس جیسے کاموں کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

جادوگروں سے مقابلہ کیلئے وقت کی تعین

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلہ کے لئے یہ خود تجویز کیا کہ ایسے مقام پر ہونا چاہئے جو آلِ فرعون اور حضرت موسیٰ و بنی اسرائیل کے لئے مسافت کے اعتبار سے برابر ہوتا کہ کسی فریق پر زیادہ دور جانے کی مشقت نہ پڑے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قبول کر کے دن اور وقت کی تعیین اس طرح فرمادی مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى یعنی یہ مقابلہ یوم الزینۃ میں ہونا چاہئے۔ مراد عید یا کسی میلے وغیرہ کے اجتماع کا دن ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ کونسا دن تھا؟ بعض نے کہا کہ آل فرعون کی کوئی عید مقرر تھی جس میں وہ زینت کے کپڑے پہن کر شہر سے باہر نکلنے کے عادی تھے، بعض نے کہا کہ وہ نیروز کا دن تھا کسی نے کہا کہ یوم السبت یعنی ہفتہ کا دن تھا جس کی یہ لوگ تعظیم کرتے تھے، بعض نے کہا کہ وہ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔

نبوی حکمت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دن اور وقت کی تعیین میں بڑی حکمت سے کام لیا کہ دن ان کی عید کا تجویز کیا جس میں سب چھوٹے بڑے ہر طبقے کے لوگوں کا اجتماع پہلے سے متعین تھا جس کا نتیجہ لازمی یہ تھا کہ یہ اجتماع بہت بڑا پورے شہر کے لوگوں پر مشتمل ہو جائے اور وقت ضحیٰ یعنی چاشت کا رکھا جو آفتاب کے بلند ہونے کے بعد ہوتا ہے جس میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ سب لوگوں کو اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر اس میدان میں آنا آسان ہو۔ دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ وقت روشنی اور ظہور کے اعتبار سے سارے دن میں بہتر ہے ایسے ہی وقت میں دلجمعی اور سکون کے ساتھ اہم کام کئے جاتے ہیں اور ایسے وقت کے اجتماع سے جب لوگ منتشر ہوتے ہیں تو بات دور دور تک پھیل جاتی ہے چنانچہ اس روز جب حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی ساحروں پر غلبہ عطا فرمایا تو ایک ہی دن میں پورے شہر میں بلکہ دور دور تک اس کی شہرت ہو گئی۔

جادوگروں کو جمع کرنا

قوم کے لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر یہ جادوگر ہے اور جادو کے ذریعہ ہمارا ملک فتح کرنا چاہتا ہے تو اس کا مقابلہ ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں، ہمارے ملک میں بڑے بڑے ماہر جادوگر ہیں اس کو اپنے جادو سے شکست دے دیں گے، کچھ سپاہی ملک کے اطراف میں بھیج دیئے جو ہر شہر کے جادوگروں کو بلا لائیں۔

وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں جادو، سحر کا رواج عام تھا اور عام لوگوں پر جادوگروں کا اقتدار تھا اور شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء کا معجزہ اسی لئے عطا فرمایا کہ جادوگروں سے مقابلہ ہو اور معجزہ کے مقابلہ میں جادو کی رسوائی سب لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم عادت بھی یہی ہے کہ ہر زمانہ کے پیغمبر کو اس زمانہ کے مناسب معجزات عطا فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمت یونانی اور طب یونانی اپنے عروج پر تھی تو ان کو معجزہ یہ دیا گیا کہ مادرزاد اندھوں کو بینا بنا دیں اور جذامی کوڑھیوں کو تندرست کر دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کا سب سے بڑا کمال فصاحت و بلاغت تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن بنایا گیا جس کے مقابلہ سے سارا عرب و عجم عاجز ہو گیا۔

جادوگروں کی فرعون سے سودا بازی

لوگوں کے مشورہ کے مطابق ملک بھر سے جادوگروں کے جمع کرنے کا انتظام کیا گیا، اور یہ جادوگر فرعون کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آگئے تو ہمیں اس کی کچھ اجرت اور انعام بھی ملے گا؟ فرعون نے کہا کہ ہاں اُجرت بھی ملے گی اور اس پر مزید یہ انعام ہوگا کہ تم سب ہمارے مقربین میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہ جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ملک بھر سے جمع کیے گئے تھے۔ ان کی تعداد میں تاریخی روایات مختلف ہیں۔ نو سو سے لے تین لاکھ تک کی روایات ہیں ان کے ساتھ لاٹھیوں اور رسیوں کا ایک انبار تھا جو تین سو اُونٹوں پر لاد کر لایا گیا تھا (قرطبی)

فرعونی جادوگروں نے آتے ہی پہلی بات سودا بازی کی شروع کی کہ ہم مقابلہ کریں اور غالب آجائیں تو ہمیں کیا ملے گا۔ وجہ یہ تھی کہ اہل باطل کے سامنے صرف دنیا کے فوائد ہوتے ہیں اس لئے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے معاوضہ اور اجرت کا سوال سامنے آتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین کے کہ وہ ہر قدم پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ. اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی ہم جو پیغام حق تمہارے فائدہ کے لئے تمہیں پہنچاتے ہیں اس پر تم سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، بلکہ ہمارا معاوضہ صرف رب العالمین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ فرعون نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ اُجرت چاہتے ہو، ہم اجرت بھی دیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ تمہیں شاہی دربار کا مقرب بنالیں گے۔

جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ

فرعون سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کی جگہ اور وقت کا تعین کرایا۔ چنانچہ ایک کھلا میدان اور عید کے دن آفتاب بلند ہونے کے بعد کا وقت اس کام کے لئے تجویز ہوا جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے،

بعض روایات میں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آگیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اُس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آہی نہیں سکتا۔ اس لئے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا، اور اگر بالفرض تم غالب آگئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (مظہری و قرطبی)

جب میدان مقابلہ میں پہنچے تو جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یا تو آپ پہلے ڈالیں یا ہم پہلے ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں۔ جادوگروں کا یہ کہنا اپنی بے فکری اور بڑائی جتانے کے لئے تھا کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ابتدا ہماری طرف سے ہو، کیونکہ ہم ہر حالت میں اپنے فن پر اطمینان رکھتے ہیں۔ ان کے انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ چاہتے تو یہی تھے کہ پہلا وار ان کا ہو مگر اظہار قوت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پہل آپ کرنا چاہتے ہو یا ہم کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے منشاء کو محسوس کر کے اپنے معجزہ پر مکمل اطمینان ہونے کے سبب پہلا موقعہ ان کو دے دیا اور فرمایا القوا یعنی تم ہی پہلے ڈالو۔

اور ابن کثیر نے فرمایا کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ادب واحترام کا معاملہ کیا کہ پہلا موقعہ ان کو دینے کی پیش کش کی، اُسی کا یہ اثر تھا کہ ان کو ایمان کی توفیق ہوگئی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جادو خود ہی ایک حرام فعل ہے، پھر جب کہ وہ کسی پیغمبر کو شکست دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو بلاشبہ کفر ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے کیسے ان لوگوں کو اس کی اجازت دینے کے لئے فرمایا القوا یعنی تم ڈالو۔ لیکن حقیقت حال پر غور کرنے سے یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں تو یقینی تھا کہ یہ لوگ اپنا سحر مقابلہ پر ضرور پیش کریں گے، گفتگو صرف پہلے اور پیچھے کی تھی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اولو العزمی کا ثبوت دینے کے لئے ان کو ہی موقعہ عطا فرمایا، اس کے علاوہ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ پہلے جادوگر اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنالیں تو پھر عصا موسیٰ کا معجزہ، صرف یہی نہیں کہ وہ بھی سانپ بن جائے بلکہ اس طرح ظاہر ہو کہ وہ جادو کے سارے سانپوں کو نگل بھی جائے تاکہ جادوگری کی کھلی شکست پہلے ہی قدم پر سامنے آجائے (بیان القرآن)

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ان کو جادوگری کرنے کی اجازت کے لئے نہیں بلکہ ان کی رسوائی کو واضح کرنے کے لئے تھا کہ اچھا تم ڈال کر دیکھو کہ تمہارے جادو کا کیا انجام ہوتا ہے۔

جادوگروں کی جادوگری

قرآن کریم میں ہے کہ جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی نظر بندی کردی اور ان پر ہیبت غالب کردی اور بڑا جادو دکھلایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی اور تخییل تھی جس سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ واقع میں اسی طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں۔ سانپ نہیں بنے تھے۔ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر صرف اسی قسم میں منحصر ہے سحر کے ذریعہ انقلاب ماہیت نہیں ہوسکتا، کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ سحر کی مختلف اقسام واقعات سے ثابت ہیں۔ کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے، کہیں صرف تخییل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم سے۔ اور اگر کہیں قلب ماہیت بھی ہوجاتا ہو کہ انسان کا پتھر بن جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دو، وہ زمین پر گرتے ہی سب سے بڑا سانپ بن کر ان تمام سانپوں کو نگلنے لگا جو جادوگروں نے جادو سے ظاہر کئے تھے۔''

تاریخی روایات میں ہے کہ ہزاروں جادوگروں کی ہزاروں لاٹھیاں اور رسیاں جب سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو سارا میدان سانپوں سے بھر گیا اور ایک عجیب ہیبت سارے مجمع پر مسلط ہوگئی تھی، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ایک بڑے اژدہا کی صورت میں سامنے آئی تو ان سب سانپوں کو نگل کر ختم کر دیا۔

اس طرح حق ظاہر ہوگیا اور جو کچھ ساحروں نے بنایا تھا وہ سب باطل اور ہوا ہوگیا۔ اس موقعہ پر وہ سب ہار گئے اور خوب رسوا ہوئے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جادوگر سجدے میں ڈال دیئے گئے اور کہنے لگے کہ ہم رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ پر ایمان لے آئے۔

سجدے میں ڈال دیئے گئے فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر یہ لوگ کچھ ایسے مبہوت اور مجبور ہو گئے کہ بے اختیار سجدہ میں گر گئے۔ اور اس کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرما کر ان کو سجدہ میں ڈال دیا۔ اور ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' کے ساتھ ''رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ'' بڑھا کر اپنی بات کو فرعون کے مقابلہ میں واضح کر دیا کیونکہ وہ بے وقوف تو اپنے آپ ہی کو رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا تھا، اس لئے رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ کہہ کر اس کو بتلا دیا کہ ہم تیری خدائی کے قائل نہیں رہے۔

جادوگروں کا ایمان لانا

میں ہے کہ فرعون (بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو ایک مضمون گھڑ کر ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے ہو

بدوں اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں بیشک (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جو کچھ جنگ زرگری کے طور پر ہوا ہے) ایک کارروائی تھی جس پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں (خفیہ سازش ہوگئی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے اور یہ کارروائی ملی بھگت اس لئے کی ہے) تا کہ تم سب (ملکر) اس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو (پھر بفراغ خاطر سب مل کر یہاں ریاست کرو) سو (بہتر ہے) اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا (تا کہ اوروں کو عبرت ہو) انہوں نے جواب دیا کہ (کچھ پرواہ نہیں) ہم مر کر (کسی برے ٹھکانے تو نہ جائیں گے بلکہ) اپنے مالک ہی کے پاس جائیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے سو ہمارا نقصان ہی کیا ہے) اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا ہے (جس پر اس قدر شور و غل ہے) بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے (سو یہ کوئی عیب کی بات نہیں پھر اس سے اعراض کر کے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما (کہ اگر یہ سختی کرے تو مستقل رہیں) اور ہماری جان حالت اسلام پر نکالئے (کہ اس کی سختی سے پریشان ہو کر کوئی بات ایمان کے خلاف نہ ہو جائے) اور (جب موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ عظیمہ منظر عام پر ظاہر ہوا اور ساحرین ایمان لے آئے اور بعضے اور لوگ بھی آپ کے تابع ہو گئے اس وقت) قوم فرعون کے سرداروں نے (جو کہ اعیان سلطنت تھے یہ دیکھ کر کہ بعضے آدمی مسلمان ہو چلے فرعون سے) کہا کہ کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کی قوم (تابعین) کو یوں ہی (مخلی بالطبع و مطلق العنان آزاد) رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں (فساد یہ کہ اپنا مجمع بڑھائیں جس کے اخیر میں اندیشہ بغاوت ہے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آپ کو اور آپ کے (تجویز کئے ہوئے) معبودوں کو ترک کئے رہیں (یعنی ان کے معبود ہونے کے منکر رہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم بھی ایسا ہی کرے یعنی آپ اس کا انتظام کیجئے) فرعون نے کہا کہ (سر دست یہ انتظام مناسب معلوم ہوتا ہے کہ) ہم بھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں (تا کہ ان کا زور نہ بڑھنے پائے) اور (چونکہ عورتوں کے بڑھنے سے کوئی اندیشہ نہیں نیز ہم کو اپنے کار و خدمت کے لئے بھی ضرورت ہے اس لئے) عورتوں کو

زندہ رہنے دیں اور ہم کو ہر طرح کا ان پر زور ہے (اس انتظام میں کوئی دشواری نہ ہوگی)

چھ لاکھ لوگوں کا مسلمان ہونا

تاریخی روایات میں ہے کہ جادوگروں کے سردار مسلمان ہو گئے تو ان کو دیکھ کر قوم فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اعلان کر دیا۔

اس مقابلہ اور مناظرہ سے پہلے تو صرف دو حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے مخالف تھے۔ اس وقت سب سے بڑے جادوگر جو قوم میں اقتدار کے مالک تھے اور ان کے ساتھ چھ لاکھ عوام مسلمان ہو کر ایک بہت بڑی طاقت مقابلہ پر آ گئی۔

فرعون کی چالاکی

اس وقت فرعون کی پریشانی اور سراسیمگی بیجا نہ تھی مگر اس نے اس کو چھپا کر ایک چالاک ہوشیار سیاست دان کے انداز میں پہلے تو جادوگروں پر یہ باغیانہ الزام لگایا کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خفیہ سازش کر کے یہ کام اپنے ملک و ملت کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا ہے یہ ایک سازش ہے جو تم نے میدان مقابلہ میں آنے سے پہلے شہر کے اندر آپس میں کر رکھی تھی۔ اور پھر جادوگروں کو خطاب کر کے کہا کیا تم نے میری اجازت سے پہلے ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ استفہام انکاری بطور زجر و تنبیہ کے تھا۔ اور اپنی اجازت سے پہلے ایمان لانے کا ذکر کر کے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہم خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا حق پر ہونا واضح ہو جائے تو ہم بھی ان کو مانیں اور لوگوں کو بھی اجازت دیں کہ وہ مسلمان ہو جائیں لیکن تم لوگوں نے جلد بازی کی اور حقیقت کو سوچے سمجھے بغیر ایک سازش کے شکار ہو گئے۔

اس چالاکی سے ایک طرف تو لوگوں کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور جادوگروں کی تسلیم کو ایک سازش قرار دے کر اُن کو قدیم گمراہی میں مبتلا رکھنے کا انتظام کیا اور دوسری طرف سیاسی چالاکی یہ کی کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اور جادوگروں کا اسلام جو خالص فرعون کی گمراہی کو کھولنے کے لئے تھا، قوم اور عوام سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا اُس کو ایک ملکی اور سیاسی مسئلہ بنانے کے لئے کہا، تم لوگوں نے یہ سازش اس لئے کی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ

ملک مصر پر تم غالب آجاؤ اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، ان چالاکیوں کے بعد ان سب پر اپنی ہیبت اور حکومت کا رعب وخوف جمانے کے لئے جادوگروں کو دھمکیاں دینی شروع کیں، اول تو مبہم انداز میں کہا، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم ابھی دیکھ لوگے کہ تمہاری اس سازش کا کیا انجام ہوتا ہے، اس کے بعد اُس کو واضح کر کے بتلایا، لَاُ قَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ مِنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمْ اَجْمَعِیْنَ یعنی میں تم سب کے ہاتھ پیر مختلف جانبوں کے کاٹ کر تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا۔ مختلف جانبوں سے کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پیر جس سے دونوں جانبیں زخمی اور بدہیئت اور بیکار ہو جائیں۔

جادوگروں کا فرعون کو دوٹوک جواب

فرعون نے اس بدحالی پر قابو پانے اور اپنے درباریوں اور عوام کو قابو میں رکھنے کی کافی تدبیر کر لی تھی اور اس کی ظالمانہ سزائیں پہلے سے مشہور اور لوگوں کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی تھیں۔

لیکن اسلام وایمان ایک ایسی زبردست قوت ہے کہ جب وہ کسی دل میں گھر کر لیتی ہے تو پھر انسان ساری دنیا اور اس کے وسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

یہ جادوگر جواب سے چند گھنٹے پہلے فرعون کو اپنا خدا مانتے اور اسی گمراہی کی لوگوں کو تلقین کرتے تھے، چند منٹ میں کلمہ اسلام پڑھتے ہی ان میں کیا چیز پیدا ہو گئی تھی کہ وہ فرعون کی ساری دھمکیوں کے جواب میں کہتے ہیں:

اگر تو ہمیں قتل کر دے گا تو مضائقہ نہیں، ہم اپنے رب کے پاس چلے جائیں گے، جہاں ہم کو ہر طرح کی راحت ملے گی۔ جادوگر چونکہ فرعون کی سطوت وجبروت سے ناواقف نہ تھے اس لئے یہ نہیں کہا کہ ہم تیرے قابو میں نہیں آئیں گے یا ہم مقابلہ کریں گے بلکہ اس کی دھمکی کو صحیح مان کر یہ جواب دیا کہ یہ مانا کہ تو ہمیں ہر قسم کی سزا دینے پر دنیا میں قادر ہے مگر ہم دنیا کی زندگی ہی کو ایمان لانے کے بعد کوئی چیز نہیں سمجھتے، دنیا سے گزر جائیں گے تو اس زندگی سے بہتر زندگی ملے گی اور اپنے رب کی ملاقات نصیب ہوگی اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس زندگی میں جو تیرا دل چاہے کر لے، آخر کار ہم اور تم سب رب العالمین کے سامنے پیش ہوں گے اور وہ ظالم سے مظلوم کا انتقام لیں گے اس وقت اپنے اس عمل کا نتیجہ تیرے سامنے

آ جائے گا۔ چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس موقع پر ان جادوگروں کے یہ الفاظ منقول ہیں، جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں حکم دے دے، بس اتنا ہی تو ہے کہ تیرا حکم ہماری اس دنیوی زندگی پر چل سکتا ہے اور تیرے غصہ کے نتیجے میں وہ زندگی ختم ہوسکتی ہے مگر ایمان لانے کے بعد ہماری نظر میں اس دنیوی زندگی کی وہ اہمیت ہی باقی نہیں رہی جو ایمان لانے سے پہلے تھی کیونکہ ہمیں معلوم ہوگیا کہ یہ زندگی راحت یا کلفت کے ساتھ گزر ہی جائے گی، فکر اس زندگی کی کرنا چاہئے جس کے بعد موت نہیں اور جس کی راحت بھی دائمی ہے اور کلفت بھی۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو کل تک بدترین کفر میں مبتلا تھے کہ فرعون جیسے بیہودہ انسان کو خدا مانتے تھے، خدا تعالیٰ کی شان وعظمت سے بالکل ناآشنا تھے، ان میں یکبارگی ایسا انقلاب کیسے آگیا کہ اب پچھلے سب عقائد واعمال سے یکسر تائب ہوکر دین حق پر اتنے پختہ ہوگئے کہ اس کے لئے جان تک دینے کو تیار نظر آتے ہیں، اور دنیا سے رخصت ہونے کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس چلے جائیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ ایمان کی قوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت ان میں پیدا ہوگئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم ومعرفت کے دروازے ان پر کھل گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ فرعون کے مقابلہ میں اس جرأت مندانہ بیان کے ساتھ یہ دعا بھی کرنے لگے۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ

یعنی اے ہمارے پروردگار ہمیں کامل صبر عطا فرما اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہمیں وفات دے۔

اس میں اشارہ اس معرفت کی طرف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو انسان کا عزم وہمت کچھ کام نہیں آتا، اس لئے اسی سے ثابت قدمی کی دعا کی گئی۔ اور یہ دعا جیسے معرفت حق کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اسی طرح اس مشکل کے حل کا بہترین ذریعہ بھی ہے جس میں یہ لوگ اس وقت مبتلا تھے، کیونکہ صبر اور ثابت قدمی ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ عظیم کے اسباب ونتائج پر غور کرنے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ

میں لکھا تھا کہ مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی وہ قوم ہے جو میدان جنگ میں سب سے زیادہ بہادر اور مصیبت و مشقت پر صبر کرنے میں سب سے آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی اقوام میں فنون حرب کے ماہرین اس کی تاکید کرتے تھے کہ فوج میں دینداری اور خوف آخرت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کیونکہ اس سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر المنار)

ساحروں میں ایمانی انقلاب موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا و ید بیضاء سے بھی بڑا تھا

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی بنانے کے لئے ساری ہی تدبیریں اختیار کر رہے ہیں مگر اس گر کو بھول بیٹھے ہیں جو قوت اور وحدت کی روح ہے۔

فرعونی جادوگروں نے بھی اول مرحلہ میں اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدانا شناس منکر کافروں کو دم بھر میں نہ فقط مسلمان بلکہ ایک عارف کامل اور مجاہد و غازی بنا دینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا اور ید بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔

فرعون پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی ہیبت کا اثر

فرعون کی چالاکی اور سیاسی جھوٹ نے اس کی جاہل قوم کو اس کے ساتھ قدیم گمراہی میں مبتلا رہنے کا کچھ سامان تو کر دیا مگر یہ اُعجوبہ ان کے لئے بھی ناقابل فہم تھا کہ فرعون کے غصہ کا سارا زور جادوگروں پر ختم ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام جو اصل مخالف تھے ان کے بارے میں فرعون کی زبان سے کچھ نہ نکلا، اس پر ان کو کہنا پڑا۔

کیا موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دیں گے کہ وہ آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں فساد کرتے پھریں۔

اس پر مجبور ہو کر فرعون نے کہا، ان کا معاملہ ہمارے لئے کچھ قابل فکر نہیں، ہم ان کے لئے یہ کام کریں گے کہ ان میں جو لڑکا پیدا ہو گا اس کو قتل کر دیں گے صرف لڑکیوں کو رہنے دیں گے، جس کا نتیجہ کچھ عرصہ میں یہ ہو جائے گا کہ ان کی قوم مردوں سے خالی ہو کر صرف

عورتیں رہ جائیں گی جو ہماری خدمت گار باندیاں بنیں گی۔ اور ہم تو ان سب پر پوری قدرت رکھتے ہیں جو چاہیں کریں یہ ہمارا کچھ نہیں بنا سکتے۔

علماء مفسرین نے فرمایا کہ قوم کے اس طرح جھنجھوڑنے پر بھی فرعون نے یہ تو کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کردیں گے، لیکن حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں اس وقت بھی اس کی زبان پر کوئی بات نہ آئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس معجزہ اور واقعہ نے فرعون کے قلب و دماغ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سخت ہیبت بٹھلا دی تھی۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرعون کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو پیشاب خطا ہو جاتا تھا، اور یہ بالکل صحیح ہے، ہیبت حق کا یہی حال ہوتا ہے۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست

اور مولانا رومی رحمہ اللہ نے فرمایا۔

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید　ترسداز وے جن وانس و ہر کہ دید

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے ساری مخلوق اس سے ڈرنے لگتی ہے۔

اس جگہ قوم فرعون نے جو یہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر فساد کرتے پھریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون اگرچہ اپنی قوم کے سامنے خود خدائی کا دعویدار تھا اور انا ربکم الاعلی کہتا تھا، لیکن خود بتوں کی پوجا پاٹ بھی کیا کرتا تھا۔

جادوگروں کی تعداد

فرعون نے اپنے ساحروں اور ان کے آلات کو جمع کرلیا۔ حضرت ابن عباسؓ سے ان ساحروں کی تعداد بہتر منقول ہے اور دوسرے اقوال ان کی تعداد میں بہت مختلف ہیں، چار سو سے لے کر نو لاکھ تک ان کی تعداد بتلائی گئی ہے اور یہ سب اپنے ایک رئیس شمعون کے ماتحت اس کے حکم کے مطابق کام کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان کا رئیس ایک اندھا آدمی تھا (قرطبی) واللہ اعلم۔

موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کو پیغمبرانہ خطاب

جادو کا مقابلہ معجزات سے کرنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو

ہمدرانہ نصیحت آمیز چند کلمات کہہ کر اللہ کے عذاب سے ڈرایا وہ الفاظ یہ تھے...... وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ. وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى۔ یعنی تمہاری ہلاکت سامنے آ چکی ہے، اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان نہ لگاؤ کہ اس کے ساتھ خدائی میں فرعون یا کوئی اور شریک ہے، اگر تم ایسا کرو گے تو وہ تم کو عذاب میں پیس ڈالے گا اور تمہاری جڑ بنیاد اکھاڑ دے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے وہ انجام کار ناکام اور محروم ہوتا ہے۔

جادوگروں کا فیصلہ

ظاہر ہے کہ فرعون کی طاغوتی طاقت وقوت اور حشم وخدم کے سہارے جو لوگ مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آ چکے تھے ان واعظانہ کلمات کا ان پر کوئی اثر ہونا بہت ہی بعید تھا مگر انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کے ساتھ حق کی ایک مخفی طاقت وشوکت ہوتی ہے ان کے سادے الفاظ بھی سخت سے سخت دلوں پر تیر ونشتر کا کام کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ جملے سن کر ساحروں کی صفوں میں ایک زلزلہ پڑ گیا اور آپس میں اختلاف ہونے لگا کہ یہ کلمات کوئی جادوگر نہیں کہہ سکتا یہ تو اللہ ہی کی طرف سے معلوم ہوتے ہیں اس لئے بعض نے کہا کہ ان کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں، اور بعض اپنی بات پر جمے رہے فَتَنَازَعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ کا یہی مطلب ہے، پھر اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی اور آہستہ مشورے ہونے لگے۔ مگر بالآخر مجموعی رائے مقابلہ کرنے ہی پر جم گئی اور کہنے لگے۔ یعنی یہ دونوں جادوگر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم کو یعنی فرعون اور ال فرعون کو تمہاری زمین مصر سے نکال دیں، مطلب یہ ہے کہ جادو کے ذریعہ تمہارے ملک پر اپنا قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ تمہارا طریقہ جو سب سے افضل و بہتر ہے اس کو مٹا دیں مطلب یہ تھا کہ تمہارا مذہب وطریقہ کہ فرعون کو اپنا خدا اور صاحب اختیار اقتدار مانتے ہو یہی سب سے افضل و بہتر طریقہ ہے یہ لوگ اس کو مٹا کر اپنا دین ومذہب پھیلانا چاہتے ہیں اور لفظ طریقہ کے ایک معنی یہ بھی آتے ہیں کہ قوم کے سرداروں اور نمائندہ لوگوں کو اس قوم کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اس جگہ

طریقہ کی یہی تفسیر منقول ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمہاری قوم کے سرداروں اور باعزت لوگوں کو ختم کردیں، اس لئے تم لوگوں کو چاہئے کہ مقابلہ کے لئے اپنی پوری تدبیر و توانائی صرف کرو اور سب جادوگر صف بستہ ہوکر یکبارگی ان کے مقابلے پر عمل کرو (فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا) صف بستہ ہونے کو مقابل پر رعب ڈالنے کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اس لئے جادوگروں نے اپنی صف بندی کر کے مقابلہ کیا۔

جادوگروں کو پہل کی پیشکش

جادوگروں نے اپنی بےفکری اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے کہا کہ پہل آپ کرتے ہیں یا ہم کریں یعنی پہلے آپ اپنا عمل کرتے ہیں یا ہم کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: بل القوا یعنی پہلے تمہیں ڈالو اور اپنے جادو کا کرشمہ دکھلاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں۔ اول تو ادب مجلس کہ جب جادوگروں نے اپنا یہ حوصلہ دکھلایا کہ مخالف کو پہلے حملہ کرنے کی اجازت دی تو اس کا شریفانہ جواب یہی تھا کہ ان کی طرف سے اس سے زیادہ حوصلے کے ساتھ ان کو ابتداء کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے یہ کہ جادوگروں کا یہ کہنا اپنے اطمینان اور بےفکری کا مظاہرہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان ہی کو ابتداء کرنے کا موقع دے کر اپنی بےفکری اور اطمینان کا ثبوت دے دیا۔ تیسرے یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کے جادو کے سب کرشمے آجاویں اس کے بعد اپنے معجزات کا اظہار کریں تو بیک وقت غلبۂ حق کا ظہور واضح طور پر ہو جائے۔

جادوگروں کا کرتب

جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد پر اپنا عمل شروع کردیا اور اپنی لاٹھیاں اور رسیاں جو بڑی تعداد میں تھیں بیک وقت زمین پر ڈال دیں اور وہ سب کی سب بظاہر سانپ بن کر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی جادوگروں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی تھی جو مسمریزم کے ذریعہ بھی ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی

دکھائی دینے لگیں، وہ حقیقتاً سانپ نہ بنی تھیں، اور اکثر جادو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ صورت حال دیکھ کر خوف طاری ہوا جس کو انہوں نے اپنے نفس میں چھپائے رکھا دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا، یہ خوف اگر موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کے لئے ہوا تو مقتضائے بشریت سے ایسا ہونا نبوت کے خلاف نہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ خوف اپنی جان کا نہیں تھا بلکہ اس کا تھا کہ اس مجمع کے سامنے ساحروں کا غلبہ محسوس کیا گیا تو جو مقصد دعوت نبوت کا تھا وہ پورا نہ ہو سکے گا اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے جو ارشاد ہوا اس میں یہ اطمینان دلایا گیا کہ جادوگر غالب نہ آسکیں گے آپ ہی کو فتح اور غلبہ حاصل ہوگا۔

اور موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی خطاب ہوا کہ آپ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس کو ڈال دو، مراد اس سے موسیٰ علیہ السلام کی عصا تھی مگر یہاں عصا کا ذکر نہیں فرمایا۔ اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ان کے جادو کی کوئی حقیقت نہیں، اس کی پرواہ نہ کرو اور جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے ڈال دو وہ ان کے سب سانپوں کو نگل جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈال دی وہ ایک بڑا اژدہا بن کر ان سب جادو کے سانپوں کو نگل گیا۔

فرعونی جادوگروں کا مسلمان ہو کر سجدہ میں پڑ جانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصا نے اژدہا بن کر جب ان کے خیالی سانپوں کو نگل لیا تو چونکہ یہ لوگ جادو کے ماہرین تھے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ کام جادو کے ذریعہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ بلاشبہ معجزہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے سجدہ میں گر گئے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے۔ بعض روایات حدیث میں ہے کہ ان جادوگروں نے سجدہ سے اس وقت تک سر نہیں اٹھایا جب تک کہ ان کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ قدرت نے نہیں کرا دیا۔ (رواہ عبد ابن حمید)

فرعون کی بوکھلاہٹ

فرعون کی رسوائی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے واضح کر دی تو بوکھلا کر اوّل تو

ساحروں کو یہ کہنے لگا کہ بغیر میری اجازت کے تم کیسے ان پر ایمان لائے۔ گویا لوگوں کو یہ بتلایا تھا کہ میری اجازت کے بغیر ان جادوگروں کا کوئی قول فعل معتبر نہیں مگر ظاہر ہے کہ اس کھلے ہوئے معجزہ کے بعد کسی کی اجازت کی ضرورت کسی عاقل انسان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے اب جادوگروں پر اس سازش کا الزام لگایا کہ اب معلوم ہوا کہ تم سب موسیٰ کے شاگرد ہو اسی جادوگر نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور تم نے سازش کر کے اس کے سامنے اپنی ہار مان لی ہے۔

جادوگروں کو دھمکی

اب جادوگروں کو سخت سزا سے ڈرایا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے جس کی صورت یہ ہوگی کہ داہنا ہاتھ کٹے گا تو بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ یہ صورت یا تو اس لئے تجویز کی کہ فرعونی قانون میں سزا کا یہی طریقہ رائج ہوگا یا اس لئے کہ اس صورت میں انسان ایک عبرت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یعنی ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھر تمہیں کھجور کے درختوں پر سولی دی جائے گی کہ تم ان پر اسی طرح لٹکے رہو گے یہاں تک کہ بھوک اور پیاس سے مر جاؤ۔

جادوگروں کا فرعون کو جواب

جادوگروں نے فرعون کی یہ سخت دھمکی اور سخت سزا دینے کا اعلان سن کر اپنے ایمان پر بڑی پختگی کا ثبوت دیا۔ کہنے لگے کہ ہم تجھے یا تیرے کسی قول کو ان بینات و معجزات پر ترجیح نہیں دے سکتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ جادوگر جب سجدہ میں گرے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت کے ان مقامات عالیہ اور نعمتوں کا مشاہدہ کرا دیا جو ان کو ملنے والے تھے اس کو ان لوگوں نے کہا کہ ان بینات کے ہوتے ہوئے ہم تیری بات نہیں مان سکتے (قرطبی) نیز خالق کائنات رب سموات کو چھوڑ کر تجھے اپنا رب نہیں مان سکتے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اب جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں فیصلہ کر، اور جو چاہے سزا تجویز کر۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا، یعنی اگر تو نے ہمیں سزا دے بھی دی تو وہ سزا صرف اسی دنیا کی چند روزہ زندگی ہی تک ہوگی مرنے کے بعد تو تیرا ہم پر قبضہ نہیں رہے گا بخلاف حق تعالیٰ کے کہ ہم اس کے قبضہ میں

مرنے سے پہلے بھی ہیں اور مرنے کے بعد بھی، اس کی سزا کی فکر سب سے مقدم ہے۔

جادوگروں نے اب فرعون پر یہ الزام لگایا کہ ہمیں جادوگری پر تو نے ہی مجبور کر رکھا تھا ورنہ ہم اس لغو کام کے پاس نہ جاتے، اب ہم ایمان لاکر اللہ سے اس جادو کے گناہ کی بھی معافی مانگتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ جادوگر تو خود اپنے اختیار سے مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے اور اس مقابلہ کی سودا بازی بھی فرعون سے کر چکے تھے کہ ہم غالب آئیں گے تو کیا ملے گا، پھر انکا فرعون پر یہ الزام لگانا کہ تو نے ہمیں جادو کرنے پر مجبور کر رکھا تھا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ جادوگر شروع میں تو شاہی انعام واکرام کے لالچ میں مقابلہ کے لئے تیار تھے بعد میں ان کو کچھ احساس ہوا کہ ہم معجزہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس وقت فرعون نے ان کو مجبور کیا۔ دوسری وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے اپنے ملک میں جادوگری کی تعلیم کو لازمی بنایا ہوا تھا اس لئے ہر شخص جادو سیکھنے پر مجبور تھا (روح)

اہلیۂ فرعون آسیہ کا انجام خیر

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حق و باطل کے اس معرکہ کے وقت فرعون کی بیوی برابر خبر رکھتی رہی کہ انجام کیا ہوا۔ جب اس کو یہ بتلایا گیا کہ موسیٰ و ہارونؑ غالب آگئے تو فوراً اس نے اعلان کر دیا کہ میں بھی رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئی۔ فرعون کو اپنے گھر کی خبر لگی تو حکم دیا کہ ایک بڑے پتھر کی چٹان اٹھا کر اس کے اوپر ڈال دو۔ آسیہ نے جب یہ دیکھا تو آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور اللہ سے فریاد کی۔ حق تعالیٰ نے پتھر اس کے اوپر گرنے سے پہلے اس کی روح قبض کر لی پھر پتھر اس بے جان جسم پر گرا۔

فرعونی جادوگروں میں عجیب انقلاب

قرآن کریم میں جادوگروں کے جو ایمانی جملے نقل کئے گئے ہیں وہ عجیب ہیں۔ یہ کلمات اور حقائق جن کا تعلق خالص اسلامی عقائد اور عالم آخرت سے ہے، ان جادوگروں کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں اور اسلامی عقائد و اعمال کی کوئی تعلیم ان کو ملی نہیں، یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کی برکت اور ان کے

اخلاص کا اثر تھا کہ حق تعالیٰ نے ان پر دین کے تمام حقائق آن کی آن میں ایسے کھول دیئے کہ ان کے مقابلے میں نہ اپنی جان کی پرواہ رہی نہ کسی بڑی سے بڑی سزا اور تکلیف کا خوف رہا، گویا ایمان کے ساتھ ساتھ ہی ان کو ولایت کا بھی وہ مقام حاصل ہو گیا جو دوسروں کو عمر بھر کے مجاہدوں ریاضتوں سے بھی حاصل ہونا مشکل ہے۔ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور عبید بن عمیرؒ نے فرمایا کہ قدرت حق کا یہ کرشمہ دیکھو کہ یہ لوگ شروع دن میں کفار جادوگر تھے اور آخر دن اولیاء اللہ اور شہداء۔ (ابن کثیر)

مصر سے ہجرت کا حکم

حق و باطل معجزہ اور جادو کے فیصلہ کن معرکہ نے فرعون اور آل فرعون کی کمر توڑ دی اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی قیادت میں جمع ہو گئے تو اب ان کو یہاں سے ہجرت کا حکم ملتا ہے۔ اور چونکہ فرعون کے تعاقب اور آگے دریا کے راستہ میں حائل ہونے کا خطرہ سامنے تھا اس لئے دونوں چیزوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطمئن کر دیا گیا کہ دریا پر اپنی لاٹھی ماریں گے تو درمیان سے خشک راستے نکل آئیں گے اور پیچھے سے فرعون کے تعاقب کا خطرہ نہ رہے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا پر لاٹھی ماری تو اس میں بارہ سڑکیں اس طرح بن گئیں کہ پانی کے تودے بحر منجمد کی طرح دونوں طرف پہاڑ کی برابر کھڑے رہے اور درمیان سے راستے خشک نکل آئے جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ، اور درمیان میں جو یہ پانی کی دیواریں ان بارہ سڑکوں کے درمیان تھیں ان کو قدرت نے ایسا بنا دیا کہ ایک سڑک سے گزرنے والے دوسری سڑکوں سے گزرنے والوں کو دیکھتے بھی جاتے تھے اور باہم باتیں بھی کر رہے تھے تاکہ ان کے دلوں میں یہ خوف و ہراس بھی نہ رہے کہ ہمارے دوسرے قبیلوں کا کیا حال ہوا (قرطبی)

مصر سے نکلنے کے وقت بنی اسرائیل کے بعض حالات اور ان کی تعداد اور لشکر فرعون کی تعداد

تفسیر روح المعانی میں یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شروع رات میں بنی

اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے دریائے قلزم کی طرف نکلے۔ بنی اسرائیل نے اس سے پہلے شہر کے لوگوں میں یہ شہرت دے دی تھی کہ ہماری عید ہے ہم عید منانے کے لئے باہر جائیں گے اور اس بہانے سے قبطی لوگوں سے کچھ زیورات عاریۃً مانگ لئے کہ عید سے آ کر واپس کر دیں گے۔ بنی اسرائیل کی تعداد اس وقت چھ لاکھ تین ہزار اور دوسری روایت میں چھ لاکھ ستر ہزار تھی (یہ اسرائیلی روایات ہیں جن میں مبالغہ ہوسکتا ہے لیکن اتنی بات قرآن کریم کے اشارات اور روایات حدیث سے ثابت ہے کہ ان کے بارہ قبیلے تھے اور ہر قبیلے کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ بھی قدرت حق تعالیٰ کا ایک عظیم مشاہدہ تھا کہ جب یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر آئے تو بارہ بھائی تھے، اب بارہ بھائیوں کے بارہ قبیلوں کی اتنی عظیم الشان تعداد مصر سے نکلی جو چھ لاکھ سے زائد بتلائی جاتی ہے۔ فرعون کو جب ان کے نکل جانے کی اطلاع ملی تو اپنی فوجیں جمع کیں جن میں ستر ہزار سیاہ گھوڑے تھے اور لشکر کے مقدمہ میں سات لاکھ سوار تھے۔ جب پیچھے سے اس فوجی سیلاب کو اور آگے دریائے قلزم کو بنی اسرائیل نے دیکھا تو گھبرا اٹھے اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی انا لمدر کون، کہ ہم تو پکڑ لئے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ، کہ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے راستہ دے گا، پھر بحکم ربانی دریا پر لاٹھی ماری اور اس میں بارہ سڑکیں خشک نکل آئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ان سے گزر گئے۔ جس وقت فرعون اور اس کا لشکر یہاں پہنچا تو لشکر فرعون یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر سہم گیا کہ ان کے لئے دریا میں کس طرح راستے بن گئے مگر فرعون نے ان کو کہا کہ یہ سب کرشمہ میری ہیبت کا ہے جس سے دریا کی روانگی رک کر راستے بن گئے ہیں یہ کہہ کر فوراً آگے بڑھ کر اپنا گھوڑا دریا کے اس راستہ میں ڈال دیا اور سب لشکر کو پیچھے آنے کا حکم دیا۔ جس وقت فرعون مع اپنے تمام لشکر کے ان دریائی راستوں کے اندر سما چکے اسی وقت حق تعالیٰ نے دریا کو روانی کا حکم دے دیا اور دریا کے سب حصے مل گئے فَغَشِیَھُمْ مِنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَھُمْ کا یہی حاصل ہے (روح المعانی)

کوہ طور کے پاس ٹھہرنے کا حکم

فرعون سے نجات اور دریا سے پار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ان کے واسطے سے تمام بنی اسرائیل سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ کوہِ طور کی داہنی

جانب چلے آئیں تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی جائے اور بنی اسرائیل خود بھی ان کے شرف ہمکلامی کا مشاہدہ کرلیں۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل عبور دریا کے بعد آگے بڑھے اور ایک مقدس شہر میں داخل ہونے کا ان کو حکم ملا۔ انہوں نے خلاف ورزی کی، اس کی یہ سزا دی گئی کہ اسی وادی میں جس کو وادیٔ تیہ کہتے ہیں قید کردیئے گئے۔ یہاں سے چالیس سال تک باہر نہ نکل سکے۔ اس سزا کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے ان پر اس قید کے زمانے میں بھی طرح طرح کے انعامات ہوتے رہے انہیں میں سے من وسلوی کا انعام تھا جو ان کی غذا کے لئے دیا جاتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنا کر کتاب لینے جانا

قرآن کریم میں ہے کہ اور (جب بنی اسرائیل سب پریشانیوں سے مطمئن ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم کو کوئی شریعت ملے تو اس پر اطمینان کے ساتھ عمل کریں، موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی، حق تعالیٰ اس کا قصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ طور پر آکر اعتکاف کریں تو آپ کو شریعت اور کتاب تورات دی جائے گی) اور دس راتیں مزید ان تیس راتوں کا تتمہ بنا دیا (یعنی تورات دے کر ان میں دس راتیں عبادت کیلئے اور بڑھا دیں جس کی وجہ سورۃ بقرہ میں مذکور ہو چکی ہے) اس طرح ان کے پروردگار کا (مقرر کیا ہوا) وقت (سب مل کر) پوری چالیس راتیں ہو گیا اور موسیٰ (علیہ السلام کوہ طور آنے لگے تو چلتے وقت) اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہہ دیا تھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل نہ کرنا۔ (اعراف: ۱۴۲)

کتاب ملنے کی شرط

غرق فرعون اور بنی اسرائیل کے مطمئن ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ

علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم مطمئن ہیں، اب ہمیں کوئی کتاب اور شریعت ملے تو ہم بے فکری کے ساتھ اس پر عمل کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے دعا کی، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنا کلام نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کیلئے یہ شرط لگائی کہ تیس راتیں کوہ طور پر اعتکاف اور ذکر اللہ میں گزار دیں اور پھر ان تیس پر اور دس راتوں کا اضافہ کر کے چالیس کر دیا۔ اس میں چند چیزیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہی یہ تھا کہ اعتکاف چالیس راتوں کا کرایا جائے تو پہلے تیس اور بعد میں دس کا اضافہ کر کے چالیس کرنے میں کیا حکمت تھی، پہلے ہی چالیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دے دیا جاتا تو کیا حرج تھا، سو اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ تو کون کر سکتا ہے، بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ اس میں ایک حکمت تدریج اور آہستگی کی ہے کہ کوئی کام کسی کے ذمہ لگایا جائے تو اول ہی زیادہ مقدار کام کی اس پر نہ ڈالی جائے تا کہ وہ آسانی سے برداشت کرے پھر مزید کام دیا جائے۔ اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس طرز میں حکام اور اولوالامر کو اس کی تعلیم دینا ہے کہ اگر کسی کو کوئی کام ایک معین وقت میں پورا کرنے کا حکم دیا جائے اور اس معین میعاد میں وہ پورا نہ کر سکے تو اس کو مزید مہلت دی جائے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پیش آیا کہ تیس راتیں پوری کرنے کے بعد جس کیفیت کا حاصل ہونا مطلوب تھا وہ پوری نہ ہوئی اس لئے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا کیونکہ ان دس راتوں کے اضافہ کا جو واقعہ مفسرین نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس راتوں کے اعتکاف میں موسیٰ علیہ السلام نے حسب قاعدہ تیس روزے بھی مسلسل رکھے بیچ میں افطار نہیں کیا، تیسواں روزہ پورہ کرنے کے بعد افطار کر کے مقررہ مقام طور پر حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ روزہ دار کے منہ سے جو ایک خاص قسم کی رائحہ معدہ کی تبخیر سے پیدا ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، آپ نے افطار کے بعد مسواک کر کے اس رائحہ کو زائل کر دیا، اس لئے مزید دس روزے اور رکھئے تا کہ وہ رائحہ پھر پیدا ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت ہارون علیہ السلام کو ہدایات

موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے وقت ان کو چند ہدایات دیں اس سے معلوم ہوا کہ جس کو قائم مقام بنایا جائے اس کی سہولت کار کیلئے ضروری ہدایات دے کر جائے ان ہدایات میں پہلی ہدایت یہ ہے کہ اصلح اس میں اصلح کا مفہوم ذکر نہیں فرمایا کہ کس کی اصلاح کرو، اس سے اشارہ اس عموم کی طرف ہے کہ اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنی قوم کی بھی، یعنی جب ان میں کوئی بات فساد کی محسوس کرو تو ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرو، دوسری ہدایت یہ دی کہ

فساد کرنے والوں کے راستہ کا اتباع نہ کرو، ظاہر ہے کہ ہارون علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، ان سے فساد میں مبتلا ہونے کا تو خطرہ نہ تھا اس لئے اس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ مفسدین کی مدد یا ہمت افزائی کا کوئی کام نہ کرو۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب قوم کو دیکھا کہ سامری کے پیچھے چلنے لگے یہاں تک کہ اس کے کہنے سے گوسالہ پرستی شروع کر دی تو قوم کو اس بے ہودگی سے روکا اور سامری کو ڈانٹا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپسی کے بعد جب یہ خیال کیا کہ ہارون علیہ السلام نے میرے پیچھے اپنے فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی تو ان سے مواخذہ فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو بدنظمی اور بے فکری ہی کو سب سے بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے کلام، تجلی الٰہی اور احکام کا ملنا

آیت ۱۴۳ تا ۱۴۵ میں ہے کہ اور جب موسیٰ (علیہ السلام اس واقعہ میں) ہمارے وقت (موعود) پر آئے (تھے جس کا قصہ بیان ہو رہا ہے) اور ان کے رب نے ان سے بہت سی لطف و عنایت کی) باتیں کیں تو (شدت انبساط سے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے (کیونکہ یہ آنکھیں تاب جمال نہیں لا سکتیں، کما فی المشکوٰة عن مسلم لاحرقت سبحات وجهه) لیکن (تمہاری تشفی کیلئے یہ

تجویز کرتے ہیں کہ) تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو (ہم اس پر ایک جھلک ڈالتے ہیں) سو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو (خیر) تم بھی دیکھ سکو گے (غرض موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف دیکھنے لگے) پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس (پہاڑ) کے پرخچے اڑا دیئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب افاقہ میں آئے تو عرض کیا بے شک آپ کی ذات (ان آنکھوں کی برداشت سے) منزہ (اور بلند) ہے میں آپ کی جناب میں (اس مشتاقانہ درخواست سے) معذرت کرتا ہوں اور (جو کچھ حضور کا ارشاد ہے کہ لن ترانی) سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! (یہی بہت ہے کہ) میں نے (تم کو) اپنی (طرف سے) پیغمبری (کا عہدہ دے کر) اور اپنے (ساتھ) ہم کلامی (کا شرف بخش کر اس) سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو (اب) جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے (رسالت و ہم کلامی و توریت) اس کو لو اور شکر کرو اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (احکام ضروریہ کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی (یہی تختیاں تورات ہیں، پھر حکم ہوا کہ جب یہ تختیاں ہم نے دی ہیں) تو ان کو کوششوں کے ساتھ (خود بھی) عمل میں لاؤ اور اپنی قوم کو (بھی) حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر (یعنی سب پر کہ سب ہی اچھے ہیں) عمل کریں میں اب بہت جلد تم لوگوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) ان بے حکموں کا (یعنی فرعونیوں کا یا عمالقہ کا) مقام دکھلاتا ہوں (اس میں بشارت اور وعدہ ہے کہ مصر یا شام پر عنقریب تسلط ہوا چاہتا ہے، مقصود اس سے ترغیب دینا ہے اطاعت کی کہ اطاعت احکام الٰہیہ کے یہ برکات ہیں)

دیدار الٰہی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد (آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے) اس میں اشارہ ہے کہ رؤیت ناممکن نہیں مگر مخاطب بحالت موجودہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اگر رؤیت ممکن ہی نہ ہوتی تو لن ترانی کے بجائے لن ارى کہا جاتا کہ میری رؤیت نہیں ہو سکتی (مظہری)

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہو گیا اور یہی مذہب ہے جمہور اہل سنت کا کہ دنیا میں اللہ

تعالیٰ کی رؤیت عقلاً ممکن ہے مگر شرعاً ممتنع، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا

قرآن کریم میں جو ہے کہ پہاڑ کی طرف دیکھو اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ بحالت موجودہ مخاطب رؤیت الٰہی کو برداشت نہیں کرسکتا اس لئے پہاڑ پر ادنیٰ سی جھلک ڈال کر بتلا دیا گیا کہ وہ بھی برداشت نہیں کرسکتا، انسان تو ضعیف الخلقت ہے وہ کیسے برداشت کرے۔

اللہ تعالیٰ کی تجلی

تجلی کے معنی عربی لغت میں ظاہر اور منکشف ہونے کے ہیں اور صوفیہ کرام کے نزدیک تجلی کے معنی کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں، جیسے کوئی چیز بواسطہ آئینہ کے دیکھی جائے، اسی لئے تجلی کو رؤیت نہیں کہہ سکتے، خود اسی آیت میں اس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت کی تو نفی فرمائی اور تجلی کا اثبات۔ امام احمد، ترمذی، حاکم نے بروایت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے اور اس کی سند کو ترمذی وحاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر ہاتھ کی چھوٹی انگلی (خنصر) کے سرے پر انگوٹھا رکھ کر اشارہ فرمایا کہ اللہ جل شانہ، کے نور کا صرف اتنا سا حصہ ظاہر کیا گیا تھا جس سے پہاڑ کے ٹکڑے اڑ گئے، یہ ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کے ٹکڑے ہو گئے ہوں بلکہ جس حصہ پر حق تعالیٰ نے یہ تجلی فرمائی وہ حصہ ہی اس سے متاثر ہوا ہو۔

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام

اتنی بات تو قرآن کے واضح الفاظ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام فرمایا، پھر اس کلام میں بھی ایک تو وہ ہے جو اول عطاء نبوت کے وقت ہوا تھا، دوسرا کلام یہ ہے کہ جو عطاء تورات کے وقت ہوا اور جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ آیت کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دوسرے کلام کو بہ نسبت پہلے کے کچھ مزید خصوصیت حاصل تھی، لیکن حقیقت اس کلام کی کیا اور کس طرح تھی اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا، اس میں جتنے احتمالات عقلیہ ایسے ہوں جو شریعت کے کسی حکم کے

خلاف نہ ہوں سب کی گنجائش ضرور ہے مگر ان احتمالات میں کسی ایک کو متعین کرنا بلا دلیل درست نہیں، اور سلف صالحین صحابہ و تابعین ہی کا مسلک اس معاملہ میں اسلم ہے کہ اس معاملہ کو حوالۂ خدا کیا جائے احتمالات نکالنے کی فکر میں نہ پڑیں (بیان القرآن)

سامری کا مجسمہ بنانا

جب موسیٰ علیہ السلام تورات حاصل کرنے کیلئے کوہ طور پر معتکف ہوئے اور شروع میں تیس دن رات کے اعتکاف کا حکم تھا اور اس کے مطابق اپنی قوم سے کہہ گئے تھے کہ تیس دن بعد لوٹیں گے، وہاں حق تعالیٰ نے اس پر دس روز کی میعاد اور بڑھا دی تو اسرائیلی قوم جس کی جلد بازی اور کجروی پہلے سے معروف تھی، اس وقت بھی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے، ان کی قوم میں ایک شخص سامری نام کا تھا، جو اپنی قوم میں بڑا اور چودھری مانا جاتا تھا، مگر کچے عقیدہ کا آدمی تھا اس نے موقع پا کر یہ حرکت کی کہ بنی اسرائیل کے پاس کچھ زیورات قوم فرعون کے لوگوں کے رہ گئے تھے ان سے کہا کہ یہ زیورات تم نے قبطی لوگوں سے مستعار طور پر لیے تھے اب وہ سب غرق ہو گئے اور زیورات تمہارے پاس رہ گئے، یہ تمہارے لئے حلال نہیں، کیونکہ کفار سے جنگ کے وقت حاصل شدہ مال غنیمت بھی اس زمانہ میں مسلمانوں کیلئے حلال نہیں تھا، بنی اسرائیل نے اس کے کہنے کے مطابق سب زیورات لا کر اس کے پاس جمع کر دیئے، اس نے اس سونے چاندی سے ایک بچھڑے یا گائے کا مجسمہ بنایا اور جبریل امین کے گھوڑے کے سم کے نیچے کی مٹی جو اس نے کہیں پہلے سے جمع کر رکھی تھی، اس مٹی میں اللہ تعالیٰ نے حیات و زندگی کا خاصہ رکھا تھا، اس نے سونا چاندی آگ پر پگھلانے کے وقت یہ مٹی اس میں شامل کر دی اس کا یہ اثر ہوا کہ اس گائے کے مجسمہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کے اندر سے گائے کی سی آواز نکلنے لگی۔
سامری کی یہ حیرت انگیز شیطانی ایجاد سامنے آئی تو اس نے بنی اسرائیل کو اس کفر کی دعوت دینا شروع کر دی کہ یہی خدا ہے، موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کیلئے کوہ طور پر گئے ہیں اور اللہ میاں (معاذ اللہ) خود یہاں آ گئے موسیٰ علیہ السلام سے بھول ہو گئی بنی

اسرائیل میں اس کی بات پہلے سے مانی جاتی تھی اور اس وقت تو یہ شعبدہ اس نے دکھلا دیا تو اور بھی معتقد ہو گئے اور اسی گائے کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت میں لگ گئے۔

سامری کون تھا؟

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ آل فرعون کا قبطی آدمی تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے پڑوس میں رہتا تھا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور جب بنی اسرائیل کو لے کر موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو یہ بھی ساتھ ہو لیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے ایک قبیلہ سامرہ کا رئیس تھا اور قبیلہ سامرہ ملک شام میں معروف ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ یہ فارسی شخص کرمان کا رہنے والا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسی قوم کا آدمی تھا جو گائے کی پرستش کرنے والی تھی یہ کسی طرح مصر پہنچ گیا اور بظاہر دین بنی اسرائیل میں داخل ہو گیا مگر اس کے دل میں نفاق تھا (قرطبی) حاشیہ قرطبی میں ہے کہ یہ شخص ہندوستان کا ہندو تھا جو گائے کی عبادت کرتے ہیں۔ انتہیٰ، موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ گیا یا پہلے ہی سے منافقانہ طور پر ایمان کا اظہار کیا واللہ اعلم۔

مشہور یہ ہے کہ سامری کا نام موسیٰ ابن ظفر تھا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ سامری پیدا ہوا تو فرعون کی طرف سے تمام اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا حکم جاری تھا اس کی والدہ کو خوف ہوا کہ فرعونی سپاہی اس کو قتل کر دیں گے تو بچہ کو اپنے سامنے قتل ہوتا دیکھنے کی مصیبت سے یہ بہتر سمجھا کہ اس کو جنگل کے ایک غار میں رکھ کر اوپر سے بند کر دیا (کبھی کبھی اس کی خبر گیری کرتی ہوگی) ادھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو اس کی حفاظت اور غذا دینے پر مامور کر دیا وہ اپنی ایک انگلی پر شہد ایک پر مکھن ایک پر دودھ لاتے اور اس بچہ کو چٹا دیتے تھے یہاں تک کہ یہ غار ہی میں پل کر بڑا ہو گیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ کفر میں مبتلا ہوا اور بنی اسرائیل کو مبتلا کیا پھر قہر الٰہی میں گرفتار ہوا۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے دو شعروں میں اس طرح ضبط کیا ہے (از روح المعانی)

اذا المرء لم یخلق سعیدا تحیرت　　عقول مربیه وخاب المؤمل
فموسی الذی رباه جبریل کافر　　وموسی الذی رباه فرعون مرسل

(ترجمہ) جب کوئی شخص اصل پیدائش میں نیک بخت نہ ہو تو اس کے پرورش کرنے والوں کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں اور اس سے امید کرنے والا محروم ہو جاتا ہے۔ دیکھو جس موسیٰ کو جبرئیل امین نے پالا تھا وہ تو کافر ہو گیا اور جس موسیٰ کو فرعون لعین نے پالا تھا وہ خدا کا رسول بن گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم سے خطاب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رنج و غم کے عالم میں واپس آ کر قوم سے خطاب کیا اور پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کا وعدہ یاد دلایا جس کے لئے وہ سب قوم کو لے کر طور کی جانب ایمن کی طرف چلے تھے کہ یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ہدایت عطا فرمائیں گے اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے تمام مقاصد تمہارے پورے ہوں گے۔ اور فرمایا کہ اللہ کے اس وعدہ پر کوئی بڑی مدت بھی تو نہیں گزری جس میں تمہارے بھول جانے کا احتمال ہو کہ وعدہ کا انتظار زمانہ دراز تک کرنے کے بعد مایوس ہو گئے اس لئے دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔ اور فرمایا کہ بھول جانے یا انتظار سے تھک جانے کا تو کوئی احتمال نہیں تو اب اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ تم نے خود ہی اپنے قصد و اختیار سے اپنے رب کے غضب کو دعوت دی۔

قوم کا جواب

قوم والوں نے کہا ہم نے گوسالہ کی پرستش پر اقدام اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ سامری کے عمل کو دیکھ کر ہم مجبور ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے۔ سامری یا اس کے عمل نے ان کو مجبور تو نہیں کر دیا تھا خود ہی غور و فکر سے کام نہ لیا تو مبتلا ہو گئے۔

اور کہنے لگے کہ ہمیں قوم فرعون کے زیوروں کے سبب اس گناہ میں مبتلا کیا گیا بنی اسرائیل کے لوگوں کے پاس فرعونیوں کے زیورات وغیرہ تھے جو انہوں نے عید کے موقع پر ان سے عاریتہً لئے تھے۔ انہیں زیورات کو آگ میں جلایا گیا اور سامری نے اسی سے بچھڑا بنایا اب انہیں کے بارے میں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ یعنی ہم نے ان زیورات کو پھینک دیا۔ حدیث فتون کی رو سے یہ عمل حضرت ہارون علیہ السلام کے حکم سے کیا گیا اور بعض روایات میں ہے کہ سامری نے ان کو بہکا کر زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور

دونوں باتیں جمع ہو جائیں یہ بھی کوئی مستبعد نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے سب زیورات گڑھے میں ڈلوادیئے اور اس میں آگ جلوادی کہ سب زیورات پگھل کر یک جسم ہو جائیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد اس کا معاملہ طے کیا جاوے گا کہ کیا کیا جائے۔ جب سب لوگ اپنے اپنے زیورات اس میں ڈال چکے تو سامری بھی مٹھی بند کئے ہوئے پہنچا اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں بھی ڈال دوں۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی زیور ہوگا، فرمایا کہ ڈال دو۔ اس وقت سامری نے ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں جب ڈالوں گا کہ آپ یہ دعا کریں کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ پورا ہو جائے۔ ہارون علیہ السلام کو اس کا نفاق و کفر معلوم نہیں تھا دعا کر دی۔ اب جو اس نے اپنے ہاتھ سے ڈالا تو زیور کے بجائے مٹی تھی جس کو اس نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے کہیں یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھ کر اٹھا لیا تھا کہ جس جگہ اسکا قدم پڑتا ہے وہیں مٹی میں نشو ونما اور آثارِ حیات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے اس نے سمجھا کہ اس مٹی میں آثار حیات رکھے ہوئے ہیں، شیطان نے اس کو اس پر آمادہ کر دیا کہ یہ اس کے ذریعہ ایک بچھڑا زندہ کر کے دکھلا دے۔ بہر حال اس مٹی کا ذاتی اثر ہو یا حضرت ہارون علیہ السلام کی دعا کا کہ یہ سونے چاندی کا پگھلا ہوا ذخیرہ اس مٹی کے ڈالنے اور ہارون علیہ السلام کی دعا کرنے کے ساتھ ایک زندہ بچھڑا بن کر بولنے لگا جن روایات میں ہے کہ سامری ہی نے بنی اسرائیل کو زیورات اس گڑھے میں ڈالنے کا مشورہ دیا تھا ان میں یہ بھی ہے کہ اس نے زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی مورت تیار کر لی تھی مگر اس میں کوئی زندگی نہیں تھی۔ پھر یہ جبرئیل امین کے نشان قدم کی مٹی ڈالنے کے بعد اس میں حیات پیدا ہوگئی (یہ سب روایات تفسیر قرطبی وغیرہ میں مذکور ہیں اور ظاہر ہے کہ اسرائیلی روایات ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا مگر ان کو غلط کہنے کی بھی کوئی دلیل موجود نہیں)

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ یعنی نکال لیا سامری نے ان زیورات سے ایک بچھڑے کا جسم جس میں گائے کی آواز (خوار) تھی۔ لفظ جسدا سے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ محض ایک جسد اور جسم تھا زندگی اس میں نہیں تھی اور آواز بھی ایک خاص صفت کے سبب

اس سے نکلتی تھی، عامہ مفسرین کا قول وہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے کہ اس میں آثار زندگی کے تھے۔

سامری اور اس کے ساتھی یہ بچھڑا بولنے والا دیکھ کر دوسرے بنی اسرائیل سے کہنے لگے کہ یہی تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے موسیٰ علیہ السلام بھول بھٹک کر کہیں اور چلے گئے۔

حضرت ہارون کی نصیحت

بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹ پڑا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی خلافت اور نیابت کا حق ادا کر کے قوم کو سمجھایا مگر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ان میں تین فرقے ہو گئے ایک فرقہ تو حضرت ہارون کے ساتھ رہا ان کی اطاعت کی اس نے گوسالہ پرستی کو گمراہی سمجھا ان کی تعداد بارہ ہزار بتلائی گئی ہے، کذا فی القرطبی۔ باقی دو فرقے گوسالہ پرستی میں تو شریک ہو گئے فرق اتنا رہا کہ ان دونوں میں سے ایک فرقے نے یہ اقرار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آ کر اس سے منع کریں گے تو ہم گوسالہ پرستی کو چھوڑ دیں گے۔ دوسرا فرقہ اتنا پختہ تھا کہ اس کا یقین یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی واپس آ کر اسی کو معبود بنالیں گے اور ہمیں اس طریقے کو بہر حال چھوڑنا نہیں ہے۔ جب ان دونوں فرقوں کا یہ جواب حضرت ہارون نے سنا کہ ہم تو موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک گوسالہ ہی کی عبادت پر جمے رہیں گے تو حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ہم عقیدہ بارہ ہزار ساتھیوں کو لے کر ان سے الگ تو ہو گئے مگر رہنے سہنے وغیرہ کی جگہ وہی تھی اس میں ان کے ساتھ اشتراک رہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت ہارون پر ناراضگی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپس آکر اوّل تو بنی اسرائیل کو وہ خطاب کیا پھر اپنے خلیفہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر ان پر سخت غصہ اور ناراضی کا اظہار کیا ان کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے اور فرمایا کہ جب ان بنی اسرائیل کو آپ نے دیکھ لیا کہ کھلی گمراہی یعنی شرک و کفر میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئے تو تم نے میرا اتباع کیوں نہ کیا، میرے حکم کی خلاف ورزی کیوں کی۔

حضرت ہارون کا جواب

حضرت ہارون علیہ السلام نے اس معاملے کے باوجود ادب کی پوری رعایت کے ساتھ

موسیٰ علیہ السلام کو نرم کرنے کے لئے خطاب یبنؤم کے الفاظ سے کیا یعنی میری ماں کے بیٹے اس خطاب میں ایک خاص اشارہ سختی کا معاملہ نہ کرنے کی طرف تھا کہ میں آپ کا بھائی ہی تو ہوں کوئی مخالف تو نہیں اس لئے آپ میرا عذر سنیں۔ پھر عذر یہ بیان کیا کہ مجھے خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے پر آپکے آنے سے پہلے اقدام کیا یا ان کو چھوڑ کر خود بارہ ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کے پاس چلا گیا، تو بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا اور آپ نے جو چلتے وقت مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ میں اس اصلاح کا مقتضا یہ سمجھا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہونے دوں (ممکن ہے کہ آپ کے واپس آنے کے بعد یہ سب ہی سمجھ جائیں اور ایمان وتوحید پر واپس آ جائیں) اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ہارون علیہ السلام کے عذر میں یہ قول بھی ہے کہ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ یعنی قوم بنی اسرائیل نے مجھے ضعیف و کمزور سمجھا کیونکہ میرے ساتھی دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم تھے اس لئے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے۔

خلاصہ عذر کا یہ ہے کہ میں ان کی گمراہی کا ساتھی نہیں تھا جتنا سمجھانا اور ہدایت پر رکھنا میرے بس میں تھا وہ میں نے پورا کیا ان لوگوں نے میری بات نہ مانی اور میرے قتل کرنے کے درپے ہو گئے ایسی صورت میں ان سے مقاتلہ کرتا یا ان کو چھوڑ کر آپ کے پاس جانے کا ارادہ کرتا تو صرف یہ بارہ ہزار بنی اسرائیل میرے ساتھ ہوتے باقی سب مقاتلہ اور مقابلہ پر آ جاتے اور باہمی معرکہ گرم ہو جاتا میں نے اس سے بچنے کے لئے آپ کی واپسی تک کے لئے کچھ مسالمت کی صورت اختیار کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر سنا تو ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور اصل بانیٔ فساد سامری کی خبر لی۔ قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی رائے کو صحیح مان لیا یا محض ان کی خطا اجتہادی سمجھ کر چھوڑ دیا۔

دو پیغمبروں میں اختلاف رائے اور دونوں طرف صواب کے پہلو

اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اس حالت میں ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اس مشرک قوم کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے تھا ان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ جاتے جس سے انکے عمل سے مکمل بیزاری کا اظہار ہو جاتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور تفرقہ قائم ہو جائے گا اور چونکہ ان کی اصلاح کا یہ احتمال موجود تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد ان کے اثر سے پھر یہ سب ایمان اور توحید کی طرف لوٹ آویں اس لئے کچھ دنوں کے لئے ان کے ساتھ مساہلت اور مساکنت کو ان کی اصلاح کی توقع تک گوارا کیا جائے۔ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، ایمان و توحید پر لوگوں کو قائم کرنا تھا مگر ایک نے مفارقت اور مقاطعہ کو اس کی تدبیر سمجھا، دوسرے نے اصلاح حال کی امید تک ان کے ساتھ مساہلت اور نرمی کے معاملہ کو اس مقصد کے لئے نافع سمجھا۔ دونوں جانبین اہل عقل و فہم اور فکر و نظر کے لئے محل غور و فکر ہیں۔ کسی کو خطا کہنا آسان نہیں مجتہدین امت کے اجتہادی اختلافات عموماً اسی طرح کے ہوتے ہیں ان میں کسی کو گنہگار یا نافرمان نہیں کہا جا سکتا رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کے بال پکڑنے کا معاملہ تو یہ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے شدت و غضب کا اثر تھا کہ تحقیق حال سے پہلے انہوں نے ہارون علیہ السلام کو ایک واضح غلطی پر سمجھا اور جب ان کا عذر معلوم ہو گیا تو پھر اپنے لئے اور ان کے لئے دعا مغفرت فرمائی۔

سامری سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خطاب اور اس کا جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا تجھے کیا ہوا تو نے یہ حرکت کیوں کی تو سامری نے کہا میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی اس سے مراد جبرئیل امین ہیں اور ان کے دیکھنے کے واقعہ میں ایک روایت تو یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز سے دریائے قلزم میں خشک راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے اور فرعونی لشکر دریا میں داخل ہو رہا تھا تو جبرئیل امین گھوڑے پر سوار یہاں موجود تھے دوسری روایت یہ ہے کہ دریا سے پار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر آنے کی دعوت دینے کے لئے جبرئیل امین گھوڑے پر سوار تشریف لائے تھے ان کو سامری نے دیکھ لیا دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا اس کی وجہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سامری کی پرورش خود جبرئیل امین کے ذریعہ ہوئی تھی جس وقت اس کی ماں نے اس کو غار میں ڈال دیا تو جبرئیل امین روزانہ اس کو غذا دینے کے لئے آتے تھے اس کی وجہ سے

وہ ان سے مانوس تھا اور پہچانتا تھا دوسرے لوگ نہیں پہچان سکتے تھے۔ (بیان القرآن)

سامری کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈالی کی جبرئیل امین کے گھوڑے کا قدم جس جگہ پڑتا ہے وہاں کی مٹی میں حیات وزندگی کے خاص اثرات ہوں گے یہ مٹی اٹھالی جاوے اس نے نشانِ قدم کی مٹی اٹھالی، یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے القی فی روعه انه، لایلقیها علیٰ شیء فیقول کن کذاالاکان، یعنی سامری کے دل میں خود بخود یہ بات پیدا ہوئی کہ نشان قدم کی اس مٹی کو جس چیز پر ڈال کر یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز بن جا تو وہ وہی چیز بن جائے گی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سامری نے گھوڑے کے نشان قدم کا یہ اثر مشاہدہ کیا کہ جس جگہ قدم پڑتا وہیں سبزہ فوراً نمودار ہوجاتا تھا جس سے یہ استدلال کیا کہ اس مٹی میں آثار حیات ہیں، کذا فی الکمالین۔ اسی تفسیر کو روح المعانی میں صحابہ وتابعین اور جمہور مفسرین سے منقول کہا ہے اور اس میں آج کل ظاہر پرست لوگوں نے جو شبہات نکالے ہیں ان سب کا جواب دیا ہے۔ فجزاہُ اللہ خیر الجزاء (بیان القرآن)

پھر جب بنی اسرائیل کے جمع کئے زیورات سے اس نے ایک بچھڑے کی ہیئت بنالی تو اپنے گمان کے مطابق کہ اس مٹی میں آثار حیات ہیں جس چیز میں ڈالی جائے گی اس میں زندگی پیدا ہوجائے گی اس نے یہ مٹی اس بچھڑے کے اندر ڈال دی۔ بقدرت خداوندی اس میں حیات کے آثار پیدا ہوگئے اور بولنے لگا۔ اور حدیث فتون جو پہلے مفصل آچکی ہے اس میں یہ ہے کہ اس نے حضرت ہارون علیہ السلام سے دعا کرائی کہ میں اپنے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس کو ڈالتا ہوں شرط یہ ہے کہ آپ یہ دعا کردیں کہ جو میں چاہتا ہوں وہ ہوجاوے۔ حضرت ہارون اس کے نفاق اور گوسالہ پرستی سے واقف نہ تھے دعا کردی اور اس نے وہ خاک نشان قدم کی اس میں ڈال دی تو حضرت ہارون کی دعا سے اسمیں حیات کے آثار پیدا ہوگئے۔ ایک روایت کے حوالہ سے یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ سامری فارس یا ہندوستان کا باشندہ اس قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کرتی ہے، مصر پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا بعد میں پھر مرتد ہوگیا یا پہلے ہی ایمان کا اظہار منافقانہ کیا تھا پھر نفاق ظاہر ہوگیا۔ اس اظہار ایمان کا فائدہ اس کو یہ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دریا سے پار ہوگیا۔

سامری کی سزا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے لئے دنیا کی زندگی میں یہ سزا تجویز کی کہ سب لوگ اس سے مقاطعہ کریں کوئی اس کے پاس نہ جاوے اور اس کو بھی یہ حکم دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگائے اور زندگی بھر اسی طرح وحشی جانوروں کی طرح سب سے الگ رہے۔ یہ سزا ہو سکتا ہے کہ ایک قانون کی صورت میں ہو جس کی پابندی اس پر اور دوسرے سب بنی اسرائیل پر منجانب موسیٰ علیہ السلام لازم کردی گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قانونی حیثیت کی سزا سے آگے خود اس کی ذات میں بقدرت خداوندی کوئی ایسی بات پیدا کردی گئی ہو کہ نہ وہ دوسروں کو چھو سکے نہ کوئی دوسرا اس کو چھو سکے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے اس میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ہاتھ لگادے یا کوئی اس کو ہاتھ لگادے تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، **کذا فی المعالم**۔ اس ڈر کے مارے وہ سب سے الگ بھاگا پھرتا تھا اور جب کسی کو قریب آتا دیکھتا تو دور سے پکارتا تھا **لا مساس** یعنی کوئی مجھے نہ چھوئے۔

سامری کی سزا میں ایک لطیفہ

روح المعانی میں بحوالہ بحر محیط نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو قتل کردینے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی سخاوت اور لوگوں کی خدمت کرنے کی وجہ سے قتل کی سزا سے منع فرمادیا۔ (بیان القرآن)

بچھڑے کو جلانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم اس بچھڑے کو آگ میں جلائیں گے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا سونے چاندی کے زیورات سے گھڑا ہوا تھا تو اس کے آگ میں جلانے کی کیا صورت ہوگی سونا چاندی پگھلنے والی چیز ہے جلنے والی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اول تو خود اس میں اختلاف ہے کہ بچھڑے میں آثار حیات پیدا ہونے کے بعد بھی وہ چاندی سونے ہی کا رہا یا اس کی حقیقت تبدیل ہو کر گوشت اور خون بن گیا۔ اگر وہ گوشت اور لحم و دم بن گیا تھا تو ظاہر

ہے کہ اس کو جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ذبح کر کے جلا دیا جاوے گا اور اگر دوسرا قول لیا جاوے تو اس کے جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو سوہان سے ریت کر ذرہ ذرہ کر دیا جائے گا (کما فی الدر المنثور) یا کسی حیلہ، اکسیریہ سے جلا دیا جائے گا (کما فی روح المعانی) اور یہ بھی کوئی امر مستبعد نہیں کہ احراق اور جلانا بطور خرق عادت و معجزہ ہو واللہ اعلم (بیان القرآن)

شرک کرنے والوں کی توبہ، ستر آدمیوں کا انتخاب اور دعا

(پھر حق تعالیٰ نے ان گوسالہ پرستوں کے متعلق موسیٰ علیہ اسلام سے فرمایا کہ) جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے (اگر اب بھی توبہ نہ کریں گے تو) ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیاوی زندگی ہی میں پڑے گی اور (کچھ ان ہی کی تخصیص نہیں) ہم (تو) افتراء پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (کہ دنیا ہی میں مغضوب اور ذلیل ہو جاتے ہیں گو کسی عارض سے اس ذلت کا گاہے ظہور نہ ہو یا دیر میں ہو، چنانچہ سامری نے جو توبہ نہ کی، اس پر غضب اور ذلت کا نزول ہوا جس کا قصہ سورہ طٰہٰ میں ہے۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ الاٰية

اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کیے (مثلاً گوسالہ پرستی ان سے سرزد ہوگئی مگر) پھر وہ ان (گناہوں) کے (کرنے کے) بعد توبہ کرلیں اور (اس کفر کو چھوڑ کر) ایمان لے آئیں، تمہارا رب اس توبہ کے بعد (ان کے) گناہ کو معاف کر دینے والا (اور ان کے حال پر) رحمت کرنے والا ہے (گو تکمیل توبہ کیلئے فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا بھی حکم ہوا ہو کیونکہ اصل رحمت آخرت کی ہے چنانچہ تائبین کی خطا اسی طرح معاف ہوئی) اور جب (ہارون علیہ السلام کی یہ معذرت سن کر) موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا تو ان تختیوں کو اٹھا لیا اور ان (تختیوں) کے مضامین میں ان لوگوں کیلئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی (مراد احکام ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے موصوف بہدایت اور موعود برحمت ہوتا ہے) اور (جب گوسالہ کا قصہ تمام ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان سے تورات کے احکام سنائے، ان لوگوں کی عادت تھی ہی شبہات نکالنے کی، چنانچہ اس میں بھی شبہ نکالا کہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں تو یقین کیا جائے، آپ

نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، وہاں سے حکم ہوا کہ ان میں سے کچھ آدمی جن کو یہ لوگ معتبر سمجھتے ہوں منتخب کر کے ان کو کوہ طور پر لے آؤ ہم خود ان سے کہہ دیں گے کہ یہ ہمارے احکام ہیں اور اس لانے کے لئے ایک وقت معین کیا گیا چنانچہ) موسیٰ (علیہ السلام) نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقت معین (پر لانے) کے لئے منتخب کئے (چنانچہ وہاں پہنچ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو اس میں ایک شاخ نکالی اور کہنے لگے کہ خدا جانے کون بول رہا ہوگا ہم تو جب یقین لائیں کہ خدا تعالیٰ کو کھلم کھلا اپنی آنکھ سے دیکھ لیں

لقولہ تعالیٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً

خدا تعالیٰ نے اس گستاخی کی سزا دی نیچے سے زلزلہ شدید شروع ہوا اوپر سے ایسی کڑک بجلی ہوئی کہ سب وہاں ہی رہ گئے) سو جب ان کو زلزلہ (وغیرہ) نے آ پکڑا تو موسیٰ (علیہ السلام ڈرے کہ بنی اسرائیل جاہل اور بدگمان تو ہیں ہی، یوں سمجھیں گے کہ کہیں لے جا کر کسی طریق سے ان سب کا کام تمام کر دیا ہے گھبرا کر) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار (یہ تو مجھ کو یقین ہے کہ ان لوگوں کو محض سزا دینا منظور ہے خاص ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ) اگر آپ کو یہ منظور ہوتا تو آپ اس کے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتے (کیونکہ ان کا اس وقت ہلاک ہونا بنی اسرائیل کے ہاتھوں میرا ہلاک ہونا ہے سو اگر آپ کو یہ مقصود ہوتا تو آپ پہلے بھی ایسا کر سکتے تھے مگر جب ایسا نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ ان کو بھی ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے میری ہلاکت بھی ہے اور بدنامی کے ساتھ، آپ سے امید ہے کہ مجھ کو بدنام نہ کریں گے اور بھلا) کہیں آپ ہم میں کے چند بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دیں گے (کہ بے وقوفی تو کریں یہ لوگ کہ ایسی گستاخی کریں اور ساتھ میں بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ہلاک ہوں میں بھی، آپ سے امید ہے کہ آپ ایسا نہ کریں گے پس ثابت ہوا کہ) یہ واقعہ (رجفہ اور صاعقہ کا) محض آپ کی طرف سے ایک امتحان ہے (ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہی میں ڈال دیں (کہ حق تعالیٰ کی شکایت اور ناشکری کرنے لگے) اور جس کو آپ چاہیں ہدایت پر قائم رکھیں (کہ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے سو میں آپ کے فضل و کرم سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور)

آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ ہیں (سوان کی گستاخی بھی معاف کر دیجئے چنانچہ وہ لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے، سورۃ بقرہ میں تفصیل ملاحظہ ہو) اور (اس دعا کے ساتھ آپ نے تفصیل رحمت کیلئے یہ بھی دعا کی کہ) ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور (اسی طرح) آخرت میں بھی (کیونکہ) ہم آپ کی طرف (خلوص واطاعت کے ساتھ) رجوع کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی اور) فرمایا کہ (اے موسیٰ اول تو مطلقاً میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ) میں اپنا عذاب (اور غضب) تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں (گو مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر واقع نہیں کرتا بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر واقع کرتا ہوں جو غایت درجہ سرکش اور متمرد ہوتے ہیں) اور میری رحمت (ایسی عام ہے کہ) تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے (باوجودیکہ ان میں بہت سی مخلوق مثلاً سرکش ومعاند لوگ اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت غیر مستحقین کیلئے بھی عام ہے) تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام تو (کامل طور پر) ضرور ہی لکھوں گا جو کہ (اس کے حسب وعدہ مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ وہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (جو منجملہ اعمال قلب سے ہے) اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ اعمال جوارح سے ہے) اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (جو کہ عقائد میں سے ہے، تو ایسے لوگ تو پہلے سے مستحق رحمت ہیں گو آپ درخواست بھی نہ کرتے اور اب تو آپ درخواست بھی کر رہے ہیں ارحمنا واکتب لنا، پس ہم بشارت قبولیت کی دیتے ہیں کیونکہ آپ تو ایسے ہیں ہی اور آپ کی قوم میں بھی جو مورد رحمت بننا چاہے وہ ایسے ہی اوصاف اختیار کرے کہ مستحق ہو جائے۔

بچھڑے کو پوجنے والوں کا انجام

سامری اور اس کے ساتھیوں کو سالہ پرستی سے صحیح توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں ہی خوار و ذلیل کر دیا کہ اس کو موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دے دیا کہ وہ سب لوگوں سے الگ

ہے نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے نہ کوئی اس کو ہاتھ لگائے، چنانچہ وہ عمر بھر اسی طرح جانوروں کے ساتھ پھرتا رہا کوئی انسان اس کے پاس نہ آتا تھا۔

تفسیر قرطبی میں بروایت قتادہؓ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا (قرطبی) اور تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ خاصیت اس کی نسل میں بھی آج تک باقی ہے اور جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد اپنے اس جرم سے توبہ کر لی اور توبہ کیلئے جو کڑی شرط اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگائی گئی تھی کہ یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں تب ان کی توبہ قبول ہوگی، یہ لوگ حکم بجالائے تو موسیٰ علیہ السلام نے بحکم خداوندی ان کو بلایا کہ تم سب کی توبہ قبول ہو گئی، اس قتل عام میں جو لوگ مارے گئے وہ شہید ہوئے جو باقی رہے ان کی مغفرت ہو گئی، اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ جو لوگ برے اعمال کے مرتکب ہوں، خواہ کیسے ہی بڑے گناہ کفر و معصیت کے ہوں اگر وہ اس کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان کو درست کر لیں یعنی مقتضائے ایمان کے مطابق اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت سے معاف فرما دیں گے، اس لئے انسان کو چاہیے کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کی طرف رجوع کرے۔

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا تو تورات کی تختیاں جو جلدی سے رکھ دی تھیں پھر اٹھالیں، اور اس کے نسخہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کیلئے ہدایت اور رحمت تھی۔

ستر بنی اسرائیل کا انتخاب اور ان کی ہلاکت کا واقعہ

موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات لا کر بنی اسرائیل کو دی تو اپنی کجروی اور حیلہ جوئی کی وجہ سے کہنے لگے کہ ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، ممکن ہے آپ اپنی طرف سے لکھ لائے ہوں، ان کو اطمینان دلانے کیلئے موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ اس قوم کے منتخب آدمیوں کو آپ کوہ طور پر لے آئیں تو ہم ان کو بھی خود اپنا کلام سنا دیں گے جس سے ان کو یقین آ جائے، موسیٰ علیہ السلام نے ان

میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور کوہ طور پر لے گئے، حسب وعدہ انہوں نے اپنے کانوں اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا مگر جب یہ حجت بھی پوری ہوگئی تو کہنے لگے ہمیں کیا معلوم یہ آواز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یا کسی اور کی، ہم تو جب یقین کریں جب کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں، ان کا یہ سوال چونکہ ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی تھا، اس پر غضب الٰہی متوجہ ہوا، ان کے نیچے سے زلزلہ آیا اور اوپر سے بجلی کی کڑک آئی جس سے یہ بے ہوش ہو کر گر گئے اور بظاہر مردہ ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

بہر حال یہ لوگ ایسے ہو کر گر گئے جیسے مردے ہوتے ہیں خواہ حقیقۃً مر ہی گئے ہوں یا ظاہر میں مردہ نظر آتے ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا، اول تو اس لئے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے منتخب لوگ تھے، دوسرے اس لئے کہ اب اپنی قوم میں جا کر کیا جواب دیں گے وہ یہ تہمت لگائیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سب کو کہیں لے جا کر قتل کرا دیا ہے اور اس تہمت کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے، اس لئے اللہ جل شانہٗ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں جانتا ہوں کہ اس واقعہ سے آپ کا مقصود ان کو ہلاک کرنا نہیں کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو اب سے پہلے بہت سے واقعات تھے جن میں یہ ہلاک کئے جا سکتے تھے، فرعون کے ساتھ غرق کر دیئے جاتے یا گوسالہ پرستی کے وقت سب کے سامنے ہلاک کر دیئے جاتے اور آپ چاہتے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے مگر آپ نے یہ نہیں چاہا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی ان کا ہلاک کرنا مقصود نہیں بلکہ سزا دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ہم سب کو چند بیوقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کر دیں۔ اس جگہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا اس لئے ذکر کیا کہ ان ستر آدمیوں کی اس طرح غائبانہ ہلاکت کا نتیجہ یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کئے جائیں۔ پھر عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض آپ کا امتحان ہے جس کے ذریعہ آپ بعض لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت و ناشکری کرنے لگیں، اور بعض کو ہدایت پر قائم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، میں بھی آپ کے فضل

سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں، لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں ہم پر مغفرت اور رحمت فرمایئے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ معافی دینے والے ہیں اس لئے ان کی اس گستاخی کو بھی معاف کر دیجئے چنانچہ وہ سب لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ستر آدمی جن کا ذکر اس آیت میں ہے وہ نہیں جنہوں نے ارنا اللہ جھرۃ کی درخواست کی تھی اور اس پر صاعقہ کے ذریعہ ہلاک کئے گئے تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو خود تو گوسالہ پرستی میں شریک نہ تھے مگر قوم کو اس حرکت سے روکنے کی کوئی کوشش بھی نہ کی تھی اس کی سزا میں ان پر زلزلہ آیا اور بے ہوش ہو گئے، واللہ اعلم۔ بہرحال یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں یہ بھی کہا کہ

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ

یعنی اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے لئے اس دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور آخرت میں بھی، کیونکہ ہم آپ کی طرف خلوص و اطاعت سے رجوع کرتے ہیں۔

دعا کا جواب

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے موسیٰ اول تو میری رحمت مطلقاً میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ میں اپنا عذاب اور غضب تو صرف اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اگرچہ مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر عذاب واقع نہیں کرتا، بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر عذاب واقع کرتا ہوں جو انتہائی سرکش اور متمرد ہوتے ہیں، اور میری رحمت ایسی عام ہے کہ سب اشیاء کو محیط ہو رہی ہے باوجودیکہ ان میں سے بہت سے لوگ مثلاً سرکش اور نافرمان اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت سب غیر مستحقین کیلئے بھی عام ہے تو وہ رحمت ان لوگوں کیلئے تو کامل طور پر ضرور ہی لکھ دوں گا جو حسب وعدہ اس کے مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، تو یہ لوگ پہلے ہی سے مستحق رحمت ہیں اس لئے آپ کو قبول دعا کی بشارت دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا ان لوگوں کے حق میں بلا کسی شرط کے قبول کر لی گئی یعنی مغفرت و معافی کی بھی اور رحمت کی بھی۔

اور دوسری دعا جس میں دنیا و آخرت کی مکمل بھلائی ان کیلئے لکھ دینے کی درخواست تھی اس کے متعلق چند شرائط لگائی گئیں، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو ہر مومن و کافر پر رحمت عام ہو سکتی ہے مگر عالم آخرت اچھے برے کے امتیاز کا مقام ہے یہاں رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو چند شرائط کو پورا کریں، اول یہ کہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں، یعنی تمام واجبات شرعیہ کو ادا کریں اور ناجائز کاموں سے دور رہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ کے لئے زکوٰۃ نکالیں، تیسرے یہ کہ ہماری سب آیات پر بلا کسی استثناء اور تاویل کے ایمان لائیں، یہ موجودہ لوگ بھی اگر یہ صفات پوری اپنے اندر پیدا کر لیں تو ان کیلئے بھی دنیا و آخرت کی مکمل بھلائی لکھ دی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد کی آیت میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ ان صفات کو پوری جامعیت کے ساتھ حاصل کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بعد آخر زمانہ میں آئیں گے اور نبی امی کا اتباع کریں گے اور اس کے نتیجہ میں وہ مکمل فلاح کے مستحق ہوں گے۔

کوہ طور پر معلق کرنا

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا، (اور اس وقت کہا) کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ (البقرہ: ۶۳)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر توریت عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لا کر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو اوّل تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہے، تب مانیں گے، غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انہوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی

طرف سے) اتنی آمیزش بھی کردی کہ "اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ فرمادیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہوسکے کرنا جو نہ ہوسکے معاف ہے تو کچھ تو جبلی شرارت، کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر اُن کے سروں پر معلق کردو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چاروناچار ماننا پڑا۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان واسلام قبول کرلینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، اُن کے لئے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا اطاعت قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

وادی تیہ میں انعامات

وادی تیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملک شام میں عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہوگیا، فرعون جب غرق ہوگیا اور یہ لوگ مطمئن ہوگئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو، اور اپنی اصلی جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑالو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مصر سے چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عمالقہ کے زور وقوت کا حال معلوم ہوا تو ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف انکار کردیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کی چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں وپریشاں پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔

یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں وپریشاں اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو وادی تیہ کہا جاتا ہے، تیہ کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشان کے۔

یہ وادی تیہ ایک کھلا میدان تھا۔ نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جا سکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرمادیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کردیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو من وسلویٰ نازل فرمادیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بکثرت پیدا کردی، یہ لوگ اس کو جمع کرلیتے، اسی کو من کہا گیا ہے، یہ لوگ اور بٹیریں ان کے پاس جمع ہوجاتیں، ان سے بھاگتی نہ تھیں، یہ ان کو پکڑ لیتے، اور ذبح کرکے کھاتے، اسی کو سلویٰ کہا گیا ہے، دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بیٹروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب سے قرار دی گئیں، ان کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاٹھی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے، جیسا کے دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلہ کے درمیان قائم فرمادی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کردی کہ ان کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں، اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسی مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اور ان لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کرکے نہ رکھیں، مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہوگیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

بستی میں داخل ہونے کے حکم میں سرکشی اور عذاب

قرآن کریم میں ہے کہ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کہ اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے، اور (یہ بھی

حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو) دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کردیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں (سب کی) اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔ (البقرہ:۵۸)

بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ بھی زمانہ وادی تیہ کا ہے، کہ جب من و سلویٰ کھاتے کھاتے اُکتا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا، کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جاکر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخر ہوگیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور ان نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کردیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے، اور نہ کوئی اشکال۔

دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر سے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول اوّل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کرلینا مناسب ہے جو من وسلویٰ چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہوگا کہ یہ درخواست تھی تو گستاخی، لیکن خیر، اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو معاف کردیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی توبہ کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

اللہ کے حکم کو تبدیل کرنا

قرآن کریم میں ہے سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے

جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سماوی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔ (البقرہ-۵۹)

فائدہ

یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلاف یہ تھا کہ حطة بمعنی توبہ کی جگہ ازراہ تمسخر حبة فی شعیرة (یعنی غلہ درمیان جو کے) کہنا شروع کیا، وہ آفت سماوی طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمبر داروں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، (بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے)۔ (قرطبی)

پتھر سے پانی پھوٹنا

وادی تیہ میں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے، اوران کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جدا جُدا تھے، اس لئے چشمے بھی بارہ ہی نکلے۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہے، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعید از قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کردی ہو کہ اجزاء زمین سے پانی کو جذب کر لے اوراس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظیر بھی محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

استسقاء

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کردیا، کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چشمے اُبل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر اکتفا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا کبھی خاص نماز استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز استسقاء کے لئے عیدگاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر اکتفا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول فرمالیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

من وسلویٰ کا نزول

قرآن کریم میں ہے کہ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگا کرتی ہیں، ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جا کر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی

طرح) جم گئی اُن پر ذلت (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود اُن کی طبائع میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔ (البقرہ:۶۱)

وادی تیہ میں من و سلویٰ سے اکتا کر ان ترکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخل حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ، جوتو، کھاؤ کماؤ۔

شام کے جہاد کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا

جب فرعون اور اس کا لشکر غرق دریا ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات پا کر حکومت مصر کے مالک بن گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا مزید انعام اور اُن کے آبائی وطن ملک شام کو بھی اُن کے قبضہ میں واپس دلانے کے لئے بذریعہ موسیٰ علیہ السلام ان کو یہ حکم دیا کہ وہ جہاد کی نیت سے ارض مقدسہ یعنی ملک شام میں داخل ہوں۔ اور ساتھ ہی اُن کو یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اس جہاد میں فتح اُن کی ہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس زمین کو ان کے حصہ میں لکھ دیا ہے وہ ضرور اُن کو مل کر رہے گی۔ مگر بنی اسرائیل... اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انعامات، غرق فرعون اور فتح مصر وغیرہ کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لینے کے باوجود یہاں بھی عہد و میثاق پر پورے نہ اترے۔ اور جہاد شام کے اس حکم الٰہی کے خلاف ضد کر کے بیٹھ گئے۔ جس کی سزا اُن کو قدرت کی طرف سے اس طرح ملی کہ چالیس سال تک ایک محدود علاقہ میں محصور و مقید ہو کر رہ گئے کہ بظاہر نہ ان کے گرد کوئی حصار تھا، نہ اُن کے ہاتھ پاؤں کسی قید میں جکڑے ہوئے تھے۔ بلکہ کھلے میدان میں تھے۔ اور اپنے وطن مصر کی طرف واپس چلے جانے کے لئے ہر روز صبح سے شام تک سفر کرتے تھے۔ مگر شام کو پھر وہیں نظر آتے تھے جہاں سے صبح چلے تھے۔ اسی دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی وفات ہو گئی۔ اور یہ لوگ اسی طرح وادی تیہ میں حیران و پریشان پھرتے رہے۔ ان کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے دوسرے پیغمبران کی ہدایت کے لئے بھیجے۔

چالیس برس اسی طرح پورے ہونے کے بعد پھر ان کی باقی ماندہ نسل نے اس وقت کے پیغمبر کی قیادت میں جہاد شام و بیت المقدس کا عزم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہوا کہ یہ ارض مقدس تمہارے حصہ میں لکھدی گئی ہے۔

جہاد کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ ہدایت ملی کہ اپنی قوم کو بیت المقدس اور ملک شام فتح کرنے کے لئے جہاد کا حکم دیں تو انہوں نے پیغمبرانہ حکمت و موعظمت کے پیش نظر یہ حکم سنانے سے پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات یاد دلائے جو بنی اسرائیل پر اب تک ہو چکے تھے۔ ارشاد فرمایا:-

اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ

یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ فضل و انعام یاد کرو جو تم پر ہوا ہے کہ تمہاری قوم میں بہت سے انبیاء بھیجے اور تم کو صاحب ملک بنا دیا اور تمہیں وہ نعمتیں بخشیں جو دنیا جہان میں کسی کو نہیں ملیں۔

اس میں تین نعمتوں کا بیان ہے جن میں سے پہلی نعمت ایک روحانی اور معنوی نعمت ہے کہ ان کی قوم میں مسلسل انبیاء بکثرت بھیجے گئے۔ جس سے بڑھ کر اُخروی اور معنوی اعزاز کوئی نہیں ہو سکتا۔ تفسیر مظہر میں نقل کیا ہے کہ کسی قوم اور کسی امت میں انبیاء کی کثرت اتنی نہیں ہوئی کہ جتنی بنی اسرائیل میں ہوئی ہے۔

امام حدیث ابن ابی حاتم نے بروایت اعمش نقل کیا ہے کہ قوم بنی اسرائیل کے آخری دور میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہے۔ صرف اس دور میں ایک ہزار انبیاء بنی اسرائیل میں بھیجے گئے۔ دوسری نعمت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، وہ دنیوی اور ظاہری نعمت ہے کہ ان کو ملوک یعنی صاحب ملک و سلطنت بنا دیا گیا۔ اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل جو مدت سے فرعون اور قوم فرعون کے غلام بنے ہوئے دن رات اُن کے مظالم کا شکار رہتے تھے، آج اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو نیست و نابود کر کے ان کو ان کی حکومت و سلطنت کا مالک بنا دیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انبیاء کے معاملہ میں تو ارشاد ہوا کہ جعل فیکم انبیاء یعنی تمہاری قوم میں سے بہت سے لوگوں کو انبیاء بنا دیا

گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ پوری قوم انبیاء نہیں تھی۔ اور یہی حقیقت بھی ہے کہ انبیاء معدودے چند ہوتے ہیں اور پوری قوم اُن کی اُمت اور متبع ہوتی ہیں۔ اور جہاں دنیا کے ملک و سلطنت کا ذکر آیا تو وہاں فرمایا۔ و جعلکم ملوکا۔ یعنی بتادیا تم کو ملوک جس کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ تم سب کو ملوک بنادیا۔ لفظ ملوک ملک کی جمع ہے۔ جس کے معنی عرف عام میں بادشاہ کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پوری قوم نبی اور پیغمبر نہیں ہوتی، اسی طرح کسی ملک میں پوری قوم بادشاہ بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ قوم کا ایک فرد یا چند افراد حکمران ہوتے ہیں۔ باقی قوم اُن کے تابع ہوتی ہے۔ لیکن قرآنی الفاظ نے ان سب کو ملوک قرار دیا۔

اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جو بیان القرآن میں بعض اکابر کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے کہ عرف عام میں جس قوم کا بادشاہ ہوتا ہے اس کی سلطنت و حکومت کو اسی پوری قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جیسے اسلام کے قرونِ وسطی میں بنی اُمیہ اور بنی عباس کی حکومت کہلاتی تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں غزنوی اور غوریوں کی حکومت پھر مغلوں کی حکومت پھر انگریزوں کی حکومت پوری قوم کے افراد کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ اس لئے جس قوم کا ایک حکمران ہو وہ پوری قوم حکمران اور بادشاہ کہلاتی ہے۔

اس محاورہ کے مطابق پوری قوم بنی اسرائیل کو قرآن کریم نے ملوک قرار دیا۔ اسمیں اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ اسلامی حکومت درحقیقت عوامی حکومت ہوتی ہے۔ عوام ہی کو اپنا امیر و امام منتخب کرنے کا حق ہوتا ہے اور عوام ہی اپنی اجتماعی رائے سے اس کو معزول بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے صورۃً اگرچہ فرد واحد حکمران ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ حکومت عوام ہی کی ہوتی ہے۔

دوسری وجہ وہ ہے جو ابن کثیر اور تفسیر مظہری وغیرہ میں بعض سلف سے نقل کی ہیں کہ لفظ ملک بادشاہ کے مفہوم سے زیادہ عام ہے۔ ایسے شخص کو ملک کہدیا جاتا ہے۔ جو آسودہ حال ہو، مکان، جائداد، نوکر چاکر رکھتا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس وقت بنی اسرائیل سے ہر فرد ملک کا مصداق تھا۔ اس لئے ان سب کو ملوک فرمایا گیا۔

تیسری نعمت جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ وہ معنوی اور ظاہری دونوں قسم کی نعمتوں کا مجموعہ ہے کہ فرمایا۔ وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی تم کو وہ نعمتیں عطا

فرمائیں جو دنیا جہان میں کسی کو نہیں دی گئیں ان نعمتوں میں معنوی شرف اور نبوت ورسالت بھی داخل ہے، اور ظاہری حکومت وسلطنت اور مال ودولت بھی البتہ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ بنص قرآن اُمت محمد یہ ساری امتوں سے افضل ہے۔

ارشاد قرآنی۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ اس پر شاہد ہے اور حدیث نبوی کی بے شمار روایات اس کی تائید میں ہیں۔ جواب یہ کہ اس آیت میں دنیا کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کے موسوی عہد میں موجود تھے۔ کہ اس وقت پورے عالم میں کسی کو وہ نعمتیں نہیں دی گئی تھیں جو بنی اسرائیل کو ملی تھیں۔ آئندہ زمانہ میں کسی امت کو ان سے بھی زیادہ نعمتیں مل جائیں یہ اس کے منافی نہیں۔

سورۃ مائدہ میں ہے یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ یعنی اے میری قوم تم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ رکھی ہے۔

ارض مقدسہ میں داخلہ کا حکم

ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے اقوال بظاہر متعارض ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ بیت المقدس مراد ہے۔ بعض نے شہر قدس اور ایلیا کو ارض مقدسہ کا مصداق بتلایا ہے۔ بعض نے شہر اریحا کو جو نہر اردن اور بیت المقدس کے درمیان دنیا کا قدیم ترین شہر تھا اور آج تک موجود ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی عظمت ووسعت کے عجیب وغریب حالات نقل کئے جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ اس شہر کے ایک ہزار حصے (وارڈ) تھے۔ ہر حصہ میں ایک ایک ہزار باغ تھے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ارض مقدسہ سے مراد دمشق، فلسطین اور بعض کے نزدیک اردن ہے۔ اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ملک شام پورا ارض مقدس ہے۔ کعب احبار نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی کتاب (غالباً توراۃ) میں دیکھا ہے کہ ملک شام پوری زمین میں اللہ کا خاص خزانہ ہے۔ اور اس میں اللہ کے مخصوص مقبول بندے ہیں۔ اس زمین کو مقدس اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مستقر رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام لبنان کے پہاڑ پر چڑھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم یہاں سے آپ نظر ڈالو، جہاں تک آپ کی

نظر پہنچے گی ہم نے اس کو ارض مقدس بنا دیا۔ یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔ اور صاف بات یہ ہے کہ ان اقوال میں تعارض کچھ نہیں۔ پورا ملک شام آخری روایات کے مطابق ارض مقدس ہے۔ بیان کرنے میں بعض حضرات نے ملک شام کے کسی حصہ کو بیان کر دیا۔ کسی نے پورے کو۔

قوم کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب

پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بذریعہ موسیٰ علیہ السلام قوم عمالقہ سے جہاد کر کے ملک شام فتح کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی دی تھی کہ ملک شام کی زمین اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے لکھدی ہے۔ اس لئے اُن کی فتح یقینی ہے۔

پھر اس کا بیان ہے کہ اس کے باوجود بنی اسرائیل نے اپنی معروف سرکشی اور کج طبعی کی وجہ سے اس حکم کو بھی تسلیم نہ کیا۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ اس ملک پر تو بڑے زبردست قوی لوگوں کا قبضہ ہے۔ ہم تو اس زمین میں اس وقت تک داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں قابض ہیں۔ ہاں وہ کہیں اور چلے جاویں تو بیشک ہم وہاں جا سکتے ہیں۔

ملک شام پر قابض قوم

واقعہ اس کا جو ائمہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس اور عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ وغیرہ سے منقول ہے یہ ہے کہ اس وقت ملک شام اور بیت المقدس پر قوم عمالقہ کا قبضہ تھا۔ جو قوم عاد کی کوئی شاخ اور بڑے ڈیل ڈول اور ہیبتناک قد و قامت کے لوگ تھے، جن سے جہاد کر کے بیت المقدس فتح کرنے کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ملا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر ملک شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جانا بیت المقدس پر تھا۔ جب نہر اُردن سے پار ہو کر دنیا کے قدیم ترین شہر اریحا پر پہنچے، تو یہاں قیام فرمایا۔ اور بنی اسرائیل کے انتظام کیلئے بارہ سرداروں کا انتخاب کرنا قرآن کریم کی پچھلی آیات میں بیان ہو چکا ہے۔ ان سرداروں کو آگے بھیجا تا کہ وہ ان لوگوں کے حالات اور محاذ جنگ کی کیفیات معلوم کر کے آئیں جو بیت

المقدس پر قابض ہیں اور جن سے جہاد کرنے کا حکم ملا ہے۔ یہ حضرات بیت المقدس پہنچے تو شہر سے باہر ہی قوم عمالقہ کا کوئی آدمی مل گیا۔ اور وہ اکیلا ان سب کو گرفتار کر کے لے گیا۔ اور اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کیا کہ یہ لوگ ہم سے جنگ کرنے کے قصد سے آئے ہیں۔ شاہی دربار میں مشورہ ہوا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے یا کوئی دوسری سزا دی جائے۔ بالآخر رائے اس پر ٹھہری کہ ان کو آزاد کر دیں تا کہ یہ اپنی قوم میں جا کر عمالقہ کی قوت و شوکت کے ایسے عینی گواہ ثابت ہوں کہ کبھی اُن کی طرف رُخ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

بنی اسرائیل کی مرعوبیت

بہر حال بنی اسرائیل کے بارہ سردار عمالقہ کی قید سے رہا ہو کر اپنی قوم کے پاس مقام اریحا پر پہنچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس عجیب و غریب قوم اور اس کی ناقابل قیاس قوت و شوکت کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر تو ان سب باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فتح و کامیابی کی بشارت سنا دی تھی۔ بقول اکبر

مجھ کو بے دل کر دے ایسا کون ہے یا مجھ کو انتم الاعلون ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ان کی قوت و شوکت کا حال سن کر اپنی جگہ کوہ استقامت بنے ہوئے اقدام جہاد کی فکر میں لگے رہے۔ مگر خطرہ یہ ہو گیا کہ بنی اسرائیل کو اگر حریف مقابل کی اس بے پناہ طاقت کا علم ہو گیا تو یہ لوگ پھسل جائیں گے۔ اس لئے ان بارہ سرداروں کو ہدایت فرمائی کہ قوم عمالقہ کے یہ حالات بنی اسرائیل کو ہرگز نہ بتائیں، بلکہ راز رکھیں۔ مگر ہوا یہ کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دوستوں سے خفیہ طور پر اس کا تذکرہ کر دیا۔ صرف دو آدمی جن میں سے ایک کا نام یوشع بن نون اور دوسرے کا قالب بن یوقنا تھا۔ انہوں نے موسوی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔

اور (ظاہر ہے کہ بارہ میں سے جب دس نے راز فاش کر دیا) تو اس کا پھیل جانا قدرتی امر تھا۔ بنی اسرائیل میں جب ان حالات کی خبریں شائع ہونے لگیں تو لگے رونے، پیٹنے اور کہنے لگے کہ اس سے تو اچھا یہی تھا کہ قوم فرعون کی طرح ہم بھی غرق دریا ہو جاتے۔ وہاں

سے بچالا کر ہمیں یہاں مروایا جارہا ہے۔ انہیں حالات میں بنی اسرائیل نے یہ الفاظ کہے۔
اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑی زبردست قوم آباد ہے جن کا مقابلہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب تک وہ لوگ آباد ہیں موجود ہیں ہم وہاں جانے کا نام نہ لیں گے بنی اسرائیل کے دو بہادر متقی شخص۔ اگلی آیت میں ہے کہ دو شخص جو ڈرنے والے تھے اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا تھا انہوں نے بنی اسرائیل کی یہ گفتگو سن کر بطور نصیحت ان کو کہا کہ تم پہلے ہی کیوں ڈرے مرتے ہو، ذرا قدم اٹھا کر شہر بیت المقدس کے دروازہ تک تو چلو۔ ہمیں یقین ہے کہ تمہارا اتنا ہی عمل تمہاری فتح کا سبب بن جائے گا۔ اور دروازہ بیت المقدس میں داخل ہوتے ہی تم غالب ہو جاؤ گے۔ اور دشمن شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ یہ دو شخص جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک وہ ہی بارہ میں سے دو سردار ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر عمالقہ کا پورا حال بنی اسرائیل کو نہ بتایا تھا۔ یعنی یوشع بن نون، اور قالب بن یوقنا۔
قرآن کریم نے اس جگہ ان دونوں بزرگوں کی دو صفتیں خاص طور پر ذکر فرمائی ہیں۔ ایک الذین یخافون۔ یعنی یہ لوگ جو ڈرتے ہیں۔ اس میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس سے ڈرتے ہیں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ڈرنے کے لائق سارے عالم میں صرف ایک ہی ذات ہے۔ یعنی اللہ جل شانہ کیونکہ ساری کائنات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس کی مشیت واذن کے بغیر کوئی نہ کسی کو ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے نہ ادنیٰ نقصان اور جب ڈرنے کے لائق ایک ہی ذات ہے اور وہ متعین ہے تو پھر اس کے تعین کی ضرورت نہ رہی۔
دوسری صفت ان بزرگوں کی قرآن کریم نے یہ بتلائی کہ انعم اللہ علیہما یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس شخص میں جہاں کوئی خوبی اور بھلائی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا انعام وعطا ہے۔ ورنہ ان بارہ سرداروں میں قویٰ ظاہرہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان اور قوائے ظاہرہ و باطنہ اور عقل وہوش اور پھر حضرت موسی علیہ السلام کی صحبت ومعیت یہ ساری ہی چیزیں سبھی کو حاصل تھیں۔ اس کے باوجود اور سب پھسل گئے اور یہی دو اپنی جگہ جمے رہے تو معلوم ہوا کہ اصل ہدایت انسان کے قوائے ظاہرہ و باطنہ اس کی سعی وعمل کے تابع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ البتہ اس انعام کے لئے سعی وعمل شرط ضرور ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے عقل وہوش اور دانائی وہوشیاری عطا

فرمائی ہو وہ اپنی ان طاقتوں پر ناز نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے رشد و ہدایت طلب کرے عارف رومی نے خوب فرمایا ہے۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اپنی برادری کو یہ نصیحت فرمائی کہ عمالقہ کی ظاہری قوت و شوکت سے نہ گھبرائیں۔ اللہ پر توکل کر کے بیت المقدس کے دروازہ تک چلے چلیں تو فتح اور غلبہ ان کا ہے۔ ان بزرگوں کا یہ فیصلہ کہ دروازہ تک پہنچنے کے بعد ان کو غلبہ ضرور حاصل ہو جائے گا اور دشمن شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عمالقہ کے جائزہ لینے کی بنا پر ہو کہ وہ لوگ بڑے ڈیل ڈول اور طاقت و قوت کے باوجود دل کے کچے ہیں۔ جب حملہ کی خبر پائیں گے تو ٹھہر نہ سکیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فرمان الٰہی جو بطور بشارت فتح موسیٰ علیہ السلام سے سن چکے تھے۔ اس پر یقین کامل ہونے کی وجہ سے یہ فرمایا ہو۔

بنی اسرائیل کی ضد

مگر بنی اسرائیل نے جب اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کی بات نہ سنی تو ان دونوں بزرگوں کی کیا سنتے۔ پھر وہی جواب اور زیادہ بھونڈے انداز سے دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ یعنی آپ اور آپ کے اللہ میاں ہی جا کر اُن سے مقابلہ کر لیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ اگر استہزاء کے طور پر ہوتا تو صریح کفر تھا۔ اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے ساتھ رہنا۔ ان کے لئے میدان تیہ میں دعائیں کرنا۔ جس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ اس کا امکان نہ تھا۔

اس لئے ائمہ مفسرین نے اس کلمہ کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ آپ جائیے اور اُن سے مقابلہ کیجئے۔ آپ کا رب آپ کی مدد کرے گا۔ ہم تو مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ اس معنے کے اعتبار سے یہ کلمہ کفر کی حد سے نکل گیا۔ اگرچہ یہ جواب نہایت بھونڈا اور دل آزار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا۔

غزوۂ بدر میں نہتے اور بھوکے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک ہزار مسلح نوجوان کا لشکر آ کھڑا ہوا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر اپنے رب سے دعائیں فرمانے لگے۔ تو حضرت

مقداد بن اسود صحابی آگے بڑھے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم ہے ہم ہرگز وہ بات نہ کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔ کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ بلکہ ہم آپ کے دائیں اور بائیں سے اور سامنے سے اور پیچھے سے مدافعت کریں گے۔ آپ بے فکر ہو کر مقابلہ کی تیاری فرمائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بے حد مسرور ہوئے۔ اور صحابہ کرام میں بھی جوش جہاد کی ایک نئی لہر پیدا ہوگئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مقداد بن اسود کے اس کارنامہ پر مجھے بڑا رشک ہے۔ کاش یہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایسے نازک موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب دے کر اپنے سب عہد و میثاق توڑ ڈالے۔

قوم کی انتہائی بے وفائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتہائی عزم واستقلال: قوم بنی اسرائیل کے سابقہ حالات و واقعات اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملات کا جائزہ لینے والا اگر سرسری طور پر بھی اس کو سامنے رکھے کہ جو قوم بنی اسرائیل صدیوں سے فرعون کی غلامی میں طرح طرح کی ذلتیں اور عذاب برداشت کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی برکت سے ان کو خدائے عزوجل نے کہاں سے کہاں پہنچایا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ جل شانہ، کی قدرت کاملہ کے کیسے کیسے مظاہر آئے۔ فرعون اور قوم فرعون کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ہاتھوں اپنے قائم کئے ہوئے دربار میں شکست فاش ہوئی۔ جن ساحروں پر ان کا بھروسہ تھا۔ وہی اب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا دم بھرنے لگے۔ پھر اس خدائی کا دعویٰ کرنے والا فرعون اور شاہی محلات میں بسنے والے آل فرعون سے خدائے عزوجل کی قدرتِ قاہرہ نے کس طرح تمام محلات و مکانات اور ان کے ساز و سامان کو بیک وقت خالی کرالیا۔ اور کس طرح بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے اسے غرق دریا کر دیا۔ اور کس طرح معجزانہ طور پر بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔ اور کس طرح وہ دولت جس پر فرعون یہ کہہ کر فخر کیا کرتا تھا۔ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ۔ اللہ تعالیٰ نے پورا ملک اور اس کی پوری مِلک بغیر کسی قتل و قتال کے بنی اسرائیل کو عطا فرمادی۔

ان تمام واقعات میں اللہ جل شانہ کی قدرت قاہرہ کے مظاہر اس قوم کے سامنے آئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قوم کو اول غفلت و جہالت سے پھر فرعون کی غلامی سے نجات دلانے میں کیا کیا روح فرسا مصائب برداشت کیں، ان سب چیزوں کے بعد جب اسی قوم کو خدائی امداد و انعامات کے وعدوں کے ساتھ ملک شام پر جہاد کرنے کا حکم ملا تو ان لوگوں نے اپنی اس دناءت کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھے کہ ان حالات اور اس کے بعد قوم کی ان حرکات کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ مگر یہاں تو اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم رسول ہیں، کہ کوہ استقامت بنے ہوئے اپنی دھن میں لگے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

قوم کی مسلسل عہد شکنی اور وعدہ فراموشی سے عاجز آ کر اپنے رب کے سامنے صرف اتنا عرض کرتے ہیں۔ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ۔ یعنی مجھے تو اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔ قوم عمالقہ پر جہاد کی مہم کو کس طرح سر کیا جائے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے قوم بنی اسرائیل میں سے کم از کم دو سردار یوشع بن نون اور قالب بن یوقنا جنہوں نے پوری طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا ثبوت دیا تھا اور قوم کو سمجھانے اور صحیح راستہ پر لانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مسلسل کوشش کی تھی۔ اسوقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا بھی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ صرف اپنا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا۔ اس کا سبب وہی قوم بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی تھی کہ صرف حضرت ہارون علیہ السلام بوجہ نبی و پیغمبر ہونے کے معصوم تھے۔ اور ان کا طریق حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ باقی یہ دونوں سردار معصوم بھی نہ تھے۔ اس انتہائی غم و غصہ کے عالم میں صرف اس کا ذکر کیا جس کا حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ اس اظہار کے ساتھ کہ مجھے اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی۔ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ یعنی ہم دونوں اور ہماری قوم کے درمیان آپ ہی فیصلہ فرما دیجئے۔ اس دعا کا حاصل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق یہ تھا کہ یہ لوگ جس سزا کے مستحق ہیں ان کو وہ سزا دی

جائے اور ہم دونوں جس صورت حال کے مستحق ہیں ہم کو وہ عطا فرمایا جائے۔

وادی تیہ کی سزا

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ۔ یعنی ملک شام کی زمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام قرار دیدی گئی۔ اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جاسکیں گے۔ اور پھر یہ نہیں کہ ملک شام نہ جاسکیں گے۔ بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جاسکیں گے بلکہ اس میدان میں ان کو نظر بند کر دیا جائے گا۔

خدائے عزوجل کی سزاؤں کے لئے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں شرط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور آہنی دروازے۔ بلکہ جب وہ کسی کو محصور و نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کر سکتے ہیں۔ سبب ظاہر ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہو جاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین و مکان اس کے لئے جیلر بن جاتے ہیں۔

خاک و بادو آب و آتش بندہ اند   بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

چنانچہ یہ مختصر سا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان ہے جس کی پیمائش حضرت مقاتل کی تفسیر کے مطابق تیس فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ اگر تین میل کا قرار دیا جائے تو نوے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہو جاتا ہے، اور بعض روایات کے مطابق صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جس کی تعداد حضرت مقاتل کے بیان کے موافق چھ لاکھ نفوس تھی، اس مختصر سے کھلے میدانی رقبہ کے اندر اس طرح قید کر دیا کہ چالیس سال مسلسل اس تنگ و دو میں رہے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل کر مصر واپس چلے جائیں، یا آگے بڑھ کر بیت المقدس پر پہنچ جائیں، مگر ہوتا یہ تھا کہ سارے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھرا کر وہ اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں سے صبح چلے تھے۔

وادی تیہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برکات و معجزات

اس وادی تیہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اپنی قوم کے ساتھ تھے مگر یہ

وادی اُن کے لئے قید اور سزا تھی، اور ان دونوں حضرات کے لئے نعمائے الٰہیہ کا مظہر۔

یہی وجہ ہے کہ چالیس سالہ دور جو بنی اسرائیل پر معتوب ہونیکا گذرا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے انکو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی برکت سے طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، کھلے میدان کی دھوپ سے عاجز آئے تو موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اُن پر بادلوں کی چھتری لگادی، جس طرف یہ لوگ چلتے تھے بادل ان کیساتھ ساتھ سایہ فگن ہو کر چلتے تھے، پیاس اور پانی کی قلت کی شکایت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسا پتھر عطا فرمادیا کہ وہ ہر جگہ اُن کیساتھ ساتھ رہتا تھا، اور جب پانی کی ضرورت ہوتی تھی، تو موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا اُس پر مارتے تھے تو بارہ چشمے اس میں سے جاری ہو جاتے تھے، بھوک کی تکلیف پیش آئی تو آسمانی غذا من و سلویٰ اُن پر نازل کردی گئی، رات کو اندھیری کی شکایت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے روشنی کا ایک مینار ان کے لئے کھڑا کر دیا جس کی روشنی میں یہ سب کام کاج کرتے تھے۔

غرض اس میدان تیہ میں صرف معتوب لوگ ہی نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دو محبوب پیغمبر اور ان کے ساتھ دو مقبول بزرگ یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا بھی تھے، ان کے طفیل میں اس قید و سزا کے زمانے میں بھی یہ انعامات اُن پر ہوتے رہے، اور اللہ تعالیٰ رحیم الرحماء ہیں، ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ان افراد نے بھی ان حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے جرم سے توبہ کرلی ہو، اس کے بدلہ میں یہ انعامات ان کو مل رہے ہوں۔

بیل والا واقعہ

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو تو) تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ، جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں، (کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں) (البقرہ:۶۷)

یہ قصہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک خون ہو گیا تھا، جس کی وجہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی درخواست کی تھی، مگر

اس نے انکار کردیا، اور اس شخص نے اس کو قتل کردیا، قاتل لاپتہ تھا اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

اور معالم نے کلبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت تک توریت میں اس کے متعلق کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ نزول توریت سے قبل کا ہے۔

غرض بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چلے، آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کا حکم فرمایا، انہوں نے حسب عادت اور اپنی جبلت کے مطابق اس میں حجتیں نکالنا شروع کیں۔

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے (اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو نہ، بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، دونوں عمروں کے اوسط میں ہو اب (زیادہ حجت مت کیجیو، بلکہ) کرڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے، کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کردیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ (بھی) بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو، کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کردیجئے کہ (اوّل بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح) ہم سے بیان کردیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں، کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ (یہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا یا کوئی اور عجیب وغریب جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور ان شاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جاوینگے، موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب وغریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنویں میں جوڑا گیا ہو کہ) اُس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو، (یہ سنکر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اوصاف) بات فرمائی، (القصہ جانور تلاش کر کے خریدا) پھر اس کو ذبح کردیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔ (البقرہ ۶۸-۷۱)

حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیمت اُن کے ذمہ نہ ہوتیں جو بھی بقرہ ذبح کر دیا جاتا کافی ہو جاتا۔

قتل والا واقعہ

قرآن کریم میں ہے کہ ''اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر (اپنی براءت کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں کے مجرم ومشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو (چنانچہ چُھوانے سے وہ زندہ ہوگیا) آگے اللہ تعالیٰ بمقابلہ منکرین قیامت کے اس قصہ سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)'' (البقرہ:۲-۷۲-۷۳)

جب اس مردہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زندہ ہوگیا، اس نے قاتل کا نام بتایا اور پھر فوراً ہی مر گیا۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا، کہ یہ مقتول سچ بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں پر شبہ کرنا بھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی، یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے، اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطہ علمی میں آسکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں۔

کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ یہ واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے۔ اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم وسکوت کا ہے۔

حدیث الفتون

اس حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی مکمل تفصیلات حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔ہم نے مختلف پیروں پر عنوانات لگا کر قارئین کیلئے آسانی کی کوشش کی ہے درحقیقت یہ ایک مسلسل طول طویل مضمون ہے۔(مرتب)

حدیث الفتون کے نام سے طویل حدیث سنن نسائی کتاب التفسیر میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کی ہے اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی اسکو پورا نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت کو مرفوع یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان قرار دیا ہے اور ابن کثیر نے بھی حدیث کے مرفوع ہونے کی توثیق کے لئے فرمایا ہے کہ:

وصدق ذلک عندی، یعنی اس حدیث کا مرفوع ہونا میرے نزدیک درست ہے پھر اس کے لئے ایک دلیل بھی بیان فرمائی لیکن اسکے بعد یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں یہ روایت نقل کی ہے مگر وہ موقوف یعنی ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے، مرفوع حدیث کے جملے اسمیں کہیں کہیں آئے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ روایت کعب احبارؒ سے لی ہے جیسا کہ بہت سے مواقع میں ایسا ہوا ہے مگر ابن کثیر جیسے ناقد حدیث اور نسائی جیسے امام حدیث اس کو مرفوع مانتے ہیں اور جنہوں نے مرفوع تسلیم نہیں کیا وہ بھی اسکے مضمون پر کوئی نکیر نہیں کرتے اور اکثر حصہ اسکا تو خود قرآن کریم کی آیات میں آیا ہوا ہے اسلئے پوری حدیث کا ترجمہ لکھا جاتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تفصیلی قصے کے ضمن میں بہت سے علمی اور عملی فوائد بھی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پہلی آزمائش

بسند امام نسائی رحمہ اللہ قاسم بن ابی ایوب فرماتے ہیں کہ مجھے سعید بن جبیرؒ نے خبر دی کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی جو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آئی ہے یعنی وفتناک فتونا میں نے دریافت کیا کہ اس میں فتون سے کیا مراد ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسکا واقعہ بڑا طویل ہے صبح کو سویرے آجاؤ تو بتلا دینگے، جب اگلے دن صبح ہوئی تو میں سویرے ہی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تا کہ کل جو وعدہ فرمایا تھا اُس کو پورا کراؤں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سنو (ایک روز) فرعون اور اس کے ہمنشینوں میں اس بات کا ذکر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ انکی ذریت میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرماویں گے۔ بعض شرکاء مجلس نے کہا کہ ہاں بنی اسرائیل تو اسکے منتظر ہیں جس میں اُن کو ذرا شک نہیں کہ ان کے اندر کوئی نبی ورسول پیدا ہو گا اور پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی یوسف بن یعقوب علیہ السلام ہیں جب ان کی وفات ہو گئی تو کہنے لگے کہ ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا یہ اسکے مصداق نہیں (کوئی اور نبی ورسول پیدا ہو گا جو اس وعدہ کو پورا کریگا)۔ فرعون نے یہ سنا تو (اس کو فکر لاحق ہو گئی کہ اگر بنی اسرائیل میں جن کو اس نے غلام بنا رکھا تھا کوئی نبی ورسول پیدا ہو گیا تو وہ ان کو مجھ سے آزاد کرائے گا) اس لئے حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ اس آفت سے بچنے کا کیا راستہ ہے یہ لوگ آپس میں مشورے کرتے رہے اور انجام کار سب کی رائے اس پر متفق ہو گئی کہ (بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو ذبح کر دیا جائے اس کے لئے) ایسے سپاہی مقرر کر دیئے گئے جن کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں اور وہ بنی اسرائیل کے ایک ایک گھر میں جا کر دیکھتے تھے جہاں کوئی لڑکا نظر آیا اسکو ذبح کر دیا۔

کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد ان کو یہ ہوش آیا کہ ہماری سب خدمتیں اور محنت مشقت کے کام تو بنی اسرائیل ہی انجام دیتے ہیں اگر یہ سلسلہ قتل کا جاری رہا تو اُن کے بوڑھے تو اپنی موت مر جائیں گے اور بچے ذبح ہوتے رہے تو آئندہ بنی اسرائیل میں کوئی مرد نہ رہے گا جو ہماری خدمتیں انجام دے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ سارے مشقت کے کام ہمیں خود ہی کرنا پڑیں گے اسلئے اب یہ رائے ہوئی کہ ایک سال میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو چھوڑ دیا جائے، دوسرے سال میں پیدا ہونے والوں کو ذبح کر دیا جائے۔ اس طرح بنی اسرائیل میں کچھ جوان بھی رہیں گے جو اپنے بوڑھوں کی جگہ لے سکیں اور اُن کی تعداد

اتنی زیادہ بھی نہیں ہوگی جس سے فرعونی حکومت کو خطرہ ہو سکے۔ یہ بات سب کو پسند آئی اور یہی قانون نافذ کردیا گیا (اب حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا ظہور اس طرح ہوا کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایک حمل اسوقت ہوا جبکہ بچوں کو زندہ چھوڑ دینے کا سال تھا، اسمیں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوائے فرعونی قانون کی رو سے ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا اگلے سال جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اُسمیں حضرت موسیٰ حمل میں آئے تو اُن کی والدہ پر رنج وغم طاری تھا کہ اب یہ بچہ پیدا ہوگا تو قتل کردیا جائیگا۔ ابن عباسؓ نے قصہ کو یہاں تک پہنچا کر فرمایا کہ اے ابن جبیر فتون یعنی آزمائش کا یہ پہلا موقع ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ابھی دنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے انکی والدہ کو بذریعہ وحی الہام یہ تسلی دیدی کہ لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ یعنی تم کوئی خوف وغم نہ کرو (ہم اسکی حفاظت کریں گے اور کچھ دن جدا رہنے کے بعد) ہم انکو تمہارے پاس واپس کردیں گے پھر ان کو اپنے رسولوں میں داخل کرلیں گے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے تو اُن کی والدہ کو حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا (نیل) میں ڈالدو۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اس حکم کی تعمیل کردی۔ جب وہ تابوت کو دریا کے حوالہ کر چکیں تو شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ تو نے کیا کام کیا اگر بچہ تیرے پاس رہ کر ذبح بھی کردیا جاتا تو اپنے ہاتھوں سے کفن دفن کر کے کچھ تو تسلی ہوتی اب تو اسکو دریا کے جانور کھائیں گے (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی رنج وغم میں مبتلا تھیں کہ) دریا کی موجوں نے تابوت کو ایک ایسی چٹان پر ڈالدیا جہاں فرعون کی باندیاں لونڈیاں نہانے دھونے کے لئے جایا کرتی تھیں، انہوں نے یہ تابوت دیکھا تو اٹھالیا اور کھولنے کا ارادہ کیا تو ان میں سے کسی نے کہا کہ اگر اسمیں کچھ مال ہوا اور ہم نے کھول لیا تو فرعون کی بیوی کو یہ گمان ہوگا کہ ہم نے اسمیں سے کچھ الگ رکھ لیا ہے ہم کچھ بھی کہیں اس کو یقین نہیں آئے گا اس لئے سب کی رائے یہ ہوگئی کہ اس تابوت کو اسی طرح بند اٹھا کر فرعون کی بیوی کے سامنے پیش کردیا جائے۔

فرعون کی بیوی نے تابوت کھولا تو اسمیں ایک ایسا لڑکا دیکھا جس کو دیکھتے ہی اس کے دل میں اس سے اتنی محبت ہوگئی جو اس سے پہلے کسی بچے سے نہیں ہوئی تھی (جو درحقیقت حق

تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظہور تھا (وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ) دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بوسوسہ شیطانی اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو بھول گئیں اور حالت یہ ہوگئی وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل ہر خوشی اور ہر خیال سے خالی ہوگیا (صرف موسیٰ علیہ السلام کی فکر غالب آگئی) ادھر جب لڑکوں کے قتل پر مامور پولیس والوں کو فرعون کے گھر میں ایک لڑکا آجانے کی خبر ملی تو وہ چھریاں لیکر فرعون کی بیوی کے پاس پہنچ گئے کہ یہ لڑکا ہمیں دو تاکہ ذبح کردیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دوسری آزمائش

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں پہنچ کر پھر ابن جبیر رحمہ اللہ کو مخاطب کیا کہ اے ابن جبیر فتون یعنی آزمائش کا (دوسرا) واقعہ یہ ہے۔

فرعون کی بیوی نے ان لشکری لوگوں کو جواب دیا کہ ابھی ٹھہرو کہ صرف اس ایک لڑکے سے تو بنی اسرائیل کی قوت نہیں بڑھ جائے گی میں فرعون کے پاس جاتی ہوں اور اس بچے کی جاں بخشی کراتی ہوں، اگر فرعون نے اسکو بخش دیا تو یہ بہتر ہوگا ورنہ تمہارے معاملے میں دخل نہ دوں گی یہ بچہ تمہارے حوالہ ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ فرعون کے پاس گئی اور کہا کہ یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا تو معلوم ہے مگر مجھے اسکی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم کھائی جاسکتی ہے اگر فرعون اسوقت بیوی کی طرح اپنے لئے بھی موسیٰ علیہ السلام کے قرۃ العین آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کا اقرار کرلیتا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ہدایت کردیتا جیسا کہ اُس کی بیوی کو ہدایت ایمان عطا فرمائی۔

(بہرحال بیوی کے کہنے سے فرعون نے اس لڑکے کو قتل سے آزاد کردیا) اب فرعون کی بیوی نے اسکو دودھ پلانے کے لئے اپنے آس پاس کی عورتوں کو بلایا۔ سب نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کی خدمت انجام دیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی کی چھاتی نہ لگتی (وحرمنا علیہ المراضع من قبل) اب فرعون کی بیوی کو یہ فکر ہوگئی کہ جب

کسی کا دودھ نہیں لیتے تو زندہ یہ کیسے رہیں گے اسلئے اپنی کنیزوں کے سپرد کیا کہ اس کو بازار اور لوگوں کے مجمع میں لے جائیں شاید کسی عورت کا دودھ یہ قبول کرلیں۔

اس طرف موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بے چین ہو کر اپنی بیٹی کو کہا کہ ذرا باہر جا کر تلاش کرو اور لوگوں سے دریافت کرو کہ اس تابوت اور بچہ کا کیا انجام ہوا، وہ زندہ ہے یا دریائی جانوروں کی خوراک بن چکا ہے اسوقت تک ان کو اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ یاد نہیں آیا تھا جو حالت حمل میں اُن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت اور چند روزہ مفارقت کے بعد واپسی کا کیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ کی بہن باہر نکلیں تو (قدرت حق کا یہ کرشمہ دیکھا کہ) فرعون کی کنیزیں اس بچے کو لئے ہوئے دودھ پلانے والی عورت کی تلاش میں ہیں، جب انہوں نے یہ ماجرا دیکھا کہ یہ بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں لیتا اور یہ کنیزیں پریشان ہیں تو ان سے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسے گھرانے کا پتہ دیتی ہوں جہاں مجھے امید ہے کہ یہ ان کا دودھ بھی لینگے اور وہ اس کو خیر خواہی و محبت کے ساتھ پالیں گے۔ یہ سن کر ان کنیزوں نے ان کو اس شبہ میں پکڑ لیا کہ یہ عورت شاید اس بچے کی ماں یا کوئی عزیز خاص ہے جو وثوق کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اس کی خیر خواہ اور ہمدرد ہیں (اسوقت یہ بہن بھی پریشان ہوگئی)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تیسری آزمائش

ابن عباسؓ نے اس جگہ پہنچ کر پھر ابن جبیرؓ کو خطاب کیا کہ یہ (تیسرا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے اسوقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے بات بنائی اور کہا کہ میری مراد اس گھر والوں کے ہمدرد خیر خواہ ہونے سے یہی تھی کہ فرعونی دربار تک ان کی رسائی ہوگی اس سے انکو منافع پہنچنے کی امید ہوگی اسلئے وہ اس بچے کی محبت و ہمدردی میں کسر نہ کریں گے۔ یہ سنکر کنیزوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ یہ واپس اپنے گھر پہنچی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو واقعہ کی خبر دی وہ انکے ساتھ اس جگہ پہنچیں جہاں یہ کنیزیں جمع تھیں، کنیزوں کے کہنے سے انہوں نے بچے کو گود میں لے لیا، موسیٰ علیہ السلام فوراً ان کی چھاتیوں سے لگ کر دودھ پینے لگے یہاں تک کہ پیٹ بھر گیا۔ یہ خوشخبری فرعون کی بیوی کو پہنچی کہ اس بچے کے لئے دودھ پلانے والی مل گئی۔ فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلوایا۔ انہوں نے آکر حالات دیکھے تو یہ

محسوس کیا کہ فرعون کی بیوی میری حاجت وضرورت محسوس کر رہی ہے تو ذرا خودداری سے کام لیا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ یہاں رہ کر اس بچے کو دودھ پلائیں کیونکہ مجھے اس بچے سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کو اپنی نظروں سے غائب نہیں رکھ سکتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ میں تو اپنے گھر کو چھوڑ کر یہاں نہیں رہ سکتی کیونکہ میری گود میں خود ایک بچہ ہے جس کو دودھ پلاتی ہوں، میں اسکو کیسے چھوڑوں۔ ہاں اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ بچہ میرے سپرد کریں میں اپنے گھر رکھ کر اسکو دودھ پلاؤں اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ اس بچے کی خبر گیری اور حفاظت میں ذرا کوتاہی نہ کرونگی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اسوقت اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ بھی یاد آ گیا جسمیں فرمایا کہ چندروز کی جدائی کے بعد ہم ان کو تمہارے پاس واپس دیدیں گے اسلئے وہ اور اپنی بات پر جم گئیں۔ اہلیہ فرعون نے مجبور ہو کر ان کی بات مان لی اور یہ اُسی روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر اپنے گھر آ گئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا نشو ونما خاص طریقے پر فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے چوتھی آزمائش

جب موسیٰ علیہ السلام ذرا تی ہو گئے تو اہلیہ فرعون نے ان کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ مجھے لا کر دکھلا جاؤ (کہ میں اسکے دیکھنے کیلئے بے چین ہوں) اور اہلیہ فرعون نے اپنے سب درباریوں کو حکم دیا کہ یہ بچہ آج ہمارے گھر میں آ رہا ہے تم میں سے کوئی ایسا نہ رہے جو اسکا اکرام نہ کرے اور کوئی ہدیہ اسکو پیش نہ کرے اور میں خود اس کی نگرانی کروں گی کہ تم لوگ اس معاملہ میں کیا کرتے ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کیساتھ گھر سے نکلے اسی وقت سے ان پر تحفوں اور ہدایا کی بارش ہونے لگی یہاں تک کہ اہلیہ فرعون کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے پاس سے خاص تحفے اور ہدیئے الگ پیش کئے۔ اہلیہ فرعون ان کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوئی اور یہ سب تحفے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دیدیئے۔ اسکے بعد اہلیہ فرعون نے کہا کہ اب میں ان کو فرعون کے پاس لے جاتی ہوں وہ انکو انعامات اور تحفے دیں گے جب ان کو لیکر فرعون کے پاس پہنچی تو فرعون نے ان کو اپنی گود میں لے لیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر زمین کی طرف جھکا دیا۔ اسوقت دربار کے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ابراہیم علیہ السلام سے جو

وعدہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک نبی پیدا ہوگا جو آپکے ملک و مال کا وارث ہوگا، آپ پر غالب آئیگا اور آپکو پچھاڑیگا، یہ وعدہ کس طرح پورا ہو رہا ہے۔

فرعون متنبہ ہوا اور اسی وقت لڑکوں کو قتل کرنے والے سپاہیوں کو بلالیا تا کہ اسکو ذبح کردیں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں پہنچ کر پھر ابن جبیر کو خطاب کیا کہ یہ (چوتھا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ پھر موت سر پر منڈلانے لگی۔

اہلیہ فرعون نے یہ دیکھا تو کہا کہ آپ تو یہ بچہ مجھے دے چکے ہیں پھر اب یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے فرعون نے کہا کہ تم یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ لڑکا اپنے عمل سے گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ مجھ کو زمین پر پچھاڑ کر مجھ پر غالب آجائیگا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ ایک بات کو اپنے اور میرے معاملہ کے فیصلہ کے لئے مان لیں جس سے حق بات ظاہر ہو جاوے گی (کہ بچے نے یہ معاملہ بچپن کی بے خبری میں کیا ہے یا دیدہ دانستہ کسی شوخی سے) آپ دو انگارے آگ کے اور دو موتی منگوا لیجئے اور دونوں کو انکے سامنے کر دیجئے اگر یہ موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور آگ کے انگاروں سے بچیں تو آپ سمجھ لیں کہ اسکے افعال عقل وشعور سے دیدہ ودانستہ ہیں اور اگر اس نے موتیوں کے بجائے انگارے ہاتھ میں اٹھا لئے تو یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ کام کسی عقل وشعور سے نہیں کیا گیا کیونکہ کوئی عقل والا انسان آگ کو ہاتھ میں نہیں اٹھا سکتا (فرعون نے اس آزمائش کو مان لیا) دو انگارے اور دو موتی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کئے تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے اٹھا لیے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے کہ جبرئیل امین نے ان کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا) فرعون نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً ان کے ہاتھ سے انگارے چھین لئے کہ ان کا ہاتھ نہ جل جائے (اب تو اہلیہ فرعون کی بات بن گئی) اس نے کہا کہ آپ نے واقعہ کی حقیقت کو دیکھ لیا اس طرح اللہ تعالیٰ نے پھر یہ موت موسیٰ علیہ السلام سے ٹلا دی کیونکہ قدرت خداوندی کو ان سے آگے کام لینا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پانچویں آزمائش

(حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی طرح فرعون کے شاہانہ اعزاز واکرام اور شاہانہ خرچ پر

اپنی والدہ کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے یہانتک کہ جوان ہو گئے)۔

اُن کے شاہی اکرام و اعزاز کو دیکھ کر فرعون کے لوگوں کو بنی اسرائیل پر وہ ظلم و جور اور تذلیل و توہین کرنے کی ہمت نہ رہی جو اس سے پہلے آل فرعون کیطرف سے ہمیشہ بنی اسرائیل پر ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام شہر کے کسی گوشہ میں چل رہے تھے تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں جن میں سے ایک فرعونی ہے اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر امداد کے لئے پکارا۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی آدمی کی جسارت پر بہت غصہ آ گیا کہ اس نے شاہی دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کو جانتے ہوئے اسرائیلی کو ان کے سامنے پکڑ رکھا ہے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کی حفاظت کرتے ہیں اور لوگوں کو تو صرف یہی معلوم تھا کہ ان کا تعلق اسرائیلی لوگوں سے صرف رضاعت اور دودھ پینے کی وجہ سے ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ یا کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم کرا دیا ہو کہ یہ اپنی دودھ پلانے والی عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور اسرائیلی ہیں۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آ کر اس فرعونی کے ایک مکا رسید کیا جس کو وہ برداشت نہ کر سکا اور وہیں مر گیا مگر اتفاق سے وہاں کوئی اور آدمی موسیٰ علیہ السلام اور ان دونوں لڑنے والوں کے سوا موجود نہیں تھا، فرعونی تو قتل ہو گیا اسرائیلی اپنا آدمی تھا اس سے اسکا اندیشہ نہ تھا کہ یہ مخبری کر دے گا۔

جب یہ فرعونی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ، یعنی یہ کام شیطان کی طرف سے ہوا ہے وہ کھلا دشمن گمراہ کرنے والا ہے (پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی) رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ فَغَفَرَلَهٗ ط اِنَّهٗ هُوَالْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، یعنی اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا (کہ یہ خطا قتل فرعونی کی مجھ سے سرزد ہو گئی) مجھے معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا کیونکہ وہ ہی بہت معاف کرنے والا اور بہت رحمت کرنے والا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ کے بعد خوف و ہراس کے عالم میں یہ خبر دریافت کرتے رہے

(کہ اسکے قتل پر آل فرعون کا ردعمل کیا ہوا اور دربار فرعون تک یہ معاملہ پہنچا یا نہیں) معلوم ہوا کہ معاملہ فرعون تک اس عنوان سے پہنچا کہ کسی اسرائیلی نے آل فرعون کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اس لئے اسرائیلیوں سے اسکا انتقام لیا جائے۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ کوئی ڈھیل کا معاملہ نہ کیا جائے۔ فرعون نے جواب دیا کہ اس کے قاتل کو متعین کر کے مع شہادت کے پیش کرو۔ کیونکہ بادشاہ اگرچہ تمہارا ہی ہے مگر اس کے لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ بغیر شہادت و ثبوت کے کسی سے قصاص لے لے تم اسکے قاتل کو تلاش کرو اور ثبوت مہیا کرو میں ضرور تمہارا انتقام بصورت قصاص اس سے لونگا۔ آل فرعون کے لوگ یہ سن کر گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے لگے کہ کہیں اسکے قتل کرنے والے کا سراغ مل جائے مگر ان کو کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک یہ واقعہ پیش آیا کہ اگلے روز موسیٰ علیہ السلام گھر سے نکلے تو اسی اسرائیلی کو دیکھا کہ کسی دوسرے فرعونی شخص سے مقاتلہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لئے پکارا مگر موسیٰ علیہ السلام کل کے واقعہ پر ہی نادم ہو رہے تھے اور اسوقت اسی اسرائیلی کو پھر لڑتے ہوئے دیکھ کر اس پر ناراض ہوئے (کہ خطا اسی کی معلوم ہوتی ہے یہ جھگڑالو آدمی ہے اور لڑتا ہی رہتا ہے) مگر اسکے باوجود موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ فرعونی شخص کو اس پر حملہ کرنے سے روکیں لیکن اسرائیلی کو بھی بطور تنبیہ کے کہنے لگے تو نے کل بھی جھگڑا کیا تھا آج پھر لڑ رہا ہے تو ہی ظالم ہے۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ آج بھی اسی طرح غصے میں ہیں جیسے کل تھے تو اس کو موسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ سے یہ شبہ ہو گیا کہ یہ آج مجھے ہی قتل کر دیں گے تو فوراً بول اٹھا کہ اے موسیٰ کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو جیسے کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔

یہ باتیں ہونے کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر فرعونی شخص نے آل فرعون کے ان لوگوں کو جو کل کے قاتل کی تلاش میں تھے جا کر یہ خبر پہنچا دی کہ خود اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ہے کہ تم نے کل ایک آدمی قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر دربار فرعون تک فوراً پہنچائی گئی۔ فرعون نے اپنے سپاہی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے بھیج دیے۔ یہ سپاہی جانتے تھے کہ وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ اطمینان کے ساتھ شہر کی بڑی سڑک سے موسیٰ علیہ السلام کی تلاش

میں نکلے۔اس طرف ایک شخص کو موسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے جو شہر کے کسی بعید حصہ میں رہتا تھا اس کی خبر لگ گئی کہ فرعونی سپاہی موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں بغرض قتل نکل چکے ہیں اس نے کسی گلی کوچے کے چھوٹے راستہ سے آگے پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی۔

یہاں پہنچ کر پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابن جبیر کو خطاب کیا کہ اے ابن جبیر یہ (پانچواں) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ موت سر پر آ چکی تھی اللہ نے اس سے نجات کا سامان کر دیا۔

مدین کی طرف ہجرت

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سن کر فوراً شہر سے نکل گئے اور مدین کی طرف رخ پھر گیا۔ یہ آج تک شاہی ناز و نعمت میں پلے تھے کبھی محنت و مشقت کا نام نہ آیا تھا مصر سے نکل کھڑے ہوئے مگر راستہ بھی کہیں کا نہ جانتے تھے مگر اپنے رب پر بھروسہ تھا کہ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ،یعنی امید ہے کہ میرا رب مجھے راستہ دکھاویگا۔جب شہر مدین کے قریب پہنچے تو شہر سے باہر ایک کنویں پر لوگوں کا اجتماع دیکھا جو اُس پر اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ اور دیکھا کہ دو عورتیں اپنی بکریوں کو سمیٹے ہوئے الگ کھڑی ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا کہ تم الگ کیوں کھڑی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم ان سب لوگوں سے مزاحمت اور مقابلہ کریں اس لئے ہم اسی انتظار میں ہیں کہ جب یہ سب لوگ فارغ ہو جائیں تو جو کچھ بچا ہوا پانی ملجائے گا اس سے ہم اپنا کام نکالیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کی شرافت دیکھ کر خود ان کے لئے کوکنویں سے پانی نکالنا شروع کر دیا اللہ تعالیٰ نے قوت و طاقت بخشی تھی بڑی جلدی اُن بکریوں کو سیراب کر دیا۔ یہ عورتیں اپنی بکریاں لے کر اپنے گھر گئیں اور موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں چلے گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ،یعنی اے میرے پروردگار میں محتاج ہوں اس نعمت کا جو آپ میری طرف بھیجیں (مطلب یہ تھا کہ کھانے کا اور ٹھکانہ کا کوئی انتظام ہو جائے) یہ لڑکیاں جب روزانہ کے وقت سے پہلے بکریوں کو سیراب کر کے گھر پہنچیں تو اُن کے والد کو تعجب ہوا اور فرمایا آج تو کوئی نئی بات ہے،لڑکیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے پانی کھینچنے اور پلانے کا قصہ والد کو سنا دیا۔والد نے ان میں سے ایک کو

حکم دیا کہ جس شخص نے یہ احسان کیا ہے اسکو یہاں بلا لاؤ، وہ بلا لائی، والد نے موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے حالات دریافت کئے اور فرمایا لَا تَخَفْ. نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ، یعنی اب آپ خوف وہراس اپنے دل سے نکال دیجئے، آپ ظالموں کے ہاتھ سے نجات پا چکے ہیں ہم نہ فرعون کی سلطنت میں ہیں نہ اسکا ہم پر کچھ حکم چل سکتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح

اب ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے اپنے والد سے کہا یٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ، یعنی ابا جان، ان کو آپ ملازم رکھ لیجئے کیونکہ ملازمت کے لئے بہترین آدمی وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔ والد کو اپنی لڑکی سے یہ بات سن کر غیرت سی آئی کہ میری لڑکی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ اسلئے اس سے سوال کیا کہ تمہیں ان کی قوت کا اندازہ کیسے ہوا اور ان کی امانتداری کس بات سے معلوم کی۔ لڑکی نے عرض کیا کہ اُن کی قوت کا مشاہدہ تو اُن کے کنویں سے پانی کھینچنے کے وقت ہوا کہ سب چرواہوں سے پہلے انہوں نے اپنا کام کرلیا دوسرا کوئی ان کی برابر نہیں آسکا اور امانت کا حال اس طرح معلوم ہوا کہ جب میں ان کو بلانے کے لئے گئی اور اوّل نظر میں جب انہوں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہوں تو فوراً اپنا سر نیچا کرلیا اور اسوقت تک سر نہیں اُٹھایا جب تک کہ میں ان کو آپ کا پیغام نہیں پہنچادیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلو مگر مجھے اپنے گھر کا راستہ پیچھے سے بتلاتی رہو اور یہ بات صرف وہی مرد کرسکتا ہے جو امانتدار ہو۔ والد کو لڑکی کی اس دانشمندانہ بات سے مسرت ہوئی اور اسکی تصدیق فرمائی اور خود بھی ان کے بارے میں قوت و امانت کا یقین ہوگیا۔ اُس وقت لڑکیوں کے والد نے (جو اللہ کے رسول حضرت شعیب علیہ السلام تھے) موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو یہ منظور ہے کہ میں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح آپ سے کردوں جس کی شرط یہ ہوگی کہ آپ آٹھ سال تک ہمارے یہاں مزدوری کریں، اور اگر آپ دس سال پورے کردیں تو اپنے اختیار سے کردیں بہتر ہوگا مگر ہم یہ پابندی آپ پر عائد نہیں کرتے تاکہ آپ پر زیادہ مشقت نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو منظور فرمالیا جسکی رو سے موسیٰ علیہ السلام پر

صرف آٹھ سال کی خدمت بطور معاہدہ کے لازم ہوگئی باقی دو سال کا وعدہ اختیاری رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے وہ وعدہ بھی پورا کرا کر دس سال پورے کرادیئے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک نصرانی عالم مجھے ملا، اُس نے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میعادوں میں سے کونسی میعاد پوری فرمائی؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ اسوقت تک ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مجھے معلوم نہ تھی۔ اس کے بعد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ملا اُن سے سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آٹھ سال کی میعاد پورا کرنا تو موسیٰؑ پر واجب تھا اسمیں کچھ کمی کرنے کا تو احتمال ہی نہیں اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کا اختیاری وعدہ بھی پورا ہی کرنا منظور تھا اس لئے دس سال کی میعاد پوری کی۔ اس کے بعد میں اس نصرانی عالم سے ملا اور اس کو یہ خبر دی تو اُسنے کہا کہ تم نے جس شخص سے یہ بات دریافت کی ہے کیا وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں، میں نے کہا کہ بیشک وہ بہت بڑے عالم اور ہم سب سے افضل ہیں۔

مدین سے واپسی اور نبوت کا ملنا

(دس سال کی میعاد خدمت پوری کرنے کے بعد جب) حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لیکر شعیب علیہ السلام کے وطن مدین سے رخصت ہوئے، راستہ میں سخت سردی اندھیری رات، راستہ نامعلوم، بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اچانک کوہ طور پر آگ دیکھنے پھر وہاں جانے اور حیرت انگیز مناظر کے بعد معجزہ عصا و ید بیضاء اور اسکے ساتھ منصب نبوت و رسالت عطا ہونے کے بعد (جسکا پورا قصہ قرآن میں اُوپر گزر چکا ہے)۔

فرعون کو دعوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر ہوئی کہ میں فرعونی دربار کا ایک مفرور ملزم قرار دیا گیا ہوں مجھ سے قبطی کا قصاص لینے کا حکم وہاں سے ہو چکا ہے اب اُس کے پاس دعوت رسالت لیکر جانے کا حکم ہوا ہے، نیز اپنی زبان میں لکنت کا عذر بھی سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض پیش کی۔ حق تعالیٰ نے ان کی فرمائش کے مطابق انکے بھائی حضرت ہارون کو شریک رسالت بنا کر انکے پاس وحی بھیج دی اور یہ حکم دیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شہر مصر

سے باہر استقبال کریں۔ اسکے مطابق موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے۔ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی دونوں بھائی (حسب الحکم) فرعون کو دعوت حق دینے کے لئے اس کے دربار میں پہنچے کچھ وقت تک تو ان کو دربار میں حاضری کا موقع نہیں دیا گیا۔ یہ دونوں دروازے پر ٹھہرے رہے پھر بہت سے پردوں میں گزر کر حاضری کی اجازت ملی اور دونوں نے فرعون سے کہا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ، یعنی ہم دونوں تیرے رب کی طرف سے قاصد اور پیغامبر ہیں۔ فرعون نے پوچھا فَمَنْ رَّبُّکُمَا (تو بتلاؤ تمہارا رب کون ہے) موسیٰ وہارون علیہما السلام نے وہ بات کہی جس کا قرآن نے خود ذکر کر دیا رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی، اس پر فرعون نے پوچھا کہ پھر تم دونوں کیا چاہتے ہو اور ساتھ ہی قبطی مقتول کا واقعہ ذکر کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجرم ٹھہرایا (اور اپنے گھر میں ان کی پرورش پانے کا احسان جتلایا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں باتوں کا وہ جواب دیا جو قرآن میں مذکور ہے (یعنی مقتول کے معاملہ میں تو اپنی خطا اور غلطی کا اعتراف کر کے ناواقفیت کا عذر ظاہر کیا اور گھر میں پرورش پر احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تم نے سارے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اُن پر طرح طرح کے ظلم کر رہے ہو اسی کے نتیجہ میں یہ نیرنگ تقدیر میں تمہارے گھر میں پہنچا دیا گیا اور جو کچھ اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا اس میں تمہارا کوئی احسان نہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خطاب کر کے پوچھا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر دو۔ فرعون نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ اگر تمہارے پاس رسول رب ہونے کی کوئی علامت ہے تو دکھلاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا زمین پر ڈال دی تو وہ عظیم الشان اژدہا کی شکل میں منہ کھولے ہوئے فرعون کی طرف لپکی۔ فرعون خوفزدہ ہو کر اپنے تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے پناہ مانگی کہ اس کو روک لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسکو پکڑ لیا۔ پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو وہ چمکنے لگا یہ دوسرا معجزہ فرعون کے سامنے آیا پھر دوبارہ گریبان میں ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

فرعون کا جادوگروں کو بلانا

فرعون نے ہیبت زدہ ہو کر اپنے درباریوں سے مشورہ کیا (کہ تم دیکھ رہے ہو یہ کیا

ماجرا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے) درباریوں نے متفقہ طور پر کہا کہ (کچھ فکر کی بات نہیں) یہ دونوں جادوگر ہیں اپنے جادو کے ذریعہ تم کو تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں اور تمہارے بہترین دین و مذہب کو (جو اُن کی نظر میں فرعون کی پرستش کرنا تھا) یہ مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی بات نہ مانیں (اور کوئی فکر نہ کریں) کیونکہ آپ کے ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں، آپ ان کو بلا لیجئے وہ اپنے جادو سے ان کے جادو پر غالب آ جائیں گے۔

فرعون نے اپنی مملکت کے سب شہروں میں حکم دیدیا کہ جتنے آدمی جادوگری میں ماہر ہوں وہ سب دربار میں حاضر کردیئے جاویں، ملک بھر کے جادوگر جمع ہوگئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کہ جس جادوگر سے آپ ہمارا مقابلہ کرانا چاہتے ہیں وہ کیا عمل کرتا ہے، اس نے بتلایا کہ وہ اپنی لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، جادوگروں نے بڑی بے فکری سے کہا کہ یہ تو کوئی چیز نہیں، لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دینے کے جادو کا تو جو کمال ہمیں حاصل ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، مگر یہ طے کر دیجئے کہ اگر ہم اس پر غالب آگئے تو ہمیں کیا ملے گا۔

فرعون نے کہا کہ تم غالب آگئے تو تم میرے خاندان کا جز اور مقربین خاص میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گے۔

جادوگروں سے مقابلہ

اب جادوگروں نے مقابلہ کا وقت اور جگہ موسیٰ علیہ السلام سے طے کر کے اپنی عید کے دن چاشت کا وقت مقرر کردیا۔ ابن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ انکا یوم الزینہ (یعنی عید کا دن) جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے جادوگروں پر فتح عطا فرمائی وہ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ جب سب لوگ ایک وسیع میدان میں مقابلہ دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے تو فرعون کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ، یعنی ہمیں یہاں ضرور رہنا چاہئے تاکہ یہ ساحر یعنی موسیٰ و ہارون اگر غالب آجائیں تو ہم بھی ان پر ایمان لے آئیں، ان کی یہ گفتگو ان حضرات کے ساتھ استہزاء و مذاق کے طور پر تھی (ان کا یقین تھا کہ یہ ہمارے جادوگروں پر غالب نہیں آسکیں گے)۔

میدان مقابلہ مکمل آراستہ ہوگیا تو جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا کہ پہلے آپ کچھ ڈالیں (یعنی اپنا سحر دکھلائیں) یا ہم پہلے ڈال کر ابتداء کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم ہی پہل کرو، اپنا جادو دکھلاؤ۔ ان لوگوں نے اپنی لاٹھیاں اور کچھ رسیاں زمین پر یہ کہتے ہوئے ڈالدیں بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ، یعنی بطفیل فرعون ہم ہی غالب آئیں گے (یہ لاٹھیاں اور رسیاں دیکھنے میں سانپ بن کر چلنے لگیں) یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام پر ایک خوف طاری ہوا (فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی)

یہ خوف طبعی بھی ہوسکتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے، انبیاء بھی اس سے مستثنٰی نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خوف اس بات کا ہو کہ اب اسلام کی دعوت جس کو میں لے کر آیا ہوں اس میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

جادوگروں کا ایمان لانا

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ اپنی عصا ڈالدو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈالی تو وہ ایک بڑا اژدہا بن گیا جس کا منہ کھلا ہوا تھا اس اژدہا نے ان تمام سانپوں کو نگل لیا جو جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے بنائے تھے۔

فرعونی جادوگر جادو کے فن کے ماہر تھے یہ ماجرا دیکھ کر اُن کو یقین ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی عصا کا یہ اژدہا جادو سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے جادوگروں نے اسی وقت اعلان کر دیا کہ ہم اللہ پر اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پچھلے خیالات وعقائد سے توبہ کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اسکے ساتھیوں کی کمر توڑ دی اور انہوں نے جو جال پھیلایا تھا وہ سب باطل ہوگیا (فَغُلِبُوْا هُنَالِکَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ) فرعون اور اسکے ساتھی مغلوب ہوگئے اور ذلت و رسوائی کیساتھ اس میدان سے پسپا ہوئے۔

جس وقت یہ مقابلہ ہو رہا تھا فرعون کی بیوی آسیہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اللہ تعالیٰ سے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کے لئے دعا مانگ رہی تھی اور آل فرعون کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ فرعون کی وجہ سے پریشان حال ہیں اسکے لئے دعا مانگ رہی ہیں حالانکہ ان کا غم وفکر

سارا موسیٰ علیہ السلام کیلئے تھا (اور انہیں کے غالب آنے کی دعا مانگ رہی تھیں)۔

فرعون پر مختلف عذاب

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوئی معجزہ دکھاتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر حجت تمام ہو جاتی تو اسی وقت وعدہ کر لیتا تھا کہ اب میں بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دوں گا مگر جب موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ عذاب کا خطرہ ٹل جاتا تو اپنے وعدہ سے پھر جاتا تھا) اور یہ کہہ دیتا تھا کہ کیا آپ کا رب کوئی اور بھی نشانی دکھا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا یا لآخر اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون پر طوفان اور ٹڈی دل اور کپڑوں میں جوئیں اور برتنوں اور کھانے میں مینڈکوں اور خون وغیرہ کے عذاب مسلط کر دیئے، جن کو قرآن میں آیات مفصلات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرعون کا حال یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی عذاب آتا اور اس سے عاجز ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتا کہ کسی طرح یہ عذاب ہٹا دیجئے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے پھر جب عذاب ٹل جاتا تو پھر بدعہدی کرتا۔

فرعون کی ہلاکت

یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیدیا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے نکل جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لیکر رات کے وقت شہر سے نکل گئے فرعون نے جب صبح کو دیکھا کہ یہ سب لوگ چلے گئے تو اپنی فوج تمام اطراف سے جمع کر کے انکے تعاقب میں چھوڑ دی۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے اس دریا کو جو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے راستہ میں تھا یہ حکم دیدیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تجھ پر لاٹھی ماریں تو دریا میں بارہ راستے بن جانے چاہئیں۔ جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل الگ الگ گزر سکیں۔ اور جب یہ گزر جائیں تو ان کے تعاقب میں آنے والوں پر یہ دریا کے بارہ حصے پھر مل جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دریا کے قریب پہنچے تو یہ یاد نہ رہا کہ لاٹھی مارنے سے دریا میں راستے پیدا ہوں گے اور ان کی قوم نے ان سے فریاد کی انا لمدرکون یعنی ہم پکڑ لئے گئے (کیونکہ پیچھے سے فرعونی فوجوں کو آتا دیکھ رہے تھے اور آگے یہ دریا حائل تھا)

اسوقت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ یاد آیا کہ دریا پر لاٹھی مارنے سے اس میں راستے پیدا ہو جائیں گے اور فوراً دریا پر اپنی لاٹھی ماری۔ یہ وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کے پچھلے حصوں سے فرعونی افواج کے اگلے حصے تقریباً مل چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے دریا کے الگ الگ ٹکڑے ہو کر وعدہ ربانی کے مطابق بارہ راستے بن گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے۔ فرعونی افواج جو ان کے تعاقب میں تھی انہوں نے دریا میں راستے دیکھ کر ان کے تعاقب میں اپنے گھوڑے اور پیادے ڈالدیئے تو دریا کے یہ مختلف ٹکڑے بامر ربانی پھر آپس میں مل گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو ان کے اصحاب نے کہا کہ ہمیں یہ خطرہ ہے کہ فرعون انکے ساتھ غرق نہ ہوا ہو اور اسنے اپنے آپ کو بچالیا ہو تو موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ فرعون کی ہلاکت ہم پر ظاہر کردے قدرت حق نے فرعون کی مردہ لاش کو دریا سے باہر پھینک دیا اور سب نے اسکی ہلاکت کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا۔

آزادی کے بعد بنی اسرائیل کی حالت

اس کے بعد یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آگے چلے تو راستہ میں ان کا گزر ایک قوم پر ہوا جو اپنے بنائے ہوئے بتوں کی عبادت اور پرستش کر رہے تھے، تو یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے (یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ط قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ) یعنی اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسے انہوں نے بہت سے معبود بنا رکھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم عجیب قوم ہو کہ ایسی جہالت کی باتیں کرتے ہو، یہ لوگ جو بتوں کی عبادت میں مشغول ہیں انکی عبادت برباد ہونیوالی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) کہ تم اپنے پروردگار کے اتنے معجزات اور اپنے اوپر انعامات دیکھ چکے ہو پھر بھی تمہارے یہ جاہلانہ خیالات نہیں بدلے۔ یہ کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنے ان ساتھیوں کے یہاں سے آگے بڑھے اور ایک مقام پر جا کر ان کو ٹھہرا دیا اور فرمایا تم سب یہاں ٹھہرو، میں اپنے رب کے پاس جاتا ہوں، تیس دن کے بعد واپس آجاؤں گا اور میرے پیچھے ہارون علیہ السلام میرے نائب وخلیفہ رہیں گے ہر کام میں ان کی اطاعت کرنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر جانا

موسیٰ علیہ السلام ان سے رخصت ہو کر کوہ طور پر تشریف لے گئے اور (اشارہ ربانی سے) تیس دن رات کا مسلسل روزہ رکھا تا کہ اسکے بعد کلام ربانی سے مستفید ہو سکیں مگر تیس دن رات کے مسلسل روزہ سے جو ایک قسم کی بو روزہ دار کے منہ میں ہو جاتی ہے یہ فکر ہوئی کہ اس بو کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شرف ہم کلامی نامناسب ہے تو پہاڑی گھاس کے ذریعہ مسواک کر کے منہ صاف کر لیا۔ جب بارگاہ حق میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ تم نے افطار کیوں کر لیا (اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کھایا پیا نہیں بلکہ صرف منہ صاف کر لینے کو پیغمبرانہ امتیاز کی بنا پر افطار کرنے سے تعبیر فرمایا) موسیٰ علیہ السلام نے اس حقیقت کو سمجھ کر عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھے یہ خیال ہوا کہ آپ سے ہم کلام ہونے کے لئے منہ کی بو دور کر کے صاف کر لوں۔ حکم ہوا کہ موسیٰ کیا تمہیں خبر نہیں کہ روزہ دار کے منہ کی بو ہمارے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے، اب آپ لوٹ جایئے اور دس دن مزید روزے رکھئے پھر ہمارے پاس آیئے موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔

سامری کا بچھڑا بنانا

ادھر جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے دیکھا کہ مقررہ مدت تیس روز گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام واپس نہیں آئے تو ان کو یہ بات ناگوار ہوئی، ادھر حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی رخصت ہونے کے بعد اپنی قوم میں ایک خطبہ دیا کہ قوم فرعون کے لوگوں کی بہت سی چیزیں جو تم نے عاریۃً مانگ رکھی تھی یا انہوں نے تمہارے پاس ودیعت (امانت) رکھوا رکھی تھی وہ سب تم اپنے ساتھ لے آئے ہو اگرچہ تمہاری بھی بہت سی چیزیں قوم فرعون کے پاس عاریت اور ودیعت کی تھیں اور آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی یہ چیزیں ہماری چیزوں کے معاوضہ میں ہم نے رکھ لی ہیں مگر میں اس کو حلال نہیں سمجھتا کہ ان کی عاریت اور ودیعت کا سامان تم اپنے استعمال میں لاؤ اور ہم اس کو واپس بھی نہیں کر سکتے اس لئے ایک گڑھا کھودوا کر سب کو حکم دیا کہ یہ چیزیں خواہ زیورات ہوں یا دوسری استعمالی اشیاء سب اس

گڑھے میں ڈالدو (ان لوگوں نے اسکی تعمیل کی) ہارون علیہ السلام نے اس سارے سامان کے اوپر آگ جلوادی جس سے یہ سب سامان جل گیا اور فرمایا کہ اب یہ نہ ہمارا رہا نہ ان کا۔

ان کے ساتھ ایک شخص سامری ایک ایسی قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھا مگر جب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہولیا، اس کو یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ اس نے (جبرئیل علیہ السلام) کا ایک اثر دیکھا (یعنی جہاں ان کا قدم پڑتا ہے اسمیں زندگی اور نمو پیدا ہو جاتا ہے) اس نے اس جگہ سے ایک مٹھی مٹی کو اٹھالیا، اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے آرہا تھا کہ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ہارون علیہ السلام نے خیال کیا کہ اسکی مٹھی میں کوئی فرعونی زیور وغیرہ ہے اس سے کہا کہ جس طرح سب نے اس گڑھے میں ڈالا ہے تم بھی ڈالدو، اس نے کہا یہ تو اس رسول (جبرئیل) کے نشان قدم کی مٹی ہے جس نے تمہیں دریا سے پار کرایا ہے اور میں اس کو کسی طرح نہ ڈالوں گا بجز اسکے کہ آپ یہ دعا کریں کہ میں جس مقصد کے لئے ڈالوں وہ مقصد پورا ہو جائے، ہارون علیہ السلام نے دعا کا وعدہ کرلیا اسنے وہ مٹھی مٹی کی اس گڑھے میں ڈالدی اور حسب وعدہ ہارون علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ جو کچھ سامری چاہتا ہے وہ پورا کر دیجئے، جب وہ دعا کر چکے تو سامری نے کہا کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ سونا، چاندی، لوہا، پیتل جو کچھ اس گڑھے میں ڈالا گیا ہے ایک گائے کا بچھڑا بن جائے۔ ہارون علیہ السلام دعا کر چکے تھے اور وہ قبول ہو چکی تھی جو کچھ زیوارت اور تانبا پیتل لوہا اسمیں ڈالا گیا تھا سب کا ایک بچھڑا بن گیا جسمیں کوئی روح تو نہ تھی مگر گائے کی طرح آواز نکالتا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ واللہ وہ کوئی زندہ آواز نہیں تھی بلکہ ہوا اسکے پچھلے حصہ سے داخل ہو کر منہ سے نکلتی تھی اس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی۔

بنی اسرائیل میں فرقے بننا

یہ عجیب وغریب قصہ دیکھ کر بنی اسرائیل کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک فرقہ نے سامری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اس نے کہا یہی تمہارا خدا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول کر دوسری طرف چلے گئے۔ ایک فرقہ نے یہ کہا کہ ہم سامری کی اس بات کو اسوقت تک تکذیب نہیں کرسکتے

جب تک موسیٰ علیہ السلام حقیقت حال بتلائیں اگر واقع میں یہی ہمارا خدا ہے تو ہم اسکی مخالفت کر کے گنہگار نہیں ہونگے اور یہ خدا نہیں تو ہم موسیٰ علیہ السلام کے قول کی پیروی کریں گے۔

ایک اور فرقہ نے کہا کہ یہ سب شیطانی دھوکہ ہے یہ ہمارا رب نہیں ہوسکتا نہ ہم اس پر ایمان لاسکتے ہیں نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ایک اور فرقہ کے دل میں سامری کی بات اتر گئی اور اس نے سامری کی تصدیق کر کے اسکو اپنا خدا مان لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی اور غصہ

ہارون علیہ السلام نے یہ فساد عظیم دیکھا تو فرمایا یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ. وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ، یعنی اے میری قوم تم فتنہ میں پڑ گئے ہو بلاشبہ تمہارا رب اور خدا تو رحمان ہے تم میرا اتباع کرو اور میرا حکم مانو۔ انہوں نے کہا کہ یہ بتلایئے کہ موسیٰ علیہ السلام کو کیا ہوا کہ ہم سے تیس دن کا وعدہ کر کے گئے تھے اور وعدہ خلافی کی یہاں تک کہ اب چالیس دن پورے ہو رہے ہیں۔ ان کے کچھ بے وقوفوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو بھول گئے۔ اس کی تلاش میں پھرتے ہونگے۔

اس طرف جب چالیس روزے پورے کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی نصیب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فتنہ کی خبر دی جس میں ان کی قوم مبتلا ہوگئی تھی فَرَجَعَ مُوْسٰٓی اِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا، موسیٰ علیہ السلام وہاں سے بڑے غصے میں اور افسوس کی حالت میں واپس آئے اور آکر وہ باتیں فرمائیں جو قرآن میں تم نے پڑھی ہیں۔ وَاَلْقَی الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗٓ اِلَیْهِ، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اس غصے میں اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچے اور الواح تورات جو کہ کوہ طور سے ساتھ لائے تھے ہاتھ میں سے رکھدیں پھر غصہ فرو ہونے کے بعد بھائی کا عذر صحیح معلوم کر کے اسکو قبول کیا اور ان کے لئے اللہ سے استغفار کیا، پھر سامری کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تو نے یہ حرکت کیوں کی، اس نے جواب دیا فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ یعنی میں نے رسول (جبرئیل) کے نشان قدم کی مٹی اٹھالی تھی اور میں نے سمجھ لیا تھا (کہ یہ جس چیز پر ڈالی جائے گی اس میں حیات کے آثار پیدا ہو جائیں گے) مگر میں نے تم لوگوں سے

اس بات کو چھپائے رکھا فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي، یعنی میں نے اس مٹی کو (زیورات وغیرہ کے ڈھیر پر ڈالدیا) میرے نفس نے میرے لئے یہ کام پسندیدہ شکل میں دکھلایا۔ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ. وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ. وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا. لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو فرمایا کہ جا، اب تیری سزا یہ ہے کہ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ مجھے کو مس نہ کرے (ورنہ وہ بھی عذاب میں گرفتار ہو جائیگا) اور تیرے لئے ایک میعاد مقرر ہے جس کے خلاف نہیں ہوگا کہ زندگی میں تو یہ عذاب چکھتا رہے) اور دیکھ اپنے اس معبود کو جس کی تو نے پرستش کی ہے ہم اس کو آگ میں جلائینگے پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہادیں گے، اگر یہ خدا ہوتا تو ہم کو اس عمل پر قدرت نہ ہوتی۔

اس وقت بنی اسرائیل کو یقین آگیا کہ ہم فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے اور سب کو اس جماعت پر غبطہ اور رشک ہونے لگا، جسکی رائے حضرت ہارون کے مطابق تھی (یعنی یہ ہمارا خدا نہیں ہوسکتا) بنی اسرائیل کو اپنے اس گناہ عظیم پر تنبہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھول دے جس سے ہمارے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

ستر صلحا کا انتخاب اور توبہ کی درخواست

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کام کے لئے بنی اسرائیل میں سے ستر ایسے صلحاء نیک لوگوں کا انتخاب کیا جو پوری قوم میں نیکی اور صلاح میں ممتاز تھے اور جو اُن کے علم میں گوسالہ پرستی سے بھی دور رہے تھے اس انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لیا۔ ان ستر منتخب صلحاء بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر کوہ طور کی طرف چلے تاکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی توبہ قبول کرنے کے بارے میں عرض کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے تو زمین میں زلزلہ آیا جس سے موسیٰ علیہ السلام کو بڑی شرمندگی اس وفد کے سامنے ہوئی اور قوم کے سامنے بھی۔ اس لئے عرض کیا رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ط اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا، یعنی اے میرے پروردگار اگر آپ ان کو ہلاک ہی کرنا چاہتے تھے تو اس وفد میں آنے سے پہلے ہلاک کر دیتے اور مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے، کیا آپ ہم سب کو اس لئے ہلاک

کرتے ہیں کہ ہم میں کچھ بیوقوفوں نے گناہ کیا ہے۔ اور دراصل وجہ اس زلزلہ کی یہ تھی کی اس وفد میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحقیق وتفتیش کے باوجود کچھ لوگ ان میں سے شامل ہو گئے تھے جو پہلے گوسالہ پرستی کر چکے تھے اور انکے دلوں میں گوسالہ کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا وفریاد کے جواب میں ارشاد ہوا، وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ط فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری رحمت تو سب کو شامل ہے اور میں عنقریب لکھدوں گا اپنی رحمت (کا پروانہ) ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اتباع کرتے ہیں اس رسول امی کا جسکا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔

توبہ کی قبولیت

یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، اے میرے پروردگار، میں نے آپ سے اپنی قوم کی توبہ کے بارے میں عرض کیا تھا، آپ نے جواب میں رحمت کا عطا فرمانا میری قوم کے علاوہ دوسری قوم کے متعلق ارشاد فرمایا، تو پھر آپ نے میری پیدائش کو مؤخر کیوں نہ کر دیا کہ مجھے بھی اسی نبی امی کی امت مرحومہ کے اندر پیدا فرما دیتے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کا ایک طریقہ ارشاد ہوا کہ ان کی توبہ قبول ہونے کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے متعلقین میں سے باپ یا بیٹے جس سے ملے اسکو تلوار سے قتل کر دے اسی جگہ میں جہاں یہ گوسالہ پرستی کا گناہ کیا تھا۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی جن کا حال موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھا اور انکو بے قصور صالح سمجھ کر ساتھ لیا تھا مگر درحقیقت ان کے دل میں گوسالہ پرستی کا جذبہ اب تک تھا وہ بھی اپنے دل میں نادم ہو کر تائب ہو گئے اور انہوں نے اس شدید حکم پر عمل کیا جو ان کی توبہ قبول کرنے کے لئے بطور کفارہ نافذ کیا تھا (یعنی اپنے عزیز واقارب کا قتل) اور جب انہوں نے یہ عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے قاتل ومقتول دونوں کی خطا معاف فرما دی۔

شام پر قابض قوم کے خلاف جہاد

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی الواح جن کو غصہ میں ہاتھ سے رکھ دیا تھا اٹھا کر اپنی قوم کو لے کر ارض مقدسہ (شام) کی طرف چل دیے وہاں ایک ایسے شہر پر پہنچے جس پر جبارین کا قبضہ تھا جن کی شکل وصورت اور قد وقامت بھی ہیبت ناک تھی ان کے ظلم وجور اور قوت وشوکت کے عجیب وغریب قصے ان سے کہے گئے (موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر بنی اسرائیل پر ان جبارین کے حالات سن کر رعب چھا گیا اور) کہنے لگے اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑے جبار ظالم لوگ ہیں جن کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہم تو اس شہر میں اس وقت تک داخل نہیں ہونگے جب تک یہ جبارین وہاں موجود ہیں، ہاں وہ یہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم اس شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے دو آدمی

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ، اس روایت کے راویوں میں جو یزید بن ہارون ہے اس سے پوچھا گیا کہ کیا ابن عباسؓ نے اس آیت کی قرأت اسی طرح کی ہے، یزید بن ہارون نے کہا کہ ہاں ابن عباسؓ کی قرأت یوں ہی ہے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ سے مراد قوم جبارین کے دو آدمی ہیں جو اس شہر سے آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، انہوں نے بنی اسرائیل پر اپنی قوم کا رعب طاری دیکھ کر کہا کہ ہم اپنی قوم کے حالات سے خوب واقف ہیں تم ان کے ڈیل ڈول اور ان کی جسامت اور ان کی بڑی تعداد سے ڈر رہے ہو حقیقت یہ ہے کہ ان میں دل (کی قوت) بالکل نہیں اور نہ مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تم ذرا شہر کے دروازے تک چلے چلو تو دیکھ لینا کہ (وہ ہتھیار ڈال دیں گے) اور تم ہی ان پر غالب آؤ گے۔

اور بعض لوگوں نے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ دو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی قوم بنی اسرائیل کے تھے۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، یعنی بنی اسرائیل نے ان دونوں آدمیوں کی نصیحت سننے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب اس بیہودگی کیساتھ دیا کہ اے موسیٰ! ہم تو اس شہر میں اس وقت تک ہرگز نہ جائینگے جب تک جبارین وہاں موجود ہیں اگر

آپ انکا مقابلہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو آپ اور آپکا رب جا کر ان سے لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل پر حق تعالیٰ کے بیشمار انعامات کے ساتھ ہر قدم پر ان کی سرکشی اور بیہودگی کا مشاہدہ کرتے آ رہے تھے مگر اس وقت تک صبر و تحمل سے کام لیتے رہے، کبھی ان کے لئے بددعا نہیں کی، اس وقت ان کے اس بیہودہ جواب سے وہ بہت دل شکستہ اور غمگین ہو گئے اور ان کے لئے بددعا کی، ان کے حق میں فاسقین کے الفاظ استعمال فرمائے۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمالی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے بھی فاسقین کا نام دے دیا اور اس زمین مقدس سے ان لوگوں کو چالیس سال کے لئے محروم کر دیا اور اس کھلے میدان میں انکو ایسا قید کر دیا کہ صبح سے شام تک چلتے رہتے تھے کہیں قرار نہ تھا۔ مگر چونکہ اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے ان کی برکت اور طفیل سے اس قوم فاسقین پر اس سزا کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں بستی رہیں کہ اس میدان تیہ میں یہ جس طرف چلتے تھے بادل ان کے سروں پر سایہ کر دیتا تھا، ان کے کھانے کیلئے من و سلویٰ نازل ہوتے تھے، ان کے کپڑے معجزانہ انداز سے نہ میلے ہوتے تھے نہ پھٹتے تھے۔ اور ان کو ایک مربع پتھر عطا فرما دیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیدیا تھا کہ جب ان کو پانی کی ضرورت ہو تو اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو تو اس میں سے بارہ چشمے جاری ہو جاتے تھے، پتھر کی ہر جانب سے تین چشمے بہنے لگتے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں یہ چشمے متعین کر کے تقسیم کر دیئے گئے تھے تاکہ باہم جھگڑا نہ پیدا ہو اور جب بھی یہ لوگ کسی مقام سے سفر کرتے اور پھر کہیں جا کر منزل کرتے تو اس پتھر کو وہیں موجود پاتے تھے (قرطبی)

حضرت ابن عباسؓ نے اس حدیث کو مرفوع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے اور میرے نزدیک یہ درست ہے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث روایت کرتے ہوئے سنا تو اس بات کو منکر اور غلط قرار دیا جو اس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس قبطی کو قتل کیا تھا اور اسکا سراغ قوم

فرعون کو نہیں مل رہا تھا تو اس کی مخبری اس دوسرے فرعونی شخص نے کی جس سے دوسرے روز یہ اسرائیلی لڑ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس فرعونی کو تو کل کے واقعہ قتل کا علم نہیں تھا وہ اسکی مخبری کیسے کر سکتا تھا اس کی خبر تو صرف اسی لڑنے والے اسرائیلی کو معلوم تھی۔

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انکی حدیث کے اس واقعہ کا انکار کیا تو ابن عباسؓ کو غصہ آیا، اور حضرت معاویہؓ کا ہاتھ پکڑ کر سعد بن مالک زہریؓ کے پاس لے گئے اور ان سے کہا کہ اے ابو اسحاق کیا تمہیں یاد ہے جب ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتیل موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث بیان فرمائی، اس راز کا افشاء کرنے والا اور فرعون کے پاس مخبری کرنے والا اسرائیلی تھا یا فرعونی۔ سعد بن مالک نے فرمایا کہ فرعونی تھا کیونکہ اس نے اسرائیلی سے یہ سن لیا تھا کہ کل کا واقعہ قتل موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوا تھا اس نے اسکی شہادت فرعون کے پاس دے دی، امام نسائی نے یہ پوری طویل حدیث اپنی کتاب سنن کبریٰ کی کتاب التفسیر میں نقل فرمائی ہے۔

اور اس پوری حدیث کو ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسی یزید بن ہارون کی سند سے نقل کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے جس کو انہوں نے کعب بن احبار کی ان اسرائیلی روایات سے لیا ہے جن کے نقل کرنے اور بیان کرنے کو جائز رکھا گیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس کلام میں مرفوع حدیث کے جملے بھی شامل ہیں۔ امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں اس پوری حدیث اور اس پر مذکور الصدر تحقیق و تصدیق لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابو الحجاج مزی بھی ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی طرح اس روایت کو موقوف ابن عباسؓ کا کلام قرار دیتے تھے۔ انتہیٰ (تفسیر ابن کثیر از ۱۴۸ تا ۱۵۳ جلد ۳) یہاں پر حدیث الفتون مکمل ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے حاصل شدہ نتائج و عبر

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا اسقدر اہتمام فرمایا ہے کہ اکثر سورتوں میں اس کا کچھ نہ کچھ ذکر آہی جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ یہ قصہ ہزاروں عبرتوں اور حکمتوں پر اور خداوند سبحانہ، وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کے عجیب مظاہر پر مشتمل ہے جس سے انسان کا

ایمان پختہ ہوتا ہے اور اس میں عملی اور اخلاقی ہدایتیں بھی بیشمار ہیں چونکہ اس جگہ یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اسکے ذیل میں آئی ہوئی عبرتوں، نصیحتوں اور ہدایتوں کا کچھ حصہ بھی لکھ دیا جائے۔

فرعون کی احمقانہ تدبیر پر قدرت حق کا حیرت انگیز ردعمل

فرعون کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں کوئی لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا تو اسرائیلی لڑکوں کی پیدائش بند کرنے کے لئے قتل عام کا حکم دے دیا۔ پھر اپنی ملکی اور ذاتی مصلحت سے ایک سال کے لڑکوں کو باقی رکھنے اور دوسرے سال کے لڑکوں کے قتل کرنے کا فیصلہ نافذ کر دیا اللہ تعالیٰ کو قدرت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس سال میں پیدا کر دیتے جو سال بچوں کو باقی چھوڑنے کا تھا مگر قدرت کو منظور یہ ہوا کہ اس احمق کی اس ظالمانہ تدبیر کو پوری طرح اس پر الٹ دیا جائے اور اس کو خوب بیوقوف بنایا جائے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو اس سال میں پیدا فرمایا جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اور اپنی حکمت بالغہ سے صورت ایسی پیدا کر دی کہ موسیٰ علیہ السلام خود اس جبار، ظالم کے گھر میں پرورش پائیں، فرعون اور اس کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شوق و رغبت سے اپنے گھر میں پالا، سارے شہر کے اسرائیلی لڑکے موسیٰ کے شبہ میں قتل ہو رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام خود فرعون کے گھر میں آرام و آسائش اور عزت و اکرام کے ساتھ ان کے خرچ پر پرورش پا رہے تھے۔

در بہ بند و دشمن اندر خانہ بود حیلہ فرعون زیں افسانہ بود

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر معجزانہ انعام اور فرعونی تدبیر کا ایک اور انتقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر عام بچوں کی طرح کسی انا کا دودھ قبول کر لیتے تو ان کی پرورش اپنے دشمن فرعون کے گھر پھر بھی آرام کے ساتھ ہوتی مگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ان کی جدائی سے پریشان رہتیں اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی کسی کافر عورت کا دودھ ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کافر عورت کے دودھ سے بچا لیا اور ان کی والدہ کو بھی جدائی کی پریشانی سے نجات دی اور نجات بھی اس طرح کہ فرعون کے گھر والے ان کے ممنون احسان ہوئے ان پر ہدایا اور تحفوں کی بارش ہوئی اور اپنے ہی محبوب بچے کو دودھ پلانے پر فرعونی دربار سے معاوضہ بھی ملا اور عام ملازموں کی طرح فرعون کے گھر میں بھی رہنا نہ پڑا فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ.

فرعونی کافر شخص کا قتل جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ ہو گیا اس کو خطا کس بنا پر قرار دیا گیا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی مسلمان سے ایک فرعونی کافر کو لڑتا ہوا دیکھ کر فرعونی کو مکا مارا جس سے وہ مر گیا اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود بھی عمل شیطان فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس خطا کی معافی طلب کی وہ معاف بھی کر دی گئی۔

مگر یہاں ایک فقہی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرعونی شخص ایک کافر حربی تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام کا کوئی معاہدہ صلح بھی نہ تھا نہ اس کو اہل ذمہ کافروں کی فہرست میں داخل کیا جا سکتا ہے جن کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے، یہ تو حربی کافر تھا جس کا حکم اسلامی شریعت میں یہ ہے کہ وہ مباح الدم ہے اس کا قتل کوئی گناہ نہیں، پھر یہاں اس کو عمل شیطان اور خطا کس بنا پر قرار دیا گیا۔

عام کتب تفسیر میں کسی نے اس سوال سے تعرض نہیں کیا۔ احقر جب سیدی حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے حکم سے احکام القرآن کی تصنیف میں مشغول تھا اور اس میں یہ واقعہ زیر تحریر آیا تو حضرت نے اس سوال کا جواب یہ دیا تھا کہ اگرچہ اس فرعونی شخص سے براہ راست کوئی صریح معاہدہ صلح یا ذمہ کا نہیں تھا مگر چونکہ اس وقت نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکومت تھی نہ اس فرعونی کی، بلکہ دونوں حکومت فرعون کے شہری تھے اور ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن تھے یہ ایک قسم کا عملی معاہدہ تھا، فرعونی کے قتل میں اس عملی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی اس لئے اس کو خطا قرار دیا گیا اور یہ خطا چونکہ قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً ہو گئی اس لئے موسیٰ علیہ السلام کی عصمت نبوت کے منافی نہیں۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ اسی بنا پر مشترک ہندوستان میں جبکہ مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کی حکومت میں رہتے تھے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہ رکھتے تھے کہ وہ کسی ہندو کی جان و مال پر ظلم کرے۔

ضعیفوں کی امداد اور خدمت خلق دین و دنیا کیلئے نافع اور مفید ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر مدین سے باہر کنویں پر دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے ضعف کی بنا پر اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتی تھیں، یہ عورتیں بالکل اجنبی، اور موسیٰ علیہ السلام ایک مسافر تھے مگر ضعیفوں کی امداد و خدمت مقتضائے شرافت اور اللہ نے نزدیک محبوب عمل تھا اس لئے ان کے واسطے محنت اٹھائی، اور انکی بکریوں کو پانی پلا دیا اس کا اجر و ثواب تو اللہ کے پاس بڑا ہے۔ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے انکے اسی عمل کو مسافرانہ بے کسی اور بے سروسامانی کا ایسا علاج بنا دیا جو ان کی اگلی زندگی ان کی شان کے مطابق سنوارنے کا ذریعہ بن گیا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت اور ان کی دامادی کا شرف حاصل ہوا، جوان ہونے کے بعد جو کام ان کی والدہ کو کرنا تھا اللہ تعالیٰ نے غربت کے عالم میں اپنے ایک نبی کے ہاتھ سے انجام دلوایا۔

دو پیغمبروں میں اجیر اور آجر کا معاملہ اور اسکی حکمتیں اور فوائد عجیبہ

موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر مہمان ہو کر فرعونی سپاہیوں کے خوف سے مطمئن ہوئے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے صاحبزادی کے مشورہ پر ان کو اپنے یہاں اجیر رکھنے کا خیال ظاہر فرمایا اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور خلق اللہ کے لئے اہم ہدایتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول تھے ایک مسافر غریب الوطن کی اتنی امداد ان سے کچھ مستبعد نہ تھی کہ کچھ عرصہ اپنے یہاں بلا کسی معاوضہ خدمت کے مہمان رکھ لیتے مگر غالباً انہوں نے پیغمبرانہ فراست سے موسیٰ علیہ السلام کا عالی حوصلہ ہونا معلوم کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ دیر تک مہمانی قبول نہ کریں گے اور کسی دوسری جگہ چلے گئے تو ان کو تکلیف ہوگی اس لئے بے تکلف معاملہ کی صورت اختیار کر لی جس میں دوسروں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ کسی کے گھر جا کر اپنا بار اس پر ڈالنا شرافت کے خلاف ہے۔

دوسرے اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ورسالت سے فائز کرنا چاہتے تھے جس کے لئے اگر چہ کوئی مجاہدہ وعمل نہ شرط ہے اور نہ وہ کسی عمل ومجاہدہ عمل کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے وہ تو خالص اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ اور انعام ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو بھی مجاہدات اور محنت و مشقت کے دور سے گزارتے ہیں جو اخلاق انسانی کی تکمیل کا ذریعہ اور دوسروں کی اصلاح کا بڑا سبب بنتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اس وقت تک شاہانہ اعزاز واکرام میں گزری تھی آگے ان کو خلق خدا کے لئے ہادی ورہبر اور انکا مصلح بننا تھا، حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ اس مزدوری ومحنت کے معاہدہ میں ان کی اخلاقی تربیت کا راز بھی پوشیدہ تھا، عارف شیرازی نے اسی کو کہا ہے

شبان وادی ایمن گہے رسد بمراد　　کہ چند سال بجاں خدمت شعیب کند

تیسرے جو خدمت ان سے لی گئی وہ بکریاں چرانے کی تھی، یہ عجیب بات ہے کہ یہ کام اکثر انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا ہے۔ شاید اس میں یہ راز بھی ہو کہ بکری ایسا جانور ہے جو گلے سے آگے پیچھے بھاگنے کا عادی ہوتا ہے جس پر چرانے والے کو بار بار غصہ آتا ہے، اس غصہ کے نتیجہ میں اگر وہ اس بھاگنے والی بکری سے قطع نظر کرے تو بکری ہاتھ سے گئی وہ کسی بھیڑیئے کا لقمہ بنے گی اور اپنی مرضی کے تابع چلانے کے لئے اس کو مار پیٹ کرے تو وہ کمزور اتنی ہے کہ ذرا چوٹ مارو تو ٹانگ ٹوٹ جائے اس لئے چرواہے کو بڑے صبر وحلم سے کام لینا پڑتا ہے۔ عام خلق خدا تعالیٰ کا بھی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی حال ہوتا ہے جس میں انبیاء نہ ان سے صرف نظر کر سکتے ہیں اور نہ زیادہ تشدد کر کے ان کو راستہ پر لا سکتے ہیں صبر وحلم ہی کو شیوہ بنانا پڑتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام

حضرت خضر علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم کی سورہ کہف میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعہ کے ضمن میں موجود ہے اور اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری و صحیح مسلم کی ایک روایت میں ملتی ہے لہذا ہم پہلے اسی روایت کو لیتے ہیں پھر سورہ کہف کی آیات کا خلاصہ تفسیر اور اس کے ذیل میں مختلف جزوی تفصیلات کا بیان بھی آ جائے گا۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ

اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابی بن کعبؓ اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں اپنے سے زیادہ علم والا کوئی تھا نہیں اس لئے فرمایا کہ ''میں سب سے زیادہ علم والا ہوں'' اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بارگاہ انبیاء کو خاص تربیت دیتے ہیں اس لئے یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ادب کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس کو اللہ کے علم کے حوالے کرتے' یعنی یہ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں اعلم کون ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا' موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، وہ آپ سے زیادہ اعلم ہے، (موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب وہ مجھ سے زیادہ اعلم ہیں تو مجھے ان سے استفادہ کے لئے سفر کرنا چاہئے اس لئے عرض کیا یا اللہ مجھے ان کا پتہ نشان بتلا دیا جائے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لو' اور مجمع البحرین کی طرف سفر کرو' جس جگہ پہنچ کر یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہی جگہ ہمارے اس بندے کے ملنے کی ہے' موسیٰ علیہ السلام نے حکم کے مطابق ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی اور چل دیئے' ان کے ساتھ ان کے خادم

یوشع بن نون بھی تھے' دوران سفر ایک پتھر کے پاس پہنچ کر اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے یہاں اچانک یہ مچھلی حرکت میں آ گئی اور زنبیل سے نکل کر دریا میں چلی گئی اور مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کے ساتھ ایک دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ جس راستہ سے مچھلی دریا میں گئی اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا جریان روک دیا اور اس جگہ پانی کے اندر ایک سرنگ جیسی ہو گئی' (یوشع بن نون اس عجیب واقعہ کو دیکھ رہے تھے' موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے) جب بیدار ہوئے تو یوشع بن نون مچھلی کا یہ عجیب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بتلانا بھول گئے اور اس جگہ سے پھر روانہ ہو گئے' پورے ایک دن ایک رات کا مزید سفر کیا جب دوسرے روز کی صبح ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ کیونکہ اس سفر سے کافی تکان ہو چکا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (بقضائے الٰہی) موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے تکان بھی محسوس نہیں ہوا' یہاں تک کہ جس جگہ پہنچنا تھا اس سے آگے نکل آئے' جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو یوشع بن نون کو مچھلی کا واقعہ یاد آیا اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا' کہ شیطان نے مجھے بھلا دیا تھا' کہ اس وقت آپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ کی' اور پھر بتلایا کہ وہ مردہ مچھلی تو زندہ ہو کر دریا میں ایک عجیب طریقہ سے چلی گئی' اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی تو ہمارا مقصد تھا (یعنی منزل مقصود ہی تھی جہاں مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے)۔

چنانچہ اسی وقت واپس روانہ ہو گئے اور ٹھیک اسی راستہ سے لوٹے جس پر پہلے چلے تھے تا کہ وہ جگہ مل جائے' اب جو یہاں اس پتھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اس پتھر کے پاس ایک شخص سر سے پاؤں تک چادر تانے ہوئے لیٹا ہے' موسیٰ علیہ السلام نے اسی حال میں سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس غیر آباد جنگل میں سلام کہاں سے آ گیا' اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں تو حضرت خضرؑ نے سوال کیا کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے وہ خاص علم سکھلا دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے' اے موسیٰ! میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے وہ آپ کے پاس نہیں اور ایک علم آپ کو دیا ہے جو میں نہیں جانتا' موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں

گے اور میں کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلنے ہی کو تیار ہیں تو کسی معاملہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ میں خود آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلاؤں۔

یہ کہہ کر دونوں حضرات دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے' اتفاقاً ایک کشتی آ گئی تو کشتی والوں سے کشتی پر سوار ہونے کی بات چیت کی' ان لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور ان سب لوگوں کو بغیر کسی کرایہ اور اجرت کے کشتی میں سوار کر لیا کشتی میں سوار ہوتے ہی خضر علیہ السلام نے ایک کلہاڑی کے ذریعے کشتی کا ایک تختہ نکال ڈالا' حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی معاوضہ کے ہمیں کشتی میں سوار کر لیا' آپ نے اس کا یہ بدلا دیا کہ ان کی کشتی توڑ ڈالی کہ یہ سب غرق ہو جائیں یہ تو آپ نے بہت برا کام کیا' خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے' اس پر موسیٰ علیہ السلام نے عذر کیا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا' اس بھول پر آپ سخت گیری نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خضر علیہ السلام پر بھول سے ہوا تھا اور دوسرا بطور شرط کے اور تیسرا قصداً (اسی اثناء میں) ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دریا میں سے ایک چونچ بھر پانی لیا' خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ میرا علم اور آپ کا علم دونوں مل کر بھی اللہ کے علم کے مقابلہ میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جتنی اس چڑیا کی چونچ کے پانی کو اس سمندر کے ساتھ ہے۔

پھر کشتی سے اتر کر دریا کے ساحل پر چلنے لگے' اچانک خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ دوسرے لڑکوں میں کھیل رہا ہے' حضرت علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکے کا سر اس کے بدن سے الگ کر دیا' لڑکا مر گیا' موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا' یہ تو آپ نے بڑا ہی گناہ کیا' خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے' موسیٰ نے دیکھا کہ یہ معاملہ پہلے معاملہ سے زیادہ سخت ہے' اس لئے کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کوئی بات پوچھی تو آپ مجھے اپنے ساتھ سے الگ کر دیجئے' آپ میری طرف سے عذر کی حد پر پہنچ چکے ہیں۔

اس کے بعد پھر چلنا شروع کیا' یہاں تک کہ ایک گاؤں پر گزر ہوا' انہوں نے گاؤں

والوں سے درخواست کی کہ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھ لیجئے' انہوں نے انکار کردیا اس بستی میں ان لوگوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ گرا چاہتی ہے' حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کردیا' موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا کہ ہم نے ان لوگوں سے مہمانی چاہی تو انہوں نے انکار کردیا آپ نے اتنا بڑا کام کردیا اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت ان سے لے سکتے تھے' خضر علیہ السلام نے کہا کہ هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ (یعنی اب شرط پوری ہو چکی' اس لئے ہماری اور آپ کی مفارقت کا وقت آ گیا ہے)

اس کے بعد خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلا کر کہا ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا "یعنی یہ ہے حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ جی چاہتا ہے موسیٰ علیہ السلام اور کچھ صبر کر لیتے تو ان دونوں کی اور کچھ خبریں معلوم ہو جاتیں (انتہیٰ)

صحیح بخاری و مسلم میں یہ طویل حدیث اس طرح آئی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موسیٰ بنی اسرائیل اور نوجوان ساتھی کا نام یوشع بن نون ہونا اور جس بندے کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کی طرف بھیجا گیا تھا ان کا نام خضر ہونا تو تصریحاً مذکور ہے آگے آیات قرآن کے ساتھ ان کے مفہوم اور تفسیر کو دیکھئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی افضلیت

قرآن و سنت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے' اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی کا خاص شرف ان کی مخصوص فضیلت ہے' اور حضرت خضر علیہ السلام کی تو نبوت میں بھی اختلاف ہے' اور نبوت کو تسلیم بھی کیا جائے تو مقام رسالت حاصل نہیں' نہ ان کی کوئی کتاب ہے نہ کوئی خاص امت' اس لئے بہر حال موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے بدرجہا افضل ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے اس سفر کا پس منظر

حق تعالیٰ اپنے مقربین کی ادنیٰ سی کمی اور کوتاہی کی اصلاح فرماتے ہیں' ان کی تربیت کے لئے ادنیٰ سی کوتاہی پر بھی سخت عتاب ہوتا ہے' اس کا تدارک بھی ان سے اسی پیمانے پر

کرایا جاتا ہے یہ سارا قصہ اسی خاص انداز تربیت کا مظہر ہے ان کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا تھا کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں' حق تعالیٰ کو یہ پسند نہ آیا تو ان کی تنبیہ کے لئے اپنے ایک ایسے بندے کا ان کو پتہ دیا گیا جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا ایک خاص علم تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھا اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا علم ان کے علم سے درجہ میں بہت بڑھا ہوا تھا مگر بہر حال وہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہ تھا' ادھر موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے طلب علم کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ کہیں اور بھی علم ہے جو مجھے حاصل نہیں تو اس کے حاصل کرنے کے لئے طالب علمانہ سفر کے لئے تیار ہو گئے اور حق تعالیٰ ہی سے اس بندے خضر علیہ السلام کا پتہ پوچھا اب یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو خضر علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات یہیں آسانی سے کرا دیتے' یا موسیٰ علیہ السلام ہی کو طالب علم بنا کر سفر کرانا تھا تو پتہ صاف بتا دیا جاتا جہاں پہنچنے میں پریشانی نہ ہوتی مگر ہوا یہ کہ پتہ ایسا مبہم بتلایا گیا کہ جس جگہ پہنچ کر مری ہوئی مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے اس جگہ وہ ہمارا بندہ ملے گا۔

حضرت خضر پیغمبر نہیں ہیں

قرآن کریم میں اگرچہ اس صاحب واقعہ کا نام مذکور نہیں بلکہ عبدا من عبادنا کہا گیا' مگر صحیح بخاری کی حدیث میں ان کا نام خضر بتلایا گیا ہے' خضر کے لفظی معنی ہرے بھرے کے ہیں ان کا نام خضر ہونے کی وجہ عامہ مفسرین نے یہ بتلائی ہے کہ یہ جس جگہ بیٹھ جاتے تو کیسی ہی زمین ہو وہاں گھاس اگ جاتی اور زمین سرسبز ہو جاتی تھی' قرآن کریم نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ خضر علیہ السلام کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے' لیکن جمہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے' کیونکہ خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں ان میں سے بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الٰہی کے ہو نہیں سکتا' جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جا سکتا اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے ان کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خاص احکام وہ

دیئے گئے تھے جو بظاہر شریعت کے خلاف تھے' انہوں نے جو کچھ کیا استثنائی کے حکم کے ماتحت کیا' خود ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا وَمَا فَعَلْتُہٗ عَنْ اَمْرِیْ (یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا بلکہ امر الٰہی سے کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں' مگر ان کے کچھ تکوینی خدمتیں منجانب اللہ سپرد کی گئی تھیں انہی کا علم دیا گیا تھا' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی اسی لئے اس پر اعتراض کیا' تفسیر قرطبی' بحر محیط ابوحیان اور اکثر تفاسیر میں یہ مضمون بعنوانات مختلفہ مذکور ہے۔

کسی ولی کو ظاہر شریعت کے حکم کی خلاف ورزی حلال نہیں

یہیں سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ بہت سے جاہل غلط کار تصوف کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے' بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لئے کسی ولی کو صریح گناہ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا' یہ کھلا ہوا زندقہ اور باطل ہے' حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے ولی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا' اور نہ ظاہر شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جا سکتا ہے۔

شاگرد پر استاد کا اتباع لازم ہے

موسیٰ علیہ السلام نے باوجود نبی و رسول اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کے حضرت خضرؑ سے تعظیم و تکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ سے آپ کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں' اس سے معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کی تعظیم و تکریم اور اتباع کرے' اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے افضل و اعلیٰ بھی ہو (قرطبی' مظہری)

حضرت خضر کی طرف سے صبر کی شرط لگانا

حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے اور کیسے صبر کریں گے جب کہ آپ کو حقیقت امر کی اطلاع نہ ہو' مطلب یہ تھا کہ مجھے جو علم عطا ہوا ہے اس کی نوعیت آپ کے علم سے مختلف ہے' اس لئے آپ کو میرے

معاملات قابل اعتراض نظر آئیں گے جب تک کہ میں ان کی حقیقت سے آپ کو مطلع نہ کر دوں، آپ اپنے فرض منصبی کی بناء پر اس پر اعتراض کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا اس لئے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلاف شرع نہیں ہوگا، گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے اس لئے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں، لیکن پھر شریعت کے بارے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

پہلا واقعہ تو زیادہ سنگین بھی نہیں تھا، صرف کشتی والوں کا مالی نقصان یا غرق ہونے کا صرف خطرہ ہی تھا جو بعد میں رفع ہو گیا لیکن بعد کے واقعات میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ میں اعتراض نہیں کروں گا، اور جب لڑکے کے قتل کا واقعہ دیکھا تو شدت کے ساتھ اعتراض کیا اور اپنے اعتراض پر کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر آئندہ اعتراض کروں تو آپ کو حق ہوگا کہ مجھے ساتھ نہ رکھیں، کیونکہ کسی نبی اور پیغمبر سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ خلاف شرع کام ہوتا دیکھ کر صبر کرے، البتہ چونکہ دوسری طرف بھی پیغمبر ہی تھے اس لئے بالآخر حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ یہ واقعات جزئیہ خضر علیہ السلام کے لئے عام قواعد شرعیہ سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے انہوں نے جو کچھ کیا وحی الٰہی کے مطابق کیا (مظہری)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے علم کا فرق

یہاں طبعی امور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تصریح کے مطابق ان کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے تو ان دونوں کے احکام میں تضاد و اختلاف کیوں ہوا، اس کی تحقیق تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب اور دل کو لگنے والی ہے، ان کی تقریر کا مطلب جو میں سمجھا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاح خلق کی خدمت ہوتی

ہے' ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے جن میں خلق خدا کی ہدایت اور اصلاح کے اصول وقواعد ہوتے ہیں' جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن کریم میں بتصریح نبوت ورسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے جن کے سپرد تشریعی اور اصلاحی خدمات تھیں ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکۃ اللہ مقرر ہیں' مگر زمرہ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کرلیا ہے' حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں' تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں' کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو بچالیا جائے یا فلاں کو ہلاک کردیا جائے' فلاں کو ترقی دی جائے' فلاں کو زیر کیا جائے' ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہوتے ہیں' ایسے واقعات جزئیہ میں بعض وہ سورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریعی قانون کے خلاف ہے مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریعی قانون سے مستثنیٰ کر کے اس شخص کے لئے جائز کردیا گیا ہے جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے' ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علماء اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں' اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا' بعض واقعات جزئیہ کا عام قانون شریعت سے استثناء ہوتا ہے' ابوحیان نے بحر محیط میں فرمایا الجمھور علی ان الخضر نبی و کان علمہ معرفۃ بواطن قد اوحیت الیہ وعلم موسی الاحکام و الفتیا بالظاھر (بحر محیط ص ۱۴۷ ج ۶)

اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحی نبوت ہو' کسی ولی کا کشف والہام ایسا استثناء کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں' اسی لئے حضرت خضرؑ کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر کے مامور کئے گئے تھے' ان پر کسی غیر نبی کے کشف والہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے۔

ایک خارجی کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا جواب

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ بخدہ حروری (خارجی) نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ خضر علیہ السلام نے لڑکے نابالغ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ اگر کسی بچے کے متعلق تمہیں وہ علم حاصل ہو جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے عالم (یعنی خضر علیہ السلام) کو حاصل ہوا تھا تو تمہارے لئے بھی نابالغ کا قتل جائز ہو جائے گا مطلب یہ تھا کہ خضر علیہ السلام کو تو بذریعہ وحی نبوت اس کا علم ہوا تھا' وہ اب کسی کو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے' آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا جس کو بذریعہ وحی اس قسم کے واقعات کے متعلق کسی حکم خداوندی سے کسی خاص شخص کو مستثنیٰ کرنے کا علم ہو سکے (مظہری) اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ کسی شخص کو کسی حکم شرعی سے مستثنیٰ قرار دینے کا نبی صاحب وحی کے سوا کسی کو حق نہیں۔

خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا ان کی وفات ہو چکی

قرآن کریم میں جو واقعہ حضرت خضر علیہ السلام کا مذکور ہے اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد وفات پا گئے یا زندہ رہے' اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صریح بات مذکور نہیں بعض روایات و آثار سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے' بعض روایات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے' اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ سے علماء کی رائیں مختلف رہی ہیں' جو حضرات ان کی حیات کے قائل ہیں ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید داڑھی والے داخل ہوئے اور لوگوں کے مجمع کو چیرتے پھاڑتے اندر پہنچے اور رونے لگے' پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات کہے:۔

''اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے ہر مصیبت سے اور بدلا ہے ہر فوت ہونے والی چیز کا اور وہی قائم مقام ہے ہر ہلاک ہونے والے کا اس لئے اسی کی طرف رجوع کرو اسی کی طرف

رغبت کرو اور اس بات کو دیکھو کہ وہ تمہیں مصیبت میں مبتلا کر کے تم کو آزماتا ہے اصل مصیبت زدہ وہ ہے جس کی مصیبت کی تلافی نہ ہو"

یہ آنے والے کلمات مذکورہ کہہ کر رخصت ہو گئے تو حضرت ابوبکر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام تھے' اس روایت کو جزریؒ نے حصن حصین میں بھی نقل کیا ہے جن کی شرط یہ ہے کہ صرف صحیح السند روایات اس میں درج کرتے ہیں۔

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ دجال مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ تک پہنچے گا تو مدینہ سے ایک شخص اس کے مقابلہ کے لئے نکلے گا جو اس زمانے کے سب انسانوں میں بہتر ہوگا' یا بہتر لوگوں میں سے ہوگا' ابواسحٰق نے فرمایا کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (قرطبی)

اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الہواتف میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تو خضر علیہ السلام نے ان کو ایک دعاء بتلائی کہ جو اس کو ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کے لئے ثواب عظیم اور مغفرت و رحمت ہے وہ دعا یہ ہے:۔

یا من لا یشغله سمع عن سمع و یامن لا تغلطه المسآئل و یامن لا یبرم من الحاح الملحین اذ قنی برد عفوک و حلاوة مغفرتک (قرطبی)

"اے وہ ذات جس کو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیک وقت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالات میں کوئی مغالطہ نہیں لگتا اور وہ ذات جو دعا میں الحاح و اصرار کرنے اور بار بار کہنے سے ملول نہیں ہوتا' مجھے اپنے عفو و کرم کا ذائقہ چکھا دیجئے' اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرمایئے۔"

اور پھر اسی کتاب میں بعینہ یہی واقعہ اور یہی دعاء اور خضر علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی نقل کیا ہے (قرطبی)

اسی طرح اولیاء امت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔

حیاتِ خضر کے منکرین کے دلائل

اور جو حضرات خضر علیہ السلام کی حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا بڑا استدلال اس

حدیث سے ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخرِ حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے۔

ار ء یتکم لیلتکم هذه فان علی راس مائة سنة منها لا یبقی ممن هو علی ظهر الارض احد

"کیا تم اپنی آج کی رات کو دیکھ رہے ہو اس رات سے سو سال گزرنے پر کوئی شخص ان میں سے زندہ نہ رہے گا جو آج زمین کے اوپر ہے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس روایت کے بارے میں لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ سو سال پر یہ قرن ختم ہو جائیگا۔

یہ روایت مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ منقول ہے، لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی حجت نہیں جو حیات خضر علیہ السلام کو باطل کہتے ہیں، کیونکہ اس روایت میں اگرچہ تمام بنی آدم کے لئے عموم کے الفاظ ہیں، اور عموم بھی مؤکد کر کے لایا گیا ہے، مگر پھر بھی اس میں نص نہیں کہ یہ عموم تمام اولاد آدم علیہ السلام کو شامل ہی ہو، کیونکہ اولاد آدم میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جن کی نہ وفات ہوئی اور نہ قتل کیے گئے، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ علی الارض میں الف لام عہد کا ہے، اور مراد ارض سے ارض عرب ہے، پوری زمین جس میں ارض یاجوج و ماجوج اور بلاد شرق اور جزائر جن کا نام بھی عربوں نے نہیں سنا اس میں شامل نہیں، یہ علامہ قرطبی کی تحقیق ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے مسئلہ ختم نبوت کو حیات خضر کے منافی سمجھا ہے، اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ختم نبوت کے منافی نہیں حضرت خضرؑ کی حیات بھی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات نے حیاتِ خضر پر یہ شبہ کیا ہے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود ہوتے تو ان پر لازم تھا کہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپؐ

کے تابع ہو کر اسلامی خدمات میں مشغول ہوتے' کیونکہ حدیث میں ارشاد ہے لو کان موسیٰ حیاً لما وسعہ الا اتباعی۔ یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا (کیونکہ میرے آنے سے دین موسوی منسوخ ہو چکا ہے) لیکن یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور ان کی نبوت عام انبیاء شریعت سے مختلف ہو' ان کو چونکہ تکوینی خدمات منجانب اللہ سپرد ہیں وہ ان کے لئے مخلوق سے الگ تھلگ اپنے کام پر مامور ہیں' رہا اتباع شریعت محمدیہ تو اس میں کوئی بُعد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے انہوں نے اپنا عمل شریعت محمدیہ پر شروع کر دیا ہو' واللہ اعلم۔

علامہ ابو حیان اور مجدد الف ثانی کا موقف

ابو حیان نے تفسیر بحر محیط میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بھی نقل کئے ہیں' مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ:۔

''جمہور علماء اس پر ہیں کہ خضر علیہ السلام کی وفات ہو گئی۔'' (بحر محیط ص ۱۴۷ ج ۲)

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل اس میں ہے کہ جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے کشف سے فرمایا وہ یہ کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالم کشف میں دریافت کیا' انہوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہ السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں' واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مسئلہ حیاتِ خضر کی نوعیت

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت و حیات سے ہمارا کوئی اعتقادی یا عملی مسئلہ متعلق نہیں' اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت و وضاحت نہیں کی گئی' اس لئے اس میں زیادہ بحث و تمحیص کی بھی ضرورت نہیں' نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے' لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے اس لئے مذکورہ صدر تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں:۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

حضرت موسیٰ کی نیابت

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی مبارک کے واقعات میں حضرت ہارونؑ کے بعد تورات میں حضرت یوشع علیہ السلام (یشوع) کا ذکر بہ کثرت آتا ہے۔ ہم نے بھی صفحات گذشتہ میں دو تین جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے، یہ حضرت موسیٰ کی حیات میں ان کے خادم تھے اور حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین نبوت بنے، کنعان میں جابر اور مشرک قوموں کے حالات معلوم کرنے کے لئے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے اور جب حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو ان قوموں سے جنگ کرنے کی دعوت وترغیب دی اور انہوں نے انکار کیا، تب یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو جرأت وہمت دلانے کی کوشش کی اور اس کا وعدۂ نصرت یاد دلا کر جہاد پر اکسایا اور کہا کہ اگر تم جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ تو یقیناً فتح تمہاری ہے۔

تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں حق تعالیٰ نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع میرا خاص بندہ ہے اور بنی اسرائیل کے نوجوان اسی کی سرکردگی میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا کہ نون کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اس شخص میں "روح" ہے اور اسے الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے اسے وصیت کر، اور اپنے رعب داب سے اسے بہرہ ور کر دے تا کہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرمانبرداری کرے۔ (گنتی باب ۲۷ آیات ۱۹۔۲۰)

اور نون کا بیٹا یشوع (یوشع) دانائی کی روح سے معمور تھا کیونکہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے اور بنی اسرائیل ان کی بات مانتے رہے۔ (استثناء باب ۳۴ آیت ۹)

چنانچہ حضرت موسیٰ کے بعد ان ہی کی قیادت میں چالیس برس کے بعد بنی اسرائیل کی نسل ارض مقدس میں داخل ہوئی اور انہوں نے کنعان، شام، شرق اردن سے تمام جابرو ظالم طاقتوں کو پامال کر دیا۔

قرآن میں ذکر

قرآن عزیز میں حضرت یوشع (علیہ السلام) کا نام مذکور نہیں ہے، البتہ سورۂ کہف میں دو جگہ حضرت موسیٰ کے ایک نوجوان رفیق سفر کا تذکرہ موجود ہے جبکہ وہ حضرت خضر سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے **واذ قال موسیٰ لفتاہ فلما جاوزا قال لفتاہ** ایک صحیح حدیث میں جو حضرت ابی بن کعبؓ سے منقول ہے اس نوجوان رفیق کا نام یوشع بتایا گیا ہے۔ اس طرح گویا انکا ذکر بھی قرآن عزیز میں موجود ہے اہل کتاب کا ان کے نبی ہونے پر اتفاق ہے اور تورات (عہد قدیم) میں یشوع کی کتاب بھی مستقل صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

نسب

حضرت یوشع (علیہ السلام) بنی اسرائیل کے اسباط (اولاد) میں سے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے سبط سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ مؤرخین نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ یوشع بن نون بن فراہیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم (علیہم السلام)

عمالقہ سے جنگ

اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا یہ عجب مظاہرہ ہے کہ جس یوسف کی بدولت کنعان کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندان عزت وعظمت اور جاہ وجلال کے ساتھ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا، آج اس کے پوتے یوشع کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شماری کا یہ خاندان پھر اپنے آباء واجداد کے وطن کنعان میں اسی جاہ وجلال اور سطوت و جبروت کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع کو

حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کے اس قافلہ کو لے کر موعودہ سرزمین کی طرف بڑھو اور وہاں عمالقہ اور دوسری جابر قوموں سے جنگ کر کے ان کو شکست دو، میری مدد تمہارے ساتھ ہے، توراۃ میں ہے۔

اور اللہ کے بندے موسیٰ کی وفات کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے خادم نون کے بیٹے یشوع سے کہا۔ میرا بندہ موسیٰ مر گیا ہے سو اب تو اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر اس یردن کے پار اس ملک میں جا، جسے میں ان کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، جس جگہ تمہارے پاؤں کا تارا ٹکے اس کو جیسا میں نے موسیٰ کو کہا میں نے تم کو دیا ہے، بیابان اور اس لبنان سے لے کر بڑے دریائے فرات تک حشیوں کا سارا ملک اور مغرب کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہوگی، تیری زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا، جیسا میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہوں گا، میں نہ تجھ سے دستبردار ہوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا۔ (یشوع کی کتاب باب ۵۔۱)

ارض مقدس میں داخلہ

حضرت یوشع نے بنی اسرائیل کو اللہ کا پیغام سنایا اور وہ سب دشت سینا سے نکل کر ارض کنعان کے سب سے پہلے شہر اریحا (ریحو) کی جانب بڑھے اور دشمنوں کو للکارا، دشمنوں نے بھی باہر نکل کر سخت مقابلہ کیا اور آخر کار شکست کھا کر وہیں کھیت رہے اور بنی اسرائیل کو زبردست فتح و نصرت نصیب ہوئی اور آہستہ آہستہ اسی طرح یشوع اور بنی اسرائیل لڑتے لڑتے تمام ارض مقدس پر قابض ہو گئے اور جابر مشرکوں سے اس کو پاک کر کے ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی وطن کے مالک کہلائے۔

توراۃ میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کے لئے تیار ہوئے تو اللہ کے حکم سے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) ان کے ساتھ تھا، اس میں عصاء موسیٰ، پیرہن ہارون اور من کا مرتبان بھی تھا اور ان کے علاوہ دوسرے تبرکات بھی تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تم من کو محفوظ کر لو، تاکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی مشاہدہ کر لیں کہ تم پر اللہ کا انعام ہوا تھا۔

ابن اثیر فرماتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی ہی میں ارض مقدس میں جابر طاقتوں سے مقابلہ کے لئے حضرت یوشع کو امیر جیش نامزد کر کے بنی اسرائیل کے اسباط کی تقسیم اور ان کے سپہ سالاروں کی نامزدگیاں کردی تھیں اس لئے حضرت یوشع کا یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک حضرت اسامہ کا سا معاملہ تھا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زندگی مبارک ہی میں شام کی تسخیر کے لئے حضرت اسامہ کو امیر منتخب کیا تھا اور دست مبارک سے ان کے لئے جھنڈا بنایا تھا، مگر لشکر ابھی روانہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور پھر خلافت صدیقی میں یہ ہوا کہ جیش اسامہ کو شام کی مہم پر روانہ کیا گیا اور آخر کار یہی مہم روم، ایران اور عراق کی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ارض مقدس میں جابر مقدس کے استیصال کے لئے بحکم الٰہی حضرت یوشع کو امیر جیش بنایا اور جنگ کے ابتدائی مراحل کو خود انجام دیا، لیکن جیش کی روانگی سے قبل ہی حضرت موسیٰ کی وفات ہوگئی اور اب حضرت یوشع کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے بھی سرفراز فرمادیا اور ان ہی کے ہاتھوں آخر کار ارض مقدس مشرک اور جبار طاقتوں سے پاک ہوئی اور اریحا کی کامیابی تمام ارض مقدس کی فتح و نصرت کا پیش خیمہ بنی۔

حضرت یوشع نے سب سے پہلے کس شہر کو فتح کیا قرآن عزیز نے اس کا نام نہیں بتایا بلکہ ''قریہ'' کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس کا جو مقصد ہے۔ قریہ کی تعیین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین کہتے ہیں کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ بیت المقدس (یروشلم) ہے اور اریحا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے اس راستہ میں نہیں پڑتا اور نہ اللہ نے بنی اسرائیل سے اس کا وعدہ کیا تھا بلکہ بیت المقدس کا وعدہ تھا۔

مگر ہمارے نزدیک ان کا یہ فرمانا تو صحیح ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش فرمائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر بنی اسرائیل بیابان سینا سے براہ راست بیت المقدس کا ہی ارادہ کرتے تب بھی خشکی کی راہ سے ارض کنعان پہلے پڑتی اور اریحا اس کا پہلا شہر تھا، نقشہ

سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ خشکی کی راہ سے جب کوئی اس زمانہ میں بیابان سینا کو عبور کر کے یروشلم جانا چاہے تو اس کو کنعان سے ہی راہ ملے گی۔ نیز بنی اسرائیل سے اللہ کا وعدہ یہ تھا کہ وہ ان کو ان کے باپ دادا کی سرزمین میں واپس کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے باپ دادا کی سرزمین صرف بیت المقدس ہی نہیں ہے، بلکہ ارض کنعان بھی ہے، جہاں سے ہجرت کر کے حضرت یوسف و یعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں آ کر بسے تھے۔ لہٰذا ابن کثیر کے ہر دو دلائل کمزور بلکہ حقیقت کے خلاف ہیں۔ البتہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہونا اس لئے صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یوشع اور بنی اسرائیل نے اریحا میں سب سے پہلے عمالقہ کو شکست دی اور اس کے بعد ارض کنعان کو فتح کرتے ہوئے ارض فلسطین جا پہنچے اور بیت المقدس کو بھی فتح کر لیا اور چونکہ یہ مقام ان کی فتوحات کا مرکز اور مقصد وحید تھا اس لئے جب وہ بھی فتح ہو گیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کامیابی پر وہ حکم دیا جس کا ذکر قرآن عزیز میں ہے۔

بنی اسرائیل کی ناشکری

قرآن عزیز میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر ان کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اس نے حکم دیا کہ مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہونا بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح درگاہِ الٰہی میں خشوع کے ساتھ جھکتے ہوئے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا، تا کہ اللہ کے شکر گزار بندوں اور مغرور و سرکش انسانوں کے درمیان امتیاز رہے مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے وہ اتراتے ہوئے سر کو بلند کرتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے جا رہے تھے اور استغفار و نیازمندی کی بجائے سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ ٹھٹھہ (مذاق) کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ آخر غیرت حق کو جوش آیا اور جزاء اعمال کے قانون الٰہی نے عذاب کی صورت میں ان کو آ پکڑا۔

قرآن عزیز میں اس کو دو جگہ اختصار اور قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں۔

سورۂ بقرہ میں ہے کہ

اور جب ہم نے کہا! اس بستی میں داخل ہو اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاہو کھاؤ اور شہر کے دروازے میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہونا اور یہ کہتے ہوئے جانا "الٰہی ہماری خطاؤں کو معاف فرما" ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نکوکاروں کو اور زیادہ دیں گے پس ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا دوسرے قول میں بدل دیا، پس ہم نے ظالموں پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے سخت عذاب بھیجا۔

سورۂ اعراف میں ہے کہ

اور پھر ان سے کہا گیا تم اس بستی میں رہو اور جس طرح تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو، اور یہ کہتے ہوئے شہر میں جاؤ! "اے اللہ! ہماری خطاؤں کو محو کر دے" اور شہر میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے اور سجدہ ریز ہو کر داخل ہو تو ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نیکوکاروں کو زیادہ دیں گے، پس ظالموں نے اس قول کو جو ان کو بتایا گیا تھا دوسرے قول سے بدل ڈالا پس ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا ان کے ظالم ہونے کی وجہ سے۔

ان الفاظ میں لفظ حطۃ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ نیز بنی اسرائیل نے کیا تبدل قول کر لیا تھا؟ یہ دو سوال ہیں جو تشریح طلب ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں ﴿ای مغفرۃ استغفروا﴾ اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں ﴿احطط عنا خطایانا﴾ (ابن کثیر ج ۱ ص ۹۸) دونوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ کہتے ہوئے داخل ہو "اللہ! ہم کو بخش دے اور ہماری خطاؤں کو محو کر دے۔" گویا حطۃ اس طویل عبارت کا اسی طرح مختصر (شارٹ) ہے جس طرح ﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾ کا ﴿بسملہ﴾ اور ﴿لاحول ولا قوۃ الا باللہ﴾ کا ﴿حوقلہ﴾ اور ﴿لا الہ الا اللہ﴾ کا ﴿ھللہ﴾ مختصر ہے اور بخاری کی ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل

نے حطة کی جگہ حبتہ فی شعرۃ کہنا شروع کردیا یعنی یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے ''ہم کو بالوں میں محفوظ والوں کی ضرورت ہے'' گویا اس اللہ کے حکم کے ساتھ ٹھٹول کرتے تھے اور سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے سرینوں کے بل چل رہے تھے یزحفون علیٰ استاھھم

روایت بخاری کی اس عبارت کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل سرینوں کے بل زمین پر گھسٹ کر چل رہے تھے مگر اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں چلنے کا یہ طریقہ تو کہیں بھی مروج و معقول نہیں ہے اور اس طرح تو خود کو مذاق اور مضحکہ بنانا ہے نہ کہ دوسروں کے ساتھ ٹھٹول کرنا۔ لہٰذا حدیث کے اس جملہ کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل شہر میں داخل ہوتے وقت سر جھکائے ہوئے چلنے کی بجائے اکڑتے ہوئے سربلند ہوئے چل رہے تھے یعنی جس طرح ایک مغرور انسان اکڑتے ہوئے اور مٹکتے ہوئے سرینوں کو حرکت دے دے کر ایک عجیب انداز سے چلتا ہے اسی طرح بنی اسرائیل بھی سرینوں کو ابھارے ان کی بل پر مٹکتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔

عذاب

غرض بنی اسرائیل نے اپنے کئے کی سزا پائی اور عذاب الٰہی کے سزاوار بنے وہ عذاب کیا تھا؟ قرآن عزیز نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی صرف رجزًا من السماء کہہ کر مبہم چھوڑ دیا ہے اور عبرت و بصیرت کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

سورۂ اعراف کے اس جملہ سے فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ پس ان میں سے جنہوں نے ظلم سے اس قول کو بدل دیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسپاسی اور نافرمانی کا یہ مذموم فعل بنی اسرائیل کی پوری جماعت سے سرزد نہیں ہوا تھا بلکہ ان میں سے ایک جماعت وہ تھی جو اللہ کے حکم کی فرمانبردار رہی اور جس نے تعمیل ارشاد میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ساتھ دیا۔

انسان کا انسانی اور اخلاقی فرض

(۱) حضرت یوشع اور بنی اسرائیل کے ان واقعات میں سب سے زیادہ جو بات جاذب توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ جب اس کو کسی مصیبت یا امتحان سے نجات ملے اور وہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر اپنی مراد کو پہنچے تو غرور ونخوت کے جال میں پھنس کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ میری ذاتی استعداد و قابلیت کا نتیجہ ہے بلکہ اللہ برتر کا شکر گزار ہے اور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے سر نیاز جھکا دے تا کہ رحمت الٰہی اس کو اپنے دامن میں چھپالے اور دنیا کی طرح آخر میں بھی وہ بامراد اور شادکام ہو۔

(۲) سخت سے سخت نا امیدی کی حالت میں بھی انسان کو اللہ سے ناامید نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اگر وہ مظلوم ہے اور ستم رسیدہ تو اللہ کا فضل اس کو بھی محروم نہیں چھوڑتا۔ البتہ دقیق اور دوررس حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے تاخیر ضرور ہو جاتی ہے۔

ناشکری کا انجام

جس قوم پر اللہ کا فضل واحسان اور انعام واکرام کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اگر شکر واطاعت کی بجائے ناسپاسی اور نافرمانی پر اتر آتی ہے تو پھر وہ جلد ہی اللہ کی بطش شدید اور سخت گرفت کا شکار بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی سرکشی وبغاوت مشاہدین اور تجربہ کے بعد ہے اور بے شبہ وہ سخت سزا کی مستوجب ہے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

انبیائے بنی اسرائیل میں ترتیب

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کا طویل سلسلہ ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچتا ہے، صدیوں کے اس دور میں کس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان کی صحیح تعداد رب العزت ہی جانتا ہے، قرآن عزیز نے ان میں سے چند پیغمبروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض کا ذکر تو تفصیل سے آیا ہے اور بعض کا اجمال کے ساتھ اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے تورات میں قرآن عزیز کی بیان کردہ فہرست پر چند اور پیغمبروں کا اضافہ ہے، اور ان کے واقعات و حالات کا بھی۔

ان اسرائیلی پیغمبروں کے درمیان تاریخی ترتیب اختلافی مسئلہ ہے ہم ابن جریر، طبری اور ابن کثیر کی ترتیب کو راجح سمجھتے ہیں اور اس لئے اس کے مطابق ان پیغمبروں کے حالات زیر بحث لائیں گے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بعد باتفاق تورات و تاریخ حضرت یوشع (علیہ السلام) منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دوسرے رفیق کالب بن یوحنا نے ادا کیا یہ حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲)

طبری کہتے ہیں کہ ان کے بعد سب سے پہلے جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت و رہنمائی کا فرض انجام دیا وہ حزقیل (علیہ السلام) ہیں۔

نام و نسب اور بعثت

تورات میں ہے کہ وہ بوذی کاہن کے بیٹے ہیں اور ان کا نام حزقی ایل ہے۔ (حزقی

ایل کی کتاب بنی اسرائیل کے یہاں کاہن، تبحر عالم وشیخ کامل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے) عبرانی زبان میں ایل اسم جلالت ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں اس لئے عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ "قدرت اللہ" ہے کہتے ہیں کہ حضرت حزقیل کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو ان کی والدہ بہت ضعیف اور معمر ہو چکی تھیں اس لئے اسرائیلیوں میں یہ "ابن العجوز" (بڑھیا کا بیٹا) کے لقب سے مشہور تھے۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۳)

حضرت حزقیل عرصہ دراز تک بنی اسرائیل میں تبلیغ حق کرتے اور ان میں دین و دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔

قرآن اور حزقیل علیہ السلام

قرآن عزیز میں حزقیل نبی کا نام مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ بقرہ میں بیان کردہ ایک واقعہ کے متعلق سلف صالحین سے جو روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرت حزقیل کے ساتھ ہی ہے۔

کتب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ یا ان کے پیغمبر حزقیل (علیہ السلام) نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں، دور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی یا قضاء و قدر کے فیصلہ سے روگردانی سمجھ کر اظہار ناراضی کرتے ہوئے ان کے لئے بددعا کی اور یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی بہرحال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ سب کے سب آغوش موت میں چلے گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان پر حضرت حزقیل علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے ان کی اس حالت پر اظہار افسوس کیا اور دعا مانگی کہ الٰہ العالمین

ان کو موت کے عذاب سے نجات دے تا کہ ان کی زندگی خود ان کے لئے اور دوسروں کے لئے عبرت و بصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعا قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونہ عبرت و بصیرت بنے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۴۴ قدیم، روح المعانی ج ۲ ص ۳۰ او تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۸۳۔ بخاری و مسلم کتاب الایمان و مستدرک ج ۲ ص ۲۵۹)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ اسرائیلی جماعت داوردان کی باشندہ تھی جو شہر واسط سے چند کوس پر اس زمانہ کی مشہور آبادی تھی اور یہ فرار ہو کر افیح کی وادی میں چلے گئے تھے وہیں ان پر موت کا عذاب نازل ہوا۔

قرآن عزیز میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْفَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (البقرہ ۲، آیت ۲۴۳)

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، پھر اللہ نے فرمایا کہ مرجاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

جہاد سے فرار

شریعت محمدیہ میں بھی میدان جہاد سے فرار (شرک باللہ کے بعد) سب سے بڑا گناہ شمار ہوتا ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد جبکہ انسان اپنی جان و مال کو اسکے سپرد کر دیتا ہے اور سپردگی ہی کا نام اسلام ہے تو پھر اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس کے حکم کے خلاف جان کو بچانے کی فکر کرے، جبن اور نامردی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی ہے اور راہ حق میں شجاعت ہی اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

اسی طرح جب انسان کا اذعان و اعتقاد اس یقین کو حاصل کر لے کہ یہ خیر و شر اور موت و حیات سب خالق کائنات کے قضا و قدر کے ہاتھ ہے تو پھر آن واحد کے لئے بھی اس کو خیال نہیں آتا کہ وہ اللہ کی مقررہ قدر کے متعلق یہ باور کرے کہ اس کا حیلہ اللہ کے فیصلہ کو رد کر سکتا ہے

اور ایک مقام پر اگر اس کی تقدیر نافذ ہے تو دوسرے مقام پر وہ اس کے اثر سے آزاد رہ سکتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں تقدیر کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر یہ یقین پیدا کر لے کہ میرا فرض اللہ کے احکام کی تعمیل ہے، رہا یہ امر کہ اس کی تعمیل میں جان کا خوف یا مال کی تباہی کا ڈر ہے تو یہ میرے اپنے اختیار میں نہیں ہے اگر قدرت کا ہاتھ جان و مال کی ہلاکت کا فوری فیصلہ کر چکا ہے تو دوسرے اسباب پیدا ہو کر عالم تکوین کے اس فیصلہ کو ضرور صادق کر دکھائیں گے یہی یقین انسان کو شجاع اور بہادر بناتا اور جبن و نامردی سے دور رکھتا ہے اس کی نظر صرف اداء فرض پر جم جاتی ہے اور وہ تکوینی فیصلوں کو اپنی دسترس سے بالاتر سمجھ کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تقدیر کے یہ معنی کبھی نہیں بتائے کہ ہاتھ پیر توڑ کر اور جدوجہد اور عمل کی زندگی کو چھوڑ کر غیبی مدد کے منتظر ہو بیٹھو اور اداء فرض کو یہ کہہ کر ترک کر دو کہ تکوینی فیصلہ کے مطابق جو کچھ ہونا ہوگا ہو رہے گا دراصل یہ خیال جبن اور نامردی کی پیداوار ہے جو اداء فرض سے روکتا اور تن آسانی کی دعوت دے کر ذلت کے حوالہ کر دیا کرتا ہے۔

آیت جہاد سے روایت کی تائید

ان آیات کے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان آیات کے بعد ہی دوسری ایت "آیت جہاد" ہے جس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اس کی راہ میں جنگ کرو اور چونکہ فریضہ جہاد سخت جانبازی اور فداکاری کی دعوت دیتا اور موت کے ڈر کو دل سے نکالتا ہے اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جس میں جہاد کے خوف سے بھاگ جانے والوں پر موت کا عذاب مسلط کیا گیا۔ تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور ان کے قلوب میں شجاعت و بہادری کا جذبہ اور جبن و نامردی کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

مردوں کو زندہ کرنا

یہ تمام تصریحات و تفصیلات جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں

ہیں کیونکہ احیاءِ موتٰی کا یہ معاملہ ان لوگوں کی عبرت کے لئے تھا جو قیامت کے دن حشر اجساد کے منکر ہیں کیونکہ بنی اسرائیل میں بھی مشرکین کا ایک ایسا گروہ تھا جو حشر اجساد کا قائل نہ تھا۔

ہم اگرچہ اس مسئلہ پر گذشتہ صفحات میں بحث کر آئے ہیں لیکن اس مقام پر بھی اس قدر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب کہ روحانیت (Spiritualism) کے ماہرین کے نزدیک یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ "روح" جسم سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے اور جسم کے گل سڑ جانے اور اس کی عنصری ترکیب کے مٹ جانے کے باوجود روح زندہ رہتی ہے نیز یہ بھی امر معقول ہے کہ جس ہستی سے کسی شے کو ترکیب دیا ہے وہ ترکیب کے بکھر جانے کے بعد دوبارہ اس کو ترکیب دے سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ حیات روح اور بکھرے ہوئے اجزاء کی دوبارہ ترکیب کے معقول ہونے کے بعد احیاءِ موتٰی کا انکار کیا جائے جو بعض خاص حالات میں نبی اور رسول کی تصدیق اور تائید کے لئے اسی دنیا میں بصورت معجزہ عالم وجود میں آ جاتا ہے۔

عالم دنیا میں عام قانون کے مطابق اگرچہ دوبارہ زندگی نہیں ملتی اور قیامت ہی کے دن حشر اجساد کا واقعہ پیش آئے گا لیکن خاص قانون کے پیش نظر کسی حکمت مصلحت کی بناء پر ایسا ہونا عقلاً نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا رہا ہے۔

لیکن جمہور کے خلاف مشہور تابعی مفسر ابن جریج کہتے ہیں کہ ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک تمثیل ہے جو جہاد سے ڈر کر بھاگنے والوں کی عبارت و بصیرت کے لئے قرآن نے بیان کی ہے کسی واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو بنی اسرائیل کی سابق تاریخ میں آیا ہو۔

ہمارے نزدیک جمہور کا قول صحیح ہے اس لئے کہ قرآن عزیز کے نظم کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات سے پہلے زن و شوہر سے متعلق طلاق کے بعض احکام بیان کئے جا رہے ہیں اور جہاد کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے البتہ ان آیات کے بعد آیت جہاد مذکور ہے پس اگر یہ آیات "جہاد" کی ترغیب و ترہیب کے لئے بطور تمثیل پیش کی گئی ہیں تو بلاغت کے اعتبار سے پہلے جہاد کا حکم مذکور ہوتا ہے اور پھر جہاد سے جی چرانے والوں کے لئے بطور تمثیل اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا حشر خراب ہوتا ہے مگر

یہاں اس کے برعکس ہے یعنی پہلے تمثیل بیان ہوئی ہے پھر آیت جہاد ہے۔

اس لئے صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب کلام کا رخ حکم جہاد کی جانب ہوا تو اس سے قبل بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا کہ اگلے وقتوں میں ایک قوم نے جہاد سے روگردانی کر کے اللہ کا عذاب مول لیا تھا۔ اور اس کے بعد مخاطبین قرآن کو حکم دیا گیا کہ جہاد کے لئے تیار رہیں اس طریق بیان کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس حکم کی روگردانی مشکل ہو جاتی اور وساوس وشبہات اور ہواجس وخطرات کا جو ہجوم جان بوجھ کر اس اہم موقع پر دل پر چھا جاتا ہے وہ مرد سلیم الطبع سے فوراً کافور ہو جاتا ہے اور پھر وہ خود کو حق کی راہ میں جاں سپاری کے لئے ہر طرح آمادہ پاتا ہے۔

حضرت حزقیل کی زندگی کی عبرتیں

حضرت حزقیلؑ اور بنی اسرائیل سے متعلق ان آیات میں جو بصیرتیں نمایاں طور پر ہم کو دعوت نظر دیتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(ا) اگر فطرت سلیم اور طبع مستقیم ہو تو انسان کی ہدایت اور بصیرت کے لئے ایک مرتبہ فکر وذہن کو حقائق کی جانب متوجہ کر دینا کافی ہے پھر اس کی انسانیت خود بخود راہ مستقیم پر گامزن ہو جاتی اور منزل مقصود کا پتہ لگا لیتی ہے لیکن اگر خارجی اسباب کی بناء پر فطرت میں کجی میں اور طبیعت میں زیغ پیدا ہو چکا ہو تو اس کو ہموار کرنے کے لئے اگرچہ بار بار اللہ کی پکار اس کو بیدار کرتی ہے مگر ہر مرتبہ کے بعد اس کی صلاحیتیں اور استعدادی قوتیں خفتہ ہو جاتیں بلکہ اور زیادہ غفلت میں سرشار ہو کر رہ جاتی ہیں حتیٰ کہ قوت واستعداد باطل ہو جاتی ہے اور اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے اس طرح کیا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ پ ا آیت ۷) تو پھر اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کے غضب اور اس کی پھٹکار کا نشانہ بن جاتی اور اس اعلان کی مستحق ٹھہرتا ہے ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ چنانچہ بنی اسرائیل کی پیہم سرکشی اور اللہ کے فرامین کے مقابلہ میں مسلسل بغاوت نے ان کی کج روی کو اس دوسری راہ پر ڈال دیا تھا اور حضرت حزقیل علیہ السلام کے دور میں بھی وہ اسی راہ بد کی تکمیل میں مصروف تھے مگر ان میں ایک چھوٹی سی

جماعت پیغمبروں کی رشد وہدایت کے سامنے ہمیشہ سر جھکاتی رہی اور لغزشوں اور خطا کاریوں کے باوجود اس نے راہ مستقیم کو گرتے پڑتے حاصل کر ہی لیا۔

(۲) جہاد اگرچہ قوم کے بعض افراد کے لئے پیغام موت بن کر ان کو دنیوی لذائذ سے محروم کر دیتا ہے لیکن وہ امت اور قوم کے لئے اکسیر حیات ہے اور نظام قومی وملی کے لئے بقاء ودوام کا کفیل اور ساتھ ہی آغوش موت میں جانے والے افراد کے لئے فانی اور ناپائیدار حیات کے عوض حیات سرمدی عطا کرنے والا ہے، یہی موت کا وہ فلسفہ ہے جس نے مسلمانوں کی زندگی کو دوسری قوموں سے الگ کر دیا تھا کہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے والا انسان حیات دنیوی سے اگر شاد کام رہا تو غازی اور مجاہد ہے اور اگر موت کا شربت حلق میں اتار لیا تو شہید ہے اسی لئے ارشاد ہے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرہ ۲، آیت ۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ حقیقی حیات تو ان ہی کو حاصل ہے لیکن تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو اور اسی لئے اس زندگی سے جان چھڑانے والے کے لئے یہ وعید ہے۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (الانفال ۸ آیت ۱۶)

اور جو کوئی اس روز (جہاد کے روز) ان (کافروں) کو اپنی پیٹھ دے گا سوائے اس شخص کے جو لڑائی کی جانب واپس آنے والا ہو یا اپنی جماعت میں پناہ تلاش کرنے والا ہو وہ اللہ کے غضب کی طرف لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

(۳) اسلام، شجاعت کو خلق حسن قرار دیتا اور بزدلی کو اخلاق ردیہ میں شمار کرتا ہے ایک حدیث میں مختلف اعمال بد کو شمار کراتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لغزش اور خطا کی راہ سے ان اعمال کا صدور ممکن ہے لیکن اسلام کے ساتھ جبن (بزدلی) کسی حال میں بھی جمع نہیں ہو سکتی مگر یاد رہے کسی پر بیجا قوت آزمائی کا نام شجاعت نہیں ہے بلکہ امر حق پر قائم ہو جانا اور باطل سے بے خوف بن جانا شجاعت ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

زمانہ

حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآن عزیز میں ان کے ابتدائی جانشینوں کے نام مذکور نہیں، حضرت یوشع علیہ السلام کا دو جگہ ذکر آیا، مگر ایک جگہ "فتی" (جوان) یعنی صاحب موسیٰ کہہ کر تذکرہ کیا اور دوسری جگہ یعنی مائدہ میں حضرت یوشع اور کالب بن یوفنا کو "رجلان" دو اشخاص کہہ کر تذکرہ کیا ہے اور حضرت حزقیل علیہ السلام کا ذکر جمہور کی روایت کے مطابق صرف قصہ کے ضمن ہی میں آتا ہے ورنہ آیت میں کسی صفت کے ساتھ بھی ان کا تذکرہ موجود نہیں ہے سب سے پہلے جس نبی اور پیغمبر کا ذکر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بعد قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، وہ حضرت الیاس (علیہ السلام) ہیں یہ حضرت حزقیلؑ کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا کے نام سے مشہور ہیں۔

نام

قرآن عزیز نے ان کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیا نبی کہا گیا ہے، بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک نبی کے دو نام ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے اول تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو نا قابل حجت قرار دیتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ج۱ص ۲۳۷، ۲۳۹) دوسرے قرآن عزیز کا انداز بیان بھی ان آثار کی تردید کرتا ہے اس لئے کہ اس نے انعام اور والصافات میں حضرت الیاس کے جو اوصاف و حالات قلم بند کئے ہیں ان میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جس سے ان دونوں پیغمبروں کے اوصاف و حالات کی مشابہت پر بھی استدلال کیا جا سکے چہ جائیکہ ان حالات کو صرف ایک ہی شخصیت سے متعلق سمجھ لیا جائے۔

علاوہ ازیں مورخین نے حضرت ادریس کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامے سے قطعاً جدا ہے جو حضرت الیاس سے متعلق ہے اور اس لحاظ سے دونوں کے درمیان صدیوں کا، بعد ہو جاتا ہے پس اگر یہ دونوں نام ایک ہی پیغمبر کے ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب اشارہ کرتا ہے اور مورخین ضرور ہر دو نسب ناموں کی وحدت کسی دلیل سے بیان کر سکتے۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت ابراہیم (علیہما السلام) کے درمیانی دور کے پیغمبر ہیں۔ اور حضرت الیاسؑ اسرائیلی نبی ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے بعد مبعوث ہوئے ہیں چنانچہ طبری کہتے ہیں کہ حضرت الیسع (علیہ السلام) کے چچازاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کی بعثت حزقیلؑ نبی کے بعد ہوئی ہے

نسب

بیشتر مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس حضرت ہارون (علیہما السلام) کی نسل سے ہیں اور ان کا نسب نامہ یہ ہے الیاس بن یاسین بن فخاص بنی یعزار بن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون (علیہ السلام)

قرآن کریم میں تذکرہ

قرآن عزیز میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر دو جگہ آیا ہے سورۂ انعام میں اور سورۂ صافات میں سورۂ انعام میں تو ان کو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں شمار کیا ہے اور والصافات میں بعثت اور قوم کی ہدایت سے متعلق حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔

سورہ	آیت	شمار
انعام	۸۵	۱
والصافات	۱۳۱۔۱۴۲	۹۔۱۰

بعثت

حضرت الیاس (علیہ السلام) کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر ان کی رسالت و ہدایت کا مرکز تھا۔

حضرت الیاس کی قوم مشہور بت بعل کی پرستار اور توحید سے بیزار شرک میں مبتلا تھی اللہ کے برگزیدہ پیغمبر نے ان کو سمجھایا اور راہ ہدایت دکھائی صنم پرستی اور کواکب پرستی کے خلاف وعظ و پند کرتے ہوئے توحید خالص کی جانب دعوت دی۔

قوم الیاس و بعل

یہ مشرق میں آباد شامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ یہ بت مذکر تھا اور زحل یا مشتری کا شنی سمجھا جاتا تھا۔

فینیقی، کنعانی، موآبی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے اس لئے بعل کی پرستش عہد قدیم سے چلی آتی تھی اور موآبی اور مدیانی اس کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے، چنانچہ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے منسوب تھا اور حضرت شعیب کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا بعض مورخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہبل بھی یہی بعل ہے۔

بعل دیوتا کی عظمت کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف مربیانہ عطاؤ نوال کی وجہ سے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم تھا، چنانچہ تورات میں سامی قوموں کی پرستش بعل کا ذکر کرتے ہوئے بعل کو بعل بریث اور بعل فغور کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے اور عقرونیوں کے یہاں بعلو بوب کا اور اضافہ پایا جاتا ہے کلدانیوں کے یہاں بعل باء کے زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے اور وہ اکثر بیل اور بیلوس یا بعل اور بعلوس بھی کہتے ہیں۔

سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک، سردار، حاکم اور رب کے آتے ہیں اسی لئے اہل عرب شوہر کو بھی (بعل) کہتے ہیں لیکن جب بعل پر الف لام لے آتے ہیں یا کسی شے کی جانب اضافت کر کے بولتے ہیں تو اس وقت فقط دیوتا اور معبود مراد ہوتا ہے۔

یہود یا مشرق اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کے لئے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لئے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اس کو بخورات کی دھونی دیتے اور اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چڑھاتے

تھے اور کبھی کبھی اس کو انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی۔ (دائرۃ المعارف البستانی ج ۵)

کتب تفسیر میں منقول ہے کہ بعل سونے کا تھا بیس گز کا قد تھا اور اس کے چار منہ تھے اور اس کی خدمت پر چار سو خادم مقرر تھے۔ (روح المعانی ۲۳ ص ۶۲۷)

حضرت الیاس کے زمانہ میں یمن و شام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاس کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی چنانچہ اسی تقریب سے قرآن عزیز میں اس کا ذکر آیا ہے۔ سورہ صٰفٰت میں ہے کہ:

"بے شبہ الیاس رسولوں میں سے ہیں اور وہ وقت ذکر کے قابل ہے جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر اللہ کو چھوڑے ہوئے ہو، اللہ ہی تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے پس انہوں نے الیاس کو جھٹلایا تو بے شبہ وہ لائے جائیں گے پکڑے ہوئے بجز ان کے جو چن لئے گئے ہیں اور ہم نے بعد کے لوگوں میں الیاس کا ذکر باقی رکھا، الیاس پر سلام ہو بے شبہ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔"

انبیائے کرام کی تین جماعتیں

سورۂ انعام میں حضرت الیاس کا جن آیات کے اندر ذکر آیا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم (علیہما السلام) کی ذریت اور ان کی نسل کے انبیاء و رسل کی ایک مختصر فہرست ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

"ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو ہدایت عطا کی اور نوح کو ہدایت بخشی ان سے پہلے اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد و سلیمان ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی یہی راہ دکھائی اور ہم اس طرح نیک کرداروں کو نیکی کا بدلہ دیتے ہیں اور زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔"

قرآن عزیز نے اس فہرست میں انبیاء علیہم السلام کو تین جدا جدا جماعتوں میں بیان

کیا ہے اس کی حکمت کیا ہے؟ اکثر مفسرین اس کے اکتشاف پر متوجہ ہوئے ہیں ان تمام اقوال میں سب سے بہتر توجیہی قول صاحب المنار کا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انبیاء ورسل کو تین جدا جدا جماعتوں میں اس لئے بیان فرمایا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصی امتیازات کے پیش نظر تین قسم کی جماعتیں تھیں بعض انبیاء علیہم السلام وہ تھے جو صاحب تخت وتاج اور صاحب حکومت تھے یا وزارت وسرداری کے مالک تھے اور بعض انبیاء علیہم السلام کی زندگی اس کے برعکس زاہدانہ اور راہبانہ تھی اور دولت وثروت سے یکسر نفور فقیرانہ معیشت کے حامل تھے اور بعض نہ تو اپنی قوم میں حاکم اور صاحب تاج وتخت تھے اور نہ خالص راہبانہ زندگی کے حامل، بلکہ ایک طرف قوم کے ہادی و پیغمبر تھے اور دوسری جانب متوسط معیشت سے وابستہ، لہٰذا جب قرآن عزیز نے ان انبیاء و رسل کا ذکر کیا تو ان کے زمانہائے بعثت اور بعض دوسری خصوصیات میں مشابہت سے الگ ہو کر اسی نقطۂ نظر سے ان کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ترتیب درجات کے لحاظ سے ترتیب ذکر کو بھی ضروری سمجھا، یعنی پہلی فہرست میں اوّل حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا جو نبی ورسول ہونے کے علاوہ صاحب مملکت بھی تھے اور اس کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحب مملکت نہ تھے مگر اوّل الذکر چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور ثانی الذکر حکومت مصر کے وزیر مختار کل تھے اور اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کا نام آیا جو نہ بڑی حکومت کے مالک تھے اور نہ چھوٹی ریاست کے مالک نہ کسی حکومت کے وزیر اور مختار کل بلکہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر تھے اور ان کے سردار بھی!

اور دوسری فہرست میں ان انبیاء کرام کا تذکرہ ہے جنہوں نے ساری عمر زہادت میں گزاری انہوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا اور نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یاد الٰہی کے بعد جہاں جگہ میسر آ جاتی ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے حضرت یحییٰ، زکریا، عیسیٰ علیہ السلام اور الیاس علیہم السلام اس سلسلہ میں بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

اور تیسری فہرست میں ان پیغمبروں کا نام مذکور ہے جنہوں نے نہ حکومت وسرداری کی اور نہ خالص زہادت اختیار کی بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حق تبلیغ وریاست ادا کیا، چنانچہ حضرت اسمٰعیل الیسع یونس اور لوط علیہم السلام اسی درمیانی زندگی کے حامل تھے۔

بنی اسرائیل کی بدبختی

حضرت الیاس علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ اگرچہ قرآن میں بہت مختصر مذکور ہے تاہم اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ یہود بنی اسرائیل کی ذہنیت اس درجہ مسخ تھی کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جس کے کرنے پر یہ حریص نہ ہوں اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جس کے یہ دلدادہ ہوں اور انبیاء ورسل کے ایک طویل اور پیہم سلسلہ کے باوجود بت پرستی عناصر پرستی، کواکب پرستی، غرض غیر اللہ کی پرستش کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے یہ پرستار نہ بنے ہوں۔

پس قرآن عزیز میں بنی اسرائیل سے متعلق ان واقعات میں جہاں ان کی بدبختی اور کج روی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ہم کو یہ موعظت وعبرت بھی حاصل ہوتی ہے کہ اب جبکہ انبیاء ورسل کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور خاتم النبیین کی بعثت اور قرآن عزیز کے آخری پیغام نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے تو ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کی مسخ فطرت اور تباہ ذہنیت کے خلاف خدائی احکام کو مضبوطی سے پکڑیں اور ان میں کجروی اور زیغ سے کام لے کر ان کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کریں گویا ہمارا شیوہ سپردو تسلیم ہو انکار و انحراف نہ ہو کہ ''اسلام'' کے یہی اور صرف یہی معنی ہیں۔

حضرت الیسع علیہ السلام

نام ونسب

وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات میں ہے کہ ان کا نام الیسع ہے اور یہ خطوب کے بیٹے ہیں، ابن اسحٰق نے اسی کو اختیار کیا ہے، کتب تواریخ میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرت الیسع حضرت الیاسؑ کے چچازاد بھائی ہیں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ان کے نسب کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہیں اور نسب نامہ اس طرح ہے۔

الیسع بن عدی شوتم بن افراہیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام) اور اگر تورات کے یسعیاہ نبی اور حضرت الیسع ایک ہی شخصیت ہیں تو تورات نے ان کو عموص کا بیٹا بتایا ہے۔

بعثت

حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ ہیں۔ اوائل عمر میں ان ہی کی رفاقت میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرت الیسع کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور انہوں نے حضرت الیاس ہی کے طریقہ پر بنی اسرائیل کی رہنمائی فرمائی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت الیسع کی عمر مبارک کیا ہوئی اور بنی اسرائیل میں کتنے عرصہ تک انہوں نے حق تبلیغ ادا کیا۔

قرآن اور حضرت الیسع

قرآن عزیز نے ان کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور سورۂ انعام اور سورۂ صٓ میں صرف ذکر پر اکتفا کیا ہے۔

وَاِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَیُوْنُسَ وَ لُوْطًا ط وَکُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۶ آیت ۸۶)

اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط اور ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

واذکر اسمٰعیل والیسع وذالکفل وکل من الاخیار (ص ۳۸ آیت ۴۸)

اور ذکر کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور ان میں سے ہر ایک نیک انسانوں میں سے تھے۔

موعظت

بنی اسرائیل کے ان نبیوں اور پیغمبروں کے واقعات سے جو کہ جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کے شرف صحبت اور مخلصانہ اتباع میں خلافت کے بعد منصب نبوت سے سرفراز ہوئے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحبت نیکاں حصول خیر کے لئے اکسیر اعظم ہے۔ رومی نے سچ کہا ہے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اگر ریاضات وطاعات کا سلسلہ ہزاروں سال بھی رہے مگر کسی کامل کی صحبت سے محرومی ہو تو بے شبہ یہ ایک بہت بڑی خامی ہے جس کا مداوا صحبت کامل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

حضرت شمویل علیہ السلام

بنی اسرائیل کی گذشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر

حضرت یوشع (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل جب سرزمین فلسطین میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اللہ کے حکم سے ان کے درمیان اس علاقہ کو تقسیم کر دیا تا کہ وہ امن واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دین حق کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ تورات یشوع باب ۲۳ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت یوشع (علیہ السلام) آخر عمر تک ان کی نگرانی اور اصلاح حال میں مصروف رہے اور ان کے معاملات اور باہمی مناقشات کے فیصلوں کے لئے قاضیوں کو مقرر کیا تا کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنا نظام قائم رکھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال تک یہ نظام یوں ہی قائم رہا کہ خاندانوں اور قبیلوں میں "سردار" حکومت کرتے اور ان کے مناقشات و معاملات کے فیصلے "قاضی" انجام دیتے تھے اور "نبی" ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کی خدمت سرانجام دیتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بفضل ایزدی ان ہی میں سے کسی قاضی کو منصب نبوت عطا ہو جاتا اور اس تمام عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لئے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ (قضاۃ باب ۲ آیات ۶۔۷ وقضاۃ باب ۲۱ آیات ۲۵) کبھی عمالقہ چڑھ آتے اور کبھی فلسطینی، کبھی مدیانی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی اور ان میں سے اگر کسی حملہ آور کو ہزیمت بھی ہو جاتی تو بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے اور لوٹ کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا کہ کبھی یہ فتح پا جاتے اور کبھی وہ غالب آ جاتے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیلی کاہن کے زمانہ میں اشدود حوالی غزہ کی فلسطینی قوم نے ان پر زبردست حملہ کیا اور شکست دے کر متبرک صندوق ''تابوت سکینہ'' بھی چھین کر لے گئے اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ، حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے عصاء اور پیرہن اور من کا مرتبان محفوظ تھے، فلسطینیوں نے اس کو اپنے مشہور مندر ''بیت دجون'' میں رکھ دیا۔ یہ مندر ان کے سب سے بڑے دیوتا ''دجون'' کے نام سے موسوم تھا دجون کا جسم انسانی چہرہ اور مچھلی کے دھڑ سے مرکب بنایا گیا تھا اور اسی مندر میں نصب تھا۔ نجار مصری کہتے ہیں کہ فلسطین کے مشہور رملہ کے قریب آج بھی ایک بستی بیت جون کے نام سے پائی جاتی ہے غالب گمان یہ ہے کہ تورات میں دجون کے جس مندر کا ذکر ہے وہ یہیں واقع ہوگا اور اسی نسبت سے بستی کا نام بھی بیت جون رکھا گیا۔ (قصص الانبیاء)

نام ونسب اور نبوت

عیلی کاہن کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کہ قضاۃ میں سے ایک قاضی سموئیل کو منجانب اللہ منصب نبوت عطا ہوا اور وہ نبی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لئے مامور ہوئے۔

بعض آثار میں مذکور ہے کہ جب حضرت الیسع (علیہ السلام) کی وفات ہوگئی تو مصر و فلسطین کے درمیان بحر روم پر آباد عمالقہ میں سے جالوت نامی جابر وظالم حکمران نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے ان کی آبادیوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے بہت سے سرداروں اور قبیلہ کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اور باقی کو مقہور و مغلوب کر کے ان پر اخراج مقرر کر دیا اور تورات کو بھی فنا کر دیا۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ ایسا نازک دور تھا کہ نہ کوئی نبی و رسول ان میں موجود تھا اور نہ سردار وامیر اور خاندان نبوت میں ایک حاملہ عورت کے علاوہ کوئی باقی نہ تھا مگر اس نکبت وادبار کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر فضل وکرم فرمایا اور اس عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شمویل رکھا گیا اور اس کی تربیت کا بار بنی اسرائیل کے ایک بزرگ نے اپنے ذمہ لیا، شمویل نے ان سے تورات حفظ کی اور دینی تعلیم کے مدارج طے کئے اور جب سن رشد کو پہنچے تو تمام بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے

لگے آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور بنی اسرائیل کی رشد وہدایت پر مامور کیا۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۱۴۲)

مورخین کہتے ہیں کہ شمویل حضرت ہارون (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔ (خازن ج ۲) اور ان کا نسب نامہ یہ ہے شموئیل بن حنہ بن عاقر (روح المعانی ج ۲ ص ۱۴۲) عاقر سے اوپر کی کڑیاں مذکور نہیں ہیں اور مقاتل کی روایت کے مطابق یہ اضافہ ہے اشموئیل بن بالی بن علقمہ بن یرخام بن یہو بن تہو بن صوف بن علقمہ بن ماحث بن عموص بن عزایا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵)

اشمویل عبرانی ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ اسمٰعیل ہوتا ہے اور کثرت استعمال سے اشمویل، شمویل رہ گیا۔

حضرت طالوت کا تقرر

جب شمویل (علیہ السلام) کے زمانہ میں بھی عمالقہ کی دست برد اور ظالمانہ شرارتیں اسی طرح جاری رہیں تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہم پر ایک بادشاہ (حاکم) مقرر کر دیں جس کی قیادت میں ہم ظالموں کا مقابلہ کریں اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ دشمنوں کی لائی ہوئی مصیبت کا خاتمہ کر دیں۔ تورات میں بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی کہ ”ہم پر ایک سلطان مقرر کر دیجئے“، وجہ یہ بیان کی ہے۔

اور ایسا ہوا کہ جب شموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں اور اس کے پہلوٹے کا نام یوئیل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کا نام ابیاہ۔ وہ دونوں بیرسبع میں قاضی تھے پر اس کے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے۔ تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے راستہ میں شموئیل کے پاس آئے اور اسے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔ (سیموئیل باب ۸ آیات ۲۴۔ ۶ و باب ۹)

اور آگے چل کر لکھا ہے کہ شموئیل کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انہوں نے فرمایا کہ اگر تم پر بادشاہ مقرر ہو گیا تو وہ سب کو اپنا خادم بنا لے گا۔ لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخر سموئیل نے اللہ سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل میں ساؤل طالوت نامی ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا جو نہایت وجیہ وشکیل اور قوی ہیکل تھا۔

ثعلبی نے طالوت کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ ساول بن قیش بن افیل بن صارد بن کورت بن افیح بن انیس بن بنیامین بن یعقوب بن اسحق بن ابراہیم۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۶)

بنی اسرائیل کی نکتہ چینی

لیکن قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر حضرت شموئیل (علیہ السلام) کا جو جواب نقل کیا ہے وہ اس سے جدا اور بنی اسرائیل کی عادات و خصائل کے عین مطابق ہے۔

قرآن عزیز میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل (علیہ السلام) سے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا۔

مجھے یہ خوف ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ کے لئے "جہاد" کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔

بنی اسرائیل نے بڑے قوت کے ساتھ جواب دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں جبکہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کر دیا ہے انہوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کیا۔

جب حضرت سموئیل (علیہ السلام) نے اتمام حجت کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کیا حق تعالیٰ نے ان کو مطلع فرمایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی دونوں لحاظ سے تم میں نمایاں ہے، تم پر بادشاہ مقرر کر دیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو منہ بنانے لگے اور ناگواری سے کہنے لگے، یہ شخص تو غریب ہے مالدار تک نہیں ہے۔ یہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے اور دراصل بادشاہت کے لائق تو ہم ہیں، ہم میں سے کسی کو مقرر کیجئے۔

مورخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبط لادی میں اور حکومت وسرداری کا سلسلہ سبط یہودا میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ سموئیل (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی نسل میں منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔

شروع میں کسی بات کے اقرار کر لینے اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طرۂ امتیاز بن چکی تھی اس لئے یہاں بھی کارفرما رہی کیونکہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سموئیل (علیہ السلام) کی نظر انتخاب بہر حال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی اس لئے جب انہوں نے خلاف توقع بنیامین کے گھرانے میں سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور ردوکد شروع کر دی۔

حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کی معترضین اور نکتہ چین سرداروں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو کبھی پائیدار اور مستقل نہیں رہنے دے گی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائے گی چنانچہ تم نے اب اسی لئے حیلہ جوئی شروع کر دی تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے سمجھ لیا ہے یعنی وسعت مال اور کثرت دولت تو یہ قطعاً غلط اور سراسر باطل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حکمران کے ذاتی اوصاف میں قوت علم اور طاقت جسم ضروری ہے اس لئے کہ یہی ہر دو وصف حسن تدبیر صحت فکر اور جرأت وشجاعت کے کفیل ہیں اور ان اوصاف میں طالوت (ساؤل) تم سب میں ممتاز اور نمایاں ہیں۔ چنانچہ سورۃ البقرہ آیت ۲۴۶، ۲۴۷ میں ہے کہ: ”کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں، جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانہ کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، ہمارے لئے ایک حکمران مقرر کر دیجئے نبی نے کہا! کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تم لڑنے سے انکار کر دو! سرداروں نے کہا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے جا چکے اور اپنی اولاد سے علیحدہ کئے جا چکے ہیں؟ پھر جب ان کو

لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی، اور اللہ بے انصافوں سے خوب واقف ہے پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو مقرر کر دیا ہے جب انہوں نے یہ بات سنی تو (اطاعت و فرمانبرداری کی بجائے) کہنے لگے وہ ہم پر کیسے حکمراں بن سکتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ ہم، حکمران بننے کے حق دار ہیں، علاوہ بریں اس کو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے نبی نے فرمایا (حکمران کا جو معیار تم نے بنالیا ہے وہ غلط ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کی قابلیت و استعداد میں تم پر اس کو برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اس کو وسعت عطا فرمائی ہے (اور تصرف و قدرت میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔" ان آیات میں جس نبی کا ذکر ہے وہ یہی سموئیل (علیہ السلام) ہیں۔

تابوت سکینہ

بنی اسرائیل کی اس ردوکد نے یہاں تک طول کھینچا کہ انہوں نے سموئیل (علیہ السلام) سے مطالبہ کیا کہ اگر طالوت کا تقرر منجانب اللہ ہے تو اس کے لئے اللہ کی کوئی "نشان" دکھائیے۔ حضرت سموئیل نے فرمایا کہ اگر تم کو اللہ کے اس فیصلہ کی تصدیق مطلوب ہے تو اتمام حجت کے لئے وہ بھی تم کو عطا کی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک صندوق (تابوت سکینہ) تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے اور جس میں "تورات" اور حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے تبرکات محفوظ ہیں وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس آ جائے گا اور حکمت الٰہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں فرشتے اسے اٹھالائیں گے اور وہ دوبارہ تمہارے قبضہ میں آ جائے گا۔

سورۃ البقرہ آیت ۲۴۸ میں ہے کہ اور ان کے نبی نے ان سے کہا طالوت کی اہلیت حکومت کی نشانی یہ ہے کہ (جو مقدس) تابوت (تم کھو چکے ہو اور دشمنوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے) تمہارے پاس واپس آ جائے گا اور فرشتے اس کو اٹھالائیں گے اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لئے (فتح و نصرت) کی طمانیت ہے اور موسیٰ و ہارون کے گھرانوں (کی مقدس یادگاروں) کا بقیہ ہے بے شبہ اس واقعہ میں تمہارے خالق کا بہت بڑا نشان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

حضرت سموئیل (علیہ السلام) کی یہ بشارت آخر بروئے کار آئی اور بنی اسرائیل کے سامنے ﴿ملائکۃ اللہ﴾ نے ﴿تابوت سکینہ﴾ طالوت کو پیش کر دیا اور اس طرح ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر وہ حضرت سموئیل کے اس الہامی فیصلہ کو قبول کر لیں تو کامیابی و کامرانی یقینی اور حتمی ہے۔

توراۃ میں ﴿تابوت سکینہ﴾ کی واپسی کی داستان جس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سفر سموئیل میں ہے کہ جب سے ﴿بیت دجون﴾ میں ﴿تابوت سکینہ﴾ لا کر رکھا گیا اس وقت سے فلسطینیوں نے روزانہ یہ منظر دیکھا کہ جب صبح کو وہ اپنے معبود ﴿دجون﴾ کی عبادت کے لئے جاتے ہیں تو اس کو منہ کے بل اوندھا پڑا پاتے ہیں اور صبح کو جب وہ اس کو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم کر دیتے ہیں تو شب گزرنے پر پھر اسی طرح اوندھا گرا ہوا پاتے ہیں پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ اس شہر میں اتنی کثرت سے چوہے پیدا ہو گئے کہ انہوں نے ان کے تمام حاصلات کو خراب اور تباہ کر دیا اور ایک خاص قسم کی گلٹیوں کی وبا نے وہاں گھر کر لیا جس سے سخت نقصان جان ہونے لگا۔ فلسطینیوں نے جب کسی طرح ان باتوں سے نجات نہ پائی تو غور و فکر کے بعد کہنے لگے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہم پر یہ تمام نحوست اس صندوق کی وجہ سے ہے لہٰذا اس کو یہاں سے نکالو۔

یہ سوچ کر فلسطینیوں نے اپنے کاہنوں اور نجومیوں کو جمع کیا اور ان سے تمام واقعات بیان کر کے علاج کا مطالبہ کیا۔ کاہنوں اور نجومیوں نے کہا کہ اس کا صرف یہی علاج ہے کہ جس طرح ممکن ہو جلد اس تابوت کو یہاں سے خارج کر دو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سونے کے سات چوہے بنائے جائیں اور سات گلٹیاں اور ان کو ایک گاڑی میں تابوت کے ساتھ رکھ دیا جائے اور گاڑی میں دو ایسی گائیں جوڑی جائیں جو دودھ دے رہی ہوں اور ان کو بستی کے باہر لے جا کر سڑک پر چھوڑ دیا جائے کہ جس جانب ان کا رخ ہو اس صندوق کو لے جائیں۔

چنانچہ فلسطینیوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ وہ گائیں خود بخود ایسے رخ پر چل پڑیں کہ جو بنی اسرائیل کی بستیوں کی جانب تھا اور آخر چلتے چلتے ایک ایسے کھیت پر جا کھڑی ہوئیں جہاں اسرائیلی اپنا کھیت کاٹ رہے تھے اسرائیلیوں نے جب صندوق کو دیکھا

تو مسرت وخوشی سے مدہوش ہو گئے اور دوڑے دوڑے شہر بیت شمس میں جا کر خبر کی اور اس کے بعد بیت یعریم کے یہودی آ کر اس کو بڑے احترام سے لے گئے اور ابنداب کے گھر میں جو ٹیلہ پر واقع تھا حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا۔ (سموئیل باب ٦ باب ٧ آیات ١۔٢)

عبدالوہاب نجار نے اس واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ ﴿تابوت سکینہ﴾ کے متعلق قرآن عزیز میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ﴿تحمله الملئكة﴾ (اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے) اس سے یہ مراد ہے کہ ملائکۃ اللہ کی رہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق اور گاڑی کو بغیر کسی قائد وسائق کے منزل مقصود پر لے آئیں گی۔ لیکن قرآن اور بائبل کے مضامین کی تطبیق میں یہ تاویل اگرچہ بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے تاہم تاویل باطل ہے اور نظم قرآنی اس کا انکار کرتی ہے۔

اس لئے کہ قرآن عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوت سکینہ کی واپسی طالوت کی حکمرانی کے لئے اللہ کا ایک نشان ہے جو سموئیل (علیہ السلام) کے ہاتھوں پر اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ملائکۃ اللہ نے بنی سرائیل کی آنکھوں دیکھتے اس کو لا کر طالوت کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر توراۃ کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جوتی گئی گائیں بیت شمس کی سڑک پر لے جا کر چھوڑی گئی تھیں، البتہ انہوں نے دائیں بائیں رخ نہ کیا اور سیدھی چلتی رہیں حتیٰ کہ بیت شمس کے سامنے کھیتوں میں جا کھڑی ہوئیں جو فلسطینیوں کی حدود کے بعد پہلی سرحدی اسرائیلی بستی تھی اور اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ فلسطینی اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بیت شمس کی سرحد تک گئے اور جب گاڑی بیت شمس کے کھیتوں میں چلی گئی تب واپس ہوئے۔

سوان گایوں نے بیت شمس کی سڑک کی سیدھی راہ لی اور اس شاہراہ پر چلیں اور چلتے ہوئے ڈکارتی تھیں اور داہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلسطینی قطب ان کے پیچھے بیت شمس کے سوانے تک گئے اور بیت شمس سے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انہوں نے جو انکھیں اوپر کو کیں تو صندوق دیکھا۔ (سموئیل باب ٦ آیت ١٢)

اور ''تابوت'' کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ ''معجزہ'' یا ''نشان'' کی حیثیت نہیں رکھتا خصوصاً تورات میں یہ بھی تصریح ہے کہ ''بیت دجون'' کے کاہن اس کے پیچھے پیچھے اسرائیلی کھیتوں کے قریب تک آئے نیز قرآن عزیز ہرگز اس کے لئے یہ زوردار جملہ نہ کہتا۔

﴿ان فی ذٰلک لاٰیۃ لکم﴾ (البقرہ۲، آیت ۲۴۸)

بلاشبہ تمہارے لئے اس میں بہت بڑا نشان ہے۔

علاوہ ازیں قرآن عزیز کے طرز بیان اور اس کے نظم کلام سمجھنے کا جس کو معمولی سا بھی ذوق ہے وہ بہت آسانی کے ساتھ یہ جان سکتا ہے کہ اگر ''تابوت سکینہ'' بائبل کے بیان کردہ واقعہ کے مطابق حاصل ہوا تھا تو قرآن عزیز اس کو ﴿تحملہ الملئکۃ﴾ سے تعبیر نہ کرتا بلکہ ﴿تھدی بہ الملائکۃ﴾ یا اسی قسم کا کوئی ایسا جملہ کہنا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ ﴿تابوت سکینہ﴾ فرشتوں کی رہنمائی میں پہنچ جائے گا۔

اور اگر بالفرض توراۃ کی اس تفصیل کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ جب کہ بیت دجون میں صنم دجون تابوت سکینہ کی موجودگی میں روزانہ اوندھے منہ گر جاتا تھا اور اس واقعہ کی بدولت تابوت کو سرزمین دجون سے نکالا گیا تو یہ بھی بہر حال اسی قسم کا ''معجزہ'' اور ''نشان'' ہے جو ظاہری اسباب کے بغیر دجون کے مندر میں ظاہر ہوتا رہا لٰہذا جو شخص اس واقعہ کی پوری تفصیل کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے اس کو ﴿تحملہ الملئکۃ﴾ کے اس صاف اور سادہ معنی کے قبول کر لینے میں کیا اشکال ہوسکتا ہے کہ اللہ کے فرشتے آنکھوں دیکھتے اس کو اٹھا کر لے آئیں گے۔

طالوت و جالوت کی جنگ اور بنی اسرائیل کا امتحان

اس تمام ردوکد کے بعد بنی اسرائیل کو انکار کرنے کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا اور حضرت سموئیل کے الہامی فیصلہ پر طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

اب طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیر عام دیا کہ وہ دشمنوں (فلسطینیوں) کے مقابلہ کے لئے نکلیں۔ جب بنی اسرائیل طالوت کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تو بنی اسرائیل کی آزمائش کا ایک اور مرحلہ پیش آیا وہ یہ کہ طالوت نے یہ سوچا کہ جنگ کا معاملہ بے حد نازک ہے اور اس میں بعض مرتبہ ایک شخص کی بزدلی یا منافقانہ حرکت پورے لشکر کو تباہ کر دیا کرتی ہے اس لئے ازبس ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کو جہاد سے پہلے آزما لیا جائے کہ کون شخص تعمیل حکم، ضبط نفس اور صداقت و اخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے اور وہ

بزدل اور کمزور ہے تا کہ ادائے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے کیونکہ یہاں صبر و ثبات قدمی اور اطاعت و انقیاد اصل ہے لہٰذا جو شخص معمولی پیاس میں ضبط و صبر پر قدرت نہیں رکھتا وہ جہاد جیسے نازک معاملہ میں کس طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

چنانچہ جب یہ گروہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو طالوت نے اعلان کیا اللہ تعالیٰ اس نہر کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اس سے جی بھر کر پانی نہ پیئے لہٰذا جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ اللہ کی جماعت سے نکال دیا جائے گا اور جو تعمیل ارشاد کرے گا وہ جماعت میں شامل رہے گا البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کر لینے کی اجازت ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (البقرہ ۲، آیت ۲۴۹)

جب طالوت لشکریوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو نہر کے پانی کے ذریعہ آزمائے گا پس جو شخص اس سے سیراب ہو کر پیئے گا وہ میری جماعت میں نہ رہے گا اور جو ایک چلو پانی کے سوا اس سے سیراب ہو کر نہیں پیئے گا وہ میری جماعت میں رہے گا پھر تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب نے اس نہر سے سیراب ہو کر پی لیا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نہر اردن پر پیش آیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸)

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اصحاب طالوت کے برابر ہے۔ (بخاری باب المغازی)

بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ جب لشکر ندی کے پار ہو گیا تو جن لوگوں نے خلاف ورزی کر کے پانی پی لیا تھا وہ کہنے لگے کہ ہم میں جالوت جیسے قوی ہیکل اور اس کی جماعت سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جن لوگوں نے ضبط نفس اور اطاعت امیر کا ثبوت دیا تھا انہوں نے بے خوف ہو کر یہ کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے اس لئے کہ اللہ کی قدرت کا یہ مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں البتہ ایمان باللہ اور اخلاص و ثبات شرط ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ط قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًم بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ ۲، آیت ۲۴۹)

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو (حکم الٰہی پر سچا) ایمان رکھتے تھے، ندی کے پار اترے تو ان لوگوں نے (جنہوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی) کہا "ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آج جالوت سے اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں، لیکن وہ لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، پکار اٹھے (تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو؟) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

مجاہدین کا لشکر رب آگے بڑھا اور دشمن کی فوج کے مقابل صف آرا ہوا دشمن کی فوج کا سردار جالوت نامی دیو ہیکل شخص تھا اور اسکے لشکر کی تعداد بھی زیادہ تھی، مجاہدین نے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں اخلاص و تضرع کے ساتھ دعاء کی کہ دشمن کو شکست دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور اپنی فتح و نصرت سے شادکام بنا۔

تورات اور کتب سیر میں ہے کہ جالوت کی غیر معمولی شجاعت و بہادری نے بنی اسرائیل کو متاثر کر رکھا تھا اور اس کی مبارزطلبی کے جواب میں جھجک محسوس کرتے تھے۔

حضرت داؤد کی شجاعت

بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک نوجوان بھی تھا جو بظاہر کوئی نمایاں شخصیت نہیں رکھتا تھا اور نہ شجاعت و بہادری میں کوئی خاص شہرت کا مالک تھا یہ داؤد (علیہ السلام) تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے اور شرکت جنگ کے ارادے سے بھی نہیں آئے تھے بلکہ باپ کی جانب سے بھائیوں اور دوسرے اسرائیلیوں کے حالات کی تحقیق کے لئے بھیجے گئے تھے مگر جب انہوں نے جالوت کا شجاعانہ مبارزطلبی اور اسرائیلیوں کے پس و پیش کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا اور طالوت سے اجازت چاہی کہ جالوت کا جواب دینے کے لئے ان کو موقع دیا جائے طالوت نے کہا تم ابھی ناتجربہ کار لڑکے ہو اس لئے اس سے عہدہ براء نہیں ہو سکتے مگر داؤد کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور آخرکار طالوت کو اجازت دینی پڑی۔

داؤد (علیہ السلام) آگے بڑھے اور جالوت کو للکارا، جالوت نے ایک نوجوان کو مقابل پایا تو حقیر سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہ دی مگر جب دونوں کے درمیان نبرد آزمائی شروع ہوگئی تو اب جالوت کو داؤد کی بے پناہ شجاعت کا اندازہ ہوگیا۔ داؤد (علیہ السلام) نے لڑتے لڑتے اپنی گوپھن سنبھالی اور تاک کر پے در پے تین پتھر اس کے سر پر مارے اور جالوت کا سر پاش پاش کردیا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی گردن کاٹ لی۔ جالوت کے قتل کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور بنی اسرائیل کی جنگ مغلوبہ جارحانہ حملہ میں تبدیل ہوگئی اور طاغوتی طاقت کو شکست ہوئی اور بنی اسرائیل کامگار و کامراں واپس لوٹے۔ اس واقعہ نے حضرت داؤد کی شجاعت کا دوست و دشمن دونوں کے قلوب پر سکہ بٹھا دیا اور وہ بے حد ہر دل عزیز ہوگئے اور ان کی شخصیت بہت نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگی۔

اگرچہ قرآن عزیز نے ان تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کردیا ہے یا حقیقتاً یہ تفصیلات خود اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہیں لیکن اس پر قرآن اور تورات دونوں کا اتفاق ہے کہ جالوت کے قاتل حضرت داؤد (علیہ السلام) ہیں اور جالوت کے قتل سے اسرائیلیوں کو فتح اور دشمن کو شکست نصیب ہوئی۔ چنانچہ سورہ البقرہ ۲۵۰، ۲۵۱ میں ہے کہ:

''اور جب وہ (مجاہدین) جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل ہوئے تو کہنے لگے'' اے پروردگار! ہم کو صبر دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطا فرما'' بس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان (فلسطینیوں) کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کردیا اور اللہ نے داؤد کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور جو مناسب جانا وہ سب کچھ سکھایا۔''

بعض اسرائیلی روایات میں یہ بھی ہے کہ جالوت کی زبردست طاقت اور بنی اسرائیل کے اس کے مقابل ہونے میں جھجک کو دیکھ کر طالوت نے یہ اعلان کردیا تھا کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا اور اس کو حکومت میں بھی حصہ دار بناؤں گا چنانچہ جب داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کردیا تو طالوت نے وفاء عہد کے پیش نظر اس کے ساتھ اپنی لڑکی میکال کی شادی کردی اور حکومت میں بھی حصہ دار بنالیا۔ (شموئیل کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۹۰۸)

ایک اسرائیلی روایت

تورات کے صحیفہ سموئیل میں طالوت اور داؤد کے متعلق ایک طویل داستان پائی جاتی

ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ طالوت نے داؤد کے شجاعانہ کارناموں کی بناء پر حسب وعدہ ان سے اپنی بیٹی کی شادی کردی مگر بنی اسرائیل کی ان کے ساتھ والہانہ عقیدت اور ان کی غیر معمولی شجاعت کو اس نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اس کے دل میں ان کی جانب سے آتش بغض و حسد بھڑک اٹھی مگر اس نے اس کو پوشیدہ رکھا اور اندر ہی اندر ایسی ترکیبیں کرتا رہا کہ جس سے داؤد کا قصہ پاک ہو جائے۔

باپ کے خلاف طالوت کے لڑکے اور لڑکی داؤد کے رازدار اور ہمدرد رہے اور اس لئے ہر موقع پر طالوت کو ناکام ہونا پڑا آخر زچ ہو کر اس نے علی الاعلان داؤد کی مخالفت شروع کردی اور داؤد یہ دیکھ کر اپنی بیوی اور سالے کو ہمراہ لے کر فرار ہو گئے اور فلسطینیوں کے ایک قصبہ میں طالوت کے دشمن کے یہاں پناہ لی۔ اسرائیلیوں کی اس باہمی آویزش سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے فوج کشی کر کے اسرائیلیوں کو سخت ہزیمت دی۔

اب اس جگہ سے سدی کی روایت اور تورات کی روایت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے تورات کہتی ہے کہ طالوت اس جنگ میں مارا گیا اور سدی کہتا ہے کہ شکست کا یہ منظر دیکھ کر ساؤل (طالوت) اپنے کئے پر پچھتایا اور نادم ہوا اور وقت کے بزرگوں اور کاہنوں سے دریافت کیا کہ میری توبہ قبول ہونے کی بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ سب نے انکار کیا مگر ایک عابدہ عورت ''ہاں'' کہہ کر اس کو الیسع نبی کی قبر پر لے گئی اور دعا کی حضرت الیسعؑ قبر سے اٹھے اور اسے کہا کہ تیری توبہ کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ تو حکومت داؤد کے حوالے کردے اور اپنے خاندان سمیت جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر شہید ہو جا چنانچہ اس نے یہی کیا اور اس طرح حکومت داؤد کے ہاتھوں میں بلاشرکت غیرے آ گئی اور ساؤل (طالوت) نے مع خاندان کے جام شہادت پی لیا۔

یہ پوری داستان سموئیل کے صحیفہ سے ماخوذ ہے مگر سدی کے حوالے سے اصحاب سیر نے بھی اس اسرائیلی داستان کو اسلامی روایات کی طرح بیان کیا ہے حتیٰ کہ حضرت داؤد کی جو منقبت سورہ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے اس داستان کو اس کی تفسیر میں بیان کردیا گیا ہے معلوم نہیں کہ گذشتہ دور میں اسرائیلیات کی نقل کا اس قدر ذوق کیوں پیدا ہو گیا تھا کہ یہود نے جن داستانوں کو اپنی گمراہی اور غلط کاموں کی تائید کے لئے گھڑا تھا ان کو بھی اسلامیات

میں شامل کرنے سے احتیاط نہیں برتی گئی اور تاریخ وسیرت تو کجا تفسیر قرآن جیسی اہم کتاب بھی اس خرافات سے محفوظ نہ رہنے دیا گیا چنانچہ یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے۔

قرآن عزیز کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ جب سموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبہ پر طالوت (ساؤل) مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اتباع و انقیاد کا وعدہ کرنے کے باوجود اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انحراف کی راہ اختیار کی تھی مگر جب الٰہی نشان نے ان کو لاجواب بنا دیا تب مجبور و مقہور ہو کر طالوت کو اپنا اولوالامر تسلیم کیا چنانچہ علماء یہود اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ ہماری مجرمانہ عادات وخصائل کے اعداد و شمار میں یہ ایک مزید اضافہ ہے کہ ہم نے اللہ کے مامور انسان طالوت کو نااہل بنا کر شروع میں اس کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا ایسی صورت پیدا کرنی چاہئے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ طالوت (ساؤل) کے بارہ میں ''نااہلیت امارت'' کا جو دعوے ہم نے کئے تھے وہ صحیح اور سچ ظاہر ہو جائے۔ اور ہم کو دنیا کے سامنے یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ وہ امور تھے جن کو ہم نے اپنی فطانت و فراست سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور آخر کار طالوت (ساؤل) کی نالائقی اور نااہلیت ثابت ہو کر رہی۔ جرم ہلکا کرنے اور اپنی مجرمانہ خصلت پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ وہ اقدام ہیں جو سموئیل کی کتاب میں طالوت (ساؤل) اور حضرت داؤد علیہ السلام کی باہمی آویزش سے متعلق داستان میں نظر آ رہا ہے مگر وائے افسوس کہ ہمارے بعض ارباب سیر وروایان تفسیر نے بھی اس حقیقت تک پہنچے بغیر اپنی سادگی سے کتب سیر و تفسیر میں اس کو نقل کر دیا اور یہ توجہ نہ فرمائی کہ جس ہستی (طالوت) کو قرآن عزیز مامور من اللہ قرار دے رہا ہے اور جس کی برکت سے تابوت سکینہ بنی اسرائیل کو دوبارہ عطا ہو رہا ہے اور جس کو وزادہ بسطة فی العلم والجسم کہہ کر اس کے علم وشجاعت کو پرشوکت الفاظ میں سراہ رہا ہے ہم بغیر کسی دلیل و برہان قویم کے کس طرح ایسے شخص کو قابل نفرت حرکات کا حامل قرار دے کر مورد لعن وطعن بنا سکتے ہیں، قرآن عزیز سے یہ قطعاً بعید ہے کہ جس ہستی کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ معاصی میں گذر رہا ہو اور وہ جرائم کا مرتکب رہا ہو اس کے مناقب ومحامد کا تو ذکر کر دے اور اس کی زندگی کے دوسرے پہلو کو نمایاں نہ کرے پس جبکہ

قرآن عزیز نے طالوت کے ثناؤ منقبت کے علاوہ ایک لفظ بھی مذمت کا بیان نہیں کیا، بلکہ اس کی جانب اشارہ تک موجود نہیں ہے تو ایک مسلمان کے لئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ تورات کی اس خرافی داستان کو صحیح تسلیم کرے، حاشا و کلا!

یہی وجہ ہے کہ مشہور محقق ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو نقل کرنیکے بعد یہ فرمادیا۔

وفی بعض هذا نظر ونكارة اور اس قصہ کے بعض حصے اوپری داستان اور قابل اعتراض ہیں نیز یہ بھی فرمایا کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک عورت نے الیسع نبی کی قبر پر حاضر ہو کر ان کو موت سے جگایا، یہ خود اس واقعہ کے غلط ہونے کا عمدہ ثبوت ہے اس لئے کہ اس قسم کے معجزات کا ظہور انبیاء ورسل سے کبھی کبھی ہوتا ہے نہ کہ ایک زاہدہ وعابدہ عورت سے (البدایہ والنہایہ ص ۹) چنانچہ اسی وجہ سے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کی جانب مطلق توجہ نہیں فرمائی اور بلاشبہ یہ ہرگز توجہ کے قابل نہیں ہے۔

اسی دوران میں حضرت سموئیل (علیہ السلام) کا انتقال ہو گیا۔

بصیرتیں اور حکمتیں

سموئیل (علیہ السلام) طالوت اور داؤد (علیہ السلام) کے ذکر کردہ واقعات میں جو بصیرتیں اور حکمتیں پنہا ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں تاہم مختصر طور پر یہ چند قابل غور ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں اور امتوں کے مزاج میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ جب ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے اور کوئی قوی ان کو غلام بنا لینے کے خیال سے ظلم پر اتر آئے تو وہ اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کے لئے تشتت وافتراق کو چھوڑ کر وحدت مرکز کی جانب دوڑتی اور اپنے لئے ایک صالح اور قابل زعیم اور رہنما تلاش کرنے لگتی ہیں تا کہ وہ ان کی اس پستی کو بلندی سے بدل ڈالے چنانچہ بنو اسرائیل کا حضرت سموئیل (علیہ السلام) سے یہ مطالبہ ان کے لئے ایک آمر و سلطان منتخب کریں اسی فطری تقاضے کے پیش نظر تھا۔

۲۔ آزادی اور حفاظت حقوق کا یہ شعور بدرجہ کمال اقوام وامم کے خواص میں پہلے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ عوام تک پہنچتا ہے اور جس قوم اور جس امت میں ایسے خواص کثرت سے موجود ہوں گے اس قوم اور اس امت میں یہ جذبہ اسی قدر تیزی کے ساتھ پایا جائے گا۔

۳۔جب کسی قوم کے خواص میں اپنے استقلال اور دشمن کے مقابلہ میں حفاظت ودفاع کا شعور بہت زیادہ ترقی پا جاتا ہے تو وہ عوام اور خام کار افراد ملت وقوم کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا یہ شعور اور یہ جذبہ قومی عصبیت وحمیت میں خواص کے شعور سے کسی طرح کم نہیں ہے مگر جب یہ فکر، شعور سے گزر کر عمل وظہور کی وادی میں آتا ہے تو اس وقت ان پر اپنا عجز اور خامکاری ظاہر ہو کر رہتی ہے اور صادقین کاملین کے علاوہ اس وادی پر خار کی کوئی دوسرا رہ رو نظر نہیں آتا چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ط

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (البقرہ ۲، آیت ۲۴۶)

پھر جب ان (بنی اسرائیل) پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پیٹھ دکھا گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خبردار ہے۔

۴۔اقوام وامم کے مختلف جاہلی رسوم واعتقادات میں سے ایک مہلک اعتقاد یہ بھی رہا ہے کہ قیادت وحکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت وثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب ونسب میں بھی بلند مرتبہ ہو اقوام عالم کا یہ تخیل اس درجہ عام ہو رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب وتمدن اور عقل ودانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس فاسد عقیدہ میں جہالت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں بلکہ اس کو علمی اور عقلی رنگ دے کر جاہلی دور سے بھی زیادہ اس کی پابند ہیں۔ بنی اسرائیل کی نقوش بھی اس فاسد عقیدہ سے خالی نہ تھے اسی بناء پر انہوں نے طالوت کی امارت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہہ دیا۔

وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ (البقرہ ۲، آیت ۲۴۷)

اور ہم اس کے مقابلہ میں زیادہ مستحق حکومت ہیں اور اس کو وسعت دولت تو حاصل ہی نہیں

۵۔مگر اسلام نے اس جاہلانہ عقیدہ کے خلاف یہ واضح کیا کہ اللہ کے نزدیک حکومت و قیادت کا تعلق دولت وثروت سے وابستہ نہیں ہے اور نہ حسب ونسب اس کے لئے مدار ہے بلکہ علم اور قوت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سلسلہ کی شرط قرار دیئے جائیں اس لئے کہ حق وانصاف، حسن تدبیر واصابت رائے جو حکومت وزعامت کے لئے شرط اولین ہیں وہ مال و دولت اور

حسب ونسب سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مبدأ صفت "علم" قرار پاتی ہے۔ اسی طرح شجاعت و بسالت اور جرأت حق جو حکومت و قیادت کے لئے ازبس ضروری ہیں بیشتر ﴿بسطة فی الجسم﴾ کی رہین منت ہیں اس لئے کہ ﴿بسطة فی الجسم﴾ سے یہ مراد نہیں کہ عمدہ غذا بھی کھا کر وہ خوب فربہ ہو گیا ہو بلکہ جسم کی وہ طاقت وقوت مراد ہے جو میدان جہاد میں دشمن کے مقابلہ میں ہیبت وسطوت کا باعث اور قوت ورفعت اور جرأت قلب کے ساتھ متصف ہو۔

قرآن عزیز نے یہ بھی بتایا کہ قیادت وحکومت کے استحقاق کا یہ مسئلہ دین حق کے امتیازی مسائل میں سے ہے اور ہمیشہ وقت کے جاہلی دور کے مقابلہ میں انبیاء ورسل کی معرفت اقوام و امم کے سامنے دہرایا جاتا رہا ہے تاکہ جب وہ اس سلسلہ کی گمراہی میں مبتلا ہوں تو فوراً کسی نبی یا رسول یا ان کے نائبین کے ذریعہ ان کی گمراہی پر متنبہ کر کے ان کو ہدایت کی راہ دکھادی جائے چنانچہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل (علیہ السلام) کے سامنے طالوت کے خلاف متذکرہ بالا غلط استدلال پیش کیا تو حضرت سموئیل نے فوراً ان کو یہ کہہ کر اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

(البقرہ ۲، آیت ۲۴۷)

بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو فضیلت دی ہے اس کو علم اور جسمانی قوت کی وسعت عطا فرمائی ہے۔

۶۔ جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصین کاملین فداکارانہ جذبات کے ساتھ حمایت حق کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں خوداعتمادی اور توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامرانی وکامیابی کا مدار قلت و کثرت پر نہیں رہتا بلکہ قلت، کثرت پر بھاری ہو جاتی اور کثرت، قلت سے مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار قرآن عزیز نے اس طرح کیا ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ ۲، آیت ۲۴۹)

اور بارہا چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

نسب نامہ

قتل جالوت میں بے نظیر شجاعت کے اظہار نے بنی اسرائیل کے قلوب پر داؤد علیہ السلام کی محبت وعظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہو چکی تھی چنانچہ یہی داؤد آگے چل کر اللہ کے برگزیدہ رسول اور پیغمبر بنے اور بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لئے رسول اور ان کے اجتماعی نظم وضبط کے لئے خلیفہ مقرر ہوئے ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔

داؤد بن ایشا (ایشی) بن عوبد بن عابر (یا عابز) بن سلمون بن نحشون بن عونیاذب (یا عمی ناذب) بن ارم (یا رام) بن حصرون بن فارص بن یہوذ ابن یعقوب بن اسحق بن ابراہیم (علیہم السلام) خطوط کے اندر جو نام درج ہیں وہ ابن جریر سے منقول ہیں اور ثعلبی نے عرائس البیان میں بعض ناموں کی جگہ دوسرے نام بیان کئے ہیں مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ داؤد (علیہ السلام) اسرائیلی اسباط میں یہودا کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۰)

توراۃ میں ہے کہ ایشا یا ایشی کے بہت سے لڑکے تھے اور داؤد ان سب میں صغیر سن تھے۔

حلیہ مبارک

محمد بن اسحق نے وہب بن منبہ کے واسطہ سے حضرت داؤد کا حلیہ مبارک اس طرح نقل کیا ہے۔ پستہ قد نیلگوں آنکھیں، جسم پر بال بہت کم تھے چہرہ اور بشرے سے طہارت قلب اور نفاست طبع جھلکتی تھی۔

قرآن عزیز میں ذکر مبارک

قرآن عزیز میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، انعام، اسراء، انبیاء،

نمل، سبا اور ص میں آیا ہے ان سورتوں میں سولہ جگہ نام مذکور ہے اور بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیلی طور پر ان کے حالات و واقعات کا ذکر اور ان کی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔

نبوت و رسالت

حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالوت کی موجودگی میں ہی یا اس کی موت کے بعد عنان حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں آ گئی اور اس عرصہ میں ان پر اللہ کا ایک اور زبردست انعام یہ ہوا کہ وہ منصب نبوت و رسالت سے بھی سرفراز کر دیئے گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے، یہودا کے گھرانے میں نبوت چلی آتی تھی اور افراہیم کے خاندان میں حکومت و سلطنت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں یکجا جمع کر دی تھیں وہ اللہ کے پیغمبر اور رسول بھی تھے اور صاحب تاج و تخت بھی چنانچہ قرآن عزیز نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس شرف کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (البقرہ ۲، آیت ۲۵۱)

اللہ نے ان کو حکومت بھی عطا کی اور حکمت (نبوت) بھی اور اپنی مرضی سے جو چاہا سکھایا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (ص ۳۸ آیت ۲۶)

اے داؤد! بے شک ہم نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (الانبیاء ۲۱، آیت ۷۹)

اور ہم نے ہر ایک (داؤد و سلیمان) کو حکمت بخشی اور علم عطا کیا۔

انبیاء و رسل میں سے حضرت آدم کے علاوہ حضرت داؤد ہی وہ پیغمبر ہیں جن کو قرآن عزیز نے "خلیفہ" کے لقب سے پکارا ہے۔ تحقیق و کاوش کے بعد حضرت داؤد کی اس امتیازی خصوصیت کی دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں ایک صفحات آئندہ میں اپنے موقع پر آئے گی اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جبکہ بنی اسرائیل میں صدیوں سے قائم شدہ رسم کے خلاف حضرت

داؤد علیہ السلام میں نبوت ورسالت کے ساتھ حکومت وسلطنت بھی جمع کردی گئی تو ضروری تھا کہ ان کو ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی صفات علم وقدرت کا مظہر ہونے پر صراحت کرتا ہو اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے شریعت حقہ کی اصطلاح میں ''خلیفہ'' سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہوسکتا تھا۔

الحاصل حضرت داؤد (علیہ السلام) بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کی خدمت بھی سرانجام دیتے اور ان کی اجتماعی حیات کی نگرانی کا فرض بھی ادا فرماتے رہے۔

عظمت مملکت

قرآن عزیز، تورات اور اسرائیلی تاریخ اس کے شاہد ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام شجاعت وبسالت اصابت رائے اور قوت فکر وتدبیر جیسے اوصاف کے پیش نظر کامل ومکمل انسان تھے اور فتح ونصرت ان کے قدم چومتی تھی اور اللہ کا فضل وکرم اس درجہ ان کے شامل حال تھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ہمیشہ ان ہی کے ہاتھ رہتی اس لئے بہت تھوڑے عرصہ میں شام، عراق، فلسطین اور شرق اردن کے تمام علاقوں پر ان کا حکم نافذ اور ایلہ (خلیج عقبہ) سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک ان کے زیرنگیں تھا اور اگر حجاز کے بھی ان حصوں کو شامل کرلیا جائے جو ان کے قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے تو یہ کہنا کسی طرح بیجا ہوگا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی مملکت وحکومت بلاشرکت ''سامی اقوام'' کی واحد سلطنت تھی جو جدید فلسفہ تاریخ اقوام کے مطابق ''وحدت عرب'' یا اس سے بھی زیادہ وسیع ''وحدت اقوام سامیہ'' کی حکومت کہی جاسکتی ہے اور پھر کثرت لشکر اور وسعت حدود رقبہ مملکت کے ساتھ ساتھ ''وحی الٰہی'' کے شرف نے ان کی عظمت وشوکت اور صولت وہیبت کو اور بھی زیادہ بلند کردیا تھا اور رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داؤد (علیہ السلام) کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے یا ایسی کوئی مہم پیش کردی جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو یا کذب وافتراء نے اس پر زیادہ سے زیادہ ملمع کردیا ہو تب بھی ''وحی الٰہی کے ذریعہ ان پر حقیقت حال منکشف ہوجاتی ہے اس لئے جن وانس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کریں

چنانچہ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا مناقشہ لے کر داؤد (علیہ السلام) کی خدمت میں پیش ہوئے ہر ایک یہ کہتا تھا کہ یہ میری ملک ہے اور دوسرا غاصب ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے قضیہ کا فیصلہ دوسرے دن پر مؤخر کر دیا دوسرے دن انہوں نے مدعی سے فرمایا کہ رات میرے اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے لہٰذا تو صحیح صحیح بات بیان کر مدعی نے کہا اللہ کے سچے نبی! اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً حق اور سچ ہے لیکن اس واقعہ سے قبل میں نے اس (مدعی علیہ) کے باپ کو دھوکا دے کر مار ڈالا تھا یہ سن کر حضرت داؤد نے اس کو قصاص میں قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲)

اسی قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب پست اور فرمانبردار تھے، قرآن عزیز کی آیت ذیل میں حضرت داؤد کی اسی عظمت مملکت اور مواہبت حکمت و نبوت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (صٓ ۳۸، آیت ۲۰)

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اسکو حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی۔

اس آیت اور گذشتہ آیات میں ''حکمت'' سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ہے جو مفسرین کے یہاں زیر بحث ہے ہمارے نزدیک اقوال سلف کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ حکمت ہے دو باتیں مراد ہیں ایک نبوت اور دوسری عقل و دانش کا وہ مقام جس پر فائز ہو کر کوئی شخص راہ راست کی بجائے کبھی کج روی اختیار نہیں کر سکتا بعض علماء نے حکمت سے زبور مراد لی ہے اسی طرح ''فصل خطاب'' سے بھی دو امور کی جانب اشارہ ہے۔

(۱) وہ تقریر و خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے اور اس طرح بولتے تھے کہ لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ جدا جدا فہم و ادراک میں آتا تھا اور اس سے کلام میں فصاحت و لطافت اور شوکت بیان پیدا ہو جاتی تھی۔

(۲) ان کا حکم اور فیصلہ حق و باطل کے درمیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

زبور

بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لئے ''اصل اور اساس'' توراۃ تھی لیکن حالات وواقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی اللہ کی جانب سے زبور عطا ہوئی جو توراۃ کے قوانین واصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رشد وہدایت کے لئے بھیجی گئی تھی، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے شریعت موسوی کو از سر نو زندہ کیا اسرائیلیوں کو راہ ہدایت دکھائی اور نور وحی سے مستفیض ہو کر تشنہ کامان معرفت الٰہی کو سیراب فرمایا۔

زبور اللہ کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن عطا فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے ہیں تو جن وانس حتیٰ کہ وحوش وطیور تک وجد میں آجاتے اس لئے آج تک ''لحن داؤدی'' ضرب المثل ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو موسیٰؓ اشعری کے حسن صوت کو سنتے تو ارشاد فرماتے ''ابو موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤدی عطا فرمایا ہے (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱)

لغت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں چونکہ یہی کتاب دراصل توراۃ کی تکمیل کے لئے نازل ہوئی تھی اسی لئے گویا اس کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

زبور ایسے قصائد اور مسجع (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۲) کلمات کا مجموعہ تھا جس میں اللہ کی حمد وثنا اور انسانی عبدیت وعجز کے اعتراف اور پند ونصائح اور بصائر وحکم کے مضامین تھے۔

مسند احمد میں ایک روایت منقول ہے کہ زبور کا نزول رمضان میں ہوا اور وہ مواعظ وحکم کا مجموعہ تھی نیز بعض بشارات اور پیشین گوئیاں بھی منقول تھیں چنانچہ بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیت مسطورہ ذیل میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی بشارت سے متعلق ہے اور وہی اس کا مصداق ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ م بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء ۲۱ آیت ۱۰۵)

اور بیشک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ توراۃ، انجیل اور زبور کو اللہ کی وحی فرمایا ہے اور منزل من اللہ بتایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ دانستہ اللہ کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تحریف کر دی حتیٰ کہ اب ان کے حقائق پر اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جعل کے درمیان فرق کرنا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔

مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (النساء ۴، آیت ۴۶)

بعض یہودہ ہیں جو (توراۃ و انجیل و زبور) کے کلمات کو ان کی اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے ہیں۔

چنانچہ توراۃ و انجیل کے علاوہ خود زبور اس کی زندہ شہادت موجود ہے موجودہ زبور میں ان مختلف حصوں کی تعداد جن کو اہل کتاب کی اصطلاح میں مزبور کہا جاتا ہے ایک سو پچاس ہے ان حصوں پر جو نام درج ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب حصے حضرت داؤد کے "مزبور" نہیں ہیں کیونکہ بعض پر اگر حضرت داؤد کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغنیوں کے استاذ قورح کا اور بعض پر شوش نیم کے سروں پر آصف کا اور بعض پر گتیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے علاوہ ازیں بعض ایسے مزبور بھی ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں بعد تصنیف کئے گئے ہیں مثلاً یہ مزبور۔

اے اللہ قومیں تیری میراث میں گھس آئی ہیں، انہوں نے تیرے مقدس ہیکل کو ناپاک کیا ہے انہوں نے یروشلم کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ (مزبور ۷۹ تا ۸۴)

اس مزبور میں اس ہولناک واقعہ کا تذکرہ ہے جو بنوکدرزر (بخت نصر) کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو پیش آیا اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ داؤد (علیہ السلام) کے صدیوں بعد پیش آیا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد (علیہ السلام) پر زبور نازل فرمائی اور ان کے ذریعہ بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کا پیغام سنایا۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۵۵)

وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (النساء ۴، آیت ۱۶۳)

اور بے شک ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور

بخشی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤد پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کرلیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کرتے اور جب کس کر فارغ ہوتے تو پوری زبور ختم کر چکے ہوتے۔

انعاماتِ الٰہیہ

سورۂ انبیاء میں ہے کہ اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جس میں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے کذا فی الدر المنثور) فیصلہ کرنے لگے جبکہ اس (کھیت) میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اس کو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے سو ہم نے اس فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دے دی۔ اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا (یعنی داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا صورت مقدمہ کی یہ تھی کہ جس قدر کھیت کا نقصان ہوا تھا اس کی لاگت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی۔ داؤد علیہ السلام نے ضمان میں کھیت والے کو بکریاں دلوا دیں اور اصل قانون شرعی کا یہی مقتضا تھا جس میں مدعی یا مدعا علیہ کی رضا کی شرط نہیں مگر چونکہ اس میں بکری والوں کا بالکل ہی نقصان ہوتا تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے بطور مصالحت کے جو کہ موقوف تھی جانبین کی رضامندی پر یہ صورت جس میں دونوں کی سہولت اور رعایت تھی تجویز فرمائی کہ چند روز کے لئے بکریاں تو کھیت والے کو دی جائیں کہ ان کے دودھ وغیرہ سے اپنا گزر کرے اور بکری والوں کو وہ کھیت سپرد کیا جائے کہ اس کی خدمت آبپاشی وغیرہ سے کریں جب کھیت پہلی حالت پر آجائے کھیت اور بکریاں اپنے اپنے مالکوں کو دے دی جائیں۔ کذا فی الدر المنثور عن مرة وابن مسعود ومسروق وابن عباس ومجاهد وقتادہ والزہری۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں کہ ایک کی صحت دوسرے کی عدم صحت کو مقتضی ہو اس لئے كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا بڑھا دیا گیا) اور (یہاں تک تو

کرامت عامہ کا ذکر تھا جو دونوں حضرات میں مشترک تھی آگے دونوں حضرات کی خاص خاص کرامتوں کا بیان ہے) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ (ان کی تسبیح کے ساتھ) وہ (بھی) تسبیح کیا کرتے تھے اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (جیسا سورۂ سبا میں ہے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ) اور (کوئی اس بات پر تعجب نہ کرے کیونکہ ان کاموں کے) کرنے والے ہم تھے (اور ہماری قدرت کا عظیم ہونا ظاہر ہے پھر ان معجزات میں تعجب ہی کیا ہے) اور ہم نے ان کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھلائی (یعنی) تاکہ وہ (زرہ) تم کو (لڑائی میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے (اور اس نفع عظیم کا مقتضا یہ ہے کہ تم شکر کرو) سو تم (اس نعمت کا) شکر کرو گے بھی (یا ج نہیں () اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کا تیز ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے (مراد ملک شام ہے جو ان کا مسکن تھا کذا فی الدرعن السدی ویدل علیہ عمارته بیت المقدس یعنی جب ملک شام سے کہیں چلے جاتے اور پھر آتے تو یہ آنا اور اسی طرح جانا بھی ہوا کے ذریعہ سے ہوتا تھا جیسا درمنثور میں بروایت وتصحیح حاکم حضرت ابن عباسؓ سے اس کی کیفیت مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام مع اعیان ملک کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے پھر ہوا کو بلا کر حکم دیتے وہ سب کو اٹھا کر تھوڑی دیر میں ایک ایک ماہ کی مسافت قطع کرتی) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں (ہمارے علم میں سلیمان کو یہ چیزیں دینے میں حکمت تھی اس لئے عطا فرمائی) اور بعضے بعضے شیطان (یعنی جن) ایسے تھے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے لئے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر ان کے پاس لائیں) اور وہ اور کام بھی اس کے علاوہ (سلیمان کے لئے) کیا کرتے تھے اور (گو وہ جن بڑے سرکش اور شریر تھے مگر) ان کے سنبھالنے والے ہم تھے (اس لئے وہ چوں نہیں کر سکتے تھے)

معنی یہ ہیں کہ جو فیصلہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ تھا اللہ تعالیٰ نے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا۔ اس مقدمہ اور فیصلہ کی صورت اوپر خلاصہ تفسیر میں آ چکی ہے۔ جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی از روئے قانون شرعی غلط نہیں تھا مگر جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھایا اس میں فریقین کی رعایت اور مصلحت تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ پسندیدہ قرار دیا گیا۔ امام بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ اور زہری سے اس واقعہ کی روایت اس طرح کی ہے کہ دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں ایک شخص بکریوں والا دوسرا کھیتی والا تھا کھیتی والے نے بکریوں والے پر یہ دعویٰ کیا کہ اس کی بکریاں رات کو چھوٹ کر میرے کھیت میں گھس گئیں اور کھیت کو بالکل صاف کر دیا کچھ نہیں چھوڑا (غالباً مدعا علیہ نے اس کا اقرار کر لیا ہوگا اور بکریوں کی پوری قیمت اس کے ضائع شدہ کھیت کی قیمت کے برابر ہوگی اس لئے) حضرت داؤدؑ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ بکریوں والا اپنی ساری بکریاں کھیت والے کو دے دے۔ (کیونکہ جو چیزیں قیمت ہی کے ذریعہ لی اور دی جاتی ہیں جن کو عرف فقہاء میں ذوات القیم کہا جاتا ہے وہ اگر کسی نے ضائع کر دی تو اس کا ضمان قیمت ہی کے حساب سے دیا جاتا ہے بکریوں کی قیمت چونکہ ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے مساوی تھی اس لئے یہ ضابطہ کا فیصلہ فرمایا گیا) یہ دونوں مدعی اور مدعا علیہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت سے واپس ہوئے تو (دروازے پر ان کے صاحبزادے) حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی انہوں نے دریافت کیا کہ تمہارے مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا؟ ان لوگوں نے بیان کر دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر اس مقدمہ کا فیصلہ میں کرتا تو اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا جو فریقین کے لئے مفید اور نافع ہوتا۔ پھر خود والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی بات عرض کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تاکید کے ساتھ دریافت کیا کہ وہ کیا فیصلہ ہے جو دونوں کے لئے اس فیصلہ سے بہتر ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ بکریاں تو سب کھیت والے کو دے دیں کہ وہ ان کے دودھ اور اون وغیرہ سے فائدہ اٹھاتا رہے اور کھیت کی زمین بکریوں والے کے سپرد کر دیں کہ وہ اس میں کاٹ کر کے کھیت اگائے۔ جب یہ کھیت اس حالت پر آجائے جس پر بکریوں نے کھایا تھا تو کھیت کھیت والے کو دلوا دیں اور بکریاں

بکری والے کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فیصلے کو پسند فرما کر کہا کہ بس اب فیصلہ یہی رہنا چاہئے۔ اور فریقین کو بلا کر دوسرا فیصلہ نافذ کر دیا۔ (مظہری وقرطبی وغیرہ)

اگر کسی کے جانور دوسرے کی جان یا مال کو نقصان پہنچائیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کا خصوصی امتیاز

ارشاد الٰہی ہے کہ: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا

ظاہر ہے کہ اس سے مراد علوم انبیاء ہیں جو نبوت و رسالت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کے عموم میں دوسرے علوم وفنون بھی شامل ہوں تو بعید نہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی گئی تھی۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام زمرۂ انبیاء میں ایک خاص امتیاز یہ رکھتے ہیں کہ ان کو نبوت و رسالت کے ساتھ سلطنت بھی دی گئی تھی اور سلطنت بھی ایسی بے نظیر کہ صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنات اور جانوروں پر بھی ان کی حکمرانی تھی ان سب عظیم الشان نعمتوں سے پہلے حق تعالیٰ کے نعمت علم کا ذکر فرمانے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نعمت علم تمام دوسری نعمتوں ں سے فائق اور بالاتر ہے۔ (قرطبی)

مخصوص صفات

ارشاد الٰہی ہے کہ: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا، ''یعنی عطا کیا ہم نے داؤد کو اپنا فضل''، فضل کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، مراد وہ خاص صفات ہیں جو دوسروں سے زائد ان کو عطا کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی و پیغمبر کو بعض خاص صفات امتیازی عطا فرمائی ہیں جو ان کی مخصوص فضیلت سمجھی جاتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی مخصوص صفات یہ تھیں کہ ان کو اپنی نبوت و رسالت کے ساتھ پوری دنیا کی سلطنت وحکومت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور خوش آوازی کی ایسی صفت عطا فرمائی تھی کہ جب آپ اللہ کے ذکر یا زبور کی تلاوت میں مشغول ہوتے تو پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے سننے کو جمع ہو جاتے تھے، اسی طرح متعدد معجزات خصوصی عطا ہوئے تھے۔

پہاڑوں کا تسبیح کرنا

اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دے دیا تھا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کا ذکر و تسبیح کریں تو پہاڑ بھی وہ کلمات پڑھ کر لوٹائیں۔

یہ پہاڑوں کی تسبیح جو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کیساتھ کرتے تھے اس عام تسبیح کے علاوہ ہے جس میں کل مخلوقات شریک ہیں اور جو ہر جگہ ہر وقت ہر زمانے میں جاری ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی تسبیح نہ پڑھتی ہو مگر تم ان کی تسبیح ک سمجھتے نہیں" یہاں جس تسبیح کا ذکر ہے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے یہ ظاہر ہے کہ اس تسبیح کو عام سننے والے بھی سنتے سمجھتے ہوں گے، ورنہ پھر معجزہ ہی نہ ہوتا۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی آواز کے ساتھ پہاڑوں کا آواز ملانا اور تسبیح کو دہرانا یہ آواز بازگشت کے طور پر نہ تھا جو عام طور پر گنبد یا کنویں وغیرہ میں آواز دینے کے وقت آواز کے لوٹنے سے سنی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس کو حضرت داؤد علیہ السلام پر خصوصی فضل وانعام کی حیثیت میں ذکر فرمایا ہے، آواز بازگشت میں کسی کی فضیلت وخصوصیت سے کیا تعلق ہے وہ تو ہر انسان چاہے کافر ہی ہو بازگشت کی جگہ میں اس کی آواز بھی لوٹتی ہے۔

پرندوں کا مسخر ہونا

پرندے بھی آپ کی آواز پر ہوا میں جمع ہو جاتے۔ اور آپ کے ساتھ پہاڑوں کی طرح تسبیح کرتے تھے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً "یعنی ہم نے پہاڑوں کو داؤد علیہ السلام کا مسخر کر دیا تھا کہ صبح شام ان کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا۔

لوہے کا نرم ہونا

لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا تھا۔ حسن بصری، قتادہ، اعمش وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ کے لوہے کو ان کے لئے موم کی طرح نرم بنا دیا تھا کہ اس سے کوئی چیز بنانے

میں نہ ان کو آگ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ کسی ہتھوڑے یا دوسرے آلات کی۔ آگے آیت میں اس کا بیان ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ لوہے کی زرہ آسانی سے بنا سکیں، اور ایک دوسری آیت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زرہ سازی کی صنعت آپ کو خود سکھائی تھی۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ، یعنی ہم نے سکھائی ان کو صنعت زرہ بنانے کی'' اور اس آیت میں بھی آگے جو قدر فی السرد آیا ہے، یہ بھی اس صنعت کے سکھانے کی تکمیل ہے۔ لفظ قدر تقدیر سے مشتق ہے جس کے معنی ایک انداز ے پر بنانے کے ہیں، اور سرد کے لفظی معنی بننے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زرہ کے بنانے میں اس کی کڑیوں کو متوازن اور متناسب بنائیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی نہ ہو، تاکہ وہ مضبوط بھی بنے اور دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہو۔ قدر فی السرد کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ (ابن کثیر)

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صنعت میں ظاہری خوش نمائی کی رعایت بھی پسندیدہ چیز ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص ہدایت فرمائی۔

فائدہ دوم: بعض حضرات نے قدر فی السرد کی تفسیر میں تقدیر سے یہ مراد لیا ہے کہ اس صنعت کے لئے ایک مقدار وقت کی معین کر لینا چاہئے۔ سارے اوقات اس میں صرف نہ ہو جائیں، تاکہ عبادت اور امور سلطنت میں اس کی وجہ سے خلل نہ آئے۔ اس تفسیر پر معلوم ہوا کہ صنعتکار اور محنت کش لوگوں کو بھی یہ چاہئے کہ عبادت اور اپنی معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے کام سے کچھ وقت بچایا کریں اور اوقات کا انضباط رکھیں۔ (روح المعانی)

حضرت داؤد علیہ السلام کو صنعت زرہ سکھانے کی حکمت

تفسیر ابن کثیر میں امام حدیث حافظ ابن عساکر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنی خلافت و سلطنت کے زمانہ میں بھیس بدل کر بازاروں میں جاتے، اور مختلف اطراف سے آنے والے لوگوں سے پوچھا کرتے تھے کہ داؤد کیسا آدمی ہے؟ چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت میں عدل وانصاف عام تھا، اور سب انسان آرام وعیش کے ساتھ گزارہ کرتے تھے کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی، اس لئے جس سے سوال کرتے وہ داؤد علیہ السلام کی مدح وثناء اور عدل وانصاف پر اظہار شکر کرتا تھا۔

حق تعالیٰ نے ان کی تعلیم کے لئے اپنے ایک فرشتے کو بشکل انسان بھیج دیا جب داوٗد علیہ السلام اس کام کے لئے نکلے تو یہ فرشتہ ان سے ملا۔ حسب عادت اس سے بھی وہی سوال کیا، فرشتے نے جواب دیا کہ داوٗد بہت اچھا آدمی ہے اور سب آدمیوں سے وہ اپنے نفس کے لئے بھی اور اپنی امت و رعیت کے لئے بھی بہتر ہے، مگر اس میں ایک عادت ایسی ہے کہ وہ نہ ہوتی تو وہ بالکل کامل ہوتا۔ داوٗد علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا عادت ہے؟ فرشتے نے کہا کہ وہ اپنا کھانا پینا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ مسلمانوں کے مال یعنی بیت المال میں سے لیتے ہیں۔

یہ بات سن کر حضرت داوٗد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف الحاح وزاری اور دعا کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی ایسا کام سکھا دیں جو میں اپنے ہاتھ کی مزدوری سے پورا کروں، اور اس کی اجرت سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ کروں، اور مسلمانوں کی خدمت اور سلطنت کے تمام کام بلا معاوضہ کروں۔ ان کی دعا کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، ان کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی، اور پیغمبرانہ اعزاز یہ دیا کہ لوہے کو ان کے لئے موم بنا دیا تا کہ یہ صنعت بہت آسان ہو جائے، اور تھوڑے وقت میں اپنا گزارہ پیدا کر کے باقی وقت عبادت اور امور سلطنت میں لگا سکیں۔

حضرت داوٗد کی عبادت گزاری

ارشاد الٰہی ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ۔ اور یاد کیجئے ہمارے بندے داوٗد کو جو قوت والے تھے) تقریباً تمام مفسرن نے اسکا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ عبادت میں بڑی قوت وہمت کا ثبوت دیتے تھے اسی لئے اس کے بعد یہ جملہ ہے کہ ”انہ اواب (بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے) چنانچہ صحیحین کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نماز داوٗد علیہ السلام کی ہے، اور سب سے زیادہ پسندیدہ روزے داوٗد (علیہ السلام) کے ہیں وہ آدھی رات سوتے، ایک تہائی رات عبادت کرتے اور پھر رات کے چھٹے حصہ میں سو جاتے تھے، ور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار فرماتے تھے، اور جب دشمن سے ان کا مقابلہ ہو جاتا تو فرار اختیار نہ فرماتے تھے۔ اور بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے۔“ (تفسیر ابن کثیر)

عبادت کے اس طریقہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا کہ ایک تو اس میں مشقت زیادہ ہے، ساری عمر روزہ رکھنے سے آدمی روزے کا عادی ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اسمیں زیادہ مشقت نہیں رہتی، لیکن ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنے میں تکلیف مسلسل رہتی ہے، دوسرے اس طریقہ سے انسان عبادت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس، اہل و عیال اور متعلقین کے حقوق بھی پوری طرح ادا کر سکتا ہے۔

صلوٰۃ الضحیٰ

قرآن کریم میں ہے: بالعشی والاشراق، عشی کے معنی ہیں ظہر کے بعد سے اگلے دن صبح تک کا وقت اور اشراق کے معنی صبح کا وہ وقت جس میں دھوپ زمین پر پھیل گئی ہو۔ اس آیت سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے صلوٰۃ الضحیٰ کے شروع ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ صلوٰۃ الضحیٰ کو صلوٰۃ لاوابین اور بعض حضرات صلوٰۃ الاشراق طلوع آفتاب کے متصل والی دو یا چار نفلوں کے لئے زیادہ مشہور ہو گیا۔

صلوٰۃ الضحیٰ میں دو سے لے کر بارہ تک جتنی رکعتیں چاہیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ حدیث میں اس کے بہت سے فوائد وارد ہوئے ہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص صلوٰۃ الضحیٰ کی دو رکعتوں کی پابندی کر لے اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، خواہ وہ سمندری جھاگ جتنے ہوں'' اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص صلوٰۃ الضحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بنا دے گا۔'' (قرطبی)

علماء نے فرمایا ہے کہ یوں تو دو سے لے کر بارہ تک جتنی رکعتیں پڑھی جا سکیں وہ ٹھیک ہیں، لیکن تعداد کے لئے کوئی خاص معمول بنا لیا جائے تو بہتر ہے، اور یہ معمول کم از کم چار رکعت ہو تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول چار رکعتیں ہی پڑھنے کا تھا۔

زورِ خطاب

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (اور ہم نے ان کو

حکمت اور فیصلہ کر دینے والی تقریر عطا فرمائی) حکمت سے مراد تو دانائی ہے، یعنی ہم نے انہیں عقل و فہم کی دولت بخشی تھی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نبوت مراد ہے۔ اور ''فصل الخطاب'' کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد زور بیان اور قوت خطابت ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اونچے درجے کے خطیب تھے، اور خطبوں میں حمد وصلوٰۃ کے بعد لفظ ''اما بعد'' سب سے پہلے انہوں نے ہی کہنا شروع کیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے بہترین قوت فیصلہ مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جھگڑے چکانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی۔ درحقیقت ان الفاظ میں بیک وقت دونوں معنی کی پوری گنجائش ہے اور یہ دونوں باتیں ہی مراد ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے جو اس کا ترجمہ فرمایا ہے اس میں بھی دونوں معنے سما سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ واقع جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت گاہ میں دو فریقوں کو جھگڑتے ہوئے بھیج کر ان کا کوئی امتحان کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس امتحان پر متنبہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا اور سجدے میں گر پڑے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمادی۔ قرآن کریم کا اصل مقصد چونکہ یہاں یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور کبھی ذرا سی لغزش بھی ہو جائے تو فوراً استغفار کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ وہ امتحان کیا تھا؟ حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ کونسی لغزش ہوئی تھی جس سے انہوں نے استغفار کیا؟ اور جسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا۔

اسی لئے بعض محقق اور محتاط مفسرین نے ان آیات کی تشریح میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت و مصلحت سے اپنے جلیل القدر پیغمبر کی اس لغزش اور امتحان کی تفصیل کو کھول کر بیان نہیں فرمایا، اس لئے ہمیں بھی اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ اور جتنی بات قرآن کریم میں مذکور ہے، صرف اسی بات پر ایمان رکھنا چاہئے۔ حافظ ابن کثیرؒ جیسے محقق مفسر نے اپنی تفسیر میں اسی پر عمل کرتے ہوئے واقعہ کی تفصیلات سے خاموشی اختیار کی ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ سب سے زیادہ محتاط اور سلامتی کا راستہ ہے۔ اسی لئے علماء سلف سے

منقول ہے کہ ابھموا ما ابھمہ اللہ یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم چھوڑا ہے تم بھی اس کو مبہم رہنے دو۔ اسی میں حکمت ومصلحت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایسے معاملات کا ابہام ہے جن سے ہمارے عمل اور حلال وحرام کا تعلق نہ ہو اور جن معاملات سے مسلمانوں کے عمل کا تعلق ہو اس ابہام کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے رفع کر دیا ہے۔

اسرائیلی خرافات

البتہ دوسرے مفسرین نے روایات وآثار کی روشنی میں اس امتحان اور آزمائش کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عامیانہ روایت تو یہ مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر ایک مرتبہ اپنے ایک فوجی افسر اوریا کی بیوی پر پڑ گئی تھی۔ جس سے ان کے دل میں اس کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، اور انہوں نے اوریا کو قتل کرانے کی غرض سے اسے خطرناک ترین مشن سونپ دیا جس میں وہ شہید ہو گیا، اور بعد میں آپ نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ اس عمل پر تنبیہ کرنے کے لئے یہ دو فرشتے انسانی شکل میں بھیجے گئے۔

لیکن یہ روایت بلاشبہ ان خرافات میں سے ہے جو یہودیوں کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی پھیل گئی تھیں۔ یہ رویات دراصل بائبل کی کتاب سموئیل دوم باب ۱۱ سے ماخوذ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں کھلم کھلا حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ اوریا کی بیوی سے نکاح سے قبل ہی زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اور ان تفسیری روایتوں میں زنا کے جزء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس اسرائیلی روایت کو دیکھا اور اس میں سے زنا کے قصے کو نکال کر اسے قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں پر چسپاں کر دیا۔ حالانکہ یہ کتاب سموئیل ہی سرے سے بے اصل ہے اور یہ روایت قطعی کذب وافتراء کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے تمام محقق مفسرین نے اس کی سخت تردید کی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے علاوہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ، قاضی ابو السعود رحمہ اللہ، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ، قاضی عیاض رحمہ اللہ، امام رازی رحمہ اللہ، علامہ ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ، خازن رحمہ اللہ، زمخشری رحمہ اللہ، ابن حزم رحمہ اللہ، علامہ خفاجی رحمہ اللہ، احمد بن نصر ح ابو تمام رحمہ اللہ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسے کذب وافتراء قرار دیا

ہے۔حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"بعض مفسرین نے یہاں ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی ایسی بات ثابت نہیں جس کا اتباع واجب ہو،صرف ابن ابی حاتمؒ نے یہاں ایک حدیث روایت کی ہے۔مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے۔"

غرض بہت سے دلائل کی روشنی میں جن کی کچھ تفصیل امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور ابن جوزیؒ کی زادالمسیر وغیرہ میں موجود ہے، یہ روایت تو اس آیت کی تفسیر میں قطعاً خارج از بحث ہو جاتی ہے۔

مدعیان کے اندازِ بیان پر صبر

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس آزمائش اور لغزش کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ مقدمہ کے یہ دو فریق دیوار پھاند کر داخل ہوئے، اور طرز مخاطبت بھی انتہائی گستاخانہ اختیار کیا کہ شروع ہی میں حضرت داؤد علیہ السلام کو انصاف کرنے اور ظلم نہ کرنے کی نصیحتیں شروع کر دیں، اس انداز کی گستاخی کی بنا پر کوئی عام آدمی ہوتا تو انہیں جواب دینے کے بجائے الٹی سزا دیتا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ امتحان فرمایا کہ وہ بھی غصہ میں آ کر انہیں سزا دیتے ہیں یا پیغمبرانہ عفو و تحمل سے کام لے کر ان کی بات سنتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے، لیکن اتنی سی فروگزاشت ہو گئی کہ فیصلہ سناتے وقت ظالم کو خطاب کرنے کے بجائے مظلوم کو مخاطب فرمایا جس سے ایک گونہ جانبداری مترشح ہوتی تھی۔مگر اس پر فوراً متنبہ ہوا اور سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا۔(بیان القرآن)

مدعی علیہ کے بیان سے پہلے فیصلہ

بعض مفسرین نے لغزش کی یہ تشریح کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعا علیہ کو خاموش دیکھا تو اس کا بیان سنے بغیر صرف مدعی کی بات سن کر اپنی نصیحت میں ایسی باتیں فرمائیں جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی، حالانکہ پہلے مدعا علیہ سے پوچھنا چاہئے تھا

کہ اس کا مؤقف کیا ہے؟ حضرت داوٗد علیہ السلام کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا اور ابھی تک مقدمہ کے فیصلے کی نوبت نہیں آئی تھی، تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغبر کے شایان شان نہیں تھا۔ اسی بات پر آپ بعد میں متنبہ ہو کر سجدہ ریز ہوئے۔ (روح المعانی)

عبادت کے نظم میں خلل

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت داوٗد علیہ السلام نے اپنا نظم اوقات ایسا بنایا ہوا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں ہر وقت گھر کا کوئی نہ کوئی فرد عبادت، ذکر اور تسبیح میں مشغول رہتا تھا، ایک روز انہوں نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ پروردگار! دن اور رات کی کوئی گھڑی ایسی نہیں گزرتی جس میں داوٗد کے گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی عبادت، نماز اور تسبیح و ذکر میں مشغول نہ ہو، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ داوٗد! یہ سب کچھ میری توفیق سے ہے، اگر میری مدد شامل حال نہ ہو تو یہ بات تمہارے بس کی نہیں ہے، اور ایک دن میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ وقت حضرت داوٗد علیہ السلام کے مشغول عبادت ہونے کا اتھا۔ اس ناگہانی قضیہ سے ان کے اوقات کا نظم مخیل ہو گیا حضرت داوٗد علیہ السلام جھگڑا چکانے میں مشغول ہو گئے، آلِ داوٗد علیہ السلام کا کوئی اور فرد بھی اس وقت عبادت اور ذکر الٰہی میں مصروف نہ تھا۔ اس سے حضرت داوٗد علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ وہ فخر یہ کلمہ جو زبان سے نکل گیا تھا، یہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ اس لئے آپ نے استغفار فرمایا اور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس توجیہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔ (احکام القرآن)

کیا فریقین کا مقدمہ فرضی تھا

ان تمام تشریحات میں یہ بات مشترکہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ مقدمہ فرضی نہیں، بلکہ حقیقی تھا، اور صورت مقدمہ کا حضرت داوٗد علیہ السلام کی آزمائش یا لغزش سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے برخلاف بہت سے مفسرین نے اس کی ایسی تشریح فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مقدمہ کے یہ فریقین انسان نہیں، بلکہ فرشتے تھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا

تھا کہ وہ ایسی فرضی صورت مقدمہ پیش کریں جس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی لغزش پر تنبیہ ہو جائے۔

چنانچہ ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اوریا کو قتل کرانے اور اس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا وہ قصہ تو غلط ہے، لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں کسی شخص سے یہ فرمائش کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کا نکاح مجھ سے کر دو" اس زمانے میں اس فرمائش کا عام رواج بھی تھا۔ اور یہ باخلاف مروت بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی بنا پر اوریا سے یہی فرمائش کی تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ دو فرشتے بھیج کر آپ کو تنبیہ فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بات صرف اتنی تھی کہ اوریا نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا ہوا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اسی عورت کو اپنا پیغام دے دیا، اس سے اوریا کو بہت رنج ہوا اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ کے لئے یہ دو فرشتے بھیجے اور ایک لطیف پیرایہ میں اس لغزش پر تنبیہ فرمائی۔ قاضی ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اس توجیہ پر قرآن کریم کے الفاظ **وعزنی فی الخطاب**، سے استدلال فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ معاملہ محض خطبہ (منگنی) کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابھی حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔ (زاد المسیر لابن الجوزیؒ ص ۱۱۶ ج ۷)

اکثر مفسرین نے ان آخری دو تشریحات کو ترجیح دی ہے اور ان کی تائید بعض آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو روح المعانی، تفسیر ابی السعود، زاد المسیر، تفسیر کبیر وغیرہ) لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آزمائش اور لغزش کی تفصیل نہ قرآن کریم سے ثابت ہے، نہ کسی صحیح حدیث سے۔ اس لئے اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ اوریا کو قتل کروانے کا جو قصہ مشہور ہے وہ غلط ہے، لیکن اصل واقعہ کے بارے میں مذکورہ بالا تمام احتمالات موجود ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا سلامتی کی راہ وہی ہے جو حافظ ابن کثیرؒ نے اختیار کی کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا ہے، ہم اپنے قیاسات اور اندازوں کے ذریعہ اس کی تفصیل کی کوشش نہ کریں۔ جبکہ اس سے ہمارے کسی عمل کا تعلق

نہیں۔اس ابہام میں بھی یقیناً کوئی حکمت ہے۔لہٰذا صرف اتنے واقعہ پر ایمان رکھا جائے جو قرآن کریم میں مذکور ہے، باقی تفصیلات کو اللہ کے حوالے کیا جائے۔البتہ اس واقعہ سے متعدد عملی فوائد حاصل ہوتے ہیں زیادہ توجہ ان کی طرف دینی چاہیئے،

مغفرت وبشارت

ارشادالٰہی ہے (اور بلاشبہ ان کے لئے ہمارے یہاں خاص تقرب اور نیک انجامی ہے) اس آیت پر واقعے کو ختم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش جو کچھ بھی رہی ہو، ان کے استغفار اور انابت کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں اور اضافہ ہو گیا۔

غلطی پر تنبیہ میں حکمت کی رعایت

اس واقعہ سے متعلق ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش خواہ کچھ رہی ہو، اللہ تعالیٰ براہ راست وحی کے ذریعہ بھی آپ کو اس پر متنبہ فرما سکتے تھے۔ لیکن اس کے بجائے ایک مقدمہ بھیج کر تنبیہ کے لئے یہ خاص طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ درحقیقت اس طریقہ پر غور کرنے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی شخص کو اس کی غلطی پر تنبیہ کے لئے حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے، جس سے متعلقہ شخص خود بخود اپنی غلطی کو محسوس کرلے اور اسے زبانی تنبیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اور اس کے لئے ایسی تمثیلات سے کام لینا زیادہ مؤثر ہوتا ہے جس سے کسی کی دلآزاری بھی نہ ہو اور ضروری بات بھی واضح ہو جائے۔

ہفتہ کے دن والے

سورۂ بقرہ آیت پینسٹھ، چھیاسٹھ میں ہے کہ: اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (حد شرع سے) تجاوز کیا تھا در بارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے (متعلق تھا کہ اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے اُن کو (اپنے حکم قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہو گئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے، اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے، اور (نیز اس واقعہ کو) موجب نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنیوالوں کے لئے۔

بنی اسرائیل کا یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے، اور مچھلی کے شوقین تھے، اُس حکم کو نہ مانا، اور شکار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا، تین دن کے بعد وہ سب مر گئے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے، فرمانبردار و نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس لئے اس کو نکال فرمایا، اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو موعظة فرمایا۔

یہودیوں کی صورتوں کا مسخ ہونا

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اوّل اوّل تو اس طرح کے حیلے کر کے مچھلیاں پکڑیں، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی، جنہوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو اُن سے

برادرانہ تعلقات قطع کر کے بالکل الگ ہو گئے، اور بستی کے دو حصے کر لئے، ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے، دوسرے میں علماء وصلحاء رہے، ایک روز اُن کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے ادھر بالکل سناٹا ہے تو وہاں جا کر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے تھے، اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اُن کے جوان بندر بنا دیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کر دیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ دار اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، اُن کے قریب آ کر روتے تھے۔

ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی

اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ صحیح مسلم میں منقول ہے، کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو اُن کی نسل نہیں چلتی، (بلکہ چند روز میں ہلاک ہو کر ختم ہو جاتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے (اور آج بھی ہیں، مگر مسخ شدہ بندروں اور خنزیروں سے اُن کا کوئی جوڑ نہیں)

حضرت سلیمان علیہ السلام

نسب

حضرت سلیمان (علیہ السلام) حضرت داؤد (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں اس لئے ان کا نسب بھی یہودا کے واسطہ سے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ان کی والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہیں ہوسکا تورات نے بنت سبع نام بتایا ہے لیکن اس طرح کہ وہ اول اوریاہ کی بیوی تھی اور پھر داؤد علیہ السلام کی بیوی بنی اور حضرت سلیمان اس سے پیدا ہوئے مگر اس قصہ کو لغویت گزشتہ صفحات میں واضح ہو چکی ہے اس لئے یہ نام بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سلیمان بن داؤد کی والدہ نے ایک دفعہ سلیمان (علیہ السلام) کو یہ نصیحت فرمائی بیٹا رات بھر نہ سوتے رہا کرو اس لئے کہ رات کے اکثر حصہ کو نیند میں گزرنا انسان کو قیامت کے دن اعمال خیر سے محتاج بنا دیتا ہے۔

قرآن عزیز نے بھی صرف اسی قدر بتایا ہے کہ وہ حضرت یعقوب کے واسطہ سے حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا وَنُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ (الانعام ٦، آیت ۸۴)

اور ہم نے اس (ابراہیم) کو بخشے اسحٰق و یعقوب ہم نے ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی اس (ابراہیم) اور اس ابراہیم کی اولاد میں سے داؤد و سلیمان کو ہدایت دی۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ (ص ۳۸ آیت ۳۰)

اور ہم نے داؤد کو سلیمان دیا۔

قرآن عزیز میں ذکر

قرآن عزیز میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا ذکر سولہ جگہ آیا ہے ان میں سے چند جگہ کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اکثر جگہ مختصر طور پر ان انعامات اور فضل و کرم کا تذکرہ ہے جو اللہ کی جانب سے ان پر اور ان کے والد حضرت داؤد (علیہ السلام) پر نازل ہوتے رہے۔

بچپن

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) میں ذکاوت اور فصل مقدمات میں اصابت رائے کا کمال فطرتی سے ودیعت کر دیا تھا چنانچہ ان کے بچپن کا وہ واقعہ اس کے لئے روشن برہان ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں قرآن عزیز سے نقل کیا جا چکا ہے۔ آیت وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ (الآیہ) کی جانب اشارہ ہے۔

حضرت داؤد نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا اس لئے بچپن ہی سے ان کو امور مملکت میں شریک کار رکھتے تھے۔ خصوصاً فصل مقدمات میں ان سے ضرور مشورہ فرمالیا کرتے تھے۔

وراثت داؤد

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سن رشد کو پہنچ چکے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور حکومت دونوں میں داؤد (علیہ السلام) کا جانشین بنا دیا اور اس طرح فیضان نبوت کے ساتھ ساتھ اسرائیلی حکومت بھی ان کے قبضہ میں آ گئی اور قرآن عزیز نے اسی جانشینی کو وراثت داؤد علیہ السلام سے تعبیر کیا ہے۔

وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ (النمل ۲۷ آیت ۱۶)

اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کا وارث ہوا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہاں وراثت سے نبوت و سلطنت کی وراثت مراد ہے، مالی وراثت مراد نہیں ہے ورنہ حضرت داؤد کی اور بھی بہت سی اولاد تھی وہ کیوں محروم رہتی نیز

صحاح ستہ میں متعدد جلیل القدر صحابہ سے یہ روایت منقول ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نحن معشر الانبیاء لانورث ماترکنا فھو صدقۃ (الحدیث)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ہم جماعت انبیاء کی وراثت مالی کا سلسلہ نہیں چلتا اور ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہو جاتا ہے۔

یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ان کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا بلکہ وہ مساکین اور فقرہاء کا حق اور اللہ کے نام پر صدقہ ہے۔

دراصل نبی کی فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ مال جیسی حقیر شے پر ان کی وراثت کا انتساب ہو اس لئے کہ جن ہستیوں کا مقصد حیات تبلیغ وارشاد اور راہ خدا کی دعوت ہو وہ کب یہ گوارا کر سکتی ہیں کہ علوم و فیوض نبوت کے علاوہ ایک ادنیٰ شے ان کی وراثت قرار پائے بلکہ بر بنائے بشریت بقاء حیات کے لئے وہ جو کچھ مال کی صورت میں رکھتے تھے پس مردن صرف اللہ کی ملکیت ہو جانا چاہئے جو فقراء اور مساکین ہی کا حصہ ہو سکتا ہے نہ کہ اس اولوالعزم ہستی کی نسل و خاندان کا۔

نبوت

جن انبیاء و رسل کی صحیح تاریخ منضبط ہے اس سے اور قرآن عزیز کی بعض آیات کی صراحت سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو شرف نبوت سے سرفراز کرتا ہے اس کو یہ منصب جلیل سن رشد کے بعد عطا فرماتا ہے تا کہ وہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے بھی عمر طبعی کا وہ حصہ طے کر لے جس میں عقل و تجربہ پختگی اختیار کر لیتے ہیں اور اس حد پر پہنچ کر استعداد کے مطابق انسانوں کے قوائے فکری و عملی میں استواری اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ یہ سنت اللہ حضرت سلیمان کے حق میں بھی کارفرما رہی اور سن رشد کے بعد ان کو حکومت و خلافت کے ساتھ ساتھ ''منصب نبوت'' بھی منجانب اللہ عطا ہوا۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ (النساء ۴ آیت ۱۶۳)

بیشک ہم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تیری طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح کی جانب وحی بھیجی اور اسکے بعد دوسرے پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی اور ابراہیم کی جانب اسمٰعیل کی اسحٰق کی یعقوب کی اور اس کی اولاد کی جانب اور عیسیٰ کی اور ایوب کی اور یونس کی اور ہارون کی اور سلیمان کی جانب وحی بھیجی۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (الانبیاء ۲۱، آیت ۷۹)

اور (داؤد و سلیمان) ہر ایک کو ہم نے حکومت دی اور علم (نبوت) دیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل ۲۷ آیت ۱۵)

اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم (نبوت کا علم) دیا۔

یہودیوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام

لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت بھی ظاہر فرمادی۔

اس کے متعلق زہرہ کا ایک لمبا چوڑا قصہ بھی مشہور ہے، جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں، جن علماء نے اس قصہ کو قواعد شرعیہ کے خلاف سمجھا ہے رد کر دیا ہے، اور جنہوں نے اس میں تاویل کو خلاف شرع نہیں سمجھا ہے رد نہیں کیا، ہمیں یہاں فی الوقت اس کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان آیات کی تفسیر اس قصہ پر موقوف نہیں۔

اور یہودی سب باتوں کے جاننے کے باوجود چونکہ عمل علم کے خلاف کرتے تھے، اور تدبر سے کام نہ لیتے تھے، اس لئے اول تو ان کے جاننے کی خبر دی، اور پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کردی کہ "کاش ان کو علم و عقل ہوتی" کیونکہ جس علم پر عمل اور تدبر نہ ہو وہ جہل کی مانند ہے۔

جادو اور معجزہ میں فرق کیلئے فرشتوں کا اترنا

ایک زمانے میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں، دنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا، اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیاء کرامؑ کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط و اشتباہ ہونے لگا، اور بعض

لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابل اتباع سمجھنے لگے، اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اسپر عمل کرنے لگے، جیسا موجودہ دور میں مسمریزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کے رفع کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کردیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے، اور جادو پر عمل کرنے نیز جادوگروں کے اتباع کرنے سے اجتناب کرسکیں اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات و دلائل سے ثابت کردیا جاتا ہے، اسی طرح ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کردیئے گئے، تاکہ ان کے احکامات وارشادات کی تعمیل واطاعت ممکن ہو۔

فرشتے کیوں اتارے گئے

اور یہ کام انبیاء کرامؑ سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اول تو انبیاءؑ اور جادوگروں میں امتیاز وفصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیاء کرامؑ ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے حکم فریقین کے علاوہ کوئی اور ثالث ہونا مناسب تھا۔

دوسرے اس کام کی تکمیل بغیر جادو کے الفاظ کی نقل وحکایت کے عادۃً ہو نہ سکتی تھی، اگرچہ نقل کفر کفر نباشد کے عقلی ونقلی مسلمہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہوسکتا تھا، مگر چونکہ حضرات انبیاء کرامؑ مظہر ہدایت ہوتے تھے، اسلئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، لہٰذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کارخانہ تکوین میں جو خیر وشر سب پر مشتمل ہوتا ہے ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے تو بوجہ مصالح عامہ خیر ہوں، لیکن لزوم مفسدہ کے سبب فی ذاتہٖ شر ہوں، جیسے کسی ظالم وجابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشوونما اور غور پرداخت، کہ تکوینی اعتبار سے تو درست ومحمود ہے، اور تشریعی لحاظ سے نادرست ومذموم، بخلاف انبیاء کرام علیہم السلام کے کہ ان سے خاص تشریعیات کا کام ہی لیا جاتا ہے جو خصوصاً وعموماً خیر ہی خیر ہوتا ہے، اور گوکہ یہ نقل وحکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک تشریعی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ کہیں یہ نقل وحکایت بھی

جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، تو حضرات انبیاء کو اس کا سبب بواسطہ نقل بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلیات شرعیہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کردی گئی، ان کلیات کے جزئیات کی تفصیلات بوجہ احتمال فتنہ انبیاء کرامؑ کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیاء کرامؑ نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلادی، لیکن یہ جزئیات نہیں بتلائے، کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحب معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے، وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں، یا مثلاً اقسام سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعد کلیہ سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دست غیب کا عمل جس میں تکیہ کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتے ہیں۔

فرشتوں نے لوگوں کو جادو کی حقیقت کس طرح سمجھائی

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں نے بابل میں آ کر اپنا کام شروع کر دیا، کہ سحر کے اصول و فروع ظاہر کر کے لوگوں کو اس کے عمل بد سے بچنے کی اور ساحرین سے نفرت و دوری رکھنے کی تنبیہ اور تائید کی، جیسے کوئی عالم دیکھے کہ جاہل لوگ اکثر نادانی سے کفریہ کلمات بک جاتے ہیں، اس لئے وہ تقریراً تحریراً ان کلماتکو جو اس وقت شائع ہیں جمع کر کے عوام کو مطلع کر دے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں ان سے احتیاط رکھنا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی آمد و رفت ان کے پاس شروع ہوتی، اور وہ درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اصول و فروع سے مطلع کر دیجئے، تاکہ ناواقفی سے کسی اعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور احتیاط و تبلیغ اور بنظر اصلاح بہ التزام کیا کہ اصول و فروع بتانے سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہمارے یہ بتانے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ دیکھیں ان چیزوں پر مطلع ہو کر کون شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، کہ شر سے آگاہ ہو کر اس سے بچے، اور کون اپنا دین خراب کرتا ہے کہ اس شر پر مطلع ہو کر وہی شر خود اختیار کر لے، جس کا انجام کفر

ہے، خواہ کفر عملی ہو یا اعتقادی، دیکھو ہم تم کو نصیحت کئے دیتے ہیں کہ اچھی نیت سے اطلاع حاصل کرنا اور پھر اسی نیت پر ثابت قدم رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں، اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو جاؤ اور ایمان برباد کر لو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ خیر خواہی اور کیا کر سکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد و پیمان کر لیتا وہ اس کے روبرو جادو کے سب اصول و فروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ و اختیار سے کافر و فاجر بنے وہ جانے، چنانچہ بعضے اس عہد پر قائم نہ رہے اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیا، جو فسق تو یقیناً ہے اور بعضے طریقے اس کے استعمال کے کفر بھی ہیں اس طرح سے فاجر کافر بن گئے۔

اس ارشاد اصلاحی اور پھر مخاطب کے خلاف کرنے کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی جامع معقول و منقول عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے، تاکہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے، اور پھر خود ہی خلاف شرع عقائد باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنے لگے، اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کر لے اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جائے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلاف اسلام نظریات و عقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس اطلاع سحر سے ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی گنجائش ہے نہ وسوسہ کی۔

اور اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلا لئے گئے ہوں گے، واللہ اعلم۔ بحقیقۃ الحال (بیان القرآن)

سحر کی حقیقت

سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو (قاموس) خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے خاص خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات و شیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوت خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے

مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم و سیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرف عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات و شیطاین کے عمل کا دخل ہو، یا قوت خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ الفاظ و کلمات کا، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی، اور قدیم و جدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثیرات جو کسی انسانی بالوں یا ناختوں وغیرہ اعضاء یا اس کے استعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کرکے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرف عام میں ٹونہ ٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اور اصطلاح قرآن و سنت میں سحر ہر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو یا کواکب و نجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں، جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کرکے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا طہارت سے اجتناب کرنا وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال و افعال سے حاصل کی جاتی ہے، جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں مثلاً تقویٰ، طہارت، اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمال خیر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی ایام حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو موثر ہوتا ہے، باقی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ چالاکی کے کام یا مسمریزم وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہہ دیا جاتا ہے، (روح المعانی)

سحر کے اقسام

امام راغبؒ اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخیل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں، جیسے بعض شعبدہ باز اپنی ہاتھ چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوت خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے زریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کی اثر سے بھی ہو سکتا ہے کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے وہ پہلی قسم کا سحر تھا، جیسا کہ ارشاد ہے۔

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (۷:۱۱۶)

''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔''

اور ارشاد ہے۔

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۲۰ ص ۶۶)

''ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں''۔

اس میں تخیل کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں نہ درحقیقت سانپ بنی، اور نہ انہوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت متخیلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تخیل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۲۶:۲۲۱:۲۲۲)

''میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں، ہر بہتان باندھنے والے گناہگار پر اترتے ہیں۔''

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲:۱۰۲)

"یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا، لوگوں کو جادو سکھانے لگے۔"

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شئے کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنادیں، امام راغب اصفہانی، ابوبکر جصاص رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے زریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ سحر کا اثر صرف تخیل اور نظر بندی ہی تک ہوسکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلاب اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو قول مشہور ہے کہ انقلاب حقائق ممکن نہیں، ان کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں، کہ کوئی محال ممکن بن جائے یا کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخییل قرار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخییل ہی ہو اس سے زائد اور کچھ نہ ہو، اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ انقلاب حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو مؤطا امام مالک میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے۔

"اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنادیتے۔"

گدھا بنادینے کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنادیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ سحر کے ذریعے انسان کو گدھا بنادینے کا امکان ہے، دوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے۔

اعوذ بوجه الله العظيم الذى ليس شيء اعظم منه وبكلمات الله التامات التى لايجاوزهن بر ولا فاجر وباسماء الله الحسنى كلها ماعلمت منها ومالم اعلم من شر ماخلق وبراء وذرأ اخرجه فى المؤطاء باب التعوذ عندالنوم.

"میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کی جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسماء حسنی کی جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور وجود دیا اور پھیلایا ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

سحر اور معجزے میں فرق

جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادتاً نہیں ہو سکتے، اسی لئے ان کو خرق عادت کہا جاتا ہے، بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں التباس بھی ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ جادوگروں کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں، اسلئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں یہ دائرہ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں، فرق صرف اسباب کے ظہور و خفا کا ہے جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں، وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرق عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی جن شیطان کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خط مشرق بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرق عادت کہیں گے، حالانکہ جنات و شیاطین کو

ایسے اعمال وافعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرق عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسباب طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرق عادت کا ہو جاتا ہے۔

بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلاواسطہ فعل حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرمادیا، کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جائے، مگر ٹھنڈک بھی اتنی ن ہو جس سے تکلیف پہنچے، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو اس حکم الٰہی سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں استعمال کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ معجزہ نہیں، بلکہ دواؤں کا اثر ہے، دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکہ خرق عادت کا ہو جاتا ہے۔

یہ بات کہ معجزہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے ارشاد فرمایا۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸:۱۷)

"کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے"

مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکر کی سارے مجمع کی آنکھوں تک پہنچ جانا اس میں آپ کے عمل کو کوئی دخل نہیں، یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ غزوۂ بدر میں پیش آیا تھا کہ آپؐ نے ایک مٹھی خاک اور سنگریزوں کی کفار کے لشکر پر پھینکی (جو سب کی آنکھوں میں پڑ گئی)

معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلاواسطہ اسباب طبعیہ کے براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اور جادو اسباب طبعیہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے، حقیقت سمجھنے کے لئے تو کافی وافی ہے، مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس اس فرق کو کیسے پہچانیں، کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچاننے کے لئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق ظاہر کر دیئے ہیں۔

اول یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے، جن کا تقویٰ، طہارت و پاکیزگی اخلاق واعمال کا سب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے

لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے ناپاک، اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دور رہتے ہیں، یہ چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ عادۃ اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزے اور نبوت کا دعویٰ کر کے کوئی جادو کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں نبوت کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

کیا انبیاء علیہ السلام پر بھی جادو کا اثر ہوسکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے، وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی گئی کہ سحر درحقیقت اسباب طبعیہ ہی کا اثر ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسباب طبعیہ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں، یہ تأثر شان نبوت کے خلاف نہیں، جیسے ان کا بھوک پیاس سے متاثر ہونا بیماری میں مبتلا ہونا اور شفاء پانا ظاہری اسباب سے سب جانتے ہیں، اسی طرح جادو کے باطنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متاثر ہوسکتے ہیں، اور یہ تاثر شان نبوت کے منافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اسکی وجہ سے آپ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سحر سے متاثر ہونا خود قرآن میں مذکور ہے آیات يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى، اور فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (۲۰: ۶۶۔۶۷) موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہونا اسی جادو کا تو اثر تھا۔

کون سا سحر کفر ہے

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں سحر صرف ایسے عمل کو کہا گیا ہے کہ جس میں کفر وشرک اور فسق وفجور اختیار کر کے جنات وشیاطین کو راضی کیا گیا ہو، اور ان سے مدد لی گئی ہو، ان کی امداد سے کچھ عجیب واقعات ظاہر ہوگئے ہوں، سحر بابل جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ یہی تھا، (جصاص) اور اسی سحر کو قرآن میں کفر قرار دیا ہے، ابو منصورؒ نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے کہ مطلقاً سحر کی سب اقسام کفر نہیں بلکہ صرف وہ سحر کفر ہے جس میں ایمان کے خلاف اقوال و اعمال اختیار کر گئے ہوں۔ (روح المعانی)

اور یہ ظاہر ہے کہ شیاطین پر لعنت کرنے اور ان سے عداوت و مخالفت کرنے کے احکام قرآن و حدیث میں بار بار آئے ہیں، اس کے خلاف ان سے دوستی اور ان کو راضی کرنے کی فکر خود ہی ایک گناہ ہے، پھر وہ راضی جب ہی ہوتے ہیں جب انسان کفر و شرک میں مبتلا ہو جس سے ایمان ہی سلب ہو جائے۔ یا کم از کم فسق و فجور میں مبتلا ہو اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مرضیات کے خلاف گندہ اور نجس رہے، یہ مزید گناہ ہے، اور اگر جادو کے ذریعے کسی کو ناحق نقصان پہنچایا تو یہ اور گناہ ہے۔

غرض اصطلاح قرآن و سنت میں جس کو سحر کہا گیا ہے وہ کفر اعتقادی یا کم از کم کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا، اگر شیاطین کو راضی کرنے کے لئے کچھ اقوال یا اعمال کفر و شرک کے اختیار کئے تو کفر حقیقی اعتقادی ہوگا، اور اگر کفر و شرک کے اقوال و افعال سے بچ بھی گیا مگر دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا تو کفر عملی سے خالی نہ رہا، قرآن عزیز کی آیات مذکورہ میں جو سحر کو کفر کہا گیا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ یہ سحر کفر حقیقی اعتقادی یا کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس سحر میں کوئی عمل کفر اختیار کیا گیا ہو جیسے شیاطین سے استغاثہ و استمداد یا کواکب کی تاثیر کو مستقل ماننا یا سحر کو معجزہ قرار دے کر اپنی نبوت کا دعویٰ کرنا وغیرہ تو یہ سحر باجماع کفر ہے اور جس میں یہ افعال کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔

سحر سیکھنا حرام ہے

جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سحر کفر اعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر مسلمانوں سے دفع ضرر کیلئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اجازت دی ہے۔ (شامی عالمگیری)

تعویذات

تعویذ گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات و شیاطین سے استمداد ہو تو بحکم سحر ہیں اور حرام ہیں، اور اگر الفاظ مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں، اور شیاطین اور بتوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

کون سا سحر جائز ہے

قرآن وسنت کے اصطلاحی سحر بابل کے علاوہ باقی قسمیں سحر کی ان میں بھی اگر کفر وشرک کا ارتکاب کیا جائے تو وہ بھی حرام ہیں۔

اور خالی مباح اور جائز امور سے کام لیا جاتا ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

حضرت سلیمان کا علم اور ہوا و جنات کا مسخر ہونا

سورۂ انبیاء میں ہے کہ اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جس میں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے کذا فی الدر المنثور) فیصلہ کرنے لگے جبکہ اس (کھیت) میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اس کو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے سو ہم نے اس فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دے دی۔ اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا (یعنی داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا صورت مقدمہ کی یہ تھی کہ جس قدر کھیت کا نقصان ہوا تھا اس کی لاگت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی۔ داؤد علیہ السلام نے ضمان میں کھیت والے کو وہ بکریاں دلوادیں اور اصل قانون شرعی کا یہی مقتضا تھا جس میں مدعی یا مدعا علیہ کی رضا کی شرط نہیں مگر چونکہ اس میں بکری والوں کا بالکل ہی نقصان ہوتا تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے بطور مصالحت کے جو کہ موقوف تھی جانبین کی رضامندی پر یہ صورت جس میں دونوں کو سہولت اور رعایت تھی تجویز فرمائی کہ چند روز کے لئے بکریاں تو کھیت والے کو دی جائیں کہ ان کے دودھ وغیرہ سے اپنا گزر کرے اور بکری والوں کو وہ کھیت سپرد کیا جائے کہ اس کی خدمت آبپاشی وغیرہ سے کریں جب کھیت پہلی حالت پر آجائے کھیت اور بکریاں اپنے اپنے مالکوں کو دے دی جائیں۔ کذا فی الدر المنثور عن مرۃ وابن مسعود ومسروق وابن عباس ومجاہد وقتادہ والزہری۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں کہ ایک کی صحت دوسرے کی عدم صحت کو مقتضی ہو اس

لئے وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا بڑھا دیا گیا) اور (یہاں تک تو کرامت عامہ کا ذکر تھا جو دونوں حضرات میں مشترک تھی آگے دونوں حضرات کی خاص خاص کرامتوں کا بیان ہے) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ (ان کی تسبیح کے ساتھ) (بھی) تسبیح کیا کرتے تھے اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (جیسا سورۂ سبا میں ہے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ) اور (کوئی اس بات پر تعجب نہ کرے کیونکہ ان کاموں کے) کرنے والے ہم تھے (اور ہماری قدرت کا عظیم ہونا ظاہر ہے پھر ان معجزات میں تعجب ہی کیا ہے) اور ہم نے ان کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھلائی (یعنی) تا کہ وہ (زرہ) تم کو (لڑائی میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے (اور اس نفع عظیم کا مقتضایہ ہے کہ تم شکر کرو) سو تم (اس نعمت کا) شکر کرو گے بھی (یا نہیں) اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کا تیز ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے (مراد ملک شام ہے جو ان کا مسکن تھا کذا فی الدر عن السدی ویدل علیه عمرته بیت المقدس یعنی جب ملک شام سے کہیں چلے جاتے اور پھر آتے تو یہ آنا اور اسی طرح جانا بھی ہوا کہ ذریعہ سے ہوتا تھا جیسا درمنثور میں بروایت وتصحیح حاکم حضرت ابن عباسؓ سے اس کی کیفیت مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام مع اعیان ملک کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے پھر ہوا کو بلا کر حکم دیتے وہ سب کو اٹھا کر تھوڑی دیر میں ایک ایک ماہ کی مسافت قطع کرتی) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں (ہمارے علم میں سلیمان کو یہ چیزیں دینے میں حکمت تھی اس لئے عطا فرمائی) اور بعضے بعضے شیطان (یعنی جن) ایسے تھے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے لئے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے (تا کہ موتی نکال کر ان کے پاس لائیں) اور وہ اور کام بھی اس کے علاوہ (سلیمان کے لئے) کیا کرتے تھے ور (گو وہ جن بڑے سرکش اور شریر تھے مگر) ان کے سنبھالنے والے ہم تھے (اس لئے وہ چوں نہیں کر سکتے تھے)

حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ہوا کی تسخیر اور اس کے متعلقہ مسائل

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ

پیش آیا کہ لشکری گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہو کر عصر کی نماز فوت ہوگئی تو اپنی اس غفلت پر افسوس ہوا اور یہ گھوڑے جو اس غفلت کا سبب بنے تھے انکو بیکار کر کے چھوڑ دیا، چونکہ انکا یہ عمل اللہ کی رضا جوئی کیلئے ہوا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے انکو گھوڑوں سے بہتر اور تیز رفتار سواری ہوا کی عطا فرمادی۔

اور جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کردیا تھا جو ان کی آواز کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کردیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ جہاں چاہتے بہت جلد آسانی سے پہنچ جاتے تھے اس جگہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ تسخیر داؤد علیہ السلام میں تو لفظ مع استعمال فرمایا کہ ان کے ساتھ پہاڑوں پرندوں کو مسخر کردیا تھا اور یہاں حرف لام کے ساتھ فرمایا کہ ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کردیا تھا اس میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دونوں تسخیروں میں فرق تھا، داؤد علیہ السلام جب تلاوت کرتے تو پہاڑ اور پرندے خود بخود تسبیح کرنے لگتے تھے ان کے حکم کے منتظر نہ رہتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو ان کے حکم کے تابع بنادیا گیا کہ جب چاہیں جس وقت چاہیں جس طرف جانا چاہیں ہوا کو حکم دے دیا اس نے پہنچا دیا پھر جہاں اترنا چاہیں وہاں اتار دیا پھر جب واپس چلنے کا حکم ہوا واپس پہنچا دیا۔ (روح عن البیضاوی)

تفسیر ابن کثیر میں تخت سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنوایا تھا جس پر خود مع اعیان سلطنت اور مع لشکر اور آلات حرب کے سب سوار ہو جاتے پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع و عریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا وہاں جا کر اتار دیتی تھی۔

یہ ہوائی تخت صبح سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں جس میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان سوار ہوتے تھے اور ان کے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھتے تھے پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ اس پورے تخت پر سایہ کرلیں تا کہ آفتاب کی

تپش سے تکلیف نہ ہو پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس ہوائی سفر کے وقت پورے راستہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سر جھکائے ہوئے اللہ کے ذکر و شکر میں مشغول رہتے تھے دائیں بائیں کچھ نہ دیکھتے تھے اور اپنے عمل سے تواضع کا اظہار فرماتے تھے (ابن کثیر)

قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں ہے: عاصفة، ریح عاصفہ کے لفظی معنے سخت اور تیز ہوا کے ہیں۔ قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس ہوا کی صفت رخاء بیان کی گئی ہے جس کے معنے نرم ہوا کے ہیں جس سے نہ غبار اڑے نہ فضا میں تلاطم پیدا ہو۔ بظاہر یہ دو متضاد صفتیں ہیں لیکن دونوں صفتوں کا جمع ہونا اس طرح ممکن ہے کہ یہ ہوا اپنی ذات میں بڑی سخت اور تیز ہو جس کی وجہ سے چند گھنٹوں میں ایک مہینہ کی مسافت طے کر سکے لیکن قدرت حق تعالیٰ نے اس کو ایسا بنا دیا ہو کہ اس سے فضاء میں تلاطم نہ پیدا ہو چنانچہ اس کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ جس فضا میں یہ تخت روانہ ہوتا تھا وہاں کسی پرندے کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا۔

سلیمان علیہ السلام کیلئے تسخیر جنات وشیاطین

ارشاد الٰہی ہے: وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ. وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ

یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا شیاطین جن میں اسے ایسے لوگوں کو جو دریاؤں میں غوطہ لگا کر سلیمان علیہ السلام کے لئے جواہر نکال کر لاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے جن میں سے بعض کا ذکر دوسری آیات میں آیا ہے۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ۔ یعنی بناتے ہیں حضرت سلیمان کے لئے محرابیں اور شاندار مکانات اور مورتیں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے جو حوض کی طرح کام دیں ان سے سلیمانؑ بڑی مشقت کے کام بھی لیتے تھے اور عجیب وغریب صنعتوں کے بھی، اور ہم ہی ان کے محافظ تھے۔

شیاطین، وہ آگ کے بنے ہوئے اجسام لطیفہ ہیں جو عقل و شعور رکھتے ہیں اور انسان

کی طرح احکام شرع کے مکلف ہیں۔اس نوع کے لئے اصل لفظ جن یا جنات استعمال ہوتا ہے ان میں جو ایمان قبول نہ کریں کافر ہیں ان کو شیاطین کہا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تو سبھی جنات تھے خواہ مومن ہوں یا کافر، مگر مومنین تو تسخیر کے بغیر بھی سلیمان علیہ السلام کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے کرتے تھے ان کے لئے تسخیر کے ذکر کی ضرورت نہیں۔اس لئے تسخیر میں صرف شیاطین یعنی کفار جنات کا ذکر فرمایا کہ وہ باجود اپنے کفر و سرکشی کے زبردستی حضرت سلیمان کے تابع فرمان رہتے تھے اور شاید اسی لئے آیت کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا گیا کہ ہم ہی ان کے محافظ تھے ورنہ کفار جنات سے تو ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچائیں مگر حفاظت خداوندی کا پہرہ ان پر لگا ہوا تھا اس لئے کوئی گزند نہ پہنچا سکتے تھے۔

ایک لطیفہ

حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے تو حق تعالیٰ نے سب سے زیادہ سخت اور کثیف اجسام کو مسخر فرمایا جن میں پہاڑ اور لوہا جیسی سخت چیزیں شامل ہیں، اس کے بالمقابل سلیمان علیہ السلام کیلئے ایسے اجسام لطیفہ کو مسخر فرمایا جو دیکھنے میں بھی نہ آسکیں جیسے ہوا اور جنات اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ہر قسم کی مخلوقات پر حاوی ہونا واضح کیا گیا ہے۔(تفسیر کبیر للرازی)

وراثت، علوم اور واقعہ نمل

سورۂ نمل آیت ۱۵ تا ۱۹ میں ہے کہ اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) کو (شریعت اور حکمرانی کا) علم عطا فرمایا اور ان دونوں نے (ادائے شکر کے لئے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے (یعنی ان کو سلطنت وغیرہ ملی) اور انہوں نے (اظہار شکر کے لئے) کہا کہ اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے (جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں) اور ہم کو (سامان سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں (جیسے

فوج، لشکر، مال، اور آلات جنگ وغیرہ) واقعی یہ (اللہ تعالیٰ کا) کھلا ہوا فضل ہے اور سلیمان (علیہ السلام کے پاس سامان سلطنت بھی عجیب وغریب تھا چنانچہ ان) کے لئے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے تابع نہیں ہوتے) اور (پھر تھے بھی اس کثرت سے کہ) ان کو (چلنے کے وقت) روکا جا (یا کر) تا تھا (تا کہ متفرق نہ ہو جائیں پیچھے والے بھی پہنچ جائیں یہ بات عادۃً نہایت کثرت میں ہوتی ہے کیونکہ تھوڑے مجمع میں تو اگلا آدمی خود ہی ایسے وقت رک جاتا ہے اور بڑے مجمع میں گلوں کو پچھلوں کی خبر بھی نہیں ہوتی اس لئے اس کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لئے جاتے تھے) یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا کہ اے چیونٹیو، اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں ی تم کو سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے سو سلیمان (علیہ السلام نے اس کی بات سنی اور) اس کی بات سے (متعجب ہو کر کہ اس چھوٹے وجود پر یہ ہوشیاری اور احتیاط) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور (یہ دیکھ کر کہ میں اس کی بولی سمجھ گیا جو کہ معجزہ ہونے کی وجہ سے ایک نعمت عظیمہ ہے اور نعمتیں بھی یاد آ گئیں اور) کہنے لگے کہ اے میرے رب مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (یعنی ایمان اور علم سب کو اور نبوت خود کو اور اپنے والد داؤد علیہ السلام کو) اور (اس پر بھی ہمیشگی دیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں (یعنی عمل مقبول ہو کیونکہ اگر حقیقت میں عمل نیک ہو اور آداب وشرائط کی کمی کی وجہ سے مقبول نہ ہو وہ مقصود نہیں ہے) اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجہ کے) نیک بندوں (انبیاء) میں داخل رکھئے (یعنی قرب کو بعد میں تبدیل نہ کیجئے)

حضرت سلیمان کا خصوصی امتیاز

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا. ظاہر ہے کہ اس سے مراد علوم انبیاء ہیں جو نبوت ورسالت سے متعلق ہوتے ہیں اس کے عموم میں دوسرے علوم وفنون بھی شامل ہوں تو بعید نہیں

جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی گئی تھی۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام زمرۂ انبیاء میں ایک خاص امتیاز نہ رکھتے ہیں کہ ان کو نبوت و رسالت کے ساتھ سلطنت بھی دی گئی تھی اور سلطنت بھی ایسی بے نظیر کہ صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنات اور جانوروں پر بھی ان کی حکمرانی تھی ان سب عظیم الشان نعمتوں سے پہلے حق تعالیٰ کے نعمت علم کا ذکر فرمانے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نعمت علم تمام دوسری نعمتوں سے فائق اور بالاتر ہے۔ (قرطبی)

پرندوں اور چوپاؤں میں بھی عقل و شعور ہے

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ پرندے، چرندے اور تمام حیوانات میں بھی عقل و شعور کسی درجہ میں موجود ہے۔ البتہ ان کی عقول اس درجہ کی نہیں کہ ان کو احکام شرع کا مکلف بنایا جاتا اور انسان اور جنات کو عقل و شعور کا وہ کامل درجہ عطا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہو سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کبوتر سب پرندوں میں زیادہ عقلمند ہے ابن عطیہ نے فرمایا کہ چیونٹی ذہین عقلمند جانور ہے اس کو قوت شامہ بڑی تیز ہے جو کوئی دانہ اس کے قبضہ میں آتا ہے اس کے دو ٹکڑے کر دیتی ہے تاکہ اگے نہیں اور سردی کے زمانے کے لئے اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرتی ہے۔ (قرطبی)

ہدہد کا گم ہونا اور ملکۂ سبا کو دعوت

آیت ۲۰ تا ۲۸ میں ہے کہ (اور ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کی حاضری لی تو (ہُد ہُد کو نہ دیکھا) فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہُد ہُد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہو گیا ہے (اور جب معلوم ہوا کہ واقع میں غائب ہے تو فرمانے لگے کہ) میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف دلیل (اور غیر حاضری کا عذر) میرے سامنے پیش کر دے (تو خیر چھوڑ دوں گا) تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور سلیمان (علیہ السلام) سے کہنے لگا کہ ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور (اجمالی بیان اس کا یہ ہے کہ) میں آپ کے پاس قبیلہ سبا کی ایک پختہ خبر لایا ہوں (جس کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ) میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ان لوگوں

پر بادشاہی کررہی ہے اور اس کو (بادشاہی کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان حاصل ہے اور اس کے پاس ایک بڑا تخت ہے (اور مذہبی حالت ان کی یہ ہے کہ) میں نے اس (عورت) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے (ان) اعمال (کفر) کو ان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے (اور ان اعمال بد کو مزین کرنے کے سبب) ان کو راہ (حق) سے روک رکھا ہے اس لئے وہ راہ (حق) پر نہیں چلتے کہ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قدرت والا ہے کہ) آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو (جن میں سے بارش اور زمین کی نباتات بھی ہیں) باہر لاتا ہے اور (ایسا جاننے والا ہے کہ) تم لوگ (یعنی تمام مخلوق) جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو اور جو کچھ (زبان اور جسم کے اعضاء سے) ظاہر کرتے ہو وہ سب کو جانتا ہے (اس لئے) اللہ ہی ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے سلیمان (علیہ السلام) نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے (اچھا) میرا یہ خط لے جا اور اس کو ان کے پاس ڈال دینا پھر (ذرا وہاں سے) ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال وجواب کرتے ہیں (پھر تو یہاں چلے آنا وہ لوگ جو کچھ کارروائی کریں گے اس سے تیرا سچ جھوٹ معلوم ہو جائے گا۔)

اصول جہانداری

حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے علاوہ جنات اور وحوش وطیور پر حکومت عطا فرمائی تھی اور جیسا کہ حکمرانی کا اصول ہے رعایا کے ہر طبقہ کی نگرانی اور خبر گیری حاکم کے فرائض میں سے ہے اس کے مطابق اس آیت میں بیان فرمایا **تفقد الطیر** یعنی سلیمان علیہ السلام نے اپنی رعایا کے طیور کا معائنہ فرمایا اور یہ دیکھا کہ ان میں کون حاضر ہے کون غیر حاضر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام کے حالات سے باخبر رہنے کا اہتمام فرماتے تھے جو شخص غیر حاضر ہوتا اگر بیمار ہے تو عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے تیمارداری کرتے اور کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اس کے لئے تدبیر فرماتے تھے۔

آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایا کے ہر طبقہ پر نظر رکھتے اور ان کے حالات سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ ہُد ہُد جو طیور میں چھوٹا اور کمزور بھی ہے اور اس کی تعداد بھی دنیا میں بہ نسبت دوسرے طیور کے کم ہے وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا، بلکہ خاص ہُد ہُد کے متعلق جو سوال آپ نے فرمایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ زمرۂ طیور میں کم تعداد اور کمزور ہے، اسلئے اپنی رعیت کے کمزوروں پر نظر رکھنے کا زیادہ اہتمام فرمایا۔ صحابۂ کرام میں حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس سنت انبیاء کو پوری طرح جاری کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرتے تھے کہ سب لوگوں کے حالات سے باخبر رہیں۔ جس شخص کو کسی مصیبت وتکلیف میں گرفتار پاتے اس کو امداد فرماتے تھے جس کے بہت سے واقعات ان کی سیرت میں مذکور ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر دریائے فرات کے کنارہ پر کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کے بچے کو پھاڑ ڈالا تو اس کا بھی عمر سے سوال ہوگا۔ (قرطبی)

یہ تھے وہ اصول جہانبانی وحکمرانی جو انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو سکھائے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کو عملاً جاری کر کے دکھلایا اور جس کے نتیجہ میں پوری مسلم وغیر مسلم رعایا امن واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی اور ان کے بعد زمین و آسمان نے ایسے عدل وانصاف اور عام دنیا کے امن وسکون اور اطمینان کا یہ منظر نہیں دیکھا۔

طیور میں سے ہُد ہُد کی تخصیص کی وجہ اور ایک اہم عبرت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ تمام پرندوں میں ہُد ہُد کی تفتیش کی کیا وجہ پیش آئی تو آپ نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کسی ایسے مقام میں قیام فرمایا جہاں پانی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہُد ہُد کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے۔ مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ ہُد ہُد سے یہ معلوم کریں کہ اس میدان میں پانی کتنی گہرائی میں ہے اور کس جگہ زمین کھودنے سے پانی کافی مل سکتا ہے۔ ہُد ہُد کی اس نشاندہی کے بعد وہ جنات کو حکم دے دیتے

کہ اس زمین کو کھود کر پانی نکالو وہ بڑی جلد کھود کر پانی نکال لیتے تھے۔ ہُد ہُد اپنی تیز نظر اور بصیرت کے باوجود شکاری کے جال میں پھنس جاتا ہے اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔

جاننے والو اس حقیقت کو پہچانو کہ ہُد ہُد زمین کی گہرائی کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے مگر زمین کے اوپر پھیلا ہوا جال اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں پھنس جاتا ہے۔ (قرطبی)

مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو امر تکلیف یا راحت کا کسی کے لئے مقدر کر دیا ہے تو تقدیر الٰہی نافذ ہو کر رہتی ہے کوئی شخص اپنی فہم و بصیرت یا زور و زر کی طاقت کے ذریعہ اس سے نہیں بچ سکتا۔

ہُد ہُد کو سزا

حضرت سلیمان نے فرمایا: لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاۡ اَذْبَحَنَّهٗ، ابتدائی غور و فکر کے بعد یہ حاکمانہ سیاست کا مظاہرہ ہے کہ غیر حاضر رہنے والے کو سزا دی جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے حق تعالیٰ نے جانوروں کو ایسی سزائیں دینا حلال کر دیا تھا جیسا عام امتوں کے لئے جانوروں کو ذبح کر کے ان کے گوشت پوست وغیرہ سے فائدہ اٹھانا اب بھی حلال ہے۔ اسی طرح پالتو جانور گائے، بیل، گدھا، گھوڑا، اونٹ وغیرہ اپنے کام میں سستی کرے اس کو تادیب کے لئے بقدر ضرورت مارنے کی معتدل سزا اب بھی جائز ہے۔ دوسرے جانوروں کو سزا دینا ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ (قرطبی)

اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یعنی اگر ہُد ہُد نے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر واضح پیش کر دیا تو وہ اس سزا سے محفوظ رہیگا۔ اس میں اشارہ ہے کہ حاکم کو چاہئے کہ جن لوگوں سے کوئی قصور عمل میں سرزد ہو جائے ان کو عذر پیش کرنیکا موقع دے، عذر صحیح ثابت ہو تو سزا کو معاف کر دے۔

ہُد ہُد کا عذر

اللہ تعالیٰ نے ہدہد کا عذر ان الفاظ میں بیان فرمایا: اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ، یعنی ہُد ہُد نے اپنا عذر بتلاتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ چیز معلوم ہے جو آپ کو معلوم نہیں، یعنی میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے علم نہیں تھا۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب

نہیں ہوتے جس سے ان کو ہر چیز کا علم ہو سکے۔

اور ہدہد نے مزید کہا: وَجِئْتُکَ مِنْ سَبَاٍم بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ، سباء، یمن کا ایک مشہور شہر جس کا ایک نام مآرب بھی ہے، اس کے اور یمن کے دارالحکومت صنعا کے درمیان تین دن کی مسافت تھی۔

ملکۂ سبا

ہد ہد نے بیان کیا: اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ، یعنی میں نے ایک عورت کو پایا جو قوم سبا کی مالک ہے یعنی ان پر حکومت کرتی ہے اس عورت یعنی ملکہ سبا کا نام تاریخ میں بلقیس بنت شراحیل بتلایا گیا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کی والدہ جنات میں سے تھی جس کا نام بلعمہ بنت شیصان بتلایا جاتا ہے (رواہ وہیب بن جریر عن الخلیل ابن احمد۔ قرطبی) اور ان کا دادا ہُداہد پورے ملک یمن کا ایک عظیم الشان بادشاہ تھا جس کی اولاد میں چالیس لڑکے ہوئے سب کے سب ملوک اور بادشاہ بنے۔ ان کے والد سراح نے ایک جنیہ عورت سے نکاح کر لیا تھا اسی کے بطن سے بلقیس پیدا ہوئی۔ جنیہ سے نکاح کرنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ اپنی حکومت وسلطنت کے غرور میں لوگوں سے کہتا تھا کہ تم میں کوئی میرا کفو نہیں اس لئے میں نکاح ہی نہ کروں گا کیونکہ غیر کفو میں نکاح مجھے پسند نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اس کا نکاح ایک جنیہ عورت سے کرا دیا (قرطبی) شاید یہ اسی فخر وغرور کا نتیجہ تھا کہ اس نے انسانوں کو جو درحقیقت کفو تھے حقیر وذلیل سمجھا اور اپنا کفو تسلیم نہ کیا تو قدرت نے اس کا نکاح ایک ایسی عورت سے مقدر کر دیا جو نہ اس کی کفو تھی نہ اس کی جنس وقوم سے تھی۔

بلقیس کی حکومت

بلقیس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے کہ وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ، مراد یہ ہے کہ سب ضروری سامان جو کسی بادشاہ وامیر کو درکار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے مطابق ہو سکتا ہے موجود تھا جو چیزیں اس زمانے میں ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں ان کا نہ ہونا اس آیت کے منافی نہیں۔

اور یہ بھی فرمایا کہ وَّلَھَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ، عرش کے لفظی معنے تخت سلطنت کے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ عرش بلقیس کا طول اسی ہاتھ اور عرض چالیس ہاتھ اور بلندی تیس ہاتھ تھی جس پر موتی اور یاقوت احمر، زبرجد، اخضر کا کام تھا اور اس کے پائے موتیوں اور جواہرات کے تھے اور پردے ریشم اور حریر کے، اندر باہر یکے بعد دیگر سات مقفل عمارتوں میں محفوظ تھا۔

قوم سبا

قوم سبا کے تعارف کے بارے میں کہا: وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ، معلوم ہوا کہ اس کی قوم نجوم پرست تھی آفتاب کی عبادت کرتی تھی بعض نے فرمایا کہ مجوس میں سے تھی جو آگ اور ہر روشنی کی پرستش کرتے ہیں۔ (قرطبی)

تحریر اور خط بھی عام معاملات میں حجت شرعیہ ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے نام خط بھیجنے کو اس پر اتمام حجت کے لئے کافی سمجھا اور اسی پر عمل فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام معاملات میں تحریر وخط قابل اعتبار ثبوت ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے صرف ان مواقع میں خط کو کافی نہیں سمجھا جہاں شہادت شرعیہ کی ضرورت ہے کیونکہ خط اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ شہادت نہیں لی جاسکتی۔ شہادت کا مدار شاہد کا عدالت کے سامنے آکر بیان دینے پر رکھا گیا جس میں بڑی حکمتیں مضمر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بھی دنیا کی کسی عدالت میں خط اور ٹیلی فون پر شہادت لینے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔

بلقیس کا ردعمل

(سلیمانؑ علیہ السلام نے ہُدہُد سے یہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون قرآن میں مذکور ہے اور ہُدہُد کے حوالہ کیا وہ اس کو چونچ میں لے کر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈال دیا) بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور) کہا کہ اے اہل دربار میرے پاس ایک خط (جس کا مضمون نہایت) باوقعت (اور عظیم الشان ہے) ڈالا گیا ہے (باوقعت اس لئے کہا کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اختصار کے اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں یہ

(مضمون) ہے (اوّل) بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (اور اسکے بعد یہ کہ) تم لوگ (یعنی بلقیس اور سب ارکانِ بادشاہت جن کے ساتھ عوام بھی وابستہ ہیں) میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر چلے آؤ۔ (مقصود تمام کو دعوت دینا ہے اور یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کا یا تو پہلے حال سن چکے ہوں گے گو سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کو نہ جانتے ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے چھوٹوں کو نہیں جانتے اور چھوٹے بڑوں کو جانا کرتے ہیں اور یا خط آنے کے بعد تحقیق کر لیا ہوگا اور خط کے مضمون کی اطلاع دینے کے بعد) بلقیس نے (یہ) کہا کہ اے اہل دربار تم مجھ کو میرے اس معاملہ میں رائے دو (کہ مجھ کو سلیمان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے) اور میں (کبھی) کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور اس میں شریک و مشیر نہ ہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم (اپنی ذات سے ہر طرح سے حاضر ہیں، اگر مقابلہ اور لڑنا مصلحت سمجھا جائے تو ہم) بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (اور آگے) اختیار تم کو ہے سو تم ہی (مصلحت) دیکھ لو جو کچھ (تجویز کر کے) حکم دینا ہو۔ بلقیس کہنے لگی کہ (میرے نزدیک لڑنا تو مصلحت نہیں کیونکہ سلیمان بادشاہ ہیں اور) بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ) جب کسی بستی میں (مخالفانہ طور پر) داخل ہوتے ہیں تو اس کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اس کے رہنے والوں میں جو عزت دار ہیں ان کو (ان کا زور گھٹانے کے لئے) ذلیل (وخوار) کیا کرتے ہیں اور (ان سے لڑائی کی جائے تو ممکن ہے کہ ان ہی کو غلبہ ہو تو پھر) یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے (تو بے ضرورت پریشانی میں پڑنا خلاف مصلحت ہے لہٰذا جنگ کو تو ابھی ملتوی کیا جائے) اور (سردست یوں مناسب ہے کہ) میں ان لوگوں کے پاس کچھ ہدیہ (کسی آدمی کے ہاتھ بھیجتی ہوں) پھر دیکھوں گی کہ وہ بھیجے ہوئے (وہاں سے) کیا (جواب) لے کر آتے ہیں (اس وقت دوبارہ غور کیا جائے گا۔ چنانچہ ہدیوں اور تحفوں کا سامان درست ہوا اور قاصد اس کو لے کر روانہ ہوا) جب وہ قاصد سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تمام ہدیے پیش کئے) تو سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس اور بلقیس والے) مال سے میری امداد کر (نا چاہتے) ہو (اس لئے ہدیے لائے ہو) سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ

مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے (کیونکہ تمہارے پاس صرف دنیا ہے اور میرے پاس دین بھی اور دنیا بھی تم سے زیادہ لہٰذا میں تو ان چیزوں کا حریص نہیں ہوں) ہاں تم ہی اپنے ہدیے پر فخر کرتے ہو گے (لہٰذا یہ ہدیے ہم نہ لیں گے) تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ (اگر وہ اب بھی ایمان لے آئیں تو درست ورنہ) ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ (ذلت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے) ماتحت (اور رعایا) ہو جائیں گے (یہ نہیں کہ نکالنے کے بعد آزادی سے چھوڑ دیئے جائیں کہ جہاں چاہیں چلے جائیں بلکہ ہمیشہ کی ذلت ان کے لئے لازمی ہو جائے گی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط کس زبان میں تھا

حضرت سلیمان علیہ السلام گو عربی نہ تھے لیکن عربی زبان جاننا اور سمجھنا آپ سے کوئی بعید بھی نہیں۔ جبکہ آپ پرندوں تک کی زبان جانتے تھے اور عربی زبان تو تمام زبانوں سے افضل و اشرف ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط عربی زبان میں لکھا ہو کیونکہ مکتوب الیہ (بلقیس) عربی النسل تھی اس نے خط کو پڑھا بھی اور سمجھا بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط اپنی ہی زبان میں تحریر فرمایا ہو اور بلقیس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان کا ترجمان ہو جس نے پڑھ کر خط سنایا اور سمجھایا ہو۔ (روح)

بلقیس کی سیاست

ملکہ بلقیس کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پہنچا تو اس نے اپنے ارکان حکومت کو جمع کر کے اس واقعہ کا اظہار کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس نے ان کی رائے دریافت کرنے سے پہلے ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کے لئے یہ بھی کہا کہ میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی'' اسی کا نتیجہ تھا کہ فوج اور وزراء نے اس کے جواب میں اپنی مستعدی کے ساتھ تعمیل حکم کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کر دی (نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ) حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ہم سے یہ

بیان کیا گیا ہے کہ بلقیس کی مجلس شوریٰ کے ارکان تین سو تیرہ تھے اور ان میں سے ہر ایک آدمی دس ہزار آدمیوں کا امیر اور نمائندہ تھا۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ اہم امور میں مشورہ لینے کا دستور پرانا ہے۔ اسلام نے مشورہ کو خاص اہمیت دی اور عمال حکومت کو مشورہ کا پابند کیا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو وحی الٰہی کے مورد تھے۔ اور آسمانی ہدایات آپ کو ملتی تھیں اس کی وجہ سے آپ کو کسی رائے مشورہ کی درحقیقت ضرورت نہ تھی، مگر امت کے لئے سنت قائم کرنے کے واسطے آپ کو بھی حکم دیا گیا (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ) یعنی آپ اہم امور میں صحابۂ کرام سے مشورہ لیا کریں۔ اس میں صحابۂ کرام کی دلجوئی اور عزت افزائی بھی ہے اور آئندہ آنے والے اعمال حکومت کو اس کی تاکید بھی کہ مشورہ سے کام کیا کریں۔

ارباب حکومت کو مشورہ میں شریک کر کے ان کا تعاون حاصل کر لینے کے بعد ملکہ بلقیس نے خود ہی ایک رائے قائم کی جس کا حاصل یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان لے اور تحقیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور جو کچھ حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کے احکام کی تعمیل ہے یا وہ ایک ملک گیری کے خواہشمند بادشاہ ہیں، اس امتحان سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعی وہ نبی و رسول ہیں تو ان کے حکم کا اتباع کیا جائے اور مخالفت کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے اور اگر بادشاہ ہیں اور ملک گیری کی ہوس میں ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں تو پھر غور کیا جائے گا کہ ان کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس امتحان کا طریقہ اس نے یہ تجویز کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس کچھ ہدیے تحفے بھیجے اگر وہ ہدیے تحفے لے کر راضی ہو گئے تو علامت اس کی ہو گی کہ وہ ایک بادشاہ ہی ہیں اور اگر وہ واقع میں نبی و رسول ہیں تو وہ اسلام و ایمان کے بغیر کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے، یہ مضمون ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہدؒ، ابن جریجؒ، ابن وہبؒ سے نقل کیا ہے اسی کا بیان اس آیت میں ہے۔

وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ یعنی میں حضرت

سلیمان علیہ السلام اوران کے ارکان دولت کے پاس ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ جو قاصد یہ ہدیہ لے کر جائیں گے وہ واپس آ کر کیا صورت حال بیان کرتے ہیں۔

بلقیس کے قاصدوں کی دربار سلیمانی میں حاضری

تاریخی اسرائیلی میں روایات میں بلقیس کی طرف سے آنے والے قاصدوں اور تحفوں کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔ اتنی بات پر سب روایات متفق ہیں کہ تحفہ میں کچھ سونے کی اینٹیں تھیں کچھ جواہرات اور ایک سو غلام اور ایک سو کنیزیں تھیں مگر کنیزوں کو مردانہ لباس میں اور غلاموں کو زنانہ لباس میں بھیجا تھا اور ساتھ ہی بلقیس کا ایک خط بھی تھا جس میں سلیمان علیہ السلام کے امتحان کے لئے کچھ سوالات بھی تھے، تحفوں کے انتخاب میں بھی ان کا امتحان مطلوب تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس کے تحفوں کی تفصیلات ان کے پہنچنے سے پہلے بتلا دی تھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے جنات کو حکم دیا کہ دربار سے نو فرسخ تقریباً تیس میل کی مسافت میں سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش کر دیا جائے اور راستہ میں دو طرفہ عجیب الخلقت جانوروں کو کھڑا کر دیا جائے جن کا بول و براز بھی سونے چاندی کے فرش پر ہو۔ اسی طرح اپنے دربار کو خاص اہتمام سے مزین فرمایا، دائیں بائیں چار چار ہزار سونے کی کرسیاں ایک طرف علماء کے لئے، دوسری طرف وزراء اور عمال سلطنت کے لئے بچھا دی گئیں۔ جواہرات سے پورا ہال مزین کیا گیا۔ بلقیس کے قاصدوں نے جب سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو کھڑا دیکھا تو اپنے تحفہ سے شرما گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سونے کی اینٹیں وہیں ڈال دیں، پھر جوں جوں آگے بڑھتے گئے دو طرفہ وحوش و طیور کی صفیں دیکھیں، پھر جنات کی صفیں دیکھیں تو بے حد مرعوب ہو گئے مگر جب دربار تک پہنچے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ خندہ پیشانی سے پیش آئے، ان کی مہمانی کا اکرام کیا مگر ان کے تحفے واپس کر دیئے اور بلقیس کے سب سوالات کے جوابات دیئے۔ (ملخصاً از تفسیر قرطبی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدیہ بلقیس کی واپسی

جب بلقیس کے قاصد اس کے ہدایا اور تحفے لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے قاصدوں سے فرمایا کہ کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اللہ نے جو مال و دولت دیا ہے وہ تمہارے مال و سامان سے کہیں زیادہ بہتر ہے اس لئے میں یہ مال کا ہدیہ قبول نہیں کرتا اس کو واپس لے جاؤ اور اپنے ہدیہ پر تم ہی خوش رہو۔

بلقیس کا تخت منگوانا

قرآن کریم میں ہے کہ (غرض وہ قاصد اپنے ہدایا لے کر واپس گیا اور سارا قصہ بلقیس سے بیان کیا تو حالات سے اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم اور نبوت کے کمالات کا یقین ہوگیا اور حاضر ہونے کے ارادہ سے اپنے ملک سے چلی) سلیمان (علیہ السلام کو وحی سے یا اور کسی پرندے وغیرہ کے ذریعہ اس کا چلنا معلوم ہوا تو انہوں) نے (اپنے دربار والوں سے) فرمایا کہ اے دربار والو تم میں کوئی ایسا ہے جو اس (بلقیس) کا تخت پہلے اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہو کر آویں حاضر کردے (مسلمین کی قید اظہار واقعہ کے لئے ہے کیونکہ وہ لوگ اسی قصد سے آرہے تھے تخت کا منگانا غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ میرا معجزہ بھی دیکھ لیں کیونکہ اتنا بڑا تخت اور پھر اس کا ایسے سخت پہروں میں اس طور پر اچانک آجانا کہ اطلاع تک نہ ہو عادت بشریہ سے باہر ہے اگر جنوں کی تسخیر یعنی تابع ہونے سے ہو تب بھی جنوں کا خود بخود تابع ہو جانا بھی ایک معجزہ ہی ہے اور اگر کسی ولی امت کی کرامت کے ذریعہ ہے تو ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور اگر بغیر کسی واسطہ کے ہے تو پھر معجزہ ہونا ظاہر ہے۔ بہر حال ہر طور پر یہ معجزہ اور نبوت کی دلیل ہے لہٰذا مقصود یہ ہوگا کہ اندرونی کمالات کے ساتھ ساتھ یہ معجزہ کے کمالات بھی دیکھ لیں تا کہ ایمان و اطمینان زیادہ ہو) ایک قوی ہیکل جن نے جواب (میں) عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا پہلے اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اٹھیں اور (گو وہ بہت بھاری ہے مگر) میں اس (کے لانے) پر طاقت رکھتا ہوں (اور گو بڑا قیمتی اور موتیوں سے مزین ہے مگر میں)

امانت دار (بھی) ہوں (اس میں کوئی خیانت نہ کروں گا) جس کے پاس کتاب (الٰہی یعنی تورات کا یا اور وحی کی ہوئی کسی کتاب کا جس میں اللہ کے ناموں کا تاثیرات ہوں اس) کا علم تھا (اقرب یہ ہے کہ اس نے خود سلیمان علیہ السلام مراد ہیں غرض) اس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ (بس تجھ میں تو اتنی ہی قوت ہے اور) میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا کھڑا کر سکتا ہوں (کیونکہ معجزہ کی طاقت سے لاؤں گا، چنانچہ آپ نے حق تعالیٰ سے دعا کی ویسے ہی یا کسی اسم الٰہی کے ذریعہ سے اور تخت فوراً سامنے آموجود ہوا) جب سلیمان (علیہ السلام) نے اس کو اپنے روبرو رکھا دیکھا تو (خوش ہو کر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے (کہ میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر کیا) تا کہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے (وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میرا رب غنی ہے کریم ہے (اس کے بعد) سلیمان (علیہ السلام) نے (بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے) حکم دیا کہ اس (کی عقل آزمانے) کے لئے اس کے تخت کی صورت بدل دو (جس کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں مثلاً موتیوں کی جگہیں بدل دو یا کسی اور طرح) ہم دیکھیں اس کو اس کا پتہ لگتا ہے یا اسکا انہیں میں شمار ہے جن کو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگتا (پہلی صورت میں معلوم ہوگا کہ وہ عقلمند ہے اور عقلمند سے حق بات سمجھنے کی زیادہ امید ہے اور اسکے حق کو پہچاننے کا اثر دور تک بھی پہنچے گا اور دوسری صورت میں اس سے حق پہچاننے کی امید کم ہے)۔

بلقیس کی حاضری دربارِ سلیمانی میں

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلقیس کے قاصد خود بھی مرعوب و مبہوت ہو کر واپس ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اعلان جنگ سنا دیا تو بلقیس نے اپنی قوم سے کہا کہ پہلے بھی میرا یہی خیال تھا کہ سلیمان دنیا کے بادشاہوں کی طرح بادشاہ نہیں بلکہ

اللہ کی طرف سے کوئی خاص منصب بھی ان کو ملا ہے اور اللہ کے نبی ورسول سے لڑنا اللہ کا مقابلہ ہے، جسکی ہم میں طاقت نہیں۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کی تیاری شروع کر دی۔ بارہ ہزار سرداروں کو اپنے ساتھ لیا جنکے تحت ایک ایک لاکھ افواج تھیں۔ (حضرت منصف" نے پہلے ہی فرمادیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں، جن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، خاص طور سے یہ روایت بعید از عقل اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے فرمانے کے مطابق جھوٹ سے زیادہ قریب ہے۔ محمد تقی۔ ا......ا......۲۳ھ) حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایسا رعب وجلال عطا فرمایا تھا کہ انکی مجلس میں کوئی ابتداء گفتگو کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام نے دور سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا تو حاضرین سے سوال کیا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: اے نبی اللہ! ملکہ بلقیس اپنے ساتھیوں کیساتھ آ رہی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ اس وقت وہ دربار سلیمانی سے ایک فرسخ یعنی تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے جنود وعساکر کو تخت لانے کا حکم فرمایا۔

تخت لانے کا حکم

حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بلقیس ان کی دعوت سے متاثر ہونے کی بناء پر مطیع بن کر آ رہی ہے۔ تو ارادہ فرمایا کہ وہ شاہانہ قوت وشوکت کے ساتھ ایک پیغمبرانہ معجزہ بھی دیکھ لے تو اسکے ایمان لانے کے لئے زیادہ معین ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تسخیر جنات کا عام معجزہ عطا فرمایا ہوا تھا شاید حق تعالیٰ کی طرف سے اشارہ پا کر انہوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ کسی طرح بلقیس کا تخت شاہی اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے حاضر ہو جائے اس لئے حاضرین کو جن میں جنات بھی تھے خطاب فرما کر یہ تخت لانے کے لئے فرمادیا اور اسکے تمام اموال و دولت میں تخت شاہی کا انتخاب بھی شاید اس لئے کیا گیا کہ وہ اس کی سب سے زیادہ محفوظ چیز تھی جس کو سات محلات شاہی کے وسط میں ایک محفوظ محل کے اندر مقفل کر کے رکھا تھا کہ اس کے اپنے آدمیوں کا بھی بھی وہاں تک گزر نہ تھا۔ اس کا بغیر دروازہ یا قفل توڑے ہوئے منتقل ہو جانا اور اتنی مسافت بعیدہ پر پہنچ جانا حق

تعالیٰ شانہٗ کی ہی قدرت کاملہ سے ہو سکتا ہے یہ اس کو حق تعالیٰ شانہ کی قدرت عظیمہ پر یقین کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتا تھا اس کے ساتھ اس پر بھی یقین لازم تھا کہ سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی خاص منصب حاصل ہے کہ ان کے ہاتھ پر ایسی فوق العادت چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں (ذکر واختارہ ابن جریر)

قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ مسلمین، مسلم کی جمع ہے جس کے لغوی معنی مطیع و فرمانبردار کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں مومن کو مسلم کہا جاتا ہے۔ یہاں بقول ابن عباسؓ اس کے لغوی معنے مراد ہیں، یعنی مطیع و فرمانبردار۔ کیونکہ ملکہ بلقیس کا اسلام لانا اس وقت ثابت نہیں بلکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہونے اور کچھ گفتگو کرنے کے بعد مسلمان ہوئی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم کے آنے والے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

آصف بن برخیا کی کرامت

تخت لانے کے لئے حضرت اپنے آپ کو پیش کرنے والے کے بارے میں ارشاد ہے کہ: قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ، یعنی کہا اس شخص نے جس کے پاس علم تھا کتاب میں سے یہ کون شخص تھا؟ اس کے متعلق ایک احتمال تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم انہیں کو حاصل تھا۔ اس صورت میں یہ سارا معاملہ بطور معجزہ کے ہوا اور یہی مقصود تھا کہ بلقیس کو پیغمبرانہ اعجاز کا مشاہدہ ہو جائے اور کوئی اشکال اس معاملے میں نہ رہے۔ مگر اکثر ائمہ تفسیر قتادہ وغیرہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے اور قرطبی نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے کہ یہ کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھا۔ ابن اسحٰق نے اس کا نام آصف بن برخیا بتلایا ہے اور یہ کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دوست تھا۔ اور بعض روایات کے اعتبار سے ان کا خالہ زاد بھائی بھی تھا جس کو اسم اعظم کا علم تھا جس کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دعا کی جائے قبول ہوتی ہے اور جو کچھ مانگا جائے اللہ کی طرف سے عطا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسم اعظم کا علم نہیں تھا کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصلحت اس میں دیکھی ہو

کہ یہ عظیم کارنامہ ان کی امت کے کسی آدمی کے ذریعہ ظاہر ہو جس سے بلقیس پر اور زیادہ اثر پڑے اس لئے بجائے خود یہ عمل کرنے کے اپنے اصحاب کو خطاب فرمایا ایکم یاتینی (کذا فی نصوص الحکم) اس صورت میں یہ واقعہ آصف بن برخیا کی کرامت ہوگی۔

تخت بلقیس کا واقعہ کرامت تھی یا تصرف

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اس کو آصف بن برخیا کا تصرف قرار دیا ہے۔ تصرف اصطلاح میں خیال ونظر کی طاقت استعمال کر کے حیرت انگیز کام صادر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے لئے نبی یا ولی بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، وہ مسمریزم جیسا ایک عمل ہے صوفیائے کرام نے اصلاح مریدین کے لئے کبھی کبھی اس کو استعمال کیا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ تصرف کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام آصف بن برخیا سے لیا۔ مگر قرآن کریم نے اس تصرف کو علم من الکتاب کا نتیجہ بتلایا ہے اس سے ترجیح اس کو ہی ہوتی ہے کہ یہ کسی دعا یا اسم اعظم کا اثر تھا جس کا تصرف سے کوئی واسطہ نہیں وہ کرامت ہی کے مفہوم میں داخل ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ان کا یہ کہنا کہ اَنَا اٰتِیۡکَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ یعنی میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے لادوں گا۔ یہ علامت اسکی ہے کہ یہ کام ان کے قصد واختیار سے ہوا جو علامت تصرف کی ہے کیونکہ کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی تو اس کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اطلاع کردی ہو کہ تم ارادہ کرو گے تو ہم یہ کام اتنی جلدی کردیں گے۔ یہ تقریر حضرت سیدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی ہے جو احکام القرآن میں سورۂ نمل کی تفسیر لکھنے کے وقت حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ اور تصرف کی حقیقت اور اسکے احکام پر حضرتؒ کا ایک مستقل رسالہ بنام ''التصرف'' عربی زبان میں تھا جس کا اردو ترجمہ احقر نے لکھا تھا وہ جداگانہ شائع ہوچکا ہے۔

بلقیس کا آنا اور مسلمان ہونا

سورۂ نمل میں ہے کہ (سلیمان علیہ السلام نے یہ سب سامان کر رکھا تھا، پھر بلقیس

پہنچی) سو جب بلقیس آئی تو اس سے (تخت دکھا کر) کہا گیا (خواہ سلیمان علیہ السلام نے خود کہا ہو یا کسی سے کہلوایا ہو) کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو ویسا ہی (بلقیس سے اس طور پر اس لئے سوال کیا کہ ہیئت تو بدل دی گئی تھی اپنی اصل کے اعتبار سے تو وہی تخت تھا اور صورت وہ نہ تھی۔ اسلئے یوں نہیں کہا کہ کیا یہی تمہارا تخت ہے بلکہ یہ کہا کہ ایسا ہی تمہارا تخت ہے اور بلقیس اسکو پہچان گئی اور اس کے بدل دینے کو بھی سمجھ گئی اس لئے جواب بھی مطابق سوال کے دیا) اور (یہ بھی کہا کہ) ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی (آپ کی نبوت کی) تحقیق ہو چکی ہے اور ہم (اسی وقت سے دل سے) مطیع ہو چکے ہیں (جب قاصد سے آپ کے کمالات معلوم ہوئے تھے اس معجزہ کی چنداں حاجت نہ تھی) اور (چونکہ اس معجزہ سے قبل تصدیق و اعتقاد کر لینا کمال عقل کی دلیل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے عاقل ہونے کی تقریر فرماتے ہیں کہ فی الواقع وہ تھی سمجھدار مگر چند روز تک جو ایمان نہ لائی تو وجہ اسکی یہ ہے کہ) اس کو (ایمان لانے سے) (غیر اللہ کی عبادت نے (جس کی اس کو عادت تھی) روک رکھا تھا (اور وہ عادت اس لئے پڑ گئی تھی کہ) وہ کافر قوم میں کی تھی (پس جو سب کو دیکھا وہی آپ کرنے لگی اور قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں مگر چونکہ عاقل تھی اس لئے جب تنبیہ کی گئی تو سمجھ گئی۔ اس کے بعد سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ علاوہ اعجاز و شان نبوت دکھلانے کے اس کو ظاہری شان سلطنت بھی دکھلا دی جائے تا کہ اپنے کو دنیا کے اعتبار سے بھی عظیم نہ سمجھے اس لئے ایک شیش محل بنوا کر اس کے صحن میں حوض بنوایا اور اس میں پانی اور مچھلیاں بھر کر اس کو شیشہ سے پاٹ دیا۔ اور شیشہ ایسا شفاف تھا کہ ظاہر نظر میں نظر نہ آتا تھا اور وہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اس محل میں جانے والے کو لامحالہ اس پر سے عبور کرنا پڑے۔ چنانچہ اس تمام سامان کے بعد) بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (ممکن ہے وہی محل قیام کے لئے تجویز کیا ہو، غرض وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اس کا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (چونکہ قرینہ سے پایاب گمان کیا اس لئے اس کے اندر گھسنے کے لئے دامن اٹھائے اور) اپنی

دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اس وقت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے۔ دامن اٹھانے کی ضرورت نہیں اس وقت) بلقیس) کو معلوم ہو گیا کہ یہاں پر دنیوی صنعت کاری کے عجائب بھی ایسے ہیں جو آج تک میں نے آنکھ سے نہیں دیکھے تو ان کے دل میں ہر طرح سے سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی اور بے ساختہ) کہنے لگی کہ اے میرے پروردگار میں نے (اب تک) اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں (اب) سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی ان کے طریق پر) ہو کر رب العالمین پر ایمان لائی۔

کیا بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آ گئی تھیں

آیاتِ مذکورہ میں بلقیس کا واقعہ اسی پر ختم ہو گیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گئی۔ اس کے بعد کیا حالات پیش آئے؟ قرآن کریم نے اس سے سکوت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے جب عبداللہ بن عیینہ سے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کا معاملہ اس پر ختم ہو گیا وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ مطلب یہ تھا کہ قرآن نے یہیں تک اس کا حال بیان کیا ہے اس کے بعد کا حال بتلانا قرآن نے چھوڑ دیا تو ہمیں بھی اس کی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ابن عساکر نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ اس کے بعد بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آ گئی اور اس کو اسکے ملک پر برقرار رکھ کر یمن واپس بھیج دیا۔ ہر مہینے حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں تشریف لے جاتے اور تین روز قیام فرماتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسکے لئے یمن میں تین عمدہ محلات ایسے تیار کرا دیئے تھے جس کی مثال ونظیر نہیں تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حضرت سلیمان کی موت کا عجیب واقعہ

حضرت سلیمان کی وفات کا تذکرہ قرآن کریم میں یوں ہے: فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ، الآیۃ، آیت میں لفظ منساۃ عصاء اور لاٹھی کے معنی میں ہے۔ بعض حضرات نے

فرمایا کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے، بمعنی عصاء، اور بعض نے فرمایا کہ عربی لفظ ہے۔ نساء کے معنی ہٹانے اور مؤخر کرنے کے ہیں، لاٹھی کے ذریعے انسان مضر چیزوں کو ہٹاتا ہے اس لئے اس کو منسأۃ کہا گیا، یعنی ہٹانے کا آلہ۔ اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا واقعہ عجیبہ بیان فرمایا کہ بہت سی عبرتوں اور ہدایتوں کا دروازہ کھول دیا۔

اس واقعہ میں بہت سی ہدایات ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جن کو ایسی بے مثل حکومت و سلطنت حاصل تھی کہ صرف ساری دنیا پر ہی نہیں بلکہ جنات اور طیور اور ہوا پر بھی ان کی حکومت تھی، مگر ان سب سامانوں کے باوجود موت سے ان کو بھی نجات نہ تھی۔ اور یہ کہ موت تو مقررہ وقت پر آنی تھی۔ بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام نے شروع کی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تکمیل فرمائی، اس میں کچھ کام تعمیر کا باقی تھا، اور یہ تعمیر کا کام جنات کے سپرد تھا جن کی طبیعت میں سرکشی غالب تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے کام کرتے تھے، ان کی وفات کا جنات کو علم ہو جائے تو فوراً کام چھوڑ بیٹھیں اور تعمیر رہ جائے، اس کا انتظام حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذن ربانی یہ کیا کہ جب موت کا وقت آیا تو موت کی تیاری کر کے اپنی محراب میں داخل ہو گئے، جو شفاف شیشے سے بنی ہوئی تھی، باہر سے اندر کی سب چیزیں نظر آتی تھیں، اور اپنے معمول کے مطابق عبادت کے لئے ایک سہارا لے کر کھڑے ہو گئے کہ روح پرواز کرنے کے بعد بھی جسم اس عصا کے سہارے اپنی جگہ جما رہے۔ سلیمان علیہ السلام کی روح وقت مقرر پر قبض کر لی گئی، مگر وہ اپنے عصا کے سہارے اپنی جگہ جمے ہوئے باہر سے ایسے نظر آتے تھے کہ عبادت میں مشغول ہیں، جنات کی یہ مجال نہ تھی کہ پاس آ کر دیکھ سکتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو زندہ سمجھ کر کام میں مشغول رہے، یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا، اور تعمیر بیت المقدس کا بقیہ کام پورا ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے گھن کی کیڑے کو جس کو فارسی میں دیوک اور اردو میں دیمک کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم نے اس کو دابۃ الارض کے نام سے موسوم کیا ہے، عصائے سلیمانی پر مسلط کر دیا۔ دیمک نے عصاء کی لکڑی کو اندر سے کھا کر کمزور کر دیا، عصاء کا سہارا ختم ہوا تو سلیمان علیہ السلام گر گئے، اس وقت جنات کو ان کی موت کی خبر ہوئی۔

جنات کو اللہ تعالیٰ نے دور دراز کی مسافت چند لمحات میں قطع کر لینے کی قوت عطا فرمائی ہے وہ بہت سے ایسے حالات وواقعات سے واقف ہوتے تھے، جن کو انسان نہیں جانتے، جب وہ انسانوں کو ان واقعات کی خبر دیتے تو انسان یہ سمجھتے تھے کہ یہ غیب کی خبر ہے اور جنات کو بھی علم غیب حاصل ہے، خود جنات کو بھی علم غیب کا دعویٰ ہو تو بعید نہیں، موت کے اس عجیب واقعہ نے اس کی بھی حقیقت کھول دی۔ خود جنات کو بھی پتہ چل گیا اور سب انسانوں کو بھی کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں، کیونکہ ان کو غیب کا علم ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے ایک سال پہلے ہی باخبر ہو جاتے۔ اور یہ سال بھر کی محنت ومشقت جوان کو زندہ سمجھ کر برداشت کرتے رہے اس سے بچ جاتے۔ آیت کے آخری جملے میں اسی کا بیان ہے۔ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ، اس میں عذاب مہین سے مراد وہ محنت مشقت کا کام ہے جس پر تعمیر بیت المقدس کی تکمیل کے لئے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے لگا دیا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کی موت کا یہ عجیب واقعہ کچھ تو خود قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے باقی تفصیل حضرت ابن عباس وغیرہ ائمہ تفسیر سے منقول ہے جو ابن کثیر وغیرہ سب تفاسیر میں نقل کی گئی ہے۔

عبرت

اس عجیب واقعہ سے یہ عبرت بھی حاصل ہوئی کہ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ وجو کام لینا ہوتا ہے اس کا جس طرح چاہیں انتظام کر سکتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں ہوا کہ موت کے باوجود سلیمان علیہ السلام کو سال بھر تک اپنی جگہ قائم رکھ کر جنات سے کام پورا کرالیا۔ اور یہ بھی کہ دنیا کے سارے اسباب وآلات اسی وقت تک اپنا کام کرتے ہیں جب تک منظور حق ہوتا ہے، جب منظور نہیں ہوتا تو آلات واسباب جواب دے دیتے ہیں، جیسے یہاں عصاء کا سہارا دیمک کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد خطرہ تھا کہ لوگ جنات کے حیرت انگیز عمل اور کارناموں اور بظاہر غیب کی چیزوں سے ان کے باخبر ہونے ہونے وغیرہ کے اعمال عجیبہ کو

دیکھ کر کہیں انہی کو اپنا معبود نہ بنا بیٹھیں، اس خطرہ کو بھی اس واقعہ موت نے ختم کر دیا، سب کو جنات کی بے خبری اور بے بسی معلوم ہو گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعائیں

امام نسائیؒ نے باسناد صحیح حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے چند دعائیں کیں، جو مقبول ہوئیں۔ ان میں سے ایک دعاء یہ ہے کہ جو شخص اس مسجد میں صرف نماز کی نیت سے داخل ہو (اور کوئی دنیاوی غرض نہ ہو) اس مسجد سے نکلنے سے پہلے اس کو تمام گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کہ اس وقت پاک تھا جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

اور سدی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور شکرانہ کے بارہ ہزار گائے بیل اور بیس ہزار بکریوں کی قربانی کر کے لوگوں کو دعوت عام دی، اور اس دن کی خوشی منائی اور صخرۂ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگیں کہ "یا اللہ آپ نے ہی مجھے یہ قوت اور وسائل عطا فرمائے، جن سے تعمیر بیت المقدس مکمل ہوئی تو یا اللہ مجھے اس کی بھی توفیق دیجئے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں اور مجھے اپنے دین پر وفات دیجئے اور ہدایت کے بعد میرے قلب میں کوئی زیغ اور کجی نہ ڈالئے۔ اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار جو شخص اس مسجد میں داخل ہو میں اس کے لئے آپ سے پانچ چیزیں مانگتا ہوں۔ ایک یہ کہ جو گناہگار توبہ کرنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کی توبہ قبول فرمالیں اور اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں۔ دوسرے یہ کہ جو آدمی کسی خوف وخطرہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کو امن دے دیں۔ اور خطرات سے نجات عطا فرمائیں۔ تیسرے یہ کہ جو بیمار آدمی اس میں داخل ہو اس کو شفا عطا فرمائیں۔ چوتھے یہ کہ جو فقیر آدمی اس میں داخل ہو اس کو غنی کر دیں۔ پانچویں یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جب تک وہ اس میں رہے آپ اپنی نظر عنایت ورحمت اس پر رکھیں بجز اس شخص کے جو کسی ظلم یا بے دینی کے کام میں مشغول ہو۔ (قرطبی)

بیت المقدس کی تعمیر کب مکمل ہوئی

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا کام حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں مکمل ہو چکا تھا، مگر جو واقعہ اوپر مذکور ہوا ہے وہ کچھ اس کے منافی نہیں کہ اصل تعمیر مکمل ہونے کے بعد بڑی تعمیرات میں کچھ کام رہا کرتے ہیں وہ باقی ہوں ان کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مذکورہ تدبیر اختیار کی ہو۔

موت کے بعد کتنا عرصہ کھڑے رہے

حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ موت کے بعد عصاء کے سہارے حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سال کھڑے رہے۔ (قرطبی) اور بعض روایات میں ہے کہ جب جنات کو یہ معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کی موت کو عرصہ ہو گیا ہم بے خبر رہے تو مدت موت معلوم کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک لکڑی پر دیمک چھوڑ دی، ایک دن رات میں جتنی لکڑی دیمک نے کھائی اس سے حساب لگالیا کہ عصائے سلیمانی پر ایک سال اس طرح گزرا ہے۔

بغوی نے علماء تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل ترپن سال کی ہوئی، اور ان کی سلطنت وحکومت چالیس سال رہی، تیرہ سال کی عمر میں سلطنت کا کام سنبھال لیا تھا، اور بیت المقدس کی تعمیر اپنی سلطنت کے چھوتے سال میں شروع کی تھی۔ (مظہری، قرطبی)

گھوڑوں کو ذبح کرنے کا واقعہ

حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنہ میں ایسے مشغول ہوئے کہ عصر کا وقت جو نماز پڑھنے کا معمول تھا وہ چھوٹ گیا، بعد میں متنبہ ہو کر آپ نے ان تمام گھوڑوں کو ذبح کر ڈالا کہ ان کی وجہ سے یاد الٰہی میں خلل واقع ہوا تھا۔

یہ نماز نفلی بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس صورت میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اتنی غفلت کی بھی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرض نماز ہو، اور معائنہ میں لگ کر بھول طاری ہوگئی ہو، بھول جانے کی صورت میں فرض نماز کے قضا ہونے سے گناہ تو نہیں

ہوتا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بلند منصب کے پیش نظر اس کا بھی تدارک فرمایا۔

اکثر حضرات مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے، لیکن ایک اور تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس میں واقعہ بالکل مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے وہ گھوڑے معائنہ کے لئے پیش کئے گئے جو جہاد کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انہیں دیکھ کر مسرور ہوئے۔ اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے ان گھوڑوں سے جو محبت اور تعلق خاطر ہے وہ دنیا کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے پروردگار ہی کی یاد کی وجہ سے ہے، کیونکہ یہ جہاد کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اور جہاد ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اتنے میں گھوڑوں کی وہ جماعت آپ کی نگاہوں سے روپوش ہوگئی۔ آپ نے حکم دیا کہ انہیں دوبارہ سامنے لایا جائے۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ سامنے آئے تو آپ ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

قدیم مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ اور امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے، کیونکہ اس پر مال ضائع کرنے کا شبہ نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کے الفاظ کے لحاظ سے دونوں تفسیروں کی گنجائش ہے، لیکن پہلی تفسیر کے حق میں چونکہ ایک مرفوع حدیث آگئی ہے جو سند کے اعتبار سے حسن ہے، اس لئے اس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

آزمائش

سورۂ نمل آیت ۳۴ میں ہے کہ: اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو (ایک اور طرح سے بھی) امتحان میں ڈالا اور ہم نے ان کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا۔ پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا۔

آزمائش کی نوعیت

اس آیت میں باری تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور آزمائش کا تذکرہ فرمایا ہے، اور اس سلسلے میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ اس آزمائش کے دوران کوئی دھڑ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈال دیا گیا تھا۔ اب وہ دھڑ کیا تھا؟ اس کے کرسی پر ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس سے آزمائش کیونکر ہوئی؟ یہ تفصیلات نہ قرآن کریم میں موجود ہیں اور نہ کسی صحیح حدیث

سے ثابت ہیں۔ اس لئے بعض محقق مفسرین مثلاً حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا رجحان یہاں بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جس بات کو مجمل چھوڑا ہے اس کی تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اتنی بات پر ایمان رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی، جس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی طرف پہلے سے زیادہ رجوع فرمایا، اور قرآن کریم کا اصل مقصد اتنے بیان سے پورا ہو جاتا ہے۔

اور بعض مفسرین نے اس آزمائش کی تفصیلات کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں متعدد احتمالات بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے بعض احتمالات تو خالص اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز ان کی انگوٹھی میں تھا، ایک دن ایک شیطان نے اس انگوٹھی کو قبضہ میں کر لیا، اور اس کی وجہ سے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر آپ ہی کی شکل میں حکمراں بن بیٹھا۔ چالیس دن کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ انگوٹھی ایک مچھلی کے پیٹ میں سے ملی، اس کے بعد آپ نے دوبارہ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یہ روایت متعدد مزید قصوں کے ساتھ کئی تفسیر کی کتابوں میں آئی ہے، لیکن حافظ ابن کثیرؒ اس قسم کی تمام روایات کو اسرائیلیات میں شمار کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"اہل کتاب میں ایک جماعت ایسی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں مانتی بس ظاہر یہ ہے کہ یہ جھوٹے قصے انہی لوگوں نے گھڑے ہیں۔" (تفسیر ابن کثیر ص ۳۶ ج ۴)

لہٰذا اس قسم کی روایات کو اس قرآنی آیت کی تفسیر کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

ان شاء اللہ نہ کہنے کا واقعہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک اور واقعہ صحیح بخاری رحمہ اللہ وغیرہ میں مذکور ہے، بعض حضرات مفسرین نے اس واقعہ کے بعض حصوں کو قرآن کریم کی اس آیت سے ملتا جلتا دیکھ کر اسے اس آیت کی تفسیر قرار دیا ہے اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ آج رات میں ازواج کے ساتھ وظیفہ، زوجیت ادا کروں گا۔ اور ان میں سے ہر بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کے راستے میں جہاد کرے گا۔ لیکن یہ خیال ظاہر فرماتے وقت آپ "ان شاء اللہ" کہنا بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کی یہ

فروگزاشت پسند نہ آئی اور اس نے آپ کے دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواج مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے یہاں ایک مردہ بچہ پیدا ہوا۔ جس کا ایک پہلو ندارد تھا۔

بعض مفسرین نے اس واقعہ کو آیت پر منطبق کر کے یہ فرمایا کہ تخت پر دھڑ کے لا ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کسی خادم نے یہ بچہ آپ کے تخت پر لا کر رکھ دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس پر تنبہ ہوا کہ یہ انجام میرے ''ان شاء اللہ'' نہ کہنے کا ہے۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرمایا اور اپنی اس فروگزاشت پر استغفار کیا۔

اس تفسیر کو متعدد محقق مفسرین مثلاً قاضی ابوالسعود، اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں بھی اسی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کو بھی آیت کی قطعی تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ واقعہ جتنی روایتوں میں آیا ہے ان میں کہیں اس بات کی کوئی علامت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا ہو۔ امام بخاریؒ نے بھی یہ حدیث کتاب الجہاد، کتاب الانبیاء اور کتاب الایمان والنذور وغیرہ میں تو متعدد طریقوں سے نقل کی ہے۔ لیکن کتاب التفسیر میں سورۂ صٓ کی تفسیر کے تحت اسے کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ آیت وھب لی ملکاً الخ کے تحت ایک دوسری روایت نقل کی ہے اور اس حدیث کا کوئی حوالہ تک نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ واقعہ آیت زیر بحث کی تفسیر نہیں، بلکہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے دوسرے متعدد واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اسی طرح یہ بھی ایک جداگانہ واقعہ ہے جس کا کسی آیت کی تفسیر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

بیمار ہونے کا واقعہ

ایک تیسری تفسیر امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے بیان کی ہے، اور وہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئے اور اس کی وجہ سے نقاہت اس درجہ بڑھ گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو ایک بے روح جسم معلوم ہوتا تھا اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی۔ اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے شکر بھی ادا کیا اور مغفرت بھی طلب فرمائی، اور آئندہ کے لئے بے نظیر حکومت کی دعا بھی کی۔

لیکن یہ تفسیر بھی محض قیاسی ہے، قرآن کریم کے الفاظ سے بھی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور کسی روایت سے بھی اس کا ثبوت نہیں ہے۔

استغفار اور حکومت کی دعا

سورہ نمل آیت ۳۵ تا ۴۰ میں ہے کہ: (حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے) دعا مانگی کہ اے میرے رب میرا (پچھلا) قصور معاف کر اور (آئندہ کے لئے) مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا (میرے زمانہ میں) کسی کو میسر نہ ہو (خواہ کوئی غیبی وجبی سامان عطا کر دیجئے، خواہ سلاطین زمانہ کو ویسے ہی دبا دیجئے تا کہ مقابلہ ہی نہ کر سکیں اور) آپ بڑے دینے والے ہیں (آپ کو اس دعا کا قبول کر لینا کچھ دشوار نہیں) سو (ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی خطا بھی معاف کر دی اور نیز) ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ (جانا) چاہتے نرمی سے چلتی (کہ اس سے گھوڑوں کی ضرورت نہ رہی) اور جنات کو بھی ان کے تابع کر دیا یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور (موتی وغیرہ کے لئے) غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے (غالباً جو مفوضہ خدمات سے گریز یا اس میں کوتاہی کرتا ہو۔ اس کو قید کی سزا ہوتی ہوگی، اور ہم نے یہ سامان دے کر ارشاد فرمایا کہ) یہ ہمارا عطیہ ہے، سو خواہ (کسی کو) دو یا نہ دو تم سے کچھ داروگیر نہیں (یعنی جتنا سامان ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں تم کو دوسرے بادشاہوں کی طرح محض خازن اور منتظم ہی نہیں بنایا، بلکہ تم کو مالک بھی بنا دیا ہے) اور علاوہ اس سامان کے جو دنیا میں ان کو عطا ہوا تھا) ان کے لئے ہمارے یہاں (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ کی) نیک انجامی ہے (جس کا ثمرہ پورے طور پر آخرت میں ظاہر ہوگا)۔

بے مثال سلطنت

حضرت سلیمانؑ نے دعا کی کہ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ م بَعْدِيْ (مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے بعد کسی کو میسر نہ ہو) اس دعا کا مطلب بعض مفسرین نے تو یہ بتایا ہے کہ میرے زمانے میں میری جیسی عظیم الشان سلطنت کسی اور کو میسر نہ ہو۔ گویا انکے نزدیک "میرے بعد" کا مطلب "میرے سوا" ہے۔ حضرت تھانویؒ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن بیشتر مفسرین کے نزدیک

دعا کا مفہوم یہ ہے کہ میرے بعد بھی کسی کو ایسی عظیم الشان حکومت حاصل نہ ہو، چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جیسی حکومت عطا فرمائی ویسی بعد میں بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہواؤں کا مسخر ہونا اور جنات کا ایسا تابع ہونا بعد میں کسی کو میسر نہ آسکا۔ بعض لوگ عملیات وغیرہ کے ذریعہ بعض جنات کو جو مسخر کر لیتے ہیں وہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر جنات سے اس کو کوئی نسبت نہیں، عملیات کے ماہرین دو ایک یا چند جنات کو تابع بنا لیتے ہیں۔ لیکن جس طرح کی ہمہ گیر حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کو حاصل تھی ویسی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

حکومت اور اقتدار کی دعا

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی باری تعالیٰ کی اجازت ہی سے مانگی تھی۔ اور چونکہ اس کا منشاء محض طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور کلمۂ حق کو سر بلند کرنے کا جذبہ کارفرما تھا اور باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ملنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام انہی مقاصد عالیہ کے لئے کام کریں گے۔ اور حب جاہ کے جذبات ان کے دل میں جگہ نہیں پائیں گے۔ اس لئے انہیں اس دعا کی اجازت بھی دے دی گئی اور اسے قبول بھی کر لیا گیا۔ لیکن عام لوگوں کے لئے از خود اقتدار کے طلب کرنے کو حدیث میں اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں حب جاہ و مال کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انسان کو اس قسم کے جذبات نفسانی سے خالی ہونے کا یقین ہو اور وہ واقعۃً اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد سے اقتدار حاصل نہ کرنا چاہتا ہو، تو اس کے لئے حکومت کی دعا مانگنا جائز ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

جنات کو قابو میں رکھنا

جنات کے بارے میں ارشاد ہے کہ: مُقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ۔ (زنجیروں میں جکڑے ہوئے) جنات کی تسخیر اور جو خدمات وانجام دیتے تھے یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سرکش جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اب ان زنجیروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ یہی نظر آنے والی لوہے کی زنجیریں ہوں، ہو سکتا ہے کہ جنات کو جکڑنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ جسے آسانی سے سمجھانے کے لئے یہاں زنجیروں سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام اور قرآن عزیز

قرآن عزیز میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں میں آیا ہے، سورۂ نساء، انعام، انبیاء اور ص۔ نساء اور انعام میں تو انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے۔

وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ (النساء ۴ آیت ۱۶۳)

اور عیسیٰ ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان

وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ (الانعام ۶، آیت ۸۴)

اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون علیہم السلام۔

اور سورۂ انبیاء اور ص میں مجمل تذکرہ ہے اور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان پر آزمائش و امتحان کا ایک سخت وقت آیا اور مصائب اور بلاؤں نے چہار جانب سے ان کو گھیر لیا مگر وہ صبر و شکر کے سوا حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور آخر کار ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا اور مصائب کے بادل دور کر کے ان کو فضل و عطا سے مالا مال کر دیا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ واقعات سے قبل حضرت ایوب کی شخصیت پر تاریخ کی روشنی میں بحث کر لی جائے تا کہ ہم اس ہستی کا صحیح تعارف کر سکیں جس کے صبر و شکر کی قرآن عزیز نے مدحت کی ہے اور جس کی زندگی کو مبارک اور اخلاقی بلندیوں میں ضرب المثل ٹھہرایا ہے۔

حضرت ایوب کی شخصیت

حضرت ایوب کی شخصیت سے متعلق تحقیق کے لئے صرف دو ماخذ ہو سکتے ہیں ایک تورات اور دوسرے وہ اقتباسات جو تاریخ قدیم سے اخذ کر کے مؤرخین عرب اور مؤرخین اسلام نے نقل کئے ہیں اور اگر ان کے ساتھ چند خارجی قرائن کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس

مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق سب سے قدیم شہادت سفرایوب کی ہے یعنی وہ صحیفہ جو مجموعہ تورات میں ایوب (علیہ السلام) کی جانب منسوب ہے اور جس میں ان کی حیات طیبہ کے متعلق تفصیلی حالات درج ہیں۔

سفرایوب میں تاریخی حیثیت سے ایوب (علیہ السلام) کے متعلق دو باتیں کی گئی ہیں ایک یہ کہ وہ سرزمین عوض کے باشندہ تھے۔عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور اللہ سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انکے مویشی اور چوپایوں پر سبا اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کرکے لوٹ لیا تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں قوموں کے زمانہ عروج کے معاصر تھے۔

عہد ایوب (علیہ السلام)

تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب (علیہ السلام) کا زمانہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت اسحق ویعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ کے درمیان ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے حدود میں تلاش کرنا چاہیے۔

ہماری یہ تحقیق چند اہم قرائن پر مبنی ہے اور جو اس درجہ واضح ہیں کہ اگر ان کو دلائل بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں۔

(۱) پہلا قرینہ یہ ہے کہ بالاتفاق محققین توراۃ کے نزدیک صحیفہ ایوب (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قبل زمانہ کا ہے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا ہے اور یہ کہ مجموعہ تورات میں سب سے قدیم صحیفہ سفرایوب ہے۔

(۲) جن مؤرخین نے ایوب (علیہ السلام) کو بنی ادوم میں سے بتایا ہے وہ بھی ادوم (عیسو یا عیص) اور ان کے درمیان دو واسطوں سے زیادہ بیان نہیں کرتے یعنی ایوب بن زراح بن موص (عوض) بن عیصو (عیسو)

(۳) یہی مؤرخین نے ایوب (علیہ السلام) کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے جب

مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق سب سے قدیم شہادت سفر ایوب کی ہے یعنی وہ صحیفہ جو مجموعہ تورات میں ایوب (علیہ السلام) کی جانب منسوب ہے اور جس میں ان کی حیات طیبہ کے متعلق تفصیلی حالات درج ہیں۔

سفر ایوب میں تاریخی حیثیت سے ایوب (علیہ السلام) کے متعلق دو باتیں کی گئی ہیں ایک یہ کہ وہ سرزمین عوض کے باشندہ تھے۔ عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا اور وہ شخص کامل اور صادق تھا اور اللہ سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انکے مویشی اور چوپایوں پر سبا اور کسدیوں (بابلیوں) نے حملہ کر کے لوٹ لیا تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں قوموں کے زمانہ عروج کے معاصر تھے۔

عہد ایوب (علیہ السلام)

تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب (علیہ السلام) کا زمانہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت اسحٰق و یعقوب (علیہما السلام) کے زمانہ کے درمیان ہے اور تقریباً ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے حدود میں تلاش کرنا چاہئے۔

ہماری یہ تحقیق چند اہم قرائن پر مبنی ہے اور جو اس درجہ واضح ہیں کہ اگر ان کو دلائل بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں۔

(۱) پہلا قرینہ یہ ہے کہ بالاتفاق محققین توراۃ کے نزدیک صحیفہ ایوب (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قبل زمانہ کا ہے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا ہے اور یہ کہ مجموعہ تورات میں سب سے قدیم صحیفہ سفر ایوب ہے۔

(۲) جن مؤرخین نے ایوب (علیہ السلام) کو بنی ادوم میں سے بتایا ہے وہ بھی ادوم (عیسو یا عیض) اور ان کے درمیان دو واسطوں سے زیادہ بیان نہیں کرتے یعنی ابو بن زراح بن موص (عوض) بن عیصو (عیسو)

(۳) یہی مؤرخین نے ایوب (علیہ السلام) کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے جب

مادری سلسلہ پر آتے ہیں تو لوط (علیہ السلام) کی صاحبزادی سے لے کر صاحبزدگان تک حضرت یوسف علیہ السلام کی صاحبزادیوں کے ذکر کے نیچے اترتے مثلاً ابن عساکر کہتے ہیں کہ وہ بنت لوط (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں اور قاضی بیضاوی نقل کرتے ہیں کہ وہ لیا بنت یعقوب (علیہ السلام) یا ماخیر بنت میشا بن یوسف (علیہ السلام) یا رحمت بن افرائیم بن یوسف (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ

ایوب (علیہ السلام) کے سلسلہ نسب میں تورات کے ناموں اور مؤرخین عرب کے ناموں میں کچھ اختلاف ہے لیکن بہ نظر تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ناموں کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف زبانوں میں منتقل ہونے کی وجوہ سے کتابت کی تصحیف وتبدیل کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے، یعنی تورات کا عوض اور عرب مؤرخین کا موص اور اسی طرح تورات کا زارح اور مورخین کا زراح ایک ہی ہیں البتہ جن بعض مؤرخین نے موص یا اموص کو ایوب اور زراح (زارح) کے درمیان بیان کردیا ہے وہ صحیح نہیں ہے حافظ ابن حجر نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بعض حضرات نے ایوب (علیہ السلام) کا نسب بیان کرتے ہوئے روم بن عیص کہہ کران کو بنی روم سے بتایا ہے یہ قطعاً بے اصل ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کا واقعہ

حافظ ابن کثیر نے اس قصے کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ابتدا میں مال ودولت اور جائیداد اور شاندار مکانات اور سواریاں اور اولاد اور حشم وخدم بہت کچھ عطا فرمایا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا کیا یہ سب چیزیں ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور بدن میں بھی ایسی سخت بیماری لگ گئی جیسے جذام ہوتا ہے کہ بدن کا کوئی حصہ بجز زبان اور قلب کے اس بیماری سے نہ بچا وہ اس حالت میں زبان وقلب کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھتے اور شکر ادا کرتے رہتے تھے۔ اس شدید بیماری کی وجہ سے سب عزیزوں، دوستوں اور پڑوسیوں نے ان کو الگ کر کے آبادی سے باہر ایک کوڑا کچرہ ڈالنے کی جگہ پر ڈال دیا۔ کوئی ان کے پاس نہ جاتا تھا صرف ان کی

بیوی ان کی خبر گیری کرتی تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی یا پوتی تھی جس کا نام لیابنت میشا ابن یوسف علیہ السلام بتلایا جاتا ہے (ابن کثیر) مال وجائیداد تو سب ختم ہو چکا تھا ان کی زوجہ محترمہ محنت مزدوری کر کے اپنے اور ان کے لئے رزق اور ضروریات فراہم کرتی اور ان کی خدمت کرتی تھیں۔ ایوب علیہ السلام کا یہ ابتلاء وامتحان کوئی حیرت وتعجب کی چیز نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ **اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الا مثل فالا مثل** یعنی سب سے زیادہ سخت بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں ان کے بعد دوسرے صالحین کو درجہ بدرجہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہر انسان کا ابتلاء اور آزمائش اس کی دینی صلابت اور مضبوطی کے اندازے پر ہوتا ہے جو دین میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اتنی اس کی آزمائش، وابتلاء زیادہ ہوتی ہے (تاکہ اسی مقدار سے اس کے درجات اللہ کے نزدیک بلند ہوں) حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں دینی صلابت اور صبر کا ایک امتیازی مقام عطا فرمایا تھا (جیسے داؤد علیہ السلام کو شکر کا ایسا ہی امتیاز دیا گیا تھا) مصائب وشدائد پر صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام ضرب المثل ہیں۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو مال و اولاد وغیرہ سب دنیا کی نعمتوں سے خالی کر کے آزمائش فرمائی تو انہوں نے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں اور زیادہ محنت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے مال جائیداد اور دولت دنیا اور اولاد عطا فرمائی جس کی محبت میرے دل کے ایک ایک جزء پر چھا گئی پھر اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ان سب چیزوں سے فارغ اور خالی کر دیا اور اب میرے اور آپ کے درمیان حائل ہونے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔

حافظ ابن کثیر یہ مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہب بن منبہ سے اس قصہ میں بڑی طویل روایات منقول ہیں جن میں غرابت پائی جاتی ہے اور طویل ہیں اس لئے ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا صبر کے خلاف نہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اس شدید بلاء میں کہ سب مال و جائیداد اور دولت دنیا سے

الگ ہو کر ایسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ لوگ پاس آتے ہوئے گھبرائیں، بستی سے باہر ایک کوڑے کچرے کی جگہ پر سات سال چند ماہ پڑے رہے کبھی جزع وفزع یا شکایت کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آیا۔ نیک بی بی لیا زوجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اللہ سے دعا کیجئے کہ یہ تکلیف دور ہو جائے تو فرمایا کہ میں نے ستر سال صحیح تندرست اللہ کی بے شمار نعمت ودولت میں گزارے ہیں کیا اس کے مقابلے میں سات سال بھی مصیبت کے گزرنے مشکل ہیں۔ پیغمبرانہ عزم وضبط اور صبر وثبات کا یہ عالم تھا کہ دعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کے خلاف نہ ہو جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور اپنی احتیاج و تکلیف پیش کرنا بے صبری میں داخل نہیں) بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دعا کرنے پر مجبور کر دیا اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے یہ دعا دعاء ہی تھی کوئی بے صبری نہیں تھی حق تعالیٰ نے ان کے کمال صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرما دی ہے فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا اس سبب کے بیان میں روایات بہت مختلف اور طویل ہیں اس لئے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

صحت وبرکت کا واپس ملنا

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ (جب ایوب علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور ان کو حکم ہوا کہ زمین پر ایڑ لگایئے یہاں سے صاف پانی کا چشمہ پھوٹے گا اس سے غسل کیجئے اور اسکا پانی پیجئے تو یہ سارا روگ چلا جائے گا۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کے مطابق کیا تمام بدن جو زخموں سے چور تھا اور بجز ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا اس چشمہ کے پانی سے غسل کرتے ہی سارا بدن کھال اور بال یکا یک اپنی اصلی حالت پر آگئے تو) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جنت کا ایک لباس بھیج دیا وہ زیب تن فرمایا اور اس کوڑے کچرے سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ زوجہ محترمہ حسب عادت ان کی خبر گیری کے لئے آئی تو ان کو اپنی جگہ پر نہ پا کر رونے لگی۔ ایوب علیہ السلام جو ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے ان کو نہیں پہچانا کہ حالت بدل چکی تھی، انہیں سے پوچھا کہ اے خدا کے بندے (کیا تمہیں معلوم ہے کہ) وہ بیمار مبتلا جو یہاں پڑا رہتا تھا کہاں چلا گیا، کیا کتوں یا بھیڑیوں نے

اسے کھالیا؟ اور کچھ دیر تک اس معاملے میں ان سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ سب سن کر ایوب علیہ السلام نے ان کو بتلایا کہ میں ہی ایوب ہوں مگر زوجہ محترمہ نے اب تک بھی نہیں پہچانا۔ کہنے لگی اللہ کے بندے کیا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ غور کرو میں ہی ایوب ہوں اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی اور میرا بدن ازسرنو درست فرمادیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا مال ودولت بھی ان کو واپس دیدیا اور اولاد بھی، اور اولاد کی تعداد کے برابر مزید اولاد بھی دے دی۔ (ابن کثیر)

حضرت ایوب علیہ السلام کی اولاد

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے سات لڑکے سات لڑکیاں تھیں اس ابتلاء کے زمانے میں یہ سب مر گئے تھے، جب اللہ نے ان کو عافیت دی تو ان کو بھی دوبارہ زندہ کردیا اور ان کی اہلیہ سے نئی اولاد بھی اتنی ہی اور پیدا ہوگئی جس کو قرآن میں ومثلهم معهم فرمایا ہے۔ ثعلبی نے کہا کہ یہ قول ظاہر آیت قرآن کے ساتھ اقرب ہے۔ (قرطبی)

بعض حضرات نے فرمایا کہ نئی اولاد خود اپنے سے اتنی ہی مل گئی، جتنی پہلے تھی اور ان کے مثل اولاد سے مراد اولاد کی اولاد ہے واللہ اعلم۔

دعا اور نجات

آیت ۴۱ تا ۴۴ میں ہے کہ: اور آپ ہمارے بندہ ایوب علیہ السلام کو یاد کیجئے جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔ اور یہ رنج و آزار بعض مفسرین کے قول کے مطابق وہ ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانے میں ایک بار شیطان ایک طبیب کی شکل میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کو ملا تھا۔ اسے انہوں نے طبیب سمجھ کر علاج کی درخواست کی، اس نے کہا اس شرط سے کہ اگر ان کو شفا ہوجائے تو یوں کہہ دینا کہ تو نے ان کو شفا دی، میں اور کچھ نذرانہ نہیں چاہتا۔ انہوں نے ایوب علیہ السلام سے ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ بھلی مانس وہ تو شیطان تھا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر

اللہ تعالیٰ مجھ کو شفا دیدے تو میں تجھ کو سو قمچیاں ماروں گا۔ پس آپکو سخت رنج پہنچا اس سے کہ میری بیماری کی بدولت شیطان کا یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ خاص میری بیوی سے ایسے کلمات کہلوانا چاہتا ہے جو ظاہراً موجب شرک ہیں۔ گو تاویل سے شرک نہ ہوں اگرچہ حضرت ایوب علیہ السلام ازالۂ مرض کیلئے پہلے بھی دعا کر چکے تھے۔ مگر اس واقعہ سے اور زیادہ ابتہال اور تضرع سے دعا کی، پس ہم نے انکی دعا قبول کر لی اور حکم دیا کہ) اپنا پاؤں (زمین پر) مارو۔ (چنانچہ انہوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پیدا ہو گیا۔ (رواہ احمد)

پس ہم نے ان سے کہا کہ۔ یہ (تمہارے لئے) نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا۔ (یعنی اس میں غسل کرو اور پیو بھی۔ چنانچہ نہائے اور پیا بھی، اور بالکل اچھے ہو گئے) اور ہم نے ان کو ان کا کنبہ عطا فرمایا اور ان کے ساتھ (گنتی میں) ان کے برابر اور بھی (دیئے) اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے اور اہل عقل کے لئے یادگار رہنے کے سبب سے (یعنی اہل عقل یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ صابروں کو کیسی جزا دیتے ہیں اور اب ایوب علیہ السلام نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ ان کی بیوی نے ایوب علیہ السلام کی خدمت بہت کی تھی۔ اور ان سے کوئی گناہ بھی صادر نہ ہوا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے لئے ایک تخفیف فرمائی) اور (ارشاد فرمایا کہ اے ایوب علیہ السلام) تم اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا سینکوں کا لو (جس میں سو سینکیں ہوں) اور (اپنی بیوی کو) اس سے مار لو اور (اپنی) قسم نہ توڑو (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آگے ایوب علیہ السلام کی تعریف کی ہے کہ) بے شک ہم نے ان کو (بڑا) صابر پایا، اچھے بندے تھے کہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہوتے تھے۔

شیطان کا عمل دخل

حضرت ایوب علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ (شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے) بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام جس بیماری میں مبتلا ہوئے وہ شیطان کے تسلط کی وجہ سے آئی تھی۔ اور ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ فرشتوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی جس پر شیطان کو سخت حسد ہوا اور

اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ان کے جسم اور مال واولاد پر ایسا تسلط عطا کر دیا جائے جس سے میں انکے ساتھ جو چاہوں سو کروں، اللہ تعالیٰ کو بھی حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش مقصود تھی، اسلئے شیطان کو یہ حق دیدیا گیا اور اس نے آپ علیہ السلام کو اس بیماری میں مبتلا کر دیا۔

لیکن محقق مفسرین نے اس قصے کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انبیاء علیہم السلام پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے آپ کو بیمار ڈال دیا ہو۔

بعض حضرات نے شیطان کے رنج وآزار پہنچانے کی یہ تشریح کی ہے کہ بیماری کی حالت میں شیطان حضرت ایوب علیہ السلام کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالا کرتا تھا، اس سے آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوتی تھی، یہاں آپ نے اسی کا ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے مرض کی نوعیت

قرآن کریم میں اتنا تو بتایا گیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک شدید قسم کا مرض لاحق ہوگیا تھا، لیکن اس مرض کی نوعیت نہیں بتائی گئی۔ احادیث میں بھی اس کی کوئی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ البتہ بعض آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جسم کے ہر حصے پر پھوڑے نکل آئے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے گھن کی وجہ سے آپ کو ایک کوڑی پر ڈال دیا تھا۔ لیکن بعض محقق مفسرین رحمہ اللہ نے ان آثار کو درست تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بیماریاں تو آسکتی ہیں، لیکن انہیں ایسی بیماریوں میں مبتلا نہیں کیا جاتا، جن سے لوگ گھن کرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری بھی ایسی نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ کوئی عام قسم کی بیماری تھی، لہٰذا وہ آثار جن میں حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف پھوڑے پھنسیوں کی نسبت کی گئی ہے یا جن میں کہا گیا ہے کہ آپ کو کوڑی پر ڈال دیا گیا تھا، روایۃً ودرایۃً قابل اعتماد نہیں ہیں۔ (ملخص از روح المعانی واحکام القرآن)

حضرت یونس علیہ السلام

قرآن عزیز میں ذکر

قرآن عزیز میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھ سورتوں میں کیا گیا ہے۔ سورہ نساء، انعام، یونس، الصافات، انبیاء، القلم ان میں سے چار پہلی سورتوں میں نام مذکور ہے اور دو آخری سورتوں میں ذوالنون اور صاحب الحوت، مچھلی والا کہہ کر صفت کا اظہار کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ سورہ نساء اور انعام میں انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں فقط نام مذکور ہے اور باقی سورتوں میں واقعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کی حیات طیبہ کے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جو ان کی پیغمبرانہ زندگی سے وابستہ ہے اور جس میں رشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوت بصیرت دیتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

قرآن عزیز کی روشنی میں یونس علیہ السلام کا واقعہ اگرچہ مختصر اور اظہار واقعہ کے لحاظ سے صاف اور واضح ہے مگر بعض تفسیری مباحث نے اس کی جزئیات کو معرکۃ الآراء بنا دیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول آیات قرآن کی روشنی میں واقعہ کو مفصل بیان کر دیا جائے تاکہ واقعہ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملے۔

حضرت یونس (علیہ السلام) کی عمر مبارک اٹھائیس سال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا اور اہل نینویٰ کی رشد و ہدایت کے لئے مامور کیا، یونس (علیہ السلام) ایک عرصہ تک ان کو تبلیغ فرماتے اور توحید کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے اعلان حق پر کان نہ دھرا اور تمرد و سرکشی کے ساتھ شرک و کفر پر اصرار کیے رہے اور گذشتہ نافرمان قوموں کی طرح اللہ کے سچے پیغمبر کی دعوت حق کا ٹھٹھا کرتے اور مذاق اڑاتے رہے تب

مسلسل اور پیہم مخالفت و معاندت سے متاثر ہو کر یونس (علیہ السلام) قوم سے خفا ہو گئے اور ان کو عذاب الٰہی کی بد دعا کر کے ان کے درمیان سے غضبناک روانہ ہو گئے۔

فرات کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا' حضرت یونس (علیہ السلام) کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ راہ میں طوفانی ہواؤں نے کشتی کو آ گھیرا جب کشتی ڈگمگانے لگی اور اہل کشتی کو غرق ہونے کا یقین ہونے لگا تو اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے جب تک اس کو کشتی سے جدا نہ کیا جائے گا نجات مشکل ہے" یونس (علیہ السلام) نے سنا تو ان کو تنبیہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا نینویٰ سے وحی کا انتظار کیے بغیر اس طرح چلا آنا پسند نہیں آیا اور یہ میری آزمائش کے آثار ہیں' یہ سوچ کر انہوں نے اہل کشتی سے فرمایا وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو مگر ملاح اور اہل کشتی ان کی پاکبازی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپس میں یہ طے کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے چنانچہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ یونس (علیہ السلام) کے نام پر قرعہ نکلا' تب مجبور ہو کر انہوں نے یونس (علیہ السلام) کو دریا میں ڈال دیا یا وہ خود دریا میں کود گئے اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو مچھلی نے نگل لیا مچھلی کو حکم تھا کہ صرف نگل لینے کی اجازت ہے یونس تیری غذا نہیں ہے اس لیے اس کے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے یونس (علیہ السلام) نے جب مچھلی کے پیٹ میں خود کو زندہ پایا تو درگاہ الٰہی میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا کہ کیوں وہ وحی الٰہی کا انتظار کیے اور اللہ تعالیٰ سے اجازت لیے بغیر امت دعوت سے ناراض ہو کر نینویٰ سے نکل آئے اور عفو تقصیر کیلئے اس طرح دعا گو ہوئے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ. اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء پ ۱۷ آیت ۸۷) الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تُو ہی یکتا ہے میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بے شبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے یونس (علیہ السلام) کی درد بھری آواز کو سنا اور قبول فرمایا' مچھلی کو حکم ہوا کہ یونس کو "جو تیرے پاس ہماری امانت ہے" اگل دے چنانچہ مچھلی نے ساحل پر یونس (علیہ السلام) کو اگل دیا' حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مچھلی کے

پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسا کسی پرندہ کا پیدا شدہ بچہ کہ جس کا جسم بے حد نرم ہوتا ہے اور جسم پر بال تک نہیں ہوتے غرض یونس (علیہ السلام) بہت نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیئے گئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک بیلدار درخت اگا دیا جس کے سایہ میں وہ ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ کے حکم سے اس بیل کی جڑ کو کیڑا لگ گیا اور اس نے جڑ کو کاٹ ڈالا جب بیل سوکھنے لگی تو یونس (علیہ السلام) کو بہت غم ہوا' تب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ان کو مخاطب کیا اور فرمایا "یونس تم کو اس بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیری سی چیز ہے مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نینویٰ کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی جس میں انسان بس رہے ہیں اور ان کے علاوہ جاندار بھی آباد ہیں اس کو برباد اور ہلاک کر دینے میں ہم کو کوئی ناگواری نہیں ہو گی اور کیا ہم ان کے لیے اس سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں ہیں جتنا کہ تجھ کو اس بیل کے ساتھ انس ہے جو تم وحی کا انتظار کیے بغیر قوم کو بد دعا کر کے ان کے درمیان سے نکل آئے ایک نبی کی شان کے یہ نامناسب ہے کہ وہ قوم کے حق میں عذاب کی بد دعا کرنے اور نفرت کر کے ان سے جدا ہو جانے میں عجلت کرے اور وحی کا بھی انتظار نہ کرے"

ہوا یہ کہ ادھر یونس (علیہ السلام) بد دعا کر کے اہل نینویٰ سے جدا ہوئے اور ادھر انہوں نے بد دعا کے کچھ آثار محسوس کیے' نیز یونس (علیہ السلام) کے بستی چھوڑ دینے پر ان کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اللہ کے سچے پیغمبر تھے اور اب ہلاکت یقینی ہے تب ہی تو یونس ہم سے جدا ہو گئے' یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف و دہشت سے کانپ اٹھے اور یونس (علیہ السلام) کو تلاش کرنے

سورہ یونس میں تذکرہ

قرآن کریم میں ہے کہ: پیشین گوئیوں کی بناء پر اس قرآن کے صدق کو بتلا دیں بیشک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں اور نہ شک کرنے والوں سے بڑھ کر ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے

اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا' کہیں آپ (نعوذ باللہ) تباہ نہ ہو جاویں یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی (یہ ازلی) بات کہ (یہ ایمان نہ لاویں گے) ثابت ہو چکی ہے وہ کبھی ایمان نہ لاویں گے گو ان کے پاس تمام دلائل ثبوت حق کے پہنچ جاویں' جب تک کہ عذاب دردناک کو نہ دیکھ لیں مگر اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا چنانچہ جن بستیوں پر عذاب آ چکا ہے ان میں سے کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا کیونکہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق نہ ہوئی تھی ہاں مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی اس لئے وہ عذاب موعود کے آثار ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے اور جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت خاص یعنی وقت موت تک خیر خوبی کے ساتھ عیش دیا' پس اور قریوں کا ایمان نہ لانا اور قوم یونس (علیہ السلام) کا ایمان لانا دونوں مشیت سے ہوئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس جگہ بعض معاصرین سے ایک سخت غلطی ہوئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف فریضہ رسالت ادا کرنے میں کوتاہیوں کی نسبت کر دی اور قوم سے عذاب ہٹ جانے کا سبب پیغمبر کی کوتاہی کو قرار دیا' اور اسی کوتاہی کو سبب عتاب بنایا جس کا ذکر سورہ انبیاء اور سورہ صٰفٰت میں آیا ہے' ان کے الفاظ یہ ہیں:

''قرآن کے ارشادات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا اس لئے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا' قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول وکلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر دیتا پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے

پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا۔" اھ (تفہیم القرآن (تفہیم القرآن کے بعد کے اڈیشنوں میں اس عبارت سے کسی رجوع کے اعلان کے بغیر یہاں عبارت میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے یعنی فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی" کے الفاظ نئی عبارت میں موجود نہیں ہیں، لیکن یہ بات اب بھی عبارت میں باقی ہے کہ "جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔" لہذا تفہیم القرآن کی عبارت میں تبدیلی کے باوجود "معارف القرآن" کا تبصرہ علیٰ حالہ برقرار ہے۔ ناشر اکتوبر ۱۹۹۱ء) مولانا مودودی ج ۲ ص ۳۱۲ طبع ۱۹۶۴ء)

یہاں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے معصوم ہونا تو ایک مسلمہ عقیدہ ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہے، اس کی تفصیلات میں کچھ جزوی اختلاف بھی ہیں کہ یہ عصمت ہر قسم کی صغیرہ گناہوں سے ہے یا صرف کبیرہ سے اور یہ کہ یہ عصمت قبل از نبوت کے زمانے کو بھی شامل ہے یا نہیں، لیکن اس میں کسی فرقہ کسی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے، کیونکہ انبیاء کے لئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے خود اسی میں کوتاہی کر بیٹھیں، یہ تو فرض منصبی میں کھلی ہوئی خیانت ہے جو عام شریف انسانوں سے بھی بعید ہے، اس کوتاہی سے بھی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوا تو پھر دوسرے گناہوں سے عصمت بے فائدہ ہے۔

قرآن و سنت کے مسلمہ اصول اور اجماعی عقیدہ عصمت انبیاء کے بظاہر خلاف اگر کسی جگہ قرآن و حدیث میں بھی کوئی بات نظر آتی تو اصول مسلمہ کی رو سے ضروری تھا کہ اس کی تفسیر و معنیٰ کی ایسی توجیہ تلاش کی جاتی جس سے وہ قرآن و حدیث کے قطعی الثبوت اصول سے متصادم و مختلف نہ رہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ مصنفِ موصوف نے جس بات کو قرآنی اشارات اور صحیفہ یونس علیہ السلام کی تفصیلات کے حوالے سے پیش کیا ہے وہ صحیفہ یونس علیہ السلام میں ہو تو ہو جس کا اہل اسلام میں کوئی اعتبار نہیں' قرآنی اشارہ تو ایک بھی نہیں' بلکہ ہوا یہ کہ کئی مقدمے جوڑ کر یہ نتیجہ زبردستی نکالا گیا ہے' پہلے تو یہ فرض کر لیا گیا کہ قوم یونس علیہ السلام سے عذاب کا ٹل جانا خدائی دستور کے خلاف واقع ہوا' جو خود اسی آیت کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے اور اہل تحقیق ائمہ تفسیر کی تصریحات کے بھی خلاف ہے' اس کے ساتھ یہ فرض کر لیا گیا کہ خدائی قانون کو اس موقع پر اس لئے توڑا گیا تھا کہ خود پیغمبر سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں' اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا کہ پیغمبر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص وقت نکلنے کا مقرر کر دیا گیا تھا' وہ اس وقت مقرر سے پہلے فریضہ دعوت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگر ذرا بھی غور وانصاف سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ قرآن وحدیث کا کوئی اشارہ ان فرضی مقدمات کی طرف نہیں پایا جاتا۔

خود آیت قرآن کے سیاق پر غور کیجئے تو الفاظ آیت کے یہ ہیں:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ

جس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ دنیا کے عام بستی والوں کے متعلق بطور اظہار افسوس یہ ارشاد ہے کہ وہ ایسے کیوں نہ ہو گئے کہ ایمان اس وقت لے آتے جس وقت تک ایمان مقبول اور نافع ہوتا ہے یعنی عذاب میں یا موت میں مبتلا ہونے سے پہلے پہلے ایمان لے آتے تو ان کا ایمان قبول ہو جاتا' مگر قوم یونس اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ آثار عذاب دیکھ کر عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی ایمان لے آئی تو ان کا ایمان اور توبہ قبول ہو گئی۔

آیت کا یہ واضح مفہوم خود بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی خدائی قانون نہیں توڑا گیا بلکہ عین خدائی دستور کے مطابق ان کا ایمان اور توبہ قبول کر لی گئی ہے۔

اکثر مفسرین بحر محیط' قرطبی' زمخشری' مظہری' روح المعانی وغیرہ نے آیت کا یہی مفہوم لکھا ہے جس میں قوم یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہونا عام قانون الٰہی کے تحت ہے' قرطبی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

ابن جبیر کہتے ہیں کہ عذاب نے ان کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا جیسے قبر پر چادر پھر چونکہ ان کی توبہ صحیح ہوگئی (کہ وقوع عذاب سے پہلے تھی) تو ان کا عذاب اٹھا دیا گیا' طبری فرماتے ہیں کہ قوم یونسؑ کو تمام اقوام عالم سے یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ معائنہ عذاب کے بعد ان کی توبہ قبول کرلی گئی' زجاج نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ابھی عذاب پڑا نہیں تھا بلکہ علامات عذاب دیکھی تھیں اور اگر عذاب پڑ جاتا تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی' قرطبی فرماتے ہیں کہ زجاج کا قول اچھا اور بہتر ہے کیونکہ جس معائنہ عذاب کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی وہ وہ ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جائے جیسا واقعہ فرعون میں پیش آیا اور اسی لئے اس سورہ میں قوم یونس کا واقعہ فرعون کے واقعہ کے بعد متصلاً ذکر فرمایا ہے تاکہ فرق واضح ہو جائے کہ فرعون کا ایمان ابتلاء عذاب کے بعد تھا' بخلاف قوم یونسؑ کے کہ وہ وقوع عذاب سے پہلے ہی ایمان لے آئی' اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک وہ غرغرہ کی حالت میں نہ پہنچ جائے' اور غرغرہ موت کے وقت طاری ہونے والے سکرات کو کہتے ہیں اور یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں بتلایا ہے کہ قوم یونس نے وقوع عذاب سے پہلے توبہ کرلی تھی' قرطبی فرماتے ہیں کہ اس تقریر و تفسیر پر نہ کوئی اشکال ہے نہ تعارض نہ قوم یونس کی تخصیص۔

اور طبری وغیرہ مفسرین نے بھی جو اس واقعہ کو قوم یونسؑ کی خصوصیت بتلایا ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس خصوصیت کا سبب یونس علیہ السلام کی کوتاہیاں تھیں بلکہ اس قوم کا سچے دل سے توبہ کرنا اور علم الٰہی میں مخلص ہونا' وغیرہ وجوہات لکھی ہیں۔

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ قوم یونس علیہ السلام کا عذاب ٹل جانا عام قانون قدرت کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ عین مطابق تھا تو اس کلام کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔

اسی طرح کسی قرآنی اشارے سے یہ ثابت نہیں کہ عذاب کی وعید سنانے کے بعد یونس علیہ السلام بغیر اذن خداوندی اپنی قوم سے الگ ہو گئے بلکہ سیاق آیات اور تفسیری روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا تمام سابق امتوں کے ساتھ معاملہ ہوتا آیا تھا کہ جب ان کی امت پر عذاب آنے کا فیصلہ کرلیا جاتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے

ساتھیوں کو یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیتے تھے جیسا لوط علیہ السلام کا واقعہ بتفریح قرآن میں مذکور ہے' اسی طرح یہاں بھی جب اللہ کا یہ حکم یونس علیہ السلام کے ذریعہ ان لوگوں کو پہنچا دیا گیا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا تو یونس علیہ السلام کا اس جگہ سے نکل جانا ظاہر یہی ہے کہ بامر خداوندی ہوا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کو تنبیہ کس عمل پر ہوئی

البتہ یونس علیہ السلام سے جو پیغمبرانہ شان کے اعتبار سے ایک لغزش ہوئی اور اس پر سورہ انبیاء اور سورہ صٰفت کی آیتوں میں عتاب کے الفاظ آئے اور اسی کے نتیجہ میں مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ پیش آیا' وہ یہ نہیں کہ انہوں نے فریضہ رسالت میں کوتاہی کر دی تھی بلکہ واقعہ وہ ہے جو اوپر مستند تفسیروں کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے حکم کے مطابق تین دن کے بعد عذاب کے آنے کی وعید سنا دی اور پھر باذنِ الٰہی اپنی جگہ کو چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ عذاب نہیں آیا تو اب یونس علیہ السلام کو اس کی فکر لاحق ہوئی کہ میں اپنی قوم میں واپس جاؤں گا تو جھوٹا قرار دیا جاؤں گا اور اس قوم کا یہ دستور تھا کہ جس کا جھوٹ ثابت ہو جائے اس کو قتل کر دیں تو اب اپنی قوم کی طرف لوٹ کر جانے میں جان کا بھی اندیشہ ہوا' ایسے وقت بجز اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ اب اس وطن ہی سے ہجرت کر جائیں لیکن سنت انبیاء علیہم السلام کی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ آ جائے محض اپنی رائے سے ہجرت نہیں کرتے تو یونس علیہ السلام کی لغزش یہ تھی کہ اللہ کی اجازت آنے سے پہلے ہجرت کا قصد کر کے کشتی پر سوار ہو گئے جو اگرچہ اپنی ذات میں کوئی گناہ نہیں تھا مگر سنت انبیاء سے مختلف تھا' اگر آیات قرآن کے الفاظ میں غور کریں تو یونس علیہ السلام کی لغزش فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں بلکہ قوم کے ظلم وستم سے بچنے کیلئے ہجرت قبل الاذن کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوگی' سورہ صٰفت کی آیت اس مضمون کیلئے تقریباً صریح ہے جس میں فرمایا ہے اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ اس میں بقصد ہجرت کشتی پر سوار ہونے کو ابق کے لفظ سے بطور عتاب کے تعبیر کیا گیا ہے' جس کے معنیٰ ہیں کسی غلام کا اپنے

آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ جانا اور سورہ انبیاء کی آیت میں ہے وَذَاالنُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ جس میں طبعی خوف کی بناء پر قوم سے جان بچا کر ہجرت کرنے کو بطور عتاب کے اس شدید عنوان سے بیان فرمایا ہے' اور یہ سب فرائض رسالت کی مکمل ادائیگی کے بعد اس وقت پیش آیا جبکہ اپنی قوم میں واپس جانے سے جان کا خطرہ لاحق ہو گیا' تفسیر روح المعانی میں یہی مضمون بالفاظ ذیل لکھا ہے:

ای غضبان علی قومه لشدة شکیمتهم و تمادی اصرارهم مع طول دعوته ایاهم، و کان ذهابه هذا سهم هجرة عنهم لکنه لم یؤمر به.

یعنی یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اس لئے چل دیئے کہ قوم کی شدید مخالفت اور اپنے کفر پر اصرار کے باوجود زمانہ دراز تک دعوت رسالت پہنچاتے رہنے کا مشاہدہ کر چکے تھے اور ان کا یہ سفر ہجرت کے طور پر تھا مگر ابھی تک ان کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔

اس میں واضح کر دیا ہے کہ دعوت و رسالت میں کوئی کوتاہی سبب عتاب نہیں تھی بلکہ قبل از اجازت ہجرت کرنا سبب عتاب بنا جو فی نفسہ کوئی گناہ نہ تھا مگر سنت انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عتاب آیا ہے' معاصر موصوف کو بعض علماء نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا تو سورہ صفت کی تفسیر میں انہوں نے اپنے موقف کی حمایت و تائید میں بہت سے مفسرین کے اقوال بھی نقل فرمائے ہیں جن میں وہب بن منبہ وغیرہ کی بعض اسرائیلی روایتوں کے سوا کسی سے ان کا یہ موقف صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے معاذ اللہ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں۔

اسرائیلی روایات

اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ عام طور پر حضرات مفسرین اپنی تفسیروں میں اسرائیلی روایات بھی نقل کر دیتے ہیں جن کے بارے میں ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ روایات مستند و معتبر نہیں' کسی حکم شرعی کا ان پر مدار نہیں رکھا جا سکتا' اسرائیلی روایات خواہ مفسرین اسلام کی کتابوں میں ہوں یا صحیفہ یونسؑ میں صرف انہی کے سہارے حضرت یونس علیہ السلام پر یہ بہتان عظیم لگایا جا سکتا ہے کہ ان سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں

ہوگئی تھیں اور کسی مفسر اسلام نے اس کو قبول نہیں کیا' **و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و بہ استغیث ان یعصمنا من الخطایا و الزلات'**

حضرت یونس علیہ السلام کی آزمائش

قرآن کریم میں ہے کہ: اور مچھلی والے (پیغمبر یونس علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جب وہ اپنی قوم سے جبکہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیئے اور ان کی قوم پر سے عذاب ٹلنے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لئے ہمارے حکم کا انتظار نہیں کیا اور انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ ہم اس چلے جانے میں ان پر کوئی دارو گیر نہ کریں گے یعنی چونکہ اس فرار کو انہوں نے اپنے اجتہاد سے جائز سمجھا اس لئے وحی کا انتظار نہ کیا لیکن چونکہ امید وحی تک کا انتظار انبیاء کے لئے مناسب ہے اور یہ مناسب کام ان سے ترک ہوگیا لہذا ان کو یہ ابتلا پیش آیا کہ راستہ میں ان کو کوئی دریا ملا اور وہاں کشتی میں سوار ہوئے' کشتی چلتے چلتے رک گئی یونس علیہ السلام سمجھ گئے کہ میرا یہ بلا اجازت فرار ناپسند ہوا اس کی وجہ سے یہ کشتی رکی' کشتی والوں سے فرمایا کہ مجھ کو دریا میں ڈال دو' وہ راضی نہ ہوئے۔

غرض قرعہ پر اتفاق ہوا تب بھی ان ہی کا نام نکلا' آخر ان کو دریا میں ڈال دیا اور خدا کے حکم سے ان کو ایک مچھلی نے نگل لیا' اخرجہ' ابن ابی حاتم عن ابن عباس کذا فی الدار المنشور) پس انہوں نے اندھیروں میں پکارا ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا' دوسرا دریا کے پانی کا دونوں گہرے اندھیرے جو بہت سے اندھیروں کے قائم مقام' یا تیسرا اندھیرا رات کا' قالہ ابن مسعود کما فی الدار المنثور غرض ان تاریکیوں میں دعا کی کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں (یہ توحید ہے) آپ سب نقائص سے پاک ہیں (یہ تنزیہ ہے) میں بیشک قصوروار ہوں (یہ استغفار ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ میرا قصور معاف کر کے اس شدت سے نجات دیجئے) سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی جس کا قصہ سورہ صافات میں **فنبذ ناہ بالعرآء** الخ میں مذکور ہے اور ہم اسی طرح اور ایمان والوں کو بھی کرب اور غم سے نجات دیا کرتے ہیں جبکہ چندے غم میں رکھنا مصلحت نہ ہو)۔

حضرت یونس کے القاب

حضرت یونس بن متی علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم نے سورہ یونس، سورہ انبیاء پھر سورہ صافات اور سورہ نون میں ذکر فرمایا کہیں ان کا اصل نام ذکر فرمایا ہے کہیں ذوالنون یا صاحب الحوت کے القاب سے ذکر کیا گیا ہے۔ نون اور حوت دونوں کے معنے مچھلی کے ہیں ذوالنون اور صاحب الحوت کا ترجمہ ہے مچھلی والا، حضرت یونس علیہ السلام کو بتقدیر الٰہی چند روز بطن ہی میں رہنے کا واقعہ غریبہ پیش آیا تھا اس کی مناسبت سے ان کو ذوالنون بھی کہا جاتا ہے اور صاحب الحوت کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا۔

حضرت یونس کو رسالت کب ملی

بعض مفسرین اور مورخین نے اس پر بحث کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے واقعہ سے پہلے ہی رسول بنا دیئے گئے تھے یا بعد میں بنائے گئے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انہیں رسول بنایا گیا، لیکن قرآن کریم کے ظاہری اسلوب اور بیشتر روایات سے یہی راجح ہے کہ آپ کو پہلے ہی منصب رسالت پر فائز کر دیا گیا تھا، مچھلی کا واقعہ بعد میں پیش آیا۔

صاحب حوت کیوں کہا

قرآن کریم میں ہے و لا تکن کصاحب الحوت، یہاں حضرت یونس علیہ السلام کو صاحب حوت اسی مناسبت سے کہا گیا کہ وہ کچھ عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

قرآن کریم میں تذکرہ

قرآن عزیز میں ذوالکفل (علیہ السلام) کا ذکر دو سورتوں "انبیاء" اور "ص" میں کیا گیا ہے اور دونوں میں صرف نام مذکور ہے اور مجمل و مفصل کسی قسم کے حالات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَاالْكِفْلِ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ط اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الانبیاء ۲۱ آیت ۸۵.۸۶)

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ط وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ

(صٓ ۳۸، آیت ۴۸)

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے ہم نے انہیں اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔

اور یاد کرو اسماعیل، اور الیسع اور ذوالکفل (کے واقعات) اور یہ سب نیکو کاروں میں سے تھے۔

نسب

ذوالکفل (علیہ السلام) کے متعلق قرآن عزیز نے نام کے سوا کچھ نہیں بیان کیا اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ منقول نہیں ہے لہٰذا قرآن وحدیث کی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذوالکفل (علیہ السلام) اللہ کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے اور کسی قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اس سے زیادہ سے سکوت ہے اس کے بعد دوسرا درجہ سیر و تواریخ کا ہے لیکن کافی تفتیش و جستجو کے بعد بھی ہم کو اس سلسلہ میں ایسی معلومات بہم نہیں پہنچ سکیں کہ جن کے ذریعہ سے ذوالکفل (علیہ السلام) کے حالات و واقعات پر مزید روشنی پڑ سکے چنانچہ تورات بھی خاموش ہے اور اسلامی تاریخ بھی۔

حضرت الیسع کی خلافت

البتہ ابن جریر نے مشہور مفسر تابعی مجاہد سے ان کے متعلق ایک قصہ نقل کیا ہے اور اسی کے قریب قریب ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے بھی بعض آثار نقل کئے ہیں جن کی سند منقطع ہے (یعنی ان دونوں بزرگوں کے اور ان سے روایت کرنے والے راوی کے درمیان ایک یا چند نام مذکور ہیں کہ جن سے سلسلہ روایت متصل اور مسلسل ہو جاتا۔ ایسی سند کو اصطلاح میں منقطع کہا جاتا ہے) مجاہد کی روایت یہ ہے۔

جب اسرائیلی نبی حضرت الیسع (علیہ السلام) بہت بوڑھے ہو گئے تو ایک دن ارشاد فرمایا کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا ہوتا جو میرا قائم مقام ہو سکتا اور مجھ کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ وہ میری صحیح نیابت کرنے کا اہل ہے اس کے بعد انہوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کیا اور فرمایا میں تم میں سے ایک شخص کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا عہد کرے (۱) دن بھر روزہ رکھے (۲) شب کو اللہ کی یاد میں مشغول رہے (۳) اور کبھی غصہ نہ لائے یہ سن کر ایک ایسا شخص کھڑا ہوا جو لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت نظر آتا تھا اور کہنے لگا ''اس خدمت کے لئے میں حاضر ہوں'' حضرت الیسع نے اپنی تینوں شرطیں دوبارہ بیان کیں اور دریافت کیا ان کی پابندی کرو گے؟ اس شخص نے جواب دیا ''بیشک'' (دوسرا دن ہوا تو حضرت الیسع (علیہ السلام) نے پھر اجتماع کیا اور کل کی بات کو دہرایا، سب خاموش رہے اور وہی شخص پھر آگے بڑھا اور اس نے خود کو اس خدمت کے لئے پیش کرتے ہوئے تینوں شرطیں پوری کرنے کا عہد کیا تب الیسع (علیہ السلام) نے اس کو اپنا خلیفہ بنا دیا ابلیس نے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اپنی ذریت کو جمع کر کے کہا کہ ایسی صورتیں اختیار کرو کہ جن سے یہ شخص بہک جائے اور اپنی شرطوں پر قائم نہ رہ سکے۔ شیاطین نے بہت کوشش کی مگر سب ناکام رہے تب ابلیس نے کہا کہ میں ہی اس کام کو انجام دے سکوں گا تم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

الیسع (علیہ السلام) کے خلیفہ کا یہ دستور تھا کہ وہ دن رات میں صرف دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ کیا کرتا اور کچھ سو کر تکان رفع کر لیا کرتا تھا چنانچہ ایک دن ابلیس پراگندہ حال

بوڑھے کی شکل میں اسی وقت اس کے دروازہ پر پہنچا اور دروازہ پر ہاتھ مارا وہ شخص آرام چھوڑ کر آیا اور دریافت کیا کون ہے؟ ابلیس نے جواب دیا ''ایک مظلوم اور ناتواں بوڑھا ہے''۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور حال دریافت کیا ابلیس نے کہا کہ میرے اور میری قوم کے درمیان خصومت ہے انہوں نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے اور داستان ظلم کو اتنا طول دیا کہ قیلولہ کا وقت ختم ہو گیا بنی اسرائیل کے اس ''امیر'' نے فرمایا اب تم جاؤ شام کو جو مجلس منعقد ہو گی تب تم آنا میں تمہاری دادرسی کروں گا وہ چلا گیا شام کو جب مجلس منعقد ہوئی تو خلیفہ نے دیکھا کہ وہ شخص موجود نہیں ہے اور مجلس برخاست بھی ہو گئی مگر وہ نہیں آیا صبح کو جب پھر مجلس میں بیٹھا تو چہار جانب غور سے دیکھا کہ شاید اب آیا ہو مگر اس کو نہ پایا مجلس برخاست ہونے پر جب اس نے قیلولہ کے لئے تنہائی اختیار کی تو پھر کسی نے دروازہ پر دستک دی اس نے دروازہ کھولا تو اسی بوڑھے کو موجود پایا اور اس نے کل کی طرح پھر گفت وشنید کی، تب خلیفہ نے کہا میں نے تم سے کہا تھا کہ شام کو مجلس میں آنا مگر تم نہ آئے؟ ابلیس نے جواب دیا، میری قوم بہت ہی خبیث ہے جب آپ کو مجلس میں پاتی ہے تو آہستہ سے مجھ سے اقرار کر لیتی ہے کہ مرافعہ نہ کرو ہم تمہارا حق ضرور دے دیں گے لیکن آپ کی مجلس برخاست کر دینے کے بعد پھر منکر ہو جاتی ہے خلیفہ نے کہا آج شام کو ضرور آ جانا میں اپنی موجودگی میں حق رسی کروں گا اس گفت وشنید میں قیلولہ کا وقت پھر جاتا رہا اور خلیفہ کو نیند کی تکلیف نے بہت ستایا مگر شام کی مجلس حسب وعدہ منعقد کی اور دادرسی کے لئے بیٹھا چاروں طرف نگاہ پھرائی مگر اس بوڑھے کو نہ پایا اور نہ صبح کی مجلس میں وہ حاضر ہوا تب تیسرے دن جب نیند کے غلبہ نے عاجز کر دیا تو خلیفہ نے اہل خانہ کو حکم دیا کہ آج دروازہ پر خواہ کوئی شخص بھی آئے قیلولہ کے وقت دروازہ ہرگز نہ کھولیں خلیفہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ فوراً ابلیس بوڑھے کی شکل میں آ موجود ہوا اور دروازہ پر دستک شروع کر دی، اندر سے جواب ملا کہ آج خلیفہ کا یہ حکم ہے کہ کسی کے لئے دروازہ نہ کھولا جائے گا ابلیس نے کہا میں دوروز سے اپنے ایک اہم معاملہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور خلیفہ نے مجھ کو اس وقت بلایا تھا اس لئے دروازہ کھول دو مگر دروازہ نہ کھلا لیکن اہل خانہ نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ شخص اندر موجود ہے اور خلیفہ کے کمرہ کے

دروازہ پر دستک دے رہا ہے خلیفہ نے دروازہ کھولا اور گھر والوں سے کہا کہ میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ آج دروازہ نہ کھولنا پھر یہ شخص کیسے اندر داخل ہو گیا ساتھ ہی دروازہ پر نظر کی تو اس کو بند پایا اور بوڑھے کو اپنے قریب دیکھا تب خلیفہ حقیقت حال کو سمجھا اور اس نے ابلیس کو مخاطب کر کے کہا اللہ کے دشمن کیا تو ابلیس ہے؟ ابلیس نے کہا ہاں میں ابلیس ہوں تو نے مجھ کو جب ہر طرح تھکا دیا اور میری ذریت کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکی تب میں نے آخری صورت یہ اختیار کی تھی تاکہ تجھ کو غضبناک کروں اور ایفاء شروط میں ناکام بنا دوں مگر افسوس کہ میں خود ہی ناکام رہا چنانچہ اس واقعہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ذوالکفل کے نام سے مشہور کر دیا اس لئے کہ اس نے جن شرائط کا حضرت الیسع (علیہ السلام) سے تکفل کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد۳ صفحہ ۱۹۰۔۱۹۱)

مذکورہ قصہ کی حیثیت

مجاہد کی یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے بھی محل نظر ہے اور درایت کے لحاظ سے بھی ناقابل حجت ہے اور جو اثر ابن عباسؓ اور ابو موسیٰؓ اشعری سے منقول ہے وہ منقطع بھی ہے اور سند کے پیش نظر محل نظر بھی اس لئے ان کی حیثیت ایک قصہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے درایت کے اعتبار سے ہم نے ان کو ناقابل حجت اس لئے کہا کہ قرآن عزیز نے اگرچہ ذوالکفل (علیہ السلام) کے واقعات و حالات بیان نہیں کئے لیکن انکو انبیاء و مرسلین کی فہرست میں شمار کیا ہے اس لئے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابہ اور مجاہد جیسے تابعی سے یہ مستبعد ہے کہ وہ ان کے متعلق یہ فرمائیں کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مرد نیک تھے جیسا کہ ابن کثیر نے ان تینوں بزرگوں سے اسی قصہ میں نقل کیا ہے اور شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں کہ ذوالکفل علیہ السلام ایوب (علیہ السلام) کے بیٹے تھے اور انہوں نے حسبۃً للہ کسی شخص کی ضمانت کر لی تھی جس کی پاداش یں ان کو کئی برس قید کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔

کہتے ہیں ذوالکفل تھے ایوب کے بیٹے ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور اللہ پر محنت سہی (موضح الفرقان سورۂ انبیاء) اور بعض معاصرین کا یہ خیال ہے کہ ذوالکفل حزقیل

(علیہ السلام) کا لقب ہے اور ایک دوسرے معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے اس لئے کہ اس کے دارالسلطنت کا نام "کپل" تھا جس کا معرب "کفل" ہے اور عربی میں "ذو" صاحب اور مالک کے لئے آتا ہے چنانچہ صاحب مال کے لئے "ذومال"۔ اور مالک شہر کے لئے "ذوبلد" بہ کثرت استعمال ہے اس لئے یہاں بھی کپل کے مالک اور بادشاہ کو "ذوالکفل" کہا گیا معاصر موصوف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید اور حقیقی اسلام کی ہی تعلیم تھی اور موجودہ شکل وصورت دوسرے ادیان وملل کی طرح مسخ اور محرف شدہ ہے مگر یہ اقوال تخمینی آراء سے زیادہ تاریخی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ہم اس تعصب کے قائل نہیں ہیں کہ اگر صحیح تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن نے جن انبیاء کے صرف نام ذکر کئے ہیں ان کا مصداق فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف اس لئے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کہی اس لئے قابل رد ہے بلاشبہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی حقائق کی جستجو کا باب بند نہیں ہوا اور ہر دن نئی نئی تحقیقات سامنے آتی اور جدید اکتشافات کو منکشف کرتی جاتی ہیں بلکہ ان کے ذریعہ قرآن عزیز اور احادیث رسول کے بیان کردہ ان واقعات کی تصدیق ہوتی چلی جارہی ہے جن کا انکار ملاحدہ اس لئے کرتے رہے تھے کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ ان کا ساتھ نہیں دیتے پس اگر قرآن عزیز کی بیان کردہ کسی ہستی کے متعلق مزید اکتشافات روشنی میں آئیں تو ہمارے لئے باعث انکار نہیں بلکہ مخالفین ومعاندین پر مزید حجت ودلیل ہیں لیکن اس اقرار حقیقت کے باوجود اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق اگر ایک شخص محض اپنے مزعومہ قیاس وتخمین سے بے دلیل کوئی دعویٰ کر دیتے تو ضرور اس کو مان لیا جائے چنانچہ ذوالکفل کو "گوتم بدھ" قرار دینا ابھی تک اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے لئے دنیا کے مختلف گوشوں میں اللہ کے فرستادہ نبیوں پر ایمان لانے کے لئے قرآن کی وہ تینوں دفعات کافی ہیں جو دین حق (اسلام) کا طرۂ امتیاز ہیں یعنی

(ا) وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (الفاطر۔۳۵ آیت ۲۴) اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اللہ کی جانب سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

(۲)مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ (المؤمن۔ ۴۰ آیت ۷۸) بعض نبیوں کا ہم نے تم کو (نام لے کر) ذکر سنا دیا اور بعض کے اوقات تم کو نہیں سنائے۔

(۲)لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ (البقرہ پ ۳ آیت ۲۸۵) اس لئے ایک مومن کا یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے یعنی سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اس صاف اور واضح عقیدہ کے بعد اگر ہمارے سامنے کسی ملک اور کسی خطہ کے انبیاء و رسل کے واقعات نہیں بھی آئے تو اس کے وجوہ واسباب دوسرے ہیں لیکن جہاں تک ان پر ایمان لانے کا تعلق ہے وہ اجمال کے ساتھ بھی کافی ہے اور ان کی تفصیلات ہمارے مقاصد ہدایت ورشد یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح کے لئے موقوف علیہ نہیں ہیں خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ حقیقت بھی قرآن میں واضح کردی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''خاتم النبیین'' ہیں اور تمام سچے ادیان وملل کی صحیح اور حقیقی تعلیم کی تصدیق کر کے ان کو ارتقائی درجات کے درجہ کمال تک پہنچانے والے ہیں۔ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا (المائدہ پ ۶ آیت ۳)

الحاصل ہم کو یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان میں بھی اللہ کے سچے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں بلکہ سیر کی روایات کے مطابق ابوالبشر آدم (علیہ السلام) اسی ہندوستان جنت نشان کے کسی گوشہ میں اتارے گئے لیکن جب تک قرآن وحدیث کی صراحت اور یا پھر تاریخ کے صحیح دلائل و براہین سے یہ ثابت نہ ہوجائے کہ ذوالکفل ''گوتم بدھ'' کا لقب ہے محض ظن و تخمین سے اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جس طرح کسی نبی کو نبی نہ ماننا کفر کی راہ ہے اسی طرح کسی غیر نبی کو نبی تسلیم کرنا بھی باطل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے ایک روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا بنی اسرائیل

میں ایک شخص کفل تھا انتہا درجہ کا فاسق وفاجر ایک مرتبہ اس کے پاس ایک حسین وجمیل عورت آئی کفل نے اس کو ساٹھ دینار دے کر زنا پر راضی کرلیا، لیکن جب اس نے عورت کے ساتھ مباشرت کا ارادہ کیا تو وہ کانپنے اور زار زار رونے لگی کفل نے دریافت کیا کیوں روتی ہے کیا مجھ سے نفرت کرتی ہے؟ عورت نے جواب دیا یہ بات تو نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ساری عمر کبھی اس بدعمل کو نہیں کیا مگر آج ضرورت اور پیٹ کی خاطر اپنی عصمت کو برباد کررہی ہوں۔ یہ نشتر ہے جو مجھ کو آہ وزاری کے لئے مجبور کررہا ہے کفل نے یہ سنا تو فوراً اس سے الگ ہوگیا اور کہنے لگا جو کار بند تو نے کبھی نہیں کیا آج وہ محض فقر وفاقہ کی خاطر کرے یہ کبھی نہ ہوگا جا عصمت وعفت کے ساتھ اپنے گھر واپس جا اور یہ دینار بھی تیری ملک ہیں ان کو اپنے کام میں لا اور پھر کہنے لگا اللہ کی قسم آج کی گھڑی سے کفل اب کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرے گا حسن اتفاق کہ اسی شب میں کفل کا انتقال ہوگیا اور صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ غیب کے ہاتھ نے اس کے دروازہ پر یہ بشارت لکھ دی ہے ”کفل کو بے شبہ اللہ نے بخش دیا۔“

اس روایات میں ذوالکفل نہیں بلکہ فقط کفل مذکور ہے اور یہ حضرت ذوالکفل کے سوا دوسرا کوئی شخص ہے اس لئے یہ مغالطہ نہ ہونا چاہئے کہ یہ حضرت ذوالکفل (علیہ السلام) کا واقعہ ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے نسل وخاندان، رنگ وروپ، ملک وقوم اور ہر قسم کے تفرقہ سے جدا اور بالا ہو کر یہ اعلان کیا ہے کہ اللہ ایک ہے تو بے شبہ اس کی صداقت بھی ایک ہی ہونی چاہئے اور وہ ایک ہی ہے البتہ اس زمانہ کے نشو وارتقاء اور امم واقوام کے ذہنی وعقلی افکار کے درجات تفاوت کے مطابق اپنے وجد اور حقیقت کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے قانون فطرت کے مطابق تفصیلات وجزئیات کے تفاوت مراتب کو تسلیم کیا ہے یہ صداقت اور حقیقت ”اسلام“ ہے جو اپنی وحدت کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام وامم اور مختلف زمانوں میں آغاز سے لے کر انجام تک متفاوت درجات ومراتب میں کائنات کی رشد وہدایت کا کفیل رہا ہے۔

اور اسی لئے اس کی تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم کے اندر اللہ کے سچے بشیر ونذیر ہی پیغام صداقت لے کر آئے ہیں اور اس لئے ایک مسلم ومومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عقیدہ کا اعلان کرے کہ ہم اللہ کے کسی بھی نبی کے

درمیان فرق کرنا جائز نہیں رکھتے اور جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح اللہ کے ہر نبی پر ایمان لاتے ہیں خواہ ہم اس کے نام و مقام اور اس کے حالات وواقعات سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں۔

انبیاء بنی اسرائیل سے ہونا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل (علیہ السلام) انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور بنی اسرائیل کے ان حالات وواقعات کے سوا جن کی تفصیلات قرآن عزیز میں مختلف انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں آتی رہی ہیں ان کے زمانہ میں کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جو عام تبلیغ وہدایت سے زائد اپنے اندر عبرت وبصیرت اور موعظت کا پہلو رکھتا ہو اس لئے قرآن عزیز نے ان کے نام ہی پر اکتفا کیا اور حالات وواقعات سے تعرض نہیں کیا کیونکہ قصص القرآن میں یہ بحث چند جگہ روشنی میں آچکی ہے کہ امم واقوام ماضیہ کے وقائع اور اخبار بیان کرنے سے قرآن عزیز کا مقصد صرف رشد وہدایت کے سلسلہ میں بصیرت وموعظت کی جانب توجہ دلانا ہے ورنہ "تاریخ" نہ اس کا موضوع ہے اور نہ اس کا مقصد۔ چنانچہ قرآن عزیز میں ارشاد ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ. وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (طٰه ۲۰ آیت ۹۹)

لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ (یوسف ۱۲ آیت ۱۱۱)

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَانُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(یوسف ۱۲ آیت ۱۰۹)

وکلا نقص علیک من انبآء الرسل مانثبت به فوادک وجآءک فی هٰذه الحق وموعظة وذکرٰی للمؤمنین (هود ۱۱، آیت ۱۲۰)

(اے پیغمبر) اسی طرح ہم گزری ہوئی سرگذشتوں میں سے (خاص واقعات کی) خبریں تجھے سناتے ہیں اور بلاشبہ ہم نے اپنے پاس سے تجھے ایک سرمایہ نصیحت عطا فرمادیا ہے (یعنی قرآن) بلاشبہ ان (نبیوں) کے واقعات میں اہل عقل ودانش کے لئے سامان عبرت ہے کیا

انہوں نے زمین میں چل پھر کر سیر نہیں کی تا کہ وہ دیکھتے کہ ان سے اگلوں کا انجام کیا ہوا اور بلاشبہ مقام آخرت ان لوگوں کے حق میں بہتر ہے جو پرہیز گار ہیں پس کیا وہ سمجھتے نہیں؟

اور (اے پیغمبر) رسولوں کی سرگذشتوں میں سے جو قصے ہم تجھ کو سناتے ہیں تو ان سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دے دیں اور پھر ان کے اندر تجھے امر حق مل گیا اور نصیحت مل گئی اور یاددہانی مومنوں کے لئے۔

حضرت ذوالکفل نبی تھے یا ولی اور ان کا قصہ عجیبہ

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۵،۸۶ میں تین حضرات کا ذکر ہے جن میں حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کا نبی ورسول ہونا قرآن کریم کی بہت سی آیات سے ثابت اور ان کا تذکرہ بھی قرآن میں جابجا آیا ہے۔ تیسرے بزرگ ذوالکفل ہیں۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ ان کا نام ان دونوں پیغمبروں کے ساتھ شامل کر کے ذکر کرنے سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بھی کوئی اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمرۂ انبیاء میں نہیں تھے بلکہ ایک مرد صالح اولیاء اللہ میں سے تھے۔ امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت یسع علیہ السلام (جن کا نبی و پیغمبر ہونا قرآن میں مذکور ہے) جب بوڑھے اور ضعیف ہو گئے تو ارادہ کیا کہ کسی کو اپنا خلیفہ بنا دیں جو ان کی زندگی میں وہ سب کام ان کی طرف سے کرے جو نبی کے فرائض میں داخل ہیں۔

اس مقصد کے لئے حضرت یسع علیہ السلام نے اپنے سب صحابہ کو جمع کیا کہ میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں جس کے لئے تین شرطیں ہیں جو شخص ان شرائط کا جامع ہو اس کو خلیفہ بناؤں گا۔ وہ تین شرطیں یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتا ہو اور ہمیشہ رات کو عبادت میں بیدار رہتا ہو اور کبھی غصہ نہ کرتا ہو۔ مجمع میں سے ایک ایسا غیر معروف شخص کھڑا ہوا جس کو لوگ حقیر ذلیل سمجھتے تھے اور کہا کہ میں اس کام کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت یسع علیہ السلام نے دریافت کیا کہ کیا تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہمیشہ شب بیداری کرتے ہو اور کبھی غصہ نہیں کرتے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ بیشک میں ان تین چیزوں کا عامل ہوں۔ حضرت

الیسع علیہ السلام (کوشاید کچھ اس کے قول پر اعتماد نہ ہوا اس لئے) اس روز اس کو رد کر دیا پھر کسی دوسرے روز اسی طرح مجمع سے خطاب فرمایا اور سب حاضرین ساکت رہے اور یہی شخص پھر کھڑا ہو گیا اس وقت حضرت یسعؑ نے ان کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔ شیطان نے یہ دیکھا کہ ذوالکفلؑ اس میں کامیاب ہو گئے تو اپنے اعوان شیاطین سے کہا کہ جاؤ کسی طرح اس شخص پر اثر ڈالو کہ یہ کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے یہ منصب اسکا سلب ہو جائے۔ اعوانِ شیطان نے عذر کر دیا۔ کہ وہ ہمارے قابو میں آنے والا نہیں شیطان ابلیس نے کہا کہ اچھا تم اس کو مجھ پر چھوڑ دو (میں اس سے نمٹ لوں گا) حضرت ذوالکفل علیہ السلام اپنے اقرار کے مطابق دن بھر روزہ رکھتے اور رات بھر جاگتے تھے صرف دوپہر کو قیلولہ کرتے تھے (قیلولہ دوپہر کے سونے کو کہتے ہیں) شیطان عین دوپہر کو انکے قیلولہ کے وقت آیا اور دروازہ پر دستک دی یہ بیدار ہو گئے اور پوچھا کون ہے کہنے لگا کہ میں بوڑھا مظلوم ہوں، انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے اندر پہنچ کر ایک افسانہ کہنا شروع کر دیا کہ میری برادری کا مجھ سے جھگڑا ہے انہوں نے مجھ پر یہ ظلم کیا وہ ظلم کیا، ایک طویل داستان شروع کر دی یہاں تک کہ دوپہر کے سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ حضرت ذوالکفل نے فرمایا کہ جب میں باہر آؤں تو میرے پاس آ جاؤ میں تمہارا حق دلواؤں گا۔

حضرت ذوالکفل علیہ السلام باہر تشریف لائے اور اپنی مجلس عدالت میں اس کا انتظار کرتے رہے مگر اس کو نہیں پایا۔ اگلے روز پھر جب وہ عدالت میں فیصلہ مقدمات کے لئے بیٹھے تو اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے اور یہ نہ آیا۔ جب دوپہر کو پھر قیلولہ کے لئے گھر میں گئے تو یہ شخص آیا اور دروازہ کوٹنا شروع کیا۔ انہوں نے پھر پوچھا کون ہے؟ جواب دیا کہ ایک مظلوم بوڑھا ہے، انہوں نے پھر دروازہ کھول دیا اور فرمایا کہ کیا میں نے کل تم سے نہیں کہا تھا کہ جب میں اپنی مجلس میں بیٹھوں تو تم آ جاؤ (تم نہ کل آئے نہ آج صبح سے آئے) اس نے کہا کہ حضرت میرے مخالف بڑے خبیث لوگ ہیں جب انہوں نے دیکھا کہ آپ اپنی مجلس میں بیٹھے ہیں اور میں حاضر ہوں گا تو آپ ان کو میرا حق دینے پر مجبور کریں گے تو

انہوں نے اس وقت اقرار کرلیا کہ ہم تیرا حق دیتے ہیں، پھر جب آپ مجلس سے اٹھ گئے تو انکار کر دیا۔ انہوں نے پھر اس کو یہی فرمایا کہ اب جاؤ جب میں مجلس میں بیٹھوں تو میرے پاس آ جاؤ۔ اسی گفت وشنید میں آج کے دوپہر کا سونا بھی رہ گیا اور وہ باہر مجلس میں تشریف لے گئے اور اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے (اگلے روز بھی دوپہر تک انتظار کیا وہ نہیں آیا پھر جب تیسرے روز دوپہر کا وقت ہوا اور نیند کو تیسرا دن ہو گیا تھا نیند کا غلبہ تھا) تو گھر میں آ کر گھر والوں کو اس پر مقرر کیا کہ کوئی شخص دروازے پر دستک نہ دے سکے۔ یہ بوڑھا پھر تیسرے روز پہنچا اور دروازے پر دستک دینا چاہا لوگوں نے منع کیا تو ایک روشندان کے راستے سے اندر داخل ہو گیا اور اندر پہنچ کر دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ یہ پھر نیند سے بیدار ہو گئے اور دیکھا کہ یہ شخص گھر کے اندر ہے اور دیکھا کہ دروازہ بدستور بند ہے اس سے پوچھا، تو کہاں سے اندر پہنچا، اس وقت حضرت ذوالکفل نے پہچان لیا کہ یہ شیطان ہے اور فرمایا کہ کیا تو خدا کا دشمن ابلیس ہے؟ اس نے اقرار کیا کہ ہاں، اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے میری ہر تدبیر میں تھکا دیا کبھی میرے جال میں نہیں آیا، اب میں نے یہ کوشش کی کہ تجھے کسی طرح غصہ دلا دوں تا کہ تو اپنے اس اقرار میں جھوٹا ہو جائے جو یسع علیہ السلام نبی کے ساتھ کیا ہے، اس لئے میں نے یہ سب حرکتیں کیں۔ یہ واقعہ تھا جس کی وجہ سے ان کو ذوالکفل کا خطاب دیا گیا، کیونکہ ذوالکفل کے معنی ہیں ایسا شخص جو اپنے عہد اور ذمہ داری کو پوری کرے، حضرت ذوالکفل اپنے اس عہد پر پورے اترے۔ (ابن کثیر)

مسند احمد میں ایک روایت اور بھی ہے مگر اس میں ذوالکفل کے بجائے الکفل کا نام آیا ہے۔ اسی لئے ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے کہا ہے کہ یہ کوئی دوسرا شخص کفل نامی ہے وہ ذوالکفل جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ نہیں۔ روایت یہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ سات مرتبہ سے زائد سنی ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کفل بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جو کسی گناہ سے پرہیز نہ کرتا تھا، اس

کے پاس ایک عورت آئی اس نے اس کو ساٹھ دینار (گنیاں) دیں اور فعل حرام پر اس کو راضی کرلیا۔ جب وہ مباشرت کے لئے بیٹھ گیا تو یہ عورت کانپنے اور رونے لگی اس نے کہا کہ رونے کی کیا بات ہے کیا میں نے تم پر کوئی جبر اور زبردستی کی ہے۔ اس نے کہا نہیں جبر تو نہیں کیا، لیکن یہ ایسا گناہ ہے جو میں نے کبھی عمر بھر نہیں کیا اور اس وقت مجھے اپنی ضرورت نے مجبور کر دیا اس لئے اس پر آمادہ ہوگئی یہ سن کر وہ شخص اسی حالت میں عورت سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ جاؤ یہ دینار بھی تمہارے ہیں اور اب سے کفل بھی کوئی گناہ نہیں کرے گا، اتفاق یہ ہوا کہ اسی رات میں کفل کا انتقال ہو گیا اور صبح اس کے دروازے پر غیب سے تحریر لکھی ہوئی دیکھی گئی غفر الله للکفل یعنی اللہ نے کفل کو بخش دیا ہے۔

ابن کثیر نے یہ روایت مسند احمد کی نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کو صحاح ستہ میں سے کسی نے روایت نہیں کیا اور اسناد اس کی غریب ہے اور بہر حال اگر روایت ثابت بھی ہو تو اس میں ذکر کفل کا ہے ذوالکفل کا نہیں، یہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ذوالکفل حضرت یسع علیہ السلام نبی کے خلیفہ اور ولی صالح تھے ان کے خاص محبوب اعمال کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ ان کا ذکر اس آیت میں بزمرہ انبیاء کر دیا گیا اور اس میں بھی کوئی بعد نہیں معلوم ہوتا کہ شروع میں یہ حضرت یسع علیہ السلام کے خلیفہ ہی ہوں پھر حق تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت عطا فرما دیا ہو واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حضرت عزیر علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت عزیر علیہ السلام

قرآن عزیز میں حضرت عزیر علیہ السلام کا نام صرف ایک جگہ سورہ توبہ میں مذکور ہے اور اس میں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہود عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے ہیں جس طرح کہ نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہیں اس ایک جگہ کے سوا قرآن میں اور کسی مقام پر ان کا نام لے کر ان کے حالات و واقعات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُنِابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ط قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (التوبہ۹ آیت ۳۰)

اور یہودیوں نے کہا عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی زبانوں سے نکالی ہوئی ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں ان پر اللہ کی لعنت' یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

سو سال بعد جی اٹھنے کا واقعہ

البتہ سورہ بقرہ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا اپنے گدھے پر سوار ایک بستی سے گزر ہوا جو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر ہو چکی تھی اور وہاں نہ کوئی مکین باقی رہا تھا اور نہ کوئی مکان' مٹے ہوئے چند نقوش باقی تھے جو اس کی بربادی اور تباہی کے مرثیہ خواں تھے ان بزرگ نے یہ دیکھا تو تعجب اور حیرت سے کہا کہ ایسا کھنڈر اور تباہ حال ویرانہ پھر کیسے آباد ہو گا اور یہ مردہ بستی کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کرے گی یہاں تو کوئی بھی ایسا سبب نظر نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ ان کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حال میں رکھا یہ مدت گزر جانے کے بعد اب ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور تب ان سے کہا بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ وہ جب تعجب کرنے پر موت کی آغوش سوئے تھے تو دن چڑھے کا وقت

تھا اور جب دوبارہ زندگی پائی تو آفتاب غروب ہونے کا وقت قریب تھا اس لئے انہوں نے جواب دیا ایک دن یا اس سے بھی کم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اسی حالت میں رہے ہو اور اب تمہارے تعجب اور حیرت کا یہ جواب ہے کہ تم ایک طرف اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اس میں مطلق کوئی تغیر نہیں آیا اور دوسری جانب اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کا جسم گل سڑ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور پھر ہماری قدرت کا اندازہ کرو کہ جس چیز کو چاہا محفوظ ہے تو سو برس کے اس طویل عرصہ میں کسی بھی موسمی تغیرات نے اثر نہ کیا اور محفوظ و سالم رہی اور جس چیز کے متعلق ارادہ کیا کہ اس کا جسم گل سڑ جائے تو وہ گل سڑ گیا اور اب تمہاری آنکھوں دیکھتے ہی ہم اس کو دوبارہ زندگی بخشے دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے کیا تا کہ ہم تم کو اور تمہارے واقعہ کو لوگوں کے لئے ''نشان'' بنا دیں اور تا کہ تم یقین کے ساتھ مشاہدہ کر لو کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مردہ کو زندگی بخش دیتا اور تباہ شدہ شے کو دوبارہ آباد کر دیتا ہے چنانچہ جب اس برگزیدہ ہستی نے قدرت الٰہی کے یہ ''نشانات'' دیکھنے کے بعد شہر کی جانب نظر کی تو اس کو پہلے سے زیادہ آباد اور بارونق پایا تب انہوں نے اظہار عبودیت کے بعد یہ اقرار کیا کہ بلاشبہ تیری قدرت کاملہ کے لئے یہ سب کچھ آسان ہے اور مجھ کو علم الیقین کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا۔

چنانچہ سورۃ البقرہ آیت ۲۵۹ میں ہے کہ: ''اور کیا تم نے اس شخص کا حال نہ دیکھا جس کا ایک بستی پر گزر ہوا جو اپنی چھتوں سمیت زمین پر ڈھیر تھا تو وہ کہنے لگا اس بستی کی موت (تباہی) کے بعد اللہ تعالیٰ کس طرح اس کو زندگی دے گا (آباد کرے گا) پس اللہ نے اس شخص پر اسی جگہ سو برس تک موت طاری کر دی اور پھر زندہ کر دیا اللہ نے دریافت کیا تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے اس نے جواب دیا ایک دن یا دن کا بعض حصہ اللہ نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے پس تم اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ بگڑی تک نہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو کہ وہ گل سڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تا کہ ہم تم کو لوگوں کے لئے ''نشان'' بنائیں اور اب تم دیکھو کہ کس طرح ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے اور آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب اس کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہو گیا تو اس نے کہا میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

ان آیات کی تفسیر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کے ساتھ یہ واقعہ

پیش آیا تو اس کے جواب میں مشہور قول یہ ہے کہ یہ حضرت عزیز علیہ السلام تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم جاؤ ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے جب یہ وہاں پہنچے اور شہر کو تباہ اور کھنڈر پایا تو بر بناء بشریت یہ کہہ اٹھے کہ اس مردہ بستی کو دوبارہ کیسے زندگی ملے گی؟ اوران کا یہ قول بہ شکل انکار نہیں تھا بلکہ تعجب اور حیرت کے ساتھ ان اسباب کا متلاشی تھا جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے برگزیدہ بندہ اور نبی کی یہ بات بھی پسند نہیں آئی کیونکہ ان کے لئے یہ کافی تھا کہ اللہ نے دوبارہ اس بستی کی زندگی کا وعدہ فرمالیا ہے چنانچہ ان کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا جس کا ذکر مسطورہ بالا آیات میں ہے اور جب وہ زندہ کئے گئے تو یروشلم (بیت المقدس) آباد ہو چکا تھا۔

حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنھم) اور قتادہ سلیمان حسن (رحم اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے کہ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام سے متعلق ہے (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۳۱۴)

اور وہب بن منبہ اور عبداللہ بن عبید کا اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن سلام کا قول یہ ہے کہ یہ شخص حضرت ارمایہ (یرمیاہ) نبی تھے ابن جریر طبری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۳)

تاریخی شواہد

اور یہ اس لئے کہ جبکہ قرآن عزیز نے اس ہستی کا نام ذکر نہیں کیا اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ و تابعین سے جو آثار منقول ہیں ان کا ماخذ بھی وہ روایات و اقوال ہیں جو وہب بن منبہ' کعب احبار اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ تک پہنچتے ہیں اور انہوں نے جن کو اسرائیلی واقعات سے نقل کر کے بیان کیا ہے تو اب واقعہ سے متعلق شخصیت کی تحقیق کے لئے صرف ایک یہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ توراۃ اور تاریخی مصادر سے اس کو حل کیا جائے تو اس حقیقت کے پیش نظر جب ہم مجموعہ تورات کے صحائف انبیاء علیہم السلام اور تاریخی بیانات پر غور کرتے ہیں تب یہ تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں (تفسیر و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۴)

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم وفساد کا بازار گرم ہے کہ اللہ کی جانب سے اس زمانہ کے پیغمبر یرمیاہ علیہ السلام پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کردو کہ وہ ان حرکات بد سے باز آ جائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا یرمیاہ علیہ السلام نے اللہ کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ظلم وشرارت میں اور اضافہ اور یرمیاہ علیہ السلام کے ساتھ مخول شروع کر دیا اور ان کو زندان میں ڈال دیا اس حالت میں بھی یرمیاہ علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور وہ ان کو قید کر کے بابل لے جائے گا اور یروشلم کو مٹایا جائے گا (نباہ نبی کا صحیفہ)

تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تھا کہ بابل میں بنو کدنضر (بخت نصر) کا ظہور ہو اور اس نے اپنی قاہرانہ اور جابرانہ طاقت سے قرب وجوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کر لیا اور تھوڑے عرصہ میں اس نے فلسطین پر پے در پے تین حملے کر کے بنی اسرائیل کو شکست فاش دے کر یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقہ کو برباد کر ڈالا اور تمام بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل لے گیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو خاکستر کر دیا اور ایک نسخہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھ میں محفوظ باقی نہ رہا جب بخت نصر اسرائیلی گھرانوں کو قید کر کے غلام بنا رہا تھا تو کسی شخص نے اس سے یہ کہا کہ یہاں ایک شخص یرمیاہ زندان میں قید ہے اس نے تیرے اس حملہ سے پہلے ان سب حالات کے متعلق پیشین گوئی کر کے بنی اسرائیل کو ڈرایا تھا مگر اس کی قوم نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کو زندان میں ڈال دیا بخت نصر نے یہ سنا تو یرمیاہ علیہ السلام کو قید خانہ سے باہر نکالا اور ان سے بات چیت کرتا رہا۔ یرمیاہ علیہ السلام کی علم ودانش سے معمور گفتگو سن کر اس نے خواہش کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بابل چلیں وہ ان کو احترام سے رکھے گا مگر حضرت یرمیاہ نے یہ کہہ کر اس کی خواہش کو رد کر دیا کہ جبکہ میری قوم اس ذلت کے ساتھ بابل جا رہی ہو میں اس عزت کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت کو ترجیح دیتا ہوں (البدایہ النہایہ جلد ۲ صفحہ ۳۸۔۳۹ و تاریخ ابن خلدون وانسائیکلو پیڈیا آف اسلام) چنانچہ انہوں نے یروشلم سے دور کسی جنگل میں بود و ماند اختیار کر لی اور یرمیاہ نبی کے صحیفہ میں ہے کہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر بابل میں اسرائیلیوں کو یہ پیشین گوئی تحریر کے ذریعہ پہنچائی تھی کہ بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اس ذلت وخواری کے ساتھ غلام رہیں

گے اور اس کے بعد وہ پھر اپنے وطن میں آ کر بسیں گے (صحیفہ یرمیاہ باب ۱۹ آیت ۱۰)

چنانچہ بخت نصر کی ہلاکت کے عرصہ دراز کے بعد جب تقریباً ۵۳۹ ق م میں فارس کے بادشاہ سائرس (کے خسرو) نے بابل کے بادشاہ بیل شاہ کو شکست دے کر فارس کو اس کے بے پناہ مظالم سے نجات دلائی تو اسی زمانہ میں اس نے بنی اسرائیل کو بھی آزاد کیا اور یروشلم اور ہیکل کی تعمیر کے لئے ان کو اجازت دی۔

شاہ خورس (کے خسرو) فتح بابل کے بعد تقریباً دس برس اور زندہ رہا اور اسی دوران میں بنی اسرائیل آزاد ہو کر بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول ہو گئے مگر جیسا کہ عزرا کے صحیفہ سے معلوم ہوتا ہے یہ تعمیر اس کی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکی اور درمیان میں بعض افسروں نے ایسی دراندازیاں کیں کہ دو مرتبہ اسرائیلیوں کو اس کی تعمیر کچھ مدت کے لئے روک دینی پڑی اور کے خسرو کے بعد دارا اور دارا کے بعد اردشیر کے زمانہ میں جا کر وہ اس کو دوبارہ مکمل کر سکے (عزرا باب ۷ آیت ۱۱) اور یروشلم (بیت المقدس) پھر ایک مرتبہ پہلے سے زیادہ بارونق شہر نظر آنے لگا۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ بخت نصر کے یروشلم کو تباہ کرنے اور کے خسرو سے لے کر اردشیر کے زمانے تک دوبارہ اس کے مکمل آباد ہو جانے کے درمیان، جو ایک طویل مدت ہے وہی وہ وقفہ ہے جس پر یرمیاہ علیہ السلام کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورہ البقرہ کی آیات میں کیا گیا ہے۔

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ یرمیاہ علیہ السلام نے بخت نصر کے ساتھ بابل جانے سے انکار کر دیا اور وہ بیت المقدس کی اس تباہ حالی سے گھبرا کر دور کسی جنگل میں گوشہ گیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بذریعہ وحی یہ حکم دیا ہو گا کہ وہ اس ویرانہ میں جا کر رہیں جو آج اگرچہ بنی اسرائیل کی تباہ کاریوں کی بدولت تباہ حال ہے مگر ہمیشہ سے نبیوں کی مقدس سرزمین ہے اور یہ کہ ہم دوبارہ اس کو آباد کریں گے اور جب حضرت یرمیاہ علیہ السلام اللہ کے حکم سے وہاں پہنچے اور ان کی نگاہ میں اس کی بربادی کا پورا نقشہ پھر گیا تو انہوں نے حسرت و افسوس اور تعجب و حیرت کے ساتھ دل میں یا زبان سے کہا ہو گا کہ اب کون سے ایسے اسباب پیدا ہوں گے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس مردہ بستی کو دوبارہ زندگی بخشیں گے اور پھر وہ سب کچھ پیش آیا جو زیر بحث آیات میں مذکور ہے اور اگر ہم اس پر یہ اور اضافہ کر دیں تو بیجا نہ ہو گا کہ اللہ کی حکمت و مصلحت کا یہ تقاضا ہوا کہ جبکہ ابھی یروشلم کی دوبارہ زندگی اور آبادی میں طویل مدت باقی ہے اور یرمیاہ علیہ السلام قوم سے الگ اس ویرانہ میں رہیں

گے تو یہ ان کی زندگی کے لئے نا قابل برداشت سانحہ ہوگا لہذا رحمت حق نے ان کے اس متعجبانہ سوال کو بہانہ بنا کر اس عرصہ کے لئے ان کو موت کی آغوش میں سلا دیا اور اس وقت بیدار کیا جب کہ یروشلم پہلے کی طرح خوب آباد اور بارونق ہو چکا تھا۔

واقعات وحادثات کی اس پوری مدت میں حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کی عمر کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتا ہے اور یہ مدت اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔

اس تحقیق کی تائید حضرت یسعیاہ (علیہ السلام) کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سائرس نجات دہندہ بنی اسرائیل کی متعلق ڈیڑھ سو سال قبل کی تھی (باب ۴ آیت ۲۸) اس لیے کہ یسعیاہ (علیہ السلام) نبی کے انتقال سے متصل ہی یرمیاہ (علیہ السلام) کا ظہور ہوا لہذا نجات بنی اسرائیل کی درمیانی مدت کا معاملہ ان ہی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے اس کے برعکس حضرت عزیز (علیہ السلام) کی حیات طیبہ کے متعلق جو تفصیلات توراۃ اور اسرائیلیات میں منقول ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی اسارت کے زمانہ میں وہ صغیر سن تھے اور اسرائیلیوں کے ساتھ بابل ہی میں رہے اور چالیس سال کی عمر میں "فقیہ" تسلیم کر لئے گئے اور وہیں منصب نبوت سے سرفراز ہونے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور اردشیر کے درباروں میں جس وفد نے کوششیں کیں ان میں بھی یہی پیش پیش رہے ہیں اور تورات کے ناپید ہو جانے کے بعد یروشلم میں اس کی تجدید ان ہی کے فیضان نبوت کا اثر تھا۔

غرض بنی اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر و آبادی بیت المقدس تک کی درمیانی مدت میں حضرت عزیز علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

یہ ہیں وہ شواہد و قرائن جن کی وجہ سے ہم نے مفسرین کے راجح قول کو مرجوع اور مرجوع قول کو راجح کہنے کی جسارت کی ہے۔

﴿ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال ﴾

مسطورہ بالا ہر دو اقوال کے علاوہ ان آیات کے مصداق متعین کرنے میں بعض اور بھی اقوال ہیں مثلاً حزقیل (علیہ السلام) یا بنی اسرائیل میں سے کوئی غیر معلوم شخص (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۳۱۴)

واقعہ کی غلط تفسیر

سورہ کہف کے تفسیری فوائد سپرد قلم کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک جگہ سورہ بقرہ

کے اس واقعہ کو حضرت حزقیل (علیہ السلام) کا مکاشفہ قرار دیا ہے جو اس واقعہ سے قریب صحیفہ حزقیل میں مذکور ہے (تفسیر ترجمان القرآن جلد۲)

ہم کو سخت تعجب ہے اور حیرت بھی کہ جب قرآن عزیز نے اس واقعہ کو صاف اور صریح طریقہ پر ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معین مدت کے لئے موت کی آغوش میں سلا دیا اور پھر زندہ کر کے اس سے موت کی مدت کے بارہ میں سوال کیا جب وہ صحیح جواب نہ دے سکا تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو کس طرح مولانا آزاد نے حزقیل کے مکاشفہ کو اس واقعہ کی تفسیر یا تاویل قرار دیا۔

غور کیجئے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسی کھنڈر اور ویران بستی پر گزر ہوا جو کبھی بہت ہی بارونق آباد بستی تھی اور جہاں لاکھوں انسان بس رہے تھے اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا اس نے یہ دیکھا تو دل میں سوچا یا زبان سے کہا کہ نہ معلوم کس طرح یہ مردہ بستی پھر زندہ ہوگی۔ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا تب اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا اور زندہ بخشنے کے بعد اس ہستی سے دریافت فرمایا بتاؤ تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے؟ برگزیدہ ہستی نے جواب دیا ایک دن یا دن کا بعض حصہ قَالَ کَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ چونکہ جواب غلط تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور حقیقت حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا نہیں بلکہ سو برس تک موت کی آغوش میں سوتے رہے ہو قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ عَامٍ اور پھر اپنی قدرت کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تر و تازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ تھیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تم کو دوسروں کے لئے اپنی قدرت کاملہ کا ایک ''نشان'' بنا دیں وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی پھر ان پر گوشت چڑھا اور پھر چمڑا اور ان کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کر لینے کے بعد جب علم

الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کرلیا تو فوراً اس برگزیدہ ہستی نے اعتراف کیا کہ بیشک اللہ کی قدرت کاملہ کے لئے اسباب و وسائل کی حاجت نہیں وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کے لئے مانع نہیں ہے فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ.

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجئے اور سوچئے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو ایک ''حقیقی واقعہ'' کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجاز کے طور پر ایک ''مکاشفہ'' کی شکل میں نیز کیا حزقیل (علیہ السلام) کے مکاشفہ اور ان آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہوسکتا ہے نہیں ہرگز نہیں پس بلا شبہ مولانا آزاد کی یہ تاویل ''تاویل باطل'' ہے۔

البتہ یہ کہنا صحیح ہوسکتا ہے کہ اگر حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کو یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے قریب قریب حضرت حزقیل (علیہ السلام) کا ایک مکاشفہ بھی ہے جو مجموعہ تورات کے صحیفہ حزقیل میں مذکور ہے اس مکاشفہ میں انہوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل اب ناامید ہو چکے ہیں کہ ہم اس بربادی کے بعد کبھی یروشلم میں دوبارہ آباد ہوں گے مگر ہم تیرے ذریعہ سے ان کو خبردار کرتے ہیں کہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ ایسا ضرور ہوگا (حزقیل باب ٣٧، آیات ١-١٤)

حضرت عزیر اور عقیدہ ابنیت

گزشتہ سطور میں ذکر آچکا ہے کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر ڈالا اور بنی اسرائیل کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں کی طرح ہنکا کر لے چلا تو توراۃ کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی حافظ تھا جس کو اول سے آخر تک توراۃ محفوظ ہو چنانچہ اسیری کے پورے دور میں وہ توراۃ سے قطعاً محروم ہو چکے تھے لیکن جب عرصہ دراز کے بعد ان کو بابل کی اسیری سے نجات ملی اور بیت المقدس (یروشلم) میں دوبارہ آباد ہوئے تو اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ اللہ کی کتاب توراۃ کو کس طرح حاصل کریں تب حضرت عزیر (عزراہ) نبی نے سب اسرائیلیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے توراۃ کو اول سے آخر تک پڑھا اور تحریر کرایا۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا تو

سب کی موجودگی میں آسمان سے دو چمکتے ہوئے "شہاب" اترے اور حضرت عزیر کے سینہ میں سما گئے تب حضرت عزیر نے بنی اسرائیل کو ازسرنو توراۃ مرتب کر کے عطا فرمائی چنانچہ جب حضرت عزیر اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو بنی اسرائیل نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور ان کے قلوب میں حضرت عزیر کی قدر و منزلت سو گنا بڑھ گئی (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۴۵) اور آہستہ آہستہ اس محبت نے گمراہی کی شکل اختیار کر لی کہ انہوں نے عزیر (علیہ السلام) کو اسی طرح اللہ کا بیٹا مان لیا جس طرح نصاری عیسی (علیہ السلام) کو ابن اللہ تسلیم کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اپنے اس عقیدہ کے لئے یہ دلیل قائم کر لی کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے جب ہم کو توراۃ لا کر دی تھی تو الواح پر لکھی ہوئی تھی مگر عزیر (علیہ السلام) نے تو کسی لوح یا قرطاس پر مکتوب لا کر دینے کی بجائے حرف بہ صرف اپنے سینہ کی لوح سے اس کو ہمارے سامنے نقل کر دیا اور عزیز میں یہ قدرت جب ہی ہوئی کہ وہ اللہ کا بیٹا ہے۔ العیاذ اللہ (سبحنک ھذا بھتان عظیم البدایۃ والنہایہ ص ۶۴)

ایک شبہ کا جواب

قرآن عزیز کے اس علان پر کہ عزیؑر کو یہود اللہ کا بیٹا کہتے ہیں آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو عزیز کو اللہ کا بیٹا نہیں مانتے اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے مگر ان علماء یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے پیشرؤوں کی طرح تلبیس اور کتمان حق پر مبنی ہے ورنہ تو وہ جانتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اس کو اقوام عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دلچسپی رہی ہو کہ آج بھی نواح فلسطین میں یہود کا وہ فرقہ موجود ہے جو عزیر (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح ان کا مجسمہ بنا کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کی زندگی مبارک

حضرت عزیر علیہ السلام کی حیات طیبہ سے متعلق تفصیلی حالات کا کچھ زیادہ مواد کتب سیر و تاریخ میں نہیں پایا جاتا اور مجموعہ توراۃ کے صحیفہ عزرا میں بھی خود ان کی زندگی پاک پر مفصل روشنی نہیں پڑتی اور اس کا زیادہ حصہ بنی اسرائیل کی اسارت بابل اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے

البتہ تورات اور وہب بن منبہ اور کعب احبار سے منقول روایات سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس کے زمانہ میں صغیر سن تھے اور چالیس (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۴۶) برس کی عمر میں بنی اسرائیل کے منصب ''فقیہ'' پر فائز ہوئے اور اس کے بعد ان کو منصب نبوت عطا ہوا اور وہ نحمیاہ نبی (علیہ السلام) بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کا فرض انجام دیتے اور اردشیر کے زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی مشکلات کے متعلق تعمیر بیت المقدس کو دور کرنے کے سلسلہ میں شاہی دربار میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے رہے (صحیفہ عزرا)

اور مشہور قول کے مطابق جن بزرگوں نے سورہ بقرہ کے واقعہ کا تعلق ان کے ساتھ بتایا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں بعض مزید تفصیلات حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور کعب احبارؒ وغیرہ سے نقل فرمائی ہیں جن کا ذکر ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے بھی آیات زیر بحث کی تفسیر کے ضمن میں ان کو نقل کیا ہے۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کے ضمن میں ایک صحیح روایت نقل کی گئی تھی کہ کسی ''نبی'' کے ایک چیونٹی نے کاٹ لیا انہوں نے غصہ میں چیونٹی کے سوراخ میں آگ ڈال کر تمام چیونٹیوں کو جلوادیا تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان پر عتاب فرمایا کہ تم نے ایک چیونٹی کی خطا پر تمام چیونٹیوں کو جلا دینا کس طرح جائز رکھا؟ تو اس واقعہ کے متعلق ابن کثیر نے اسحٰق بن بشیر کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ مجاہد ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی ''عزیر'' (علیہ السلام) تھے (البدایہ والنہایہ بتاریخ طبری) عزیر علیہ السلام کے متعلق بعض اور بھی واقعات نقل کئے جاتے ہیں مگر روایت اور درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار بلکہ لغو اور لا طائل ہیں چنانچہ ابن کثیر وغیرہ نے بھی ان کو نقل کر کے رد کر دیا ہے (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۲۷)

منصب نبوت

مگر یہ واضح رہے کہ جن روایات میں حضرت عزیر کو آیات مسطورہ بالا کا مصداق قرار دیا گیا ہے ان میں یہ بھی تصریح ہے کہ عزیر (علیہ السلام) نبی نہیں تھے بلکہ ''مرد صالح'' تھے حالانکہ جمہور کا قول یہ ہے کہ حضرت عزیر ''نبی'' تھے اور قرآن عزیز نے بھی جس انداز اور اسلوب سے انکا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں اور گمراہ

یہودیوں نے ان کو اسی طرح ''ابن اللہ'' بنالیا جس طرح نصاری نے حضرت عیسی (علیہ السلام) کو نیز توراۃ بھی ان کے نبی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

علاوہ ازیں جو حضرات ایک طرف سورہ بقرہ کی زیر بحث آیت کا مصداق عزیر (علیہ السلام) کو بتاتے ہیں اور دوسری جانب ان کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے یہ بات قابل توجہ ہے کہ بقرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلاواسطہ خطاب فرمایا ہے اور ان سے ہم کلام ہوا ہے اور یہ ان کے نبی ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

بہرحال عزیر (علیہ السلام) کے نبی ہونے کے متعلق دو قول ہیں اور راجح یہی ہے کہ وہ بلاشبہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

نسب

عزیر (علیہ السلام) کے والد اور سلسلہ نسب کے بعض دوسرے ناموں میں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔

ابن عساکر ان کے والد کا نام جروہ بتاتے ہیں اور بعض ''سوریق'' اور بعض ''سروخا'' بیان کرتے ہیں اور صحیفہ عزرا میں ہے کہ ان کا نام ''حلقیاہ'' تھا۔

وفات اور قبر مبارک

ابن کثیر نے وہب بن منبہ، کعب احبار عبداللہ بن سلامؓ سے عزیز (علیہ السلام) کے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ عزیر (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کے لئے توراۃ کی تجدید عراق کے اندر دیر حزقیل میں کی تھی اور اسی نواح کے ایک قریہ سائرآباد میں ان کی وفات ہوئی (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۴۵) اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض آثار میں موجود ہے کہ ان کی قبر دمشق میں ہے

(البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۴۴)

حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن عزیز میں حضرت زکریا (علیہ السلام) کا ذکر چار سورتوں آل عمران، انعام، مریم اور انبیاء کی حسب ذیل آیات میں آیا ہے۔

شمار	سورۃ	آیت
۱	آل عمران	۳۷۔۴۱
۲	انعام	۸۵
۳	مریم	۲۔۱۱
۴	انبیاء	۸۹۔۹۰

ان میں سے سورہ انعام میں تو صرف فہرست انبیاء میں نام ذکر کیا گیا ہے اور باقی تین سورتوں میں مختصر تذکرہ منقول ہے۔

نسب

قرآن عزیز جن زکریا (علیہ السلام) کا ذکر کر رہا ہے یہ وہ نہیں ہیں جن کا ذکر مجموعہ توراۃ کے صحیفہ زکریا میں آیا ہے اس لئے کہ توراۃ میں جن زکریا کا تذکرہ ہے ان کا ظہور دار یوس (دارا) کے زمانہ میں ہوا ہے چنانچہ "زکریا نبی کی کتاب" میں ہے۔

"دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں اللہ کا کلام زکریا بن برخیاہ بن مدد کو پہنچا۔"

اور دارا ابن گشتاسپ کا زمانہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ولادت سے پانچ سو سال قبل ہے کیونکہ وہ کیقباد بن کیخسرو کے انتقال کے بعد ۵۲۱ ق م میں تخت نشین ہوا ہے اور قرآن عزیز نے جن زکریا (علیہ السلام) کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے مربی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے معاصر ہیں اور ان کے اور یحییٰ بن زکریا اور مسیح (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور یہ حضرت یحییٰ (علیہ

السلام) کے والد ماجد ہیں۔(فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۶۵)

حضرت زکریا (علیہ السلام) کے والد کا نام کیا تھا' اس میں اصحاب سیر کے مختلف اقوال ہیں اوران میں سے کوئی قول بھی باوثوق نہیں کہا جاسکتا چنانچہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں ابن عساکر سے وہ سب اقوال نقل کر دیئے ہیں۔یعنی زکریا بن ادن (دان) ابن شبوی یا ابن لدن یا ابن برخیا بن مسلم (فتح الباری جلد ۶' بن صدوق بن جشان بن داؤد بن سلیمان بن مسلم بن صدیقہ بن برخیا بن بلعاطہ بن ناخور بن شلوم بن یہفاشاط بن اینامن بن رحعام بن سلیمان بن داؤد (علیہما السلام)

لیکن یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی ذریت میں سے ہیں (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۷)

حالات زندگی

زکریا (علیہ السلام) کی حیات طیبہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہیں لیکن جس قدر بھی قرآن عزیز اور سیر و تاریخ کی قابل اعتماد روایات سے معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔

بنی اسرائیل میں "کاہن" ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرہ بیت المقدس) کی مقدس رسوم ادا کیا کرے اس کے لئے مختلف قبائل میں سے الگ کاہن منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت زکریا (علیہ السلام) بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی چنانچہ قرآن عزیز نے ان کو انبیاء کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِينَ (الانعام ۶' آیت ۸۵)

اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس یہ سب نیکوکاروں میں سے ہیں

اور لوقا کی انجیل میں ان کو کاہن! (اسلام کے دور اول میں عرب کے اندر جو کاہن (جوتشی) ہوتے اور مستقبل کے حالات بتایا کرتے تھے اور جن کی باتوں پر ایمان لانا اسلام کے ساتھ کفر بتایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے اس منصب سے الگ شے ہے) کہا گیا ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور

اسکی بیوی ہارون (علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشع تھا اور وہ دونوں اللہ کے حضور راستباز اور اللہ کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے (باب ا آیت ۵-۶)

مگر انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے چنانچہ حضرت مسیح (علیہ السلام) یہود کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہے ہیں

وہ وقت قریب ہے جب تم پر ان انبیاء (علیہم السلام) کا وبال پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا (علیہ السلام) کے زمانہ تک قتل کیا ہے اور جبکہ زکریا (علیہ السلام) کو ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ (مشہور چار انجیلوں سے الگ یہ پانچویں انجیل ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے حواری برنابا کی جانب منسوب ہے' یہ روما کے پوپ سکنس کے کتب خانہ میں محفوظ تھی اور وہاں سے ایک اسقف نے کسی طرح حاصل کر کے اس کو شائع کر دیا اور وہ مسلمان ہو گیا' کیونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی شہادتیں صاف اور واضح پائی جاتی ہیں)

زکریا (علیہ السلام) سلالہ داؤد (علیہ السلام) سے تھے اور ان کی زوجہ مطہرہ ایشاع یا الیشع حضرت ہارون (علیہ السلام) کی ذریت میں سے تھیں (فتح الباری جلد ۶ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲)

نجاری کا پیشہ

تمام انبیاء علیہم السلام "خواہ وہ بادشاہ ہے اور صاحب حکومت ہی کیوں نہ ہوں" اپنی روزی ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے اور کسی کے لئے باردوش نہیں ہوتے تھے اسی لئے ہر نبی نے جب اپنی امت کو رشد و ہدایت کی تبلیغ کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ. اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(سورۃ الشعراء پ ۱۹ آیت ۱۰۹' ۱۲۷' ۱۴۵' ۱۶۴' ۱۸۰)

میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے چنانچہ زکریا (علیہ السلام) بھی اپنی روزی کے لئے نجاری کا پیشہ کرتے تھے جیسا کہ مسلم ابن ماجہ اور مسند احمد میں بصراحت مذکور ہے

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کان زکریا نجارا (الحدیث) (کتاب الانبیاء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکریا (علیہ السلام) نجاری (بڑھئی کا کام) کرتے تھے۔

مزید تفصیلات آئندہ صفحات میں آیات قرآنی کی تفسیر وتشریح کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مریم کی کفالت

سورۃ آل عمران میں ہے کہ: وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ عمران (پدر مریم) کی بی بی نے حالت حمل میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر یعنی منت مانی ہے آپ کی عبادت کے لئے اس بچے کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ خانہ خدا کی خدمت کے واسطے آزاد فارغ رکھا جائے گا اور میں اس کو اپنے کام میں نہ لگاؤں گی سو آپ اس کو مجھ سے قبول کر لیجئے' بیشک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں کہ میری عرض کو سن رہے ہیں' اور میری نیت کو جان رہے ہیں پھر جب ان بی بی نے لڑکی جنی تو ان کو رنج ہوا کہ یہ تو خدمت بیت المقدس کے لائق نہیں یہ کام تو مردوں کا ہے اس لئے حسرت سے کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو حمل لڑکی جنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے خیال سے حسرت کر رہی تھیں حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اس لڑکی کی شان کو جو انہوں نے جنی اور کسی طرح بھی وہ لڑکا جو انہوں نے چاہا تھا اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کہ اس کے کمالات وبرکات عجیب وغریب ہوں گے' یہ ارشاد خداوندی بطور جملہ معترضہ کے تھا پھر ان بی بی کا قول ہے اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو اگر کبھی اولاد ہو آپ کی پناہ اور حفاظت میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔

کفالت کے لئے قرعہ اندازی

حاصل یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ان کو لے کر مسجد بیت المقدس میں پہنچیں اور وہاں کے مجاورین وعابدین سے جن میں حضرت زکریا (علیہ السلام) بھی تھے' جا

کر کہا کہ اس لڑکی کو میں نے خاص خدا کے لئے مانا ہے' اس لئے میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی' سو اس کو لائی ہوں' آپ لوگ رکھئے۔

حضرت عمران علیہ السلام اس مسجد کے امام تھے اور حالت حمل میں ان کی وفات ہو چکی تھی' ورنہ سب سے زیادہ مستحق ان کے لینے کے وہ تھے' لڑکی کے باپ بھی تھے اور مسجد بیت المقدس کے امام بھی' اس لئے بیت المقدس کے مجاورین و عابدین میں سے ہر شخص للن کو لینے اور پالنے کی خواہش رکھتا تھا' حضرت زکریا (علیہ السلام) نے اپنی ترجیح کو یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے گھر میں ان کی خالہ ہیں اور وہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے اس لئے بعد ماں کے وہی رکھنے کی مستحق ہے مگر اور لوگ اس ترجیح پر راضی اور متفق نہیں ہوئے' آخر قرعہ اندازی پر اتفاق قرار پایا' اور صورت قرعہ کی بھی عجیب و غریب خلاف عادت ٹھہری جس کا بیان آگے آئے گا اس میں بھی حضرت زکریا (علیہ السلام) کامیاب ہوئے۔

نشانات قدرت کا نظارہ

چنانچہ حضرت مریم علیہ السلام ان کو مل گئیں' اور انہوں نے بعض روایات کے مطابق ایک انا کو نوکر رکھ کر دودھ پلوایا' اور بعض روایات میں ہے کہ دودھ پینے کی ان کو حاجت ہی نہیں ہوئی غرض وہ خود اٹھنے بیٹھنے لگیں' ان کو مسجد کے متعلق ایک عمدہ مکان میں لا کر رکھا جب کہیں جاتے اس کو قفل لگا کر جاتے پھر آ کر کھول لیتے' اسی قصہ کا ذکر مختصر آگے آتا ہے' یعنی پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رب نے بطریق احسن قبول فرمالیا اور عمدہ طور پر ان کو نشو و نما دیا' اور حضرت زکریا (علیہ السلام) کو ان کا سرپرست بنایا جب کبھی حضرت زکریا (علیہ السلام) ان کے پاس اسی عمدہ مکان میں جس میں ان کو رکھا تھا تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے اور یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں جب کہ مکان مقفل ہے باہر سے کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو خزانہ غیب ہے اس میں سے آئیں بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں جیسا اس موقع پر محض فضل سے بے مشقت عطا فرمایا۔

اولاد کے لئے دعا

حضرت زکریا (علیہ السلام) نے حضرت مریم علیہ السلام کی تربیت میں غیر معمولی نشانات قدرت دیکھ کر اپنے لئے بھی دعاء فرمائی جن کا بیان آیت ۳۸ میں ہے کہ

اس موقع پر دعاء کی حضرت زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے عرض کیا کہ اے میرے رب عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بیشک آپ بہت سننے والے ہیں دعاء کے۔

دعا کے لئے موقع کی مناسبت

حضرت زکریا (علیہ السلام) کے اس وقت تک اولاد نہ تھی، اور زمانہ بڑھاپے کا آ گیا تھا جس میں عادۃً اولاد نہیں ہو سکتی، اگرچہ خرق عادت کے طور پر قدرت خداوندی کا ان کو پورا اعتقاد تھا کہ وہ ذات اس بڑھاپے کے موقع میں بھی اولاد دے سکتی ہے لیکن چونکہ اللہ کی ایسی عادت آپ نے مشاہدہ نہیں کی تھی کہ وہ بے موقع اور بے موسم چیزیں عطا کرتا ہے اس لئے آپ کو اولاد کے لئے دعاء کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی لیکن اس وقت جب آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو بے موسم میوے عطا فرمائے ہیں تو اب آپ کو بھی سوال کرنے کی جرات ہوئی کہ جو قادر مطلق بے موقع پھل عطا کر سکتا ہے وہ بے موقع اولاد بھی عطا کرے گا۔

بیٹے کی بشارت

آیت ۳۹ میں ہے کہ: پس پکار کر کہا اس سے فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحیٰ (نام بیٹا عطا ہونے) کی جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور دوسرے مقتدائے دین ہوں گے اور تیسرے اپنے نفس کو لذات سے بہت روکنے والے ہوں گے اور چوتھے نبی بھی ہوں گے اور پانچویں اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔

حضرت یحیٰؑ کی ایک صفت

حصوراً، حضرت یحیٰ علیہ السلام کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنے نفس کو

لذات سے بہت روکنے والے تھے' اور لذات سے روکنے میں مباح خواہشوں سے بچنا بھی داخل ہے' مثلاً اچھا کھانا' اچھا پہننا اور نکاح وغیرہ کرنا' اس صفت کو موقع مدح میں فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے حالانکہ احادیث سے نکاح کی فضیلت ثابت ہے تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت یحیٰ علیہ السلام کی سی ہو کہ اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ اس کے غلبہ کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو' ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے' اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے: من استطاع منکم الباء ۃ' یعنی جو آدمی نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور زوجیت کے حقوق ادا کر سکتا ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا افضل ہے ورنہ نہیں (بیان القرآن)

حضرت زکریا کا تعجب کرنا اور نشانی مانگنا

آیت ۴۰' ۴۱ میں ہے کہ: حضرت زکریا (علیہ السلام) نے جناب باری میں عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آ پہنچا' اور میری بی بی بڑھاپے کی وجہ سے بچہ جننے کے قابل نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ایسی حالت میں ہی لڑکا ہو جاوے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں' انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تو پھر میرے واسطے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل ہو گیا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے بجز ہاتھ یا سر وغیرہ کے اشارہ کے جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں امید ہے اور اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے کی قدرت نہ رہے ذکر اللہ پر قادر ہو گے سو اپنے رب کو دل سے بھی بکثرت یاد کیجیو اور زبان سے بھی تسبیح و تقدیس کیجیو دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی کیونکہ ذکر اللہ کی قدرت اس وقت بھی پوری رہے گی۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء اور اس کی حکمت

حضرت زکریا علیہ السلام باوجودیکہ قدرت خداوندی کے معتقد بھی تھے اور نمو[illegible] کا مکرر

مشاہدہ بھی کر چکے تھے اور خود ہی درخواست کی تھی اور قبولیت کا علم بھی ہو گیا تھا' پھر اس کہنے کے کیا معنی کہ کس طرح لڑکا ہوگا؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال کرنا اللہ کی قدرت میں شک کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ مقصود سوال سے کیفیت کا معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی کی جو حالت موجود ہے کہ دونوں خوب بوڑھے ہیں' یہی حالت رہے گی یا کچھ اس میں تبدیلی کی جاوے گی' اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم بوڑھے ہی رہو گے اور اسی حالت میں تمہارے اولاد ہوگی اب اس میں کوئی اشکال نہ رہا (بیان القرآن)

نام کی یکتائی

اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کے بارے میں فرمایا: لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا کے معنے ہمنام کے بھی آتے ہیں' اور مثل و مشابہ کے بھی' اس جگہ اگر پہلے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب واضح ہے کہ ان سے پہلے یحییٰ نام کسی شخص کا نہیں ہوا تھا۔ یہ نام کی یکتائی اور امتیاز بھی بعض خاص صفات میں ان کی یکتائی کی طرف مشیر تھی اس لئے اس کو ان کی صفات خاص میں ذکر کیا گیا اور اگر دوسرے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب یہ ہوگا کہ بعض خاص صفات اور حالات ان کے ایسے ہیں جو پچھلے انبیاء میں سے کسی میں نہ تھے ان صفات خاصہ میں وہ بے مثل تھے۔ مثلاً ان کا حصور ہونا وغیرہ اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یحییٰ علیہ السلام پچھلے سارے انبیاء سے مطلقاً افضل ہوں کیونکہ ان میں حضرت خلیل اللہ اور حضرت کلیم اللہ کا ان سے افضل ہونا مسلم و معروف ہے۔ (مظہری)

عتیاً' عتو سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تاثر قبول نہ کرنا ہے مراد اس سے ہڈیوں کا خشک ہو جانا ہے۔ سویاً' کے معنے تندرست کے ہیں یہ لفظ اس لئے بڑھایا گیا کہ زکریا علیہ السلام پر اس حالت کا طاری ہونا کہ کسی انسان سے بات نہ کر سکیں کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا اور اسی وجہ سے ذکر اللہ اور عبادت میں ان کی زبان ان تینوں دنوں میں برابر کھلی ہوئی تھی بلکہ یہ حالت بطور معجزہ اور علامت حمل کے ان پر طاری کی گئی تھی۔

حضرت یحییٰ کی امتیازی صفت

حضرت یحییٰ کی ایک صفت یہ بھی ذکر فرمائی کہ: حناناً' اس لفظ کے لغوی معنے رقت قلب اور رحمت و شفقت کے ہیں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کو امتیازی طور پر دی گئی تھی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت یحییٰ کا ذکر قرآن عزیز میں ان ہی سورتوں میں آیا ہے جن میں زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے یعنی آل عمران' انعام' مریم' انبیاء۔

نام ونسب

یہ زکریا علیہ السلام کے بیٹے اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل تھے ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے اور ایسا نام ہے کہ اس سے قبل ان کے خاندان میں کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔

یٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا

(مریم ۱۹' آیت ۷)

اے زکریا! ہم بیشک تم کو بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی' اس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اس سے قبل ہم نے کسی کے لئے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے۔

حالات زندگی

مالک بن انس فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن زکریا اور عیسیٰ بن مریم کا رحم مادر میں استقرار ایک ہی زمانہ میں ہوا اور ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ قبل ہوا ہے (فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۶۴) اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوئے چھ ماہ گزر گئے تب جبرئیل علیہ السلام فرشتہ مریم علیہا السلام پر ظاہر ہوا اور اس نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کو بشارت دی۔

اور دیکھ تیری رشتہ دار الیشع کے بھی بڑھاپے میں بیٹا ہونے والا ہے اور اب اس کو جو

بانجھ کہلاتی تھی چھٹا مہینہ ہے (باب ا آیت ۳۶)

ان نقول کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسی علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے تھے۔ یحییٰ علیہ السلام کے لئے جب زکریا علیہ السلام نے دعا کی تھی تو اس میں یہ کہا تھا کہ وہ ''ذریت طیبہ'' ہو چنانچہ قرآن عزیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا منظور فرمالی چنانچہ یحیی علیہ السلام نیکوں کے سردار اور زہد وورع میں بے مثال تھے نہ انہوں نے شادی کی اور نہ ان کے قلب میں کبھی گناہ کا خطرہ پیدا ہوا اور اپنے والد ماجد کی طرح وہ بھی اللہ کے برگزیدہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بچپن ہی میں علم وحکمت سے معمور کر دیا تھا اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ عیسی علیہ السلام کی آمد کی بشارت دیتے اور ان کی آمد سے قبل رشد و ہدایت کے لئے زمین ہموار کرتے تھے۔ تفصیلات آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام

حضرت لقمان علیہ السلام غلام تھے یا بادشاہ

لقمان یا حکیم لقمان' اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حالات اور خاندان ونسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا (حکیم) تھے اور ان کے حکیمانہ اقوال صحیفہ لقمان کے نام سے ان کے درمیان معروف ومشہور تھے ان سے متعلق باقی امور میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نام کی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عاد ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں ایک نیک بادشاہ ہوگزرا ہے اور خالص عرب نژاد ہے۔ ابن جریر ابن کثیر سہیلی جیسے مؤرخین کی رائے یہ ہے مشہور لقمان حکیم افریقی النسل تھا اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت سے آیا تھا چنانچہ یہ حضرت اس کا نسب نامہ اور حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

وہ لقمان بن عنقا یا ثار بن سندون ہے۔

اور کہتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھا اور پستہ قد بھاری بدن سیاہ رنگ تھا' ہونٹ موٹے اور ہاتھ پیر بھدے تھے' مگر نہایت نیک عابد وزاہد' صاحب حکمت اور دانا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکمت سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں عہدہ قضا پر مامور ہو گیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے فرماتے تھے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لقمان پستہ قد موٹے ہونٹ والے نوبہ کے قبیلے سے تھے۔

اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لقمان مصری سوڈانی تھے اور ان کے ہونٹ بہت موٹے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو اگرچہ نبوت نہیں عطا کی مگر حکمت و دانائی

سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔

عبدالرحمٰن بن حرملہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے پاس آنکلا اور کچھ سوال کیا انہوں نے فرمایا تو اس بات سے دل گیر نہ ہو کہ کالا حبشی ہے اس لیے کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہتر انسان ہوئے ہیں۔ بلال رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام مہجع اور لقمان حکیم جو سوڈانی نوبی تھے اور ان کے لب بہت موٹے اور بھدے تھے۔

اور مشہور مؤرخ اور صاحب مغازی محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ لقمان عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

وہب بن منبہ کہتے ہیں جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی تھی جو اس زمانے کے انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی' اللہ تعالیٰ نے اس کو سو انسانوں کے برابر ادراک وحاسہ عطا فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔

وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ لقمان بن عاد کا نسب نامہ یہ ہے! ملطاط بن سلک بن وائل بن حمیر اور وہ نبی تھے مگر رسول نہیں تھے۔

اور لطف یہ ہے کہ ابن جریر اور ابن کثیر بھی اپنی تائید میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کا قول نقل کرتے ہیں اور ابن اسحاق بھی ان ہی کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں اور معاصر مؤرخین میں سے مصنف ارض القرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلاشبہ عاد ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں اور بہت بڑے حکیم و دانا تھے اور عرب میں لقمان کے نام سے جو ''صحیفہ'' منسوب تھا وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ شاعر جاہلی سلمی بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

اهلكن طسما وبعده غذى بهم وذاجدون
واهل جاش ومارب "وحی لقمان" و التقون

''حوادث زمانہ نے قبیلہ طسم کو اور اس کے بعد ذاجدون شاہ یمن کو اہل جاش و مارب کو اور قبیلہ لقمان کو مٹا دیا''۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبیلہ کا مالک' یمن کا باشندہ اور عظمت وشوکت میں سبا کا مقابل اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔

عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸ھ میں ملا تھا اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں۔

ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوئے تھے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔''

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفہ لقمان' لقمان کے اچھے فیصلے ایک کتاب مین لکھے ہوئے تھے۔

سورہ لقمان میں تذکرہ

حضرت لقمان کا ذکر قرآن عزیز نے بھی کیا ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام اسی تقریب سے سورہ لقمان ہے اگرچہ اس نے اپنے پیش نظر مقصد کی خاطر ان کے نسب وخاندان کی بحث میں جانا پسند نہیں کیا تاہم ان کے حکیمانہ مقولات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے لقمان کی شخصیت پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کو بیان کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ مسطورہ بالا ہر دو رایوں میں سے کون سی رائے صحیح یا قرین قیاس ہے۔

حکمت ودانائی اور بیٹے کو نصیحت

سورۂ لقمان میں ہے کہ: اور ہم نے لقمان کو دانشمندی (جس کی حقیقت علم مع العمل ہے) عطا فرمائی اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ سب نعمتوں پر عموماً اور اس نعمت حکمت پر کہ افضل النعم ہے خصوصاً اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (یعنی اسی کا نفع ہے کہ اس سے نعمت میں ترقی ہوتی ہے کما قال لئن

شکر تم لا زید نکم' دینی نعمت میں تو ترقی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی' دنیا میں تو شکر نعمت سے علم بڑھتا ہے اور توفیق عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور آخرت میں ثواب عظیم ملتا ہے اور دنیوی میں آخرت کی ترقی یعنی ثواب میں اضافہ تو یقینی ہے اور کبھی دنیا میں شکر کرنے سے نعمت بڑھ جاتی ہے اور جو ناشکری کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز اور سب خوبیوں والا ہے یعنی چونکہ وہ اپنی ذات میں کامل ہے جو مدلول ہے حمید کا اس لئے وہ غنی ہے' اس کو کسی کے شکر و ثناء کی احتیاج نہیں کہ اس میں استکمال بالغیر لازم آتا ہے اور چونکہ لقمان موصوف ہیں حکمت یعنی علم و عمل کے ساتھ اس سے مفہوم ہوا کہ انہوں نے تعلیم شکر پر بھی شکر کیا ہوگا پس وہ شاکر بھی تھے اور شاکر ہونے سے ان کی حکمت میں ترقی بھی ہوئی ہوگی' پس وہ اعلیٰ درجہ کے حکیم ہوئے' اور ایسے حکیم کی تعلیم ضرور قابل عمل ہونا چاہئے سو ان کی تعلیمات ان لوگوں کے سامنے ذکر کیجئے جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرانا' بیشک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے' ظلم کی حقیقت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ کسی چیز کو بے محل استعمال کیا جائے' اور یہ بات شرک میں سب سے زیادہ واضح ہے کہ پیدا کرنے والے کی جگہ بتوں کی پرستش کی جائے' اور درمیان قصہ کی امر توحید کی تاکید کے لئے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے کہ ان کی اطاعت اور خدمت کرے کیونکہ انہوں نے اس کے لئے بڑی مشقتیں جھیلی ہیں بالخصوص ماں نے چنانچہ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا کیونکہ جوں جوں حمل بڑھتا جاتا ہے حاملہ کا ضعف بڑھتا جاتا ہے اور پھر دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے ان دنوں میں بھی وہ ہر طرح کی خدمت کرتی ہے' اسی طرح اپنی حالت کے موافق باپ بھی مشقت اٹھاتا ہے اس لئے ہم نے اپنے حقوق کے ساتھ ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کا حکم فرمایا' چنانچہ یہ ارشاد کیا کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر حق تعالیٰ کی شکر گزاری تو عبادت و اطاعت حقیقیہ کے ساتھ اور ماں باپ کی خدمت و ادائے حقوق شرعیہ کے ساتھ کیونکہ میری ہی طرف سب کو لوٹ کر آنا ہے اس وقت میں اعمال کی جزاء و سزا دوں گا اس لئے احکام کی بجا

آوری ضروری ہے اور باوجودیکہ ماں باپ کا اتنا بڑا حق ہے جیسا ابھی معلوم ہوا لیکن امر توحید ایسا عظیم الشان ہے کہ اگر تجھ پر وہ دونوں بھی اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس کے شریک الوہیت ہونے کی تیرے پاس کوئی دلیل (اور سند) نہ ہو (اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ جس کے استحقاق شرکت پر کوئی دلیل قائم ہو بلکہ عدم استحقاق پر بہت سی دلیلیں قائم ہیں، پس مراد یہ ہوئی کہ اگر وہ کسی چیز کو بھی شریک الوہیت ٹھہرانے کا تجھ پر زور دیں تو تُو ان کا کہنا نہ ماننا اور ہاں یہ ضرور ہے کہ دنیا کے حوائج و معاملات میں جیسے ان کے ضروری اخراجات اور خدمت وغیرہ ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور دین کے بارے میں صرف اس ہی شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو یعنی میرے احکام کا معتقد اور عامل ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر آنے کے وقت میں تم کو جتلا دوں گا جو جو کچھ تم کرتے تھے اس لئے کسی امر میں میرے حکم کے خلاف مت کرو، آگے پھر تکمیل ہے نصائح لقمانیہ کی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو اور نصیحتیں بھی کیں چنانچہ توحید و عقائد کے بارے میں یہ بھی نصیحت کی کہ بیٹا حق تعالیٰ کا علم اور قدرت اس درجہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی عمل کیسا ہی مخفی ہو، مثلاً فرض کرو کہ وہ رائی کے دانہ کے برابر مقدار میں ہو اور پھر فرض کرو کہ وہ کسی پتھر کے اندر چھپا رکھا ہو جو کہ ایسا حجاب ہے کہ اس کا رفع ہونا دشوار ہے اور بدون رفع کسی کو اس کے اندر کا علم نہیں ہوتا یا وہ آسمانوں کے اندر ہو جو کہ عام خلائق سے مکاناً بہت بعید ہے یا وہ زمین کے اندر ہو جہاں خوب ظلمت رہتی ہے اور یہی اسباب ہیں عام مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے کیونکہ کبھی کوئی چیز چھوٹی اور باریک ہوتی ہے کہ نظر میں نہیں آتی اور کبھی کوئی شدید حجاب حائل ہونے سے کبھی مکان کے بعید ہونے سے کبھی ظلمت سے، لیکن حق تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر یہ اسباب بھی چھپنے کے مجتمع ہوں تب بھی قیامت کے روز حساب کے وقت اس کو اللہ تعالیٰ حاضر کر دے گا جس سے علم اور قدرت دونوں ثابت ہوئے بیشک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین اور باخبر ہے اور اعمال کے باب میں یہ نصیحت کی کہ بیٹا نماز پڑھا کرو کہ بعد تصحیح عقائد کے اعلیٰ درجہ کا عمل ہے اور جیسا تصحیح عقائد و اعمال سے اپنی تکمیل کی ہے اسی طرح دوسروں کی تکمیل کی بھی کوشش کرنا چاہئے، پس لوگوں کو

اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے کاموں سے منع کیا کر اور اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالخصوص اور ہر حالت میں بالعموم تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر یہ صبر کرنا ہمت کے کاموں سے ہے اور اخلاق و عادات کے باب میں یہ نصیحت کی کہ بیٹا لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل' بیشک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر نہ بہت دوڑ کر چل کہ وقار کے خلاف ہے' نیز گر جانے کا بھی احتمال ہے' اور نہ بہت گن گن کر قدم رکھ کہ وضع متکبرین کی ہے' بلکہ بے تکلف اور متوسط رفتار تواضع و سادگی کی چال اختیار کر جس کو دوسری آیت میں اس عنوان سے ذکر کیا ہے یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا' اور بولنے میں اپنی آواز کو پست کر یعنی بہت غل مت مچا اور یہ مطلب نہیں کہ اتنی پستی کر کہ دوسرا سنے بھی نہیں آگے غل مچانے سے نفرت دلاتے ہیں کہ بیشک آوازوں میں سے سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے تو آدمی ہو کر گدھوں کی طرح چیخنا اور چلانا کیا مناسب ہے' نیز چیخ چلاؤ سے بعض اوقات دوسروں کو وحشت و اذیت بھی ہوتی ہے۔

حضرت لقمان اپنے نصائح کے تناظر میں

حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصائح نہ کرتے اس لئے کہ غرور و نخوت خود بینی و شیخی' کرختگی و خشونت ایسے اوصاف ہیں جو بادشاہوں' شہزادوں' متمول و صاحب اقتدار انسانوں کے اندر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ نا خدا ترس اور نشہ دولت میں چور دولت مندوں ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے اور یہ وہ تمام اوصاف و عادات ہیں جو عموماً متکبرین اور جبابرہ کے لئے مخصوص ہیں غلام اور غلام زادہ کے لئے نہ ان کا موقع ہے اور نہ فرصت کیونکہ اس کا وقت عزیز تو دوسروں کی نیازمندی اور خدمت گزاری ہی کے لئے وقف ہوتا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اسی لئے یہ فرمایا ہے۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

اس تفصیل کے بعد جو کہ قرآن عزیز سے ماخوذ ہے اب ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ

لقمان حکیم اور لقمان عاد ایک ہی شخصیت ہے اور وہ عاد ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرت ہود (علیہ السلام) کے پیرو تھے اور حبشی الاصل نہیں بلکہ عربی الاصل تھے اور صاحب سیرت محمد بن اسحاق کی نقل اور شاعر جاہلی سلمی بن ربیعہ کی شہادت اس مسئلہ میں صحیح اور راجح ہیں اور عاد ثانیہ کے زمانہ کے حجری کتبہ میں جو کہا گیا ہے اس سے مراد وہی صحیفہ لقمان ہے جو عرب میں مشہور و معروف تھا۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر ان مرفوعہ روایات کو پیش کر کے ہمارے دعویٰ کی تردید کی جائے جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول ہے کہ لقمان حکیم حبشی الاصل تھے مگر واضح رہے کہ صاحب جرح و تعدیل محدثین نے ان روایات کے رفع کو صحیح تسلیم نہیں کیا اور ان میں سے بعض کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے یعنی محدثین کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے۔

لقمان علیہ السلام جمہور سلف کے نزدیک نبی نہیں بلکہ ولی اور حکیم تھے

ابن کثیر نے فرمایا کہ جمہور سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ نبی نہیں تھے' صرف حضرت عکرمہؓ سے ان کا نبی ہونا نقل کیا جاتا ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے' اور امام بغویؒ نے فرمایا کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ فقیہ اور حکیم تھے نبی نہیں تھے (مظہری)

ابن کثیر نے فرمایا کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے ان کے بارے میں ایک عجیب روایت یہ منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت لقمان کو اختیار دیا تھا کہ نبوت لے لو یا حکمت' انہوں نے حکمت کو اختیار کر لیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان کو نبوت کا اختیار دیا گیا تھا انہوں نے عرض کیا کہ اگر اس کے قبول کرنے کا حکم ہے تو میرے سر آنکھوں پر ورنہ مجھے معاف فرمایا جائے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ لقمان علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر کیوں ترجیح دی' جبکہ آپ کو دونوں کا اختیار دیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ نبوت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے' اگر وہ مجھے بغیر میرے اختیار کے

دے دیا جاتا تو حق تعالیٰ خود اس کی کفالت فرماتے کہ میں اس کے فرائض ادا کرسکوں اور اگر میں اپنے اختیار سے اس کو طلب کرتا تو ذمہ داری مجھ پر ہوتی (ابن کثیر)

اور جبکہ لقمان علیہ السلام کا نبی نہ ہونا جمہور کے نزدیک مسلم ہے تو پھر ان کو وہ حکمت جو قرآن میں مذکور ہے ان اشکر لی یہ بذریعہ الہام ہوسکتا ہے جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے شرعی مسائل میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے' جب داؤد علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا کہ اب میری ضرورت نہیں رہی۔ بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ حضرت لقمان علیہ السلام سے کلمات حکمت بہت منقول ہیں۔ وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت لقمان علیہ السلام کی حکمت کے دس ہزار سے زیادہ ابواب پڑھے ہیں۔ (قرطبی)

حضرت لقمان ایک روز ایک بڑی مجلس میں لوگوں کو حکمت کی باتیں سنا رہے تھے' ایک شخص آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا تم وہی نہیں جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتے تھے؟ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں وہی ہوں اس شخص نے پوچھا کہ پھر آپ کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا کہ خلق خدا آپ کی تعظیم کرتی ہے اور آپ کے کلمات سننے کے لئے دور دور سے جمع ہوتی ہے۔ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا سبب میرے دو کام ہیں ایک ہمیشہ سچ بولنا' دوسرے فضول باتوں سے اجتناب کرنا' اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت لقمان نے فرمایا کہ چند کام ایسے ہیں جنہوں نے مجھے اس درجہ پر پہنچایا' اگر تم اختیار کرلو تو تمہیں بھی یہی درجہ اور مقام حاصل ہو جائے گا' وہ کام یہ ہیں: اپنی نگاہ کو پست رکھنا اور زبان کو بند رکھنا' حلال روزی پر قناعت کرنا' اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا' بات میں سچائی پر قائم رہنا' عہد کو پورا کرنا' مہمان کا اکرام کرنا' پڑوسی کی حفاظت کرنا' اور فضول کام اور کلام کو چھوڑ دینا (ابن کثیرؒ)

حکمت جو لقمان علیہ السلام کو دی گئی اس سے کیا مراد ہے؟

لفظ حکمت قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے' علم' عقل' حلم و بردباری' نبوت' اصابت رائے۔

ابو حیان نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں

اوران کے دلوں میں مؤثر ہواور جس کولوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچائیں۔
اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد عقل وفہم اور ذہانت ہے۔اور بعض حضرات نے فرمایا کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہےاور درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں' یہ سبھی چیزیں حکمت میں داخل ہیں۔اوپر خلاصہ تفسیر میں حکمت کا ترجمہ دانشمندی سے اوراس کی تفسیر علم باعمل سے کی گئی ہے یہ بہت جامع اور واضح ہے۔
آیت مذکورہ میں حضرت لقمان علیہ السلام کوحکمت عطا کرنے کا ذکر فرما کرآگے فرمایا ہےان اشکر لی' اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہاں قلنا محذوف مانا جائے' مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے لقمان کوحکمت دی اور یہ حکم دیا کہ میرا شکرادا کیا کرو'اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ان اشکر لی خود حکمت کی تفسیر ہے' یعنی وہ حکمت جولقمان کودی گئی یہ تھی کہ ہم نے اس کوشکر کا حکم دیا انہوں نے تعمیل کی۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرگزار ہونا سب سے بڑی حکمت ہے۔اس کے بعد یہ جتلا دیا کہ یہ شکر گزاری کا حکم ہم نے کچھ اپنے فائدہ کے لئے نہیں دیا' ہمیں کسی کے شکر کی حاجت نہیں' بلکہ یہ خود انہی کے فائدے کے لئے دیا ہے۔کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری نعمت کا شکرادا کرتا ہے'ہم اس کی نعمت میں اور زیادتی کر دیتے ہیں۔

کلمات حکمت

اس کے بعد لقمان علیہ السلام کے کچھ کلمات حکمت کا ذکر فرمایا ہے جوانہوں نے اپنے بیٹے کومخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے' وہ کلمات حکمت قرآن کریم نے اس لئے نقل فرمائے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔
ان کلمات حکمت میں سب سے اول تو عقائد کی درستی ہے اوران میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو سارے عالم کا خالق و مالک بلا شرکت غیرے یقین کرے' اس کے ساتھ کسی غیر اللہ کوشریک عبادت نہ کرے کہ اس دنیا میں اس سے بڑا بھاری ظلم کوئی نہیں ہوسکتا کہ خدا تعالیٰ کی کسی مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرائے' اس لئے فرمایا یبنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم

والدین کی اطاعت

آگے حضرت لقمان کی دوسری نصائح اور کلمات حکمت آئے ہیں جو اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمائے تھے۔ درمیان میں حق تعالیٰ نے شرک کے ظلم عظیم ہونے اور کسی حال اس کے پاس نہ جانے کی ہدایات کے لئے ایک اور حکمت ارشاد فرمایا:

کہ اگر چہ ہم نے اولاد کو اپنے ماں باپ کی اطاعت اور شکر گزاری کی بڑی تاکید کی ہے' اور اپنی شکر گزاری و اطاعت کے ساتھ ساتھ والدین کی شکر گزاری اور اطاعت کا حکم دیا ہے لیکن شرک ایسا ظلم عظیم اور سنگین جرم ہے کہ وہ ماں باپ کے کہنے سے اور مجبور کرنے سے بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوتا' اگر کسی کو اس کے والدین اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے پر مجبور کرنے لگیں تو اس معاملہ میں والدین کا کہنا بھی ماننا جائز نہیں۔

اور یہاں جبکہ والدین کے حقوق اور ان کی شکر گزاری کا حکم دیا گیا تو اس کی حکمت یہ بتلادی کہ اسکی ماں نے اس کے وجود و بقاء میں بڑی محنت برداشت کی ہے' کہ نو مہینے تو اس کو اپنے شکم میں رکھ کر اس کی حفاظت کی اور اس کی وجہ سے جو روز بروز اس کو ضعف پر ضعف اور تکلیف پر تکلیف بڑھتی گئی اس کو برداشت کیا' پھر اس کے پیدا ہونے کے بعد بھی دو سال تک اس کو دودھ پلانے کی زحمت برداشت کی جس میں ماں کو خاص محنت بھی شب و روز اٹھانی پڑتی ہے اور اس کا ضعف بھی اس سے بڑھتا ہے اور چونکہ بچے کی پرورش میں محنت و مشقت زیادہ ماں اٹھاتی ہے اس لئے شریعت میں ماں کا حق باپ سے مقدم رکھا گیا ہے' وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ. حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ کا یہی مطلب ہے اور اس کے بعد و ان جاھداک میں یہ بتلایا ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کے معاملہ میں والدین کی اطاعت بھی حرام ہے۔

اور ایسی صورت میں کہ ماں باپ اس کو شرک و کفر پر مجبور کریں اور اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہو کہ ان کی بات نہ مانو' تو طبعی طور پر انسان حد پر قائم نہیں رہتا۔ اس پر عمل کرنے میں اس کا امکان تھا کہ بیٹا والدین کے ساتھ بدکلامی یا بدخوئی سے پیش آئے ان کی توہین کرے۔ اسلام ایک قانون عدل ہے' ہر چیز کی ایک حد ہے اس لئے شرک میں والدین کی اطاعت نہ

کرنے کے حکم کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا کہ:

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا یعنی دین میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو' مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ اس میں کمی نہ ہونے دو بلکہ دنیوی معاملات میں اس کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرو ان کی بے ادبی نہ کرو ان کی بات کا جواب ایسا نہ دو جس سے بلا ضرورت دلآزاری ہو' مطلب یہ ہے کہ ان کے شرک و کفر کے معاملہ میں نہ ماننے سے جو ان کی دل آزاری ہوگی وہ تو مجبوری کے لئے برداشت کرو مگر ضرورت کو ضرورت کی حد میں رکھو دوسرے معاملات میں ان کی دل آزاری سے پرہیز کرتے رہو۔

فائدہ: اس آیت میں جو بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتلائی گئی ہے' یہ عام عادت کے مطابق ہے۔ اس میں اس کی کوئی تشریح و تصریح نہیں کہ اس سے زیادہ مدت تک دودھ پلایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس مسئلہ کی تشریح سورہ احقاف کی آیت وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا کے تحت میں ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

دوسری وصیت متعلقہ عقائد

یہ ہے کہ اس کا اعتقاد جازم رکھا جائے کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اس کے ایک ایک ذرہ پر اللہ تعالیٰ کا علم بھی محیط اور وسیع ہے اور سب پر اس کی قدرت بھی کامل ہے۔ کوئی چیز کتنی ہی چھوٹی سے چھوٹی ہو جو عام نظروں میں نہ آسکتی ہو اسی طرح کوئی چیز کتنی ہی دور دراز پر ہو اسی طرح کوئی چیز کتنے ہی اندھیروں اور پردوں میں ہو اللہ تعالیٰ کے علم و نظر سے نہیں چھپ سکتی' اور وہ جس کو جب چاہیں جہاں چاہیں حاضر کر سکتے ہیں۔ یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ الایۃ کا یہی مطلب ہے اور حق تعالیٰ کے علم و قدرت کا ہر چیز پر محیط ہونا خود بھی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور عقیدہ توحید کی بہت بڑی دلیل ہے۔

تیسری وصیت متعلقہ اصلاح عمل

اعمال واجبہ تو بہت ہیں مگر ان سب میں سب سے بڑا اور اہم عمل نماز ہے اور خود اہم ہونے کے ساتھ وہ دوسرے اعمال کی درستی کا ذریعہ بھی ہے۔ جیسا کہ نماز کے بارے میں

ارشاد ربانی ہے ان الصلوة تنهى عن الفحشاء و المنكر' اس لئے اعمال صالح واجبہ میں سے نماز کے ذکر پر اکتفاء فرمایا یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ''یعنی اے میرے بیٹے نماز کو قائم کرو اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اقامت صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کے تمام ارکان و آداب کو پوری طرح بجا لانا' اس کے اوقات کی پابندی کرنا اور اس پر مداومت کرنا سب اقامت صلوٰۃ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

چوتھی وصیت متعلقہ اصلاح خلق

اسلام ایک اجتماعی دین ہے فرد کی اصلاح کے ساتھ جماعت کی اصلاح اس کے نظام کا اہم جزو ہے اس لئے نماز جیسے اہم فریضہ کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ذکر فرمایا گیا کہ لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دو اور برے کاموں سے روکو اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ دو فریضے ہیں ایک اپنی اصلاح اور دوسرا عام مخلوق کی اصلاح۔ دونوں ایسے ہیں کہ دونوں کی پابندی میں خاصی مشقت و محنت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں' خصوصاً اصلاح خلق کیلئے امر بالمعروف کی خدمت کا صلہ دنیا میں ہمیشہ عداوتوں اور مخالفتوں سے ملا کرتا ہے۔ اس لئے اس وصیت کیساتھ ہی یہ وصیت بھی فرمائی کہ و اصبر علی ما اصابک ط ان ذلک من عزم الامور' یعنی ان کاموں میں تمہیں جو کچھ تکلیف پیش آئے اس پر صبر و ثبات سے کام لو۔

پانچویں وصیت متعلقہ آدابِ معاشرت

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ صعر سے مشتق ہے جو اونٹ کی ایک بیماری ہے جس سے اس کی گردن مڑ جاتی ہے' جیسے انسانوں میں لقوہ معروف بیماری ہے جس سے چہرہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے' مراد اس سے رخ پھیر لینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملاقات اور گفتگو میں ان سے منہ پھیر کر گفتگو نہ کرو جو ان سے اعراض کرنے اور تکبر کرنے کی علامت ہے اور اخلاق شریفانہ کے خلاف ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا مرح اکڑ کر اترا کر چلنا ہے' معنی یہ ہیں کہ زمین کو اللہ

تعالیٰ نے سارے عناصر سے پست افتادہ بنایا ہے تم اسی سے پیدا ہوئے اسی پر چلتے پھرتے ہو اپنی حقیقت کو پہچانو اترا کر نہ چلو جو متکبرین کا طریقہ ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، یعنی اللہ نہیں پسند کرتا کسی متکبر فخر کرنے والے کو۔

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ یعنی اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، نہ بہت دوڑ بھاگ کر چلو کہ وہ وقار کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ چلنے میں بہت جلدی کرنا مؤمن کی رونق ضائع کردیتا ہے۔ (جامع صغیر عن ابی ہریرہؓ) اور اس طرح چلنے میں خود اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو تکلیف بھی پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور نہ بہت آہستہ چلو جو یا تو ان تکبر اور تصنع کرنے والوں کی عادت ہے جو لوگوں پر اپنا امتیاز جتانا چاہتے ہیں یا عورتوں کی عادت ہے جو شرم وحیاء کی وجہ سے تیز نہیں چلتیں یا پھر بیماروں کی عادت ہے جو اس پر مجبور ہیں۔ پہلی صورت حرام اور دوسری بھی اگر عورتوں کی مشابہت پیدا کرنے کے قصد سے ہو تو ناجائز ہے اور یہ قصد نہ ہو تو پھر مردوں کے لئے ایک عیب ہے۔ اور تیسری صورت میں اللہ کی ناشکری ہے کہ تندرستی کے باوجود بیماروں کی ہیئت بنائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کو یہود کی طرح دوڑنے سے بھی منع کیا جاتا ہے اور نصاریٰ کی طرح بہت آہستہ چلنے سے بھی۔ اور حکم یہ تھا کہ ان دونوں چالوں کی درمیانی چال اختیار کرو۔

حضرت عائشہ نے کسی شخص کو بہت آہستہ چلتے دیکھا جیسے ابھی مر جائے گا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایسے کیوں چلتا ہے؟ لوگوں نے بتلایا کہ یہ قرا میں سے ہے۔ قراء قاری کی جمع ہے اس زمانے میں قاری اس کو بھی کہا جاتا تھا جو تلاوت قرآن کی صحت وآداب کے ساتھ قرآن کا عالم بھی ہو۔ مطلب یہ تھا کہ یہ کوئی بڑا قاری عالم ہے اس لئے ایسا چلتا ہے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ عمر بن خطابؓ اس سے زیادہ قاری تھے مگر ان کی عادت یہ تھی کہ جب چلتے تو تیز چلتے تھے (مراد وہ تیزی نہیں جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ اس کے بالمقابل تیزی ہے) اور جب وہ کلام کرتے تھے تو اس طرح کہ لوگ اچھی طرح سن لیں (ایسی پست آواز نہ ہوتی تھی کہ سننے والوں کو پوچھنا پڑے کہ کیا فرمایا)۔

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ "یعنی آواز کو پست کرو" مراد پست کرنے سے یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ بلند آواز نہ نکالو اور شور نہ کرو جیسا کہ ابھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق گزرا کہ کلام ایسا کرتے تھے کہ حاضرین سن لیں انہیں سننے میں تکلیف نہ ہو۔

اس کے بعد فرمایا ان الکر الاصوات لصوت الحمیر، یعنی چوپاؤں میں سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی ہے جو بہت شور کرتا ہے۔"

حضرت لقمان کی نصائح اور اسلامی تعلیمات

(۱) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب اور توحید کا التزام ہے کیونکہ "دین حق" میں یہی وہ حقیقت ہے جو حنیف کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے اور شرک ہی ایسا گناہ ہے جو کسی حالت میں بھی قابل بخشش نہیں مگر یہ کہ اس سے تائب ہو جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء ۴ آیت ۴۸)

بے شک جو خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے اس کو خدائے تعالیٰ نہیں بخشے گا اور کفر و شرک کے علاوہ گناہ جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔

(۲) حضرت لقمان نے شرک کو "ظلم عظیم" فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری کی ایک روایت ہے وہ یہ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی الذین امنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم (سورۃ الانعام پ ۷ آیت ۸۲) خدا کی مغفرت ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا" تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات بہت شاق گزری اور انہوں نے خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہوگا جس نے خدائے تعالیٰ کے احکام کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انه لیس بذلک الم تسمع الی قول لقمان یبنی لا تشرک بالله ان الشرک لظلم "عظیم"

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کیا تم نے لقمان کا یہ قول نہیں سنا ''اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا' بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ آیت لَمْ يَلْبِسُوٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ میں ظلم سے مراد ''شرک'' ہے نہ کہ معصیت صغائر و کبائر۔

(۳) سورہ لقمان میں و اذ قال لقمان لابنه سے لظلم عظیم تک اور پھر ینی سے لصوت الحمیر تک حضرت لقمان کے مقولات بیان کیے گئے ہیں اور درمیان میں و وصینا الانسان سے انبئکم بما کنتم تعملون تک بطور جملہ معترضہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے تو اس کے لئے وجہ مناسبت یہ ہے کہ جب قرآن نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جس میں باپ نے بیٹے کو پند و نصائح کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے امت مرحومہ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ جب کہ باپ اور ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیوی اور اخروی کسی معاملہ میں بھی اولاد کو بے راہ دیکھنا نہیں چاہتے تا کہ انجام کار اولاد کو دکھ جھیلنا نہ پڑے تو اولاد کے لئے از بس ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح اور حقیقی معرفت کے بعد سب سے زیادہ والدین کی خدمت اور ان کی رضا جوئی کو مقدم سمجھے حتیٰ کہ اگر والدین کافر و مشرک ہوں تب بھی اس کا فرض ہے کہ ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک تواضع اور نیاز مندی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ البتہ اگر وہ دین حق سے اعراض اور شرک کے اختیار پر اصرار کریں تو اس کو قبول نہ کرے اس لیے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت بھی درست نہیں ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق لیکن اس مکالمہ میں بھی اپنے انکار کے وقت نرمی اور حسن خطابت کو نہ چھوڑے اور درشت کلامی اختیار نہ کرے۔

(۴) سورہ لقمان میں جو نصائح مذکور ہیں ان میں حسن خلق اور تواضع کی ترغیب اور کبر شیخی اور بدخلقی کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرت لقمان نے امر و نہی میں ان باتوں کا خصوصیت کے ساتھ اس لئے انتخاب فرمایا ہے کہ کائنات میں جس قدر بھلائی اور برائی پیش آتی ہے ان سب کی جڑ اور بنیاد یہی امور ہیں چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت مرحومہ کو ان امور کی اہمیت پر بہت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

حسن خلق

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم بعثت لا تمم حسن الاخلاق (موطا امام مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بے شبہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ محاسن اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچاؤں

عن ابن عمر رضی الله عنه قیل یا رسول الله ای المؤمن ۳م (بیهقی) افضل قال احسنهم خلقاً عن انس قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان العبد لیبلغ بحسن خلقه درجات الاخرة و شرف المنازل و انه ضعیف العبادة و انه لیبلغ بسوء خلفه درک جهنم و وهو عابد (معجم طبرانی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کون سا مسلمان سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ حسن اخلاق رکھتا ہے وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازل علیا کو حاصل کر لیتا ہے اور عابد ہونے کے باوجود بد خلقی کی وجہ سے جہنم پاتا ہے۔ (وقال میمون بن مہران عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من ذنب اعظم عند اللہ من سوء الخلق) تفسیر ابن کثیر

میمون بن مہران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک بد خلقی سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں ہے۔

تواضع

قال رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم طوبیٰ للا تقیاء الا ثریاء

الذین اذا حضر والم یعرفوا واذا غابوا یتفقدواو اولئک
مصابیح مجردون من کل فتنة غبرآء مشتة)(تفسیر ابن کثیر ج ۳)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بشارت ہے نیکوکار بے نفس لوگوں کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ مجلس میں موجود ہوں تو کوئی تعارف نہ کرے اور جب غائب ہو جائیں تو کوئی تلاش نہ کرے۔ یہی ہیں روشن چراغ اور ہر تاریک و پراگندہ فتنہ سے محفوظ۔

کبر وغرور

عن عبدلله بن مسعود قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم
لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرةٍ من کبر (تفسیر ابن کثیر ج ۳)
عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص ہرگز داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ذرہ کی مقدار بھی غرور وکبر ہوگا۔

عند عبداللّٰہ بن عمر و قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من کان
فی قلبه مثقال ذرة من کبر اکبه اللّٰہ علیٰ وجهه فی النار (اصحاب السنن)
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اوندھے منہ گرادے گا۔

عن بریدة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من جرثوبه
خیلاء لم ینظر اللّٰہ الیه (مسلم)
حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے لباس کو ازراہ غرور زمین پر کھینچتا ہوا چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی جانب نظر رحمت سے نہ دیکھے گا۔

(۵)۔ حضرت لقمان نے درشت اور کرخت آواز سے بات چیت کرنے کو بھی منع فرمایا ہے اور یہ بہت واضح بات ہے اس لئے کہ نرم گفتاری حسن خلق کا شعبہ اور درشت اور کرخت لہجہ بدخلقی کا جز ہے اور اسی بناء پر اس طرز گفتگو کو ''صورت حمار'' سے مشابہ بتایا گیا

ہے اور نہیق حمار کے متعلق یہ حدیث بہت معروف و مشہور ہے۔

(عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم صیاح الدیکۃ فاسئلو اللّٰہ من فضلہ واذا سمعتم نھیق الحمیر فتعوذوا باللّٰہ من الشیطان فانھارأت شیطاناً)
(تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۱۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرو اور گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو اس لئے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز کرتا ہے۔

یعنی مرغ کی آواز (ملائکۃ اللہ) کے نزول کی دلیل ہے کیونکہ وہ سحر میں تسبیح کا عادی ہے اور حمار کی آواز نزول شیاطین کا پتہ دیتی ہے اس لئے کہ ہر مکروہ اور فطرت سلیم کو ناگوار شے شیطان کے لئے محبوب ہے۔

(۶) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں ان میں یہ بھی کہا ہے کہ ''زمین پر اکڑ کر نہ چلو'' اس مضمون کو قرآن عزیز نے دوسری جگہ عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔

(وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا. اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۳۷)

اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل تو اپنے اس انداز رفتار سے نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک طویل ہو جائے گا۔ مغرور انسان کے انداز رفتار کو کس معجزانہ بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے گویا وہ اس طرح چلتا ہے کہ اپنی اکڑی ہوئی بلندی گردن کے ذریعہ پہاڑی کی بلندی سے بھی اونچا ہو جانا چاہتا ہے اور قدم کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ گویا اس کو پھاڑ ڈالے گا۔ مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کرے گا پھر بلا وجہ اکڑ کر چلنے کے کیا معنی؟

اور اس کے برعکس متواضع اور بلا اخلاق انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ:

وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان ۲۵، آیت ۶۳)

اور جو رحمان کے بندے (یعنی حکم بردار بندے) ہیں وہ زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جہالت سے بچنے کے لئے) السلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

حضرت لقمان کے اقوال زریں

گزشتہ سطور میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ عرب میں حکمت لقمان کا کافی چرچا تھا اور وہ اکثر مجالس میں ان کے حکیمانہ اقوال کو نقل کرتے رہتے تھے چنانچہ تابعین صحابہ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ کے بعض اقوال منقول ہیں اور ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہی بنا دیتی ہے۔

(۲) جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اول سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہل مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود گفتگو نہ کرو پس اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں سے اپنا حصہ لے لو اور اگر وہ فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہو جاؤ اور دوسری کسی عمدہ مجلس کو حاصل کرو۔

(۳) اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانت دار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے۔

(۴) اے بیٹے خدائے تعالیٰ سے ڈر اور ریا کاری سے خدا کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقتہً گنہگار ہے۔

(۵) اے بیٹے جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کہ کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کر لے۔

(۶) واضح رہے کہ داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولتا مگر یہ کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ اسی طرح کرنا چاہتا ہو۔

(۷) اے بیٹے خاموشی میں کبھی ندامت اٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے۔

(۸) بیٹا ہمیشہ شر سے دور رہو تو شر تم سے دور رہے گا اس لیے کہ شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے

(۹) بیٹا غیظ و غضب سے بچو اس لئے کہ شدت غضب دانا کے قلب کو مردہ بنا دیتی ہے

(۱۰) بیٹا خوش کلام بنو' طلاقت وجہ اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے جو ہر وقت ان کو داد و دہش کرتا رہتا ہو۔

(۱۱) نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے (۱۲) جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

(۱۳) اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو۔

(۱۴) کسی نے لقمان سے دریافت کیا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟ کہا جس کے صبر کے پیچھے ایذا نہ ہو' پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے پھر سوال کیا سب سے بہتر آدمی کون سا ہے؟ فرمایا "غنی" سائل نے پھر کہا غنی سے مال دار مراد ہے؟ جواب میں کہا نہیں بلکہ غنی وہ ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے۔

(۱۵) کسی نے دریافت کیا بد ترین انسان کون سا ہے فرمایا جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔

(۱۶) بیٹا تیرے دستر خوان پر ہمیشہ نیکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علماء حق سے ہی لینا (تفسیر ابن کثیر ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۳ ماخوذ از امام احمد)

حضرت عیسیٰ وحضرت مریم علیہما السلام

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جلیل القدر اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ورسل ہیں اسی طرح عیسیٰ (علیہ السلام) خاتم الانبیاء بنی اسرائیل جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سوستر (۵۷۰) سال ہے۔ فترۃ (انقطاع وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کی جلالت قدر اور عظمت شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاء بنی اسرائیل حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت ورسالت کا مقام امامت حاصل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام مجدد انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ اس لئے کہ قانون ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لئے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانون تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے۔ نزول تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے توراۃ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیل تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغام ہدایت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ باران رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔ مزید برآں یہ کہ عیسیٰؑ سرور کائنات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے مناد اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور

حضرت عیسیٰ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کہ جس دین قویم اور ملت بیضاء کا عروج وکمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت وتبلیغ کا محور ومرکز ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بننے والی تھی وہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے۔ مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنہوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحید الٰہی کو حنفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کیلئے خدا کی راہ مستقیم کے لئے "ملۃ حنیفیہ" کا امتیاز قائم کر دیا، یعنی خدا کی پرستش کیلئے مظاہر کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے "وہ مشرک" ہے اور جو خالق کائنات کی یکتائی کا قائل ہوکر براہ راست اسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیان حق کیلئے اس کی پیروی حق وصداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطا ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائنات رشد وہدایت کا امام اکبر اور مجدد اعظم قرار دیا گیا۔ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا (سورۃ آل عمران پ۴ آیت ۹۵) اور پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔

مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا (الحج ۲۲ آیت ۷۸)

یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا۔ نزول قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام "مسلم" ہے۔

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی دعوت وتبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت ونافرمانی، دشمنان خدا سے نبرد آزمائی پیہم مصائب وآلام پر صبر واستقلال کا دوام وثبات اور اسی قسم کے دوسرے کوائف وحالات میں ان کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بہت زیادہ مشابہت ومناسبت پائی جاتی ہے اور اس لئے وہ واقعات وحالات، قبول وانکار حق اور ان سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت وعبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر وشواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی حیات طیبہ کا

مقدس ذکر مسطورہ بالا خصوصیت و امتیازات کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی حیات طیبہ کے دیباچہ کے طور پر ان کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے واقعات زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد ''تذکیرہ بایام اللہ'' پورا ہو۔

یہ ذکر پاک قرآن عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نام مبارک عیسیٰؑ سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ ''مسیح'' اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت ''ابن مریمؑ'' کے اظہار کے ساتھ۔

عمران وحنہ:

بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد و زاہد شخص تھا اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب و مقبول تھے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ا (آل عمران)

محمد بن اسحاق ''صاحب مغازی'' نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔

عمران بن ہاشم بن میشا بن جزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہوا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایا رحیم (رحیعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) اور حافظ ابن عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کئے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماء انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن قبیل بھی داؤد (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶)

عمران صاحب اولاد نہیں تھے اور ان کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے اولاد ہو، وہ اس کے لئے درگاہ الٰہی میں دست بدعاء اور قبولیت دعا کے لئے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش

مارا اور حالت اضطراب میں بارگاہ الٰہی میں دعاء کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور عرض کیا ''پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔'' دل سے نکلی ہوئی دعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گی۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ امید برآنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحاق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔

جب مدت حمل پوری ہوگئی اور ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لئے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر ان کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی، اس لئے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا، سریانی میں اس کے معنیٰ ''خادم'' کے ہیں چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دی گئیں اس لئے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵)

حضرت مریم کی والدہ کی منت

انبیاء سابقین علیہ السلام کی شریعت میں ایک طریقہ عبادت کا یہ بھی تھا کہ اپنی اولاد میں سے کسی بچے کو اللہ کے لئے مخصوص کر دیں کہ اس سے دنیا کی کوئی خدمت نہ لیں، حضرت مریمؑ کی والدہ نے اسی قاعدہ کے مطابق اپنے حمل کے متعلق یہ منت مان لی کہ اس کو خاص بیت المقدس کی خدمت کے لئے رکھوں گی، دنیا کے کام میں نہ لگاؤں گی، مگر جب حمل سے لڑکی پیدا ہوئی تو یہ خیال کر کے افسوس کیا کہ لڑکی تو یہ کام نہیں کر سکتی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی برکت سے اس لڑکی ہی کو قبول فرما لیا، اور اس کی شان ساری دنیا کی لڑکیوں سے ممتاز کر دی۔

حضرت مریم حضرت زکریا کی کفالت میں

حاصل یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ان کو لے کر مسجد بیت المقدس میں پہنچیں اور وہاں کے مجاورین وعابدین سے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے، جا کر کہا کہ اس لڑکی کو میں نے خاص خدا کے لئے مانا ہے، اس لئے میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی، سو اس کو لائی ہوں، آپ لوگ رکھئے۔

حضرت عمران علیہ السلام اس مسجد کے امام تھے، اور حالت حمل میں ان کی وفات ہو چکی تھی، ورنہ سب سے زیادہ مستحق ان کے لینے کے وہ تھے، لڑکی کے باپ بھی تھے اور مسجد بیت المقدس کے امام بھی، اس لئے بیت المقدس کے مجاورین وعابدین میں سے ہر شخص ان کو لینے اور پالنے کی خواہش رکھتا تھا، حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی ترجیح کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے گھر میں ان کی خالہ ہیں، اور وہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے، اس لئے بعد ماں کے وہی رکھنے کی مستحق ہے، مگر اور لوگ اس ترجیح پر راضی اور متفق نہیں ہوئے، آخر قرعہ اندازی پر اتفاق قرار پایا، اور صورت قرعہ کی بھی عجیب وغریب خلاف عادت ٹھہری، جس کا بیان آگے آئے گا، اس میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کامیاب ہوئے۔

چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام ان کو مل گئیں، اور انہوں نے بعض روایات کے مطابق ایک اَنّا کو نوکر رکھ کر دودھ پلوایا، اور بعض روایات میں ہے کہ دودھ پینے کی ان کو حاجت ہی نہیں ہوئی، غرض وہ خود اٹھنے بیٹھنے لگیں، ان کو مسجد کے متعلق ایک عمدہ مکان میں لا کر رکھا، جب کہیں جاتے اس کو قفل لگا کر جاتے، پھر آ کر کھول لیتے، اسی قصہ کا ذکر مختصر آیت ۳۷ میں ہے، یعنی) پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رب نے بطریق احسن قبول فرمالیا اور عمدہ طور پر ان کو نشو ونما دیا اور (حضرت) زکریا (علیہ السلام) کو ان کا سرپرست بنایا۔ جب کبھی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) ان کے پاس (اسی) عمدہ مکان میں (جس میں ان کو رکھا تھا) تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں (جب کہ مکان مقفل ہے، باہر سے کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں) وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (جو خزانہ غیب

ہے اس میں) سے آئیں، بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں (جیسا اس موقع پر محض فضل سے بے مشقت عطا فرمایا)

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا

(حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت میں غیر معمولی نشانات قدرت دیکھ کر اپنے لئے بھی دعا فرمائی جن کا بیان آیت ۳۸ میں ہے۔

اس موقع پر دعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے عرض کیا کہ اے میرے رب عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بیشک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے اس وقت تک اولاد نہ تھی، اور زمانہ بڑھاپے کا آ گیا تھا جس میں عادۃً اولاد نہیں ہو سکتی، اگر چہ خرق عادت کے طور پر قدرت خداوندی کا ان کو پورا اعتقاد تھا کہ وہ ذات اس بڑھاپے کے موقع میں بھی اولاد دے سکتی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی ایسی عادت آپ نے مشاہدہ نہیں کی تھی کہ وہ بے موقع اور بے موسم چیزیں عطا کرتا ہے اس لئے آپ کو اولاد کے لئے دعا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن اس وقت جب آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو بے موسم میوے عطا فرمائے ہیں تو اب آپ کو بھی سوال کرنے کی جرأت ہوئی، کہ جو قادر مطلق بے موقع پھل عطا کر سکتا ہے وہ بے موقع اولاد بھی عطا کرے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لئے دعا کرنا انبیاءؑ اور صالحین کی سنت ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت

آیت ۳۹ میں ہے کہ پس پکار کر کہا اس سے فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰ (نام بیٹا عطا ہونے) کی جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور (دوسرے) مقتدائے (دین) ہوں گے اور (تیسرے) اپنے نفس کو (لذات سے) بہت روکنے والے ہوں گے اور (چوتھے) نبی بھی ہوں گے اور (پانچویں) اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔

کلمۃ اللہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلاف عادت بلاواسطہ باپ کے پیدا کئے گئے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تیسری صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ اپنے نفس کو لذات سے بہت روکنے والے تھے، اور لذات سے روکنے میں مباح خواہشوں سے بچنا بھی داخل ہے، مثلاً اچھا کھانا، اچھا پہننا اور نکاح وغیرہ کرنا، اس صفت کو موقع مدح میں فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے حالانکہ احادیث سے نکاح کی فضیلت ثابت ہے، تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی سی ہو کہ اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ اس کے غلبہ کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو، ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے، اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے: من استطاع منکم الباء ۃ، یعنی جو آدمی نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اور زوجیت کے حقوق ادا کرسکتا ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا افضل ہے ورنہ نہیں (بیان القرآن)

قرآن کریم میں ہے کہ (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے (جناب باری میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آپہنچا، اور میری بی بی بھی (بڑھاپے کی وجہ سے) بچہ جننے کے قابل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) فرمایا کہ ایسی حالت میں ہی لڑکا ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار (تو پھر) میرے واسطے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل ہو گیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کرسکو گے بجز (ہاتھ یا سر وغیرہ کے) اشارہ کے (جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں امید ہے) اور اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے کی قدرت نہ رہے ذکر اللہ پر قادر ہو گے سو) اپنے رب کو (دل سے بھی)

بکثرت یاد کیجیو اور (زبان سے بھی) تسبیح (وتقدیس) کیجیو دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی، (کیونکہ ذکر اللہ کی قدرت اس وقت بھی پوری رہے گی)

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی حکمت

حضرت زکریا علیہ السلام باوجودیکہ قدرت خداوندی کے معتقد بھی تھے اور نمونہ کا مکرر مشاہدہ بھی کر چکے تھے اور خود ہی درخواست کی تھی اور قبولیت کا علم بھی ہو گیا تھا، پھر اس کہنے کے کیا معنی کہ کس طرح لڑکا ہوگا؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال کرنا اللہ کی قدرت میں شک کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ مقصود سوال سے کیفیت کا معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی کی جو حالت موجودہ ہے کہ دونوں خوب بوڑھے ہیں، یہی حالت رہے گی یا کچھ اس میں تبدیلی کی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم بوڑھے ہی رہو گے، اور اسی حالت میں تمہارے اولاد ہوگی، اب اس میں کوئی اشکال نہ رہا (بیان القرآن)

حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانی طلب کرنا

حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانی معلوم کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ہمیں جلدی خوشی ہو، اور بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی شکر میں مشغول ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نشانی عطا کی کہ آپ تین دن تک لوگوں سے سوائے اشارے کے کوئی کلام نہیں کر سکیں گے۔

اس نشانی میں لطافت یہ ہے کہ نشانی کی درخواست سے جو ان کا مقصود تھا کہ شکر ادا کریں نشانی ایسی تجویز کی گئی کہ بجز اس مقصود کے دوسرے کام ہی کے نہ رہیں گے، سو نشانیوں کی ایک نشانی ہو گئی، اور مقصود کا مقصود بدرجۂ اتم حاصل ہو گیا۔ (بیان القرآن)

حضرت مریم علیہا السلام کے فضائل ومناقب

قرآن کریم میں ہے کہ (اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے) کہا اے مریم بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے، اور (تمام ناپسندیدہ افعال واخلاق سے) پاک بنایا ہے اور (مقبول فرمانا کچھ ایک دو عورتوں کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس زمانہ کی) تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلہ

میں منتخب فرمایا ہے، (اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ) اے مریم اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ (یعنی نماز ادا) کیا کرو اور (نماز میں) رکوع (بھی) کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔ (آل عمران ۴۲-۴۳)

حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ سے مراد اس زمانے میں تمام جہان کی عورتیں ہیں، اس لئے حدیث میں سیدۃ نساء اہل الجنۃ فاطمۃ کا ارشاد اس کے منافی نہیں،

حضرت مریم بتول علیہا السلام نبی تھیں یا ولی؟

حضرت مریم کی ولایت اور نبوت کے بارے میں اختلاف ہے، آیت مذکورہ میں مقام مدح میں لفظ ''صدیقه'' سے بظاہر اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ''ولی'' تھیں، نبی نہیں، کیونکہ مقام مدح میں اعلیٰ درجہ کو ذکر کیا جاتا ہے، اگر آپ کو نبوت حاصل ہوتی تو یہاں ''نبیه'' کہا جاتا، حالانکہ یہاں ''صدیقه'' کہا گیا ہے، جو ولایت کا مقام ہے۔ (روح ملخصًا)

جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی، یہ منصب رجال ہی کے لئے مخصوص رہا ہے، وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی (یوسف، رکوع ۱۲) (فوائد عثمانی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت مریم علیہا السلام کو بیٹے کی بشارت

قرآن کریم میں ہے کہ اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کتاب (یعنی قرآن کے اس خاص حصہ یعنی سورت) میں (حضرت) مریم (علیہا السلام) کا قصہ بھی ذکر کیجئے (کہ وہ زکریا علیہ السلام کے قصۂ مذکورہ سے خاص مناسبت رکھتا ہے اور وہ اس وقت واقع ہوا) جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ (ہوکر) ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لئے) گئیں پھر ان (گھر والے) لوگوں کے سامنے سے انہوں نے (درمیان میں) پردہ ڈال لیا (تا کہ اس کی آڑ میں غسل کرسکیں) پس (اس حالت میں) ہم نے اپنے فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) کو بھیجا اور وہ (فرشتہ) ان کے سامنے (ہاتھ پاؤں اور صورت وشکل میں) ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا (چونکہ حضرت مریم نے اس کو انسان سمجھا اس لئے گھبرا کر) کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اپنے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جائے گا) فرشتہ نے کہا کہ (میں بشر نہیں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو بلکہ) میں تو تمہارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں (اس لئے آیا ہوں) تا کہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں (یعنی تمہارے منہ میں یا گریبان میں دم کردوں جس کے اثر سے باذن اللہ حمل رہ جائے اور لڑکا پیدا ہو) وہ (تعجب سے) کہنے لگیں (نہ کہ انکار سے) کہ میرے لڑکا کس طرح ہو جائے گا حالانکہ (اس کی شرائط عادیہ میں سے مرد کے ساتھ مقاربت ہے اور وہ بالکل مفقود ہے کیونکہ) مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا (یعنی نہ تو نکاح ہوا) اور نہ میں بدکار ہوں، فرشتہ نے کہا کہ (بس بغیر کسی بشر کے چھونے کے) یوں ہی (لڑکا) ہو جائے گا (اور میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ) تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات (کہ بغیر اسباب عادیہ کے بچہ پیدا کردوں) مجھ کو آسان ہے اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم بغیر

اسباب عادیہ کے) اس خاص طور پر اس لئے پیدا کریں گے تا کہ ہم اس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی (قدرت کی) بنادیں اور (نیز اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت پانے کے لئے) اس کو باعث رحمت بنادیں اور یہ (بے باپ کے اس بچہ کا پیدا ہونا) ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہو کر رہے گی) (مریم:۱۶-۲۱)

حضرت مریم علیہا السلام کی یکسوئی

حضرت مریم علیہا السلام گھر کے اندر مشرقی جانب کے کسی گوشہ میں چلی گئیں۔ ان کا گوشہ میں جانا کس غرض کے لئے تھا اس میں احتمالات اور اقوال مختلف ہیں بعض نے کہا کہ غسل کرنے کے لئے اس گوشہ میں گئی تھیں۔ بعض نے کہا کہ حسب عادت عبادت الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے محراب کی شرقی جانب کے کسی گوشہ کو اختیار کیا تھا۔ قرطبی نے اسی دوسرے احتمال کو احسن قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نصاریٰ نے جو جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنایا اور اس جانب کی تعظیم کرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

روح سے کون مراد ہے

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا، روح سے مراد جمہور کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بشر کی شبیہ ان کے سامنے کردی۔ مگر پہلا قول راجح ہے بعد کے کلمات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا، فرشتہ کو اس کی اپنی اصلی صورت و ہیئت میں دیکھنا انسان کے لئے آسان نہیں، اس کی ہیبت غالب آجاتی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غار حراء میں اور بعد میں پیش آیا۔ اس مصلحت سے جبرئیل امین حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بشکل انسانی ظاہر ہوئے۔ جب حضرت مریم نے ایک انسان کو اپنے قریب دیکھا جو پردہ کے اندر آگیا تو خطرہ ہوا کہ اس کا ارادہ برا معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی پریشانی اور تسلی

قرآن کریم میں ہے کہ پھر (اس گفتگو کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے ان کے گریبان

میں پھونک ماردی جس سے) ان کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا، پھر (جب اپنے وقت پر حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے آثار محسوس ہوئے تو) اس حمل کو لئے ہوئے (اپنے گھر سے) کسی دور جگہ (جنگل پہاڑ میں) الگ چلی گئیں پھر (جب درد شروع ہوا تو) دردزہ کی وجہ سے کھجور کے درخت کی طرف آئیں (کہ اس کے سہارے بیٹھیں اٹھیں، اب حالت یہ تھی کہ نہ کوئی انیس نہ جلیس، درد سے بے چین، ایسے وقت جو سامان راحت وضرورت کا ہونا چاہئے وہ ندارد، ادھر بچہ ہونے پر بدنامی کا خیال، آخر گھبرا کر کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مرگئی ہوتی اور ایسی نیست و نابود ہوجاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی، پس (اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت) جبرئیل (علیہ السلام پہنچے اور ان کے احترام کی وجہ سے سامنے نہیں گئے بلکہ جس مقام پر حضرت مریم تھیں اس سے اسفل مقام میں آڑ میں آئے اور انہوں) نے ان کے (اس) پائیں (مکان) سے ان کو پکارا۔

(جس کو حضرت مریم نے پہچانا کہ یہ اسی فرشتہ کی آواز ہے جو اوّل ظاہر ہوا تھا) کہ تم (بے سروسامانی سے یا خوف بدنامی سے) مغموم مت ہو، (کیونکہ بے سروسامانی کا تو یہ انتظام ہوا ہے کہ) تمہارے رب نے تمہارے پائیں (مکان) میں ایک نہر پیدا کردی ہے (جس کے دیکھنے سے اور پانی پینے سے فرحت طبعی ہو نیز حسب روایت روح ان کو اس وقت پیاس بھی لگی تھی اور حسب مسئلہ طبیہ گرم چیزوں کا استعمال قبل وضع یا بعد وضع مسہل ولادت و دافع فضلات ومقوی طبیعت بھی ہے اور پانی میں اگر سخونت (گرمی) بھی ہو جیسا بعض چشموں میں مشاہد ہے تو اور زیادہ مزاج کے موافق ہوگا، و نیز کھجور کثیر الغذاء مولد خون، مسمن ومقوی گردہ کمر ومفاصل ہونے کی وجہ سے زچہ کے لئے سب غذاؤں اور دواؤں سے بہتر ہے اور حرارت کی وجہ سے جو اس کی مضرت کا احتمال ہے سو اوّل تو رطب میں حرارت کم ہے، دوسرے پانی سے اس کی اصلاح ہوسکتی ہے تیسرے مضرت کا ظہور جب ہوتا ہے کہ عضو میں ضعف ہو ورنہ کوئی چیز بھی کچھ نہ کچھ مضرت سے خالی نہیں ہوتی و نیز خرق عادت (کرامت) کا ظہور اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت ہونے کی وجہ سے موجب مسرت روحانی بھی

ہے) اور اس کھجور کے تنہ کو (پکڑ کر) اپنی طرف ہلاؤ اس سے تم پر تر و تازہ کھجوریں جھڑیں گی (کہ اس سے پھل کے کھانے میں لذت جسمانی اور بطور خرق عادت کے پھل کے آنے میں لذت روحانی مجتمع ہے) پھر (اس پھل کو) کھاؤ اور (وہ پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو (یعنی بچہ کے دیکھنے سے اور کھانے پینے سے اور علامت قبول عنداللہ ہونے سے خوش رہو) پھر (جب بدنامی کے احتمال کا موقع آئے یعنی کوئی آدمی اس قصہ پر مطلع ہو تو اس کا یہ انتظام ہوا ہے کہ) اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو بھی (آتا اور اعتراض کرتا) دیکھو تو (تم کچھ مت بولنا بلکہ اشارہ سے اس سے) کہہ دینا کہ میں نے تو اللہ کے واسطے (ایسے) روزہ کی منت مان رکھی ہے (جس میں بولنے کی بندش ہے) سو (اس وجہ سے) میں آج (دن بھر) کسی آدمی سے نہیں بولوں گی (اور خدا کے ذکر اور دعا میں مشغول ہونا اور بات ہے بس تم اتنا جواب دے کر بے فکر ہو جانا، اللہ تعالیٰ اس مولود مسعود کو خرق عادت کے طور پر بولتا کر دے گا جس سے ظہور اعجاز دلیل نزاہت و عصمت ہو جائے گی غرض ہر غم کا علاج ہو گیا۔) (مریم ۲۲-۲۶)

تمنائے موت کا حکم

یہ تمنائے موت اگر غم دنیا سے تھی تب تو غلبۂ حال کو اس کا عذر کہا جائے گا جس میں انسان من کل الوجوہ مکلف نہیں رہتا اور اگر غم دین سے تھا کہ لوگ بدنام کریں گے اور شاید مجھے اس پر صبر نہ ہو سکے تو بے صبری کی معصیت میں ابتلا ہوگا، موت سے اس معصیت کی حفاظت رہے گی تو ایسی تمنا ممنوع نہیں ہے، اور اگر شبہ ہو کہ حضرت مریم کو جو کہا گیا کہ تم کہہ دینا کہ میں نے نذر کی ہے سو انہوں نے نذر تو نہ کی تھی، جواب یہ ہے کہ اسی سے یہ حکم بھی مفہوم ہو گیا کہ تم نذر بھی کر لینا اور اسکو ظاہر کر دینا۔

سکوت کا روزہ شریعت اسلامیہ میں منسوخ ہو گیا

قبل از اسلام یہ بھی عبادت میں داخل تھا کہ بولنے کا روزہ رکھے، صبح سے رات تک کسی سے کلام نہ کرے۔ اسلام نے اس کو منسوخ کر کے یہ لازم کر دیا کہ صرف بُرے کلام گالی گلوچ،

جھوٹ، غیبت وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ عام گفتگو ترک کرنا اسلام میں کوئی عبادت نہیں رہی اس لئے اس کی نذر ماننا بھی جائز نہیں۔ لما رواہ ابوداؤد مرفوعا لیتم بعد احتلام ولا صمات یوم الی اللیل وحسنہ السیوطی والعزیزی، یعنی بچہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے مرنے سے یتیم نہیں کہلاتا، اس پر احکام یتیم کے جاری نہیں ہوتے اور صبح سے شام تک خاموش رہنا تو (اسلام میں) کوئی عبادت نہیں۔ اور دردزہ میں پانی اور کھجور کا استعمال طبا بھی مفید ہے اور اکل وشرب کا حکم بظاہر اباحت کے لئے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلاف عقل نہیں

اور حمل وتولد بلا توسط مرد کے خارق عادت (معجزہ) ہے اور خوارق میں کتنا ہی استبعاد ہو مضائقہ نہیں بلکہ وصف اعجاز کا اور زیادہ ظہور ہے لیکن اس میں اس وجہ سے زیادہ استبعاد بھی نہیں کہ حسب تصریح کتب طب عورت کی منی میں قوت منعقدہ کے ساتھ قوت عاقدہ بھی ہے اس لئے مرض رجا میں اعضا کی کچھ ناتمام صورت بھی بن جاتی ہے کما صرح بہ فی القانون، پس اگر یہی قوت عاقدہ اور بڑھ جائے تو زیادہ مستبعد نہیں ہے۔ (بیان القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجور کا درخت ہلانے کا حکم دیا حالانکہ اس کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ بغیر ان کے ہلانے کے خود ہی کھجوریں ان کی گود میں گر جاتیں مگر حکمت یہ ہے کہ اس میں تحصیل رزق کے لئے کوشش کرنے کا سبق ملتا ہے اور یہ بھی بتلانا ہے کہ رزق کے حاصل کرنے میں کوشش اور محنت کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ (روح المعانی)

کھانے پینے کا انتظام

اس موقع پر حق تعالیٰ نے ایک چھوٹی نہر اپنی قدرت سے بلاواسطہ جاری فرمادی یا جبرئیل کے ذریعہ چشمہ جاری کرادیا، دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حضرت مریم کی تسلی کے اسباب ذکر کرنے کے وقت تو پہلے پانی کا ذکر فرمایا پھر کھانے کی چیز کھجور کا، اور جب استعمال کا ذکر آیا تو ترتیب بدل کر پہلے کھانے کا حکم فرمایا پھر پانی پینے کا۔ کُلی واشربی، وجہ غالباً یہ ہے کہ انسان کی فطری عادت ہے کہ پانی کا اہتمام کھانے سے پہلے کرتا

ہے خصوصاً کوئی ایسی غذا جس کے بعد پیاس لگنا یقینی ہو اس کے کھانے سے پہلے پانی مہیا کرتا ہے مگر استعمال کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے غذا کھاتا ہے پھر پانی پیتا ہے۔ (روح المعانی)

قوم والوں کی باتیں اور بچہ کا کلام کرنا

قرآن کریم میں ہے کہ (غرض مریم علیہا السلام کی اس کلام سے تسلی ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے) پھر وہ ان کو گود میں لئے ہوئے (وہاں سے بستی کو چلیں اور) اپنی قوم کے پاس لائیں، لوگوں نے (جو دیکھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی یہ بچہ کیسا، بدگمان ہو کر کہا) اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا (یعنی نعوذ باللہ بدکاری کی، اور یوں تو بدکاری کوئی بھی کرے برا ہے لیکن تم سے ایسا فعل ہونا زیادہ غضب کی بات ہے کیونکہ) اے ہارون کی بہن! (تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا چنانچہ) تمہارے باپ کوئی برے آدمی نہ تھے (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) پھر ہارون جو تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں جن کا نام ان ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا ہے وہ کیسے کچھ نیک شخص ہیں، غرض جس کا خاندان کا خاندان پاک صاف ہو اس سے یہ حرکت ہونا کتنا بڑا غضب ہے) پس مریم (علیہا السلام) نے (یہ ساری تقریر سن کر کچھ جواب نہیں دیا بلکہ) بچہ کی طرف اشارہ کر دیا (کہ اس سے کہو جو کچھ کہنا ہو یہ جواب دے گا) وہ لوگ (سمجھے کہ یہ ہمارے ساتھ تمسخر کرتی ہیں) کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسے شخص سے کیونکر باتیں کریں جو ابھی گود میں بچہ ہی ہے (کیونکہ بات اس شخص سے کی جاتی ہے جو کہ وہ بھی بات چیت کرتا ہو، سو جب یہ بچہ ہے اور بات پر قادر نہیں، تو اس سے کیا بات کریں اتنے میں) وہ بچہ (خود ہی) بول اٹھا کہ میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں (نہ تو اللہ ہوں جیسا کہ جہلاء نصاریٰ سمجھیں گے اور نہ غیر مقبول ہوں جیسا یہود سمجھیں گے اور بندہ ہونے کے اور پھر خاص ہونے کے یہ آثار ہیں کہ) اس نے مجھ کو کتاب (یعنی انجیل) دی (یعنی گو آئندہ دے گا مگر بوجہ یقینی ہونے کے ایسا ہی ہے جیسا کہ دیدی) اور اس نے مجھ کو نبی بنایا (یعنی بنا دے گا) اور مجھ کو برکت والا بنایا (یعنی مجھ سے خلق کو دین کا نفع پہنچے گا) میں جہاں کہیں بھی ہوں (گا مجھ سے برکت پہنچے گی وہ نفع تبلیغ دین ہے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے انہوں نے تو نفع پہنچا ہی دیا) اور اسنے مجھ کو

نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں (دنیا میں) زندہ رہوں (اور ظاہر ہے کہ آسمان پر جانے کے بعد مکلف نہیں رہے اور یہ دلیل ہے بندہ ہونے کی جیسا کہ اور دلائل ہیں خصوصیت کے) اور مجھ کو میری والدہ کا خدمت گزار بنایا (اور چونکہ بے باپ پیدا ہوئے ہیں اس لئے والدہ کی تخصیص کی گئی) اور اس نے مجھ کو سرکش بدبخت نہیں بنایا (کہ ادائے حق خالق یا ادائے حق والدہ سے سرکشی کروں یا حقوق واعمال کے ترک سے بدبختی خرید لوں) اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا (کہ وہ زمانہ قرب قیامت کا بعد نزول من السماء کے ہوگا) اور جس روز میں (قیامت میں) زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا (اور اللہ کا سلام دلیل ہے خاص بندہ ہونے کی۔)

بچہ کو لے کر گھر واپسی

حضرت مریم کو جب غیبی بشارتوں کے ذریعہ اس کا اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بدنامی اور رسوائی سے بچادیں گے تو خود ہی اپنے نومولود بچے کو لے کر اپنے گھر واپس آ گئیں۔ پھر یہ واپسی پیدائش کے کتنے دن بعد ہوئی۔ ابن عساکر کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولادت سے چالیس روز بعد جب نفاس سے فارغ و طہارت ہو چکی اس وقت اپنے گھر والوں کے پاس آئیں۔ (روح المعانی)

حضرت مریم کو قوم والوں کا ہارون کی بہن کہنا

حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ساتھی تھے حضرت مریم کے زمانے سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے یہاں حضرت مریم کو ہارون کی بہن قرار دینا ظاہر ہے کہ اپنے اس ظاہری مفہوم کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا اسی لئے جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کے پاس بھیجا تو انہوں نے سوال کیا کہ تمہارے قرآن میں حضرت مریم کو اُخت ہارون کہا گیا ہے حالانکہ ہارون علیہ السلام ان سے بہت قرنوں پہلے گزر چکے ہیں حضرت مغیرہ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا جب واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ اہل ایمان کی عادت یہ ہے کہ تبرکاً انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے

نام رکھتے ہیں اور ان کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں۔ (رواہ احمد و مسلم والترمذی والنسائی) اس حدیث کے مطلب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت مریم کی نسبت حضرت ہارون کی طرف اس لئے کردی گئی کہ وہ ان کی نسل و اولاد میں سے ہیں اگرچہ زمانہ کتنا ہی بعید ہوگیا ہو جیسے عرب کی عادت ہے کہ قبیلہ تمیم کے آدمی کو اخا تمیم اور عرب کے آدمی کو اخا عرب بولتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں ہارون سے مراد ہارون نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق مراد نہیں بلکہ حضرت مریم کے اپنے بھائی کا نام ہارون تھا جو تبرکا حضرت ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا تھا اس طرح مریم کو اخت ہارون کہنا اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے درست ہوگیا۔

حضرت عیسیٰ کا قوم والوں کو جواب

ایک روایت میں ہے کہ جس وقت خاندان کے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو ملامت کرنا شروع کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے۔ جب انہوں نے ان لوگوں کی ملامت کو سنا تو دودھ چھوڑ دیا اور اپنی بائیں کروٹ پر سہارا لے کر ان کی طرف متوجہ ہوئے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے انی عبداللہ یعنی میں اللہ کا بندہ ہوں، اس پہلے ہی لفظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس غلط فہمی کا ازالہ کردیا کہ اگرچہ میری پیدائش معجزانہ انداز سے ہوئی ہے مگر میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں تاکہ لوگ میری پرستش میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی شیرخوارگی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت اور کتاب ملنے کی خبر دی۔ حالانکہ کسی پیغمبر کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبوت و کتاب نہیں ملتی۔ اس لئے مفہوم اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرمادیا ہے کہ مجھے اپنے وقت پر نبوت اور کتاب دیں گے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نبوت اس وقت عطا کردی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اس کے سوا نہیں کہ عطاء نبوت کا وعدہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے قطعی اور یقینی تھا یہاں بھی اسی یقین کو عطا نبوت کے لفظ ماضی

سے تعبیر کردیا گیا ہے۔ عطاء نبوت کا اظہار کرنے سے ان لوگوں کی بدگمانی رفع کردی گئی کہ میری والدہ پر بدکاری کا الزام لگانا سراسر غلط ہے کیونکہ میرا نبی ہونا اور مجھے رسالت کا ملنا اس کی دلیل ہے کہ میری پیدائش میں کسی گناہ کا دخل نہیں ہوسکتا۔

کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اس کو وصیت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی اس کا مفہوم یہی ہے کہ بڑی تاکید سے ان دونوں چیزوں کا مجھے حکم دیا۔

نماز اور زکوٰۃ، ایسی عبادتیں ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی ورسول کی شریعت میں فرض رہی ہیں البتہ مختلف شریعتوں میں ان کی تفصیلات اور جزئیات مختلف رہی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز اور زکوٰۃ فرض تھے۔ رہا یہ معاملہ کہ عیسیٰ علیہ السلام تو کبھی مالدار ہی نہیں ہوئے، نہ گھر بنایا نہ کچھ جمع کیا پھر زکوٰۃ کا ان کو حکم دینا کس بناء پر ہے؟ تو اس کا مقصد واضح یہ ہے کہ ان کی شریعت میں قانون یہ بنادیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس مال ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہے عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کے مخاطب ہیں کہ جب کبھی مال بقدر نصاب جمع ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کریں پھر اگر عمر بھر میں کبھی مال جمع ہی نہ ہو تو یہ اس کے منافی نہیں۔ (روح)

یعنی نماز اور زکوٰۃ کا حکم میرے لئے دائمی ہے جب تک زندہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ حیات ہے جو اس عالم دنیا میں زمین پر ہے کیونکہ یہ اعمال اسی زمین پر ہو سکتے ہیں اور یہیں سے متعلق ہیں آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد نزول کے زمانے تک رخصت کا زمانہ ہے۔

اس جگہ صرف والدہ کا ذکر کیا والدین کا نہیں۔ اس میں اشارہ کردیا کہ میرا وجود معجزانہ طور پر بغیر والد کے ہوا ہے اور بچپن کا یہ معجزانہ کلام اس کے لئے کافی شہادت اور دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فضائل، معجزات اور دعوت

قرآن کریم میں ہے (اور اے مریم اس مولود مسعود کی یہ فضیلتیں ہوں گی کہ) اللہ ان کو تعلیم فرمائیں گے، (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل

اوران کو (تمام) بنی اسرائیل کی طرف (پیغمبر بنا کر یہ مضمون دے کر) بھیجیں گے کہ انی قد جئتکم تامستقیم یعنی) میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے (یقین لانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسی پرندہ کی شکل ہوتی ہے پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور میں اچھا کردیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اور زندہ کردیتا ہوں مردوں کو خدا کے حکم سے (یہ دوسرا تیسرا معجزہ ہوا) اور میں تم کو بتلادیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کھا کر) آتے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ چوتھا معجزہ ہوا) بلاشبہ ان (معجزات مذکورہ) میں (میرے نبی ہونے کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو، اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے (نازل ہوئی) تھی یعنی توراۃ کی اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعضی ایسی چیزیں حلال کردوں جو (شریعت موسیٰ علیہ السلام میں) تم پر حرام کردی گئی تھیں (سو ان کی حرمت میری شریعت میں منسوخ ہوگی) اور (میرا یہ دعویٰ نسخ بلادلیل نہیں ہے بلکہ میں ثابت کرچکا ہوں کہ) میں تمہارے پاس (نبوت کی) دلیل لے کر آیا ہوں (اور صاحب نبوت کا قول دعویٰ نسخ میں حجت ہے) حاصل یہ کہ (جب میرا نبی ہونا دلائل سے ثابت ہوچکا تو میری تعلیم کے موافق) تم لوگ اللہ تعالیٰ (کی مخالفت حکم) سے ڈرو اور (دین کے باب میں) میرا کہنا مانو (اور خلاصہ میری دینی تعلیم کا یہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں (یہ تو حاصل ہے تکمیل عقیدہ کا) سو تم لوگ اس (رب) کی عبادت کرو (یہ حاصل ہوا تکمیل عمل کا) بس یہ ہے راہ راست (دین کی جس میں عقائد واعمال دونوں کی تکمیل ہو اسی سے نجات ووصول الی اللہ میسر ہوتا ہے) (آل عمران: ۴۸-۵۳)

پرندہ کی شکل بنانا تصویر تھا جو اس شریعت میں جائز تھا، ہماری شریعت میں اس کا جواز منسوخ ہوگیا۔

روح اقدس کی تائید

سورۂ بقرہ میں ہے کہ اور ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سوا لگ جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا، (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

قرآن وحدیث میں جابجا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے جیسے قرآن کی اس آیت نمبر ۸۷ میں، نیز قل نزله روح القدس (۱۶:۱۰۲) میں اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ شعر۔

وجبریل رسول الله فینا　وروح القدس لیس له کفاء

اور جبریل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی، اوّل، تو ولادت کے وقت مس شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دم کرنے سے حمل عیسوی قرار پایا، پھر یہود چونکہ کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے، اس لئے جبرئیل علیہ السلام حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں ان کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھوا لئے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی، اور حضرت زکریا وحضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی دعوت اور معجزات ظاہر فرمائے، مگر بنی اسرائیل آپؑ کی نبوت کے منکر رہے) سو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے انکار دیکھا (اور انکار کے ساتھ درپے ایذا بھی، اور اتفاقاً کچھ لوگ ان کو ایسے ملے جو حوارین کہلاتے تھے) تو (ان حوارین سے) آپ نے فرمایا کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو (دین حق میں بمقابلہ مخالفین و منکرین کے) میرے مددگار ہو جائیں اللہ کے واسطے (جس سے دعوت دین میں مجھے کوئی ایذا نہ پہنچائے) حوارین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے (دین کے) ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب دعوت آپ کے) ایمان لائے اور آپ اس (بات) کے گواہ رہئے کہ ہم (اللہ تعالیٰ کے اور آپ کے) فرمانبردار ہیں (پھر زیادت اہتمام و توثیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ) اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ان چیزوں (یعنی ان احکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اختیار کی ہم نے (ان) رسول کی سو (ہمارا ایمان قبول فرما کر) ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو (مضامین مذکورہ کی) تصدیق کرتے ہیں (یعنی مومنین کاملین کے زمرہ میں ہمارا بھی شمار فرمائیے۔)

حواری کا معنیٰ

لفظ حواری، حور سے ماخوذ ہے جس کے معنے لغت میں سفیدی کے ہیں، اصطلاح میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں کو ان کے اخلاص اور صفائی قلب کی وجہ سے یا ان کی سفید پوشاک کی وجہ سے حواری کا لقب دیا گیا ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو صحابی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے حوارین کی تعداد بارہ بتلائی ہے، اور کبھی لفظ حواری مطلقاً مددگار

کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے، اسی معنی سے ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ہر نبی کا کوئی حواری یعنی مخلص ساتھی ہوتا ہے، میرے حواری زبیر ہیں (تفسیر قرطبی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حواریوں کے مطالبات

قرآن کریم میں ہے کہ اور جبکہ میں نے حوارین کو (انجیل میں تمہاری زبانی) حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لاؤ انہوں نے (جواب میں تم سے) کہا کہ ہم (خدا اور رسول یعنی آپ پر) ایمان لائے اور آپ شاہد رہئے کہ ہم (خدا کے اور آپؑ کے) پورے فرمانبردار ہیں، وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ حوارین نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں (یعنی کوئی امر مثل خلاف حکمت ہونے وغیرہ کے اس سے مانع تو نہیں) کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا (پکا پکایا) نازل فرمادیں آپ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (مطلب یہ کہ تم تو ایمان دار ہو اس لئے خدا سے ڈرو اور معجزات کی فرمائش سے کہ بے ضرورت ہونے کی وجہ سے خلاف ادب ہے بچو) وہ بولے کہ (ہمارا مقصود بے ضرورت فرمائش کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک مصلحت سے اس کی درخواست کرتے ہیں وہ یہ کہ) ہم (ایک تو) یہ چاہتے ہیں کہ (برکت حاصل کرنے کو) اس میں سے کھائیں اور (دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہمارے دلوں کو (ایمان پر) پورا اطمینان ہو جائے اور (مطلب اطمینان کا یہ ہے کہ) ہمارا یہ یقین اور بڑھ جائے کہ آپ نے (دعویٰ رسالت میں) ہم سے سچ بولا ہے (کیونکہ جس قدر دلائل بڑھتے جاتے ہیں دعوے کا یقین بڑھتا جاتا ہے) اور (تیسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہم (ان لوگوں کے سامنے جنہوں نے یہ معجزہ نہیں دیکھا) گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں (کہ ہم نے ایسا معجزہ دیکھا ہے تا کہ ان کے سامنے اثبات رسالت کر سکیں، اور ان کی ہدایت کا یہ ذریعہ بن جائے) عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) نے (جب دیکھا کہ اس درخواست میں ان کی غرض صحیح ہے تو حق تعالیٰ سے) دعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے کہ وہ (مائدہ) ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اوّل (یعنی موجودہ زمانہ میں) ہیں اور جو بعد (کے زمانہ میں آنیوالے) ہیں، سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے (حاضرین کی خوشی تو کھانے سے اور درخواست قبول ہونے سے اور

بعد والوں کی خوشی اپنے سلف پر انعام ہونے سے، اور یہ غایت تو خاص ہے مؤمنین کے ساتھ) اور (میری پیغمبری پر) آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے، (کہ مؤمنین کا یقین بڑھ جائے اور منکرین حاضرین یا غائبین پر حجت ہو جائے اور یہ مقصد مؤمنین وغیرہ سب کے لئے عام ہے) اور آپ ہم کو (وہ مائدہ) عطا فرمائیے، اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ سب کا دینا اپنے نفع کے لئے اور آپ کا دینا مخلوق کے نفع کے لئے ہے، اس لئے ہم اپنے منافع کو پیش کر کے آپ سے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں) حق تعالیٰ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا کہ (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) میں وہ کھانا (آسمان سے) تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد (اس کی) ناحق شناسی کرے گا (یعنی اس کے حقوق واجبہ عقلاً و نقلاً ادا نہ کرے گا) تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا (اس وقت کے) جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔ (المائدہ:١١١-١١٥)

مؤمن کو معجزات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے

جب حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمان سے مائدہ کے اترنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم ایمان دار ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دار بندہ کو لائق نہیں کہ وہ اس قسم کی فرمائشیں کر کے خدا کو آزمائے، اور اس سے خرق عادت کی چیزوں کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کو چاہئے کہ روزی وغیرہ کو انہی ذرائع سے طلب کرے جو قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں۔

جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو تو ناشکری کا وبال بھی بڑا ہوتا ہے

ارشاد الٰہی ہے فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اسکی شکر گزاری کی تاکید بھی معمولی سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے، اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔

آسمان سے دسترخوان کا اترنا

مائدہ آسمان سے نازل ہوا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین حضرات کا اختلاف

ہے، جمہور نزول کے قائل ہیں، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے (یعنی بعض نے) خیانت کی، اور اگلے دن کے لئے اٹھا کر رکھا، پس بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے (نعوذ باللہ من غضب اللہ)

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے کھاتے بھی تھے، جیسا ناکل میں ان کی یہ غرض بھی مذکور ہے، البتہ آگے کے لئے رکھ لینا ممنوع تھا۔ (بیان القرآن)

نزول عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دلیل بڑی عمر میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام معجزہ ہی ہے

مذکورہ آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک صفت یہ بتلائی ہے کہ وہ بچپن کے گہوارے میں جب کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس حالت میں بھی کلام کریں گے، جیسا دوسری آیت میں مذکور ہے کہ جب لوگوں نے ابتدائی ولادت کے بعد حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت کی بناء پر لعن طعن کیا تو یہ نومولود بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول اٹھے، انی عبداللہ (۱۹: ۳۰) الخ اور اسکے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جب وہ کہل یعنی ادھیڑ عمر کے ہوں گے، اس وقت بھی لوگوں سے کلام کریں گے یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بچپن کی حالت میں کلام کرنا تو ایک معجزہ اور نشانی تھی اس کا ذکر تو اس جگہ کرنا مناسب ہے مگر ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام کرنا تو ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان مومن کافر، عالم، جاہل کیا ہی کرتا ہے، یہاں اس کو بطور وصف خاص ذکر کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں،

اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو بیان القرآن کے خلاصۂ تفسیر سے سمجھ میں آیا کہ مقصد اصل میں حالت بچپن ہی کے کلام کا بیان کرنا ہے، اس کے ساتھ بڑی عمر کے کلام کا ذکر اس غرض سے کیا گیا کہ ان کا بچپن کا کلام بھی ایسا نہیں ہوگا جیسے بچے ابتداء میں بولا کرتے ہیں بلکہ عاقلانہ، عالمانہ، فصیح وبلیغ کلام ہوگا، جیسے ادھیڑ عمر کے آدمی کیا کرتے ہیں، اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ اور اس کی پوری تاریخ پر غور کیا جائے تو اس جگہ ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کا تذکرہ ایک مستقل عظیم فائدہ کے لئے ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی

اور قرآنی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا ہے۔

روایات سے یہ ثابت ہے کہ ان کو اٹھانے کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تقریباً تیس پینتیس سال کے درمیان تھی جو عین عنفوان شباب کا زمانہ تھا، ادھیڑ عمر جس کو عربی میں کہل کہتے ہیں، وہ اس دنیا میں ان کی ہوئی ہی نہ تھی، اس لئے ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں، اس لئے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر کا کلام بھی معجزہ ہی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے پانچ وعدے

قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے ہیں۔

سب سے پہلا وعدہ یہ تھا کہ ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ نہیں ہوگی، طبعی طور سے وقت موعود پر ہوگی، اور وہ وقت موعود قرب قیامت میں آئے گا جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے جیسا کہ احادیث صحیحہ متواترہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، اور اس کا کچھ حصہ آگے آئے گا۔

دوسرا وعدہ: فی الحال عالم بالا کی طرف اٹھالینے کا تھا، یہ اسی وقت پورا کردیا گیا جس کے پورا کرنے کی خبر سورۂ نساء کی آیت میں اس طرح دے دی گئی، وما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ۔ (۴:۱۵۸) "یقیناً ان کو یہودیوں نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا۔"

تیسرا وعدہ: ان کو دشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، میں وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور یہود کے سب غلط الزامات کو صاف کردیا، مثلاً یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے نسب کو مطعون کرتے تھے، قرآن کریم نے اس الزام کو یہ فرما کر صاف کردیا کہ وہ محض اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے، بلا باپ کے پیدا ہوئے، اور یہ کوئی تعجب کی چیز نہیں، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اس سے زیادہ تعجب کی چیز ہے، کہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خدائی کے دعوے کا الزام لگاتے تھے، قرآن کریم کی بہت سی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس کے خلاف اپنی عبدیت اور بندگی اور بشریت کا اقرار نقل فرمایا۔

چوتھا وعدہ: وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ میں ہے کہ آپ کے متبعین کو آپ کے منکرین پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہاں اتباع سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد اور اقرار مراد ہے ان کے سب احکام پر ایمان و اعتقاد کی شرط نہیں، تو اس طرح نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں اس میں داخل ہو گئے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے معتقد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ صرف اتنا اعتقاد نجات و آخرت کے لئے کافی نہیں، بلکہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام احکام پر اعتقاد و ایمان رکھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں، نصاریٰ نے اس پر اعتقاد و ایمان اختیار نہ کیا، اس لئے نجات آخرت سے محروم رہے، مسلمانوں نے اس پر بھی عمل کیا، اس لئے نجات آخرت کے مستحق ہو گئے، لیکن دنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر موقوف تھا، وہ دنیا کا غلبہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو بمقابلہ یہود ہمیشہ حاصل رہا اور یقیناً قیامت تک رہے گا۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا اس وقت سے آج تک ہمیشہ مشاہدہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بمقابلۂ یہود ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمان غالب رہے، انہیں کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں اور رہیں۔

اسرائیل کی موجودہ حکومت سے اس پر کوئی شبہ نہیں ہوسکتا

کیونکہ اوّل تو اس حکومت کی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ وہ روس اور یورپ کے نصاریٰ کی مشترکہ چھاؤنی ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف قائم کر رکھی ہے، ایک دن کے لئے بھی اگر حکومت روس و امریکہ و دیگر ممالک یورپ اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹا لیں تو دنیا کے نقشہ

سے اس کا وجود مٹتا ہوا ساری دنیا مشاہدہ کر لے، اس لئے یہود یا اسرائیل کی یہ حکومت حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ایک مجاز تو ہو سکتا ہے اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، اور بالفرض اس کو ان کی اپنی ہی حکومت تسلیم کر لیا جائے تو بھی نصاریٰ اور اہل اسلام کے مجموعہ کے مقابلہ میں اس کے مغلوب و مقہور ہونے سے کونسا صحیح العقل انسان انکار کر سکتا ہے، اس سے بھی قطع نظر کرو تو قرب قیامت میں چند روزہ یہود کے غلبہ کی خبر تو خود اسلام کی متواتر روایات میں موجود ہے، اگر اس دنیا کو اب زیادہ باقی رہنا نہیں ہے اور قیامت قریب ہی آ چکی ہے تو اس کا ہونا بھی اسلامی روایات کے منافی نہیں، اور ایسی چند روزہ شورش کو سلطنت یا حکومت نہیں کہہ سکتے۔

پانچواں وعدہ: قیامت کے روز ان مذہبی اختلافات کا فیصلہ فرمانے کا تو وہ وعدہ بھی اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا، جیسا کہ آیت میں ارشاد ہے ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا

قرآن کریم میں ہے کہ اور ان لوگوں نے (جو کہ بنی اسرائیل میں سے آپ کے منکر نبوت تھے آپ کو ہلاک کرنے اور ایذا پہنچانے کے لئے) خفیہ تدبیر کی (چنانچہ مکر و حیلہ سے آپ کو گرفتار کر کے سولی دینے پر آمادہ ہوئے) اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی (جس کی حقیقت کا ان لوگوں کو بھی پتہ نہ لگا، کیونکہ انہیں مخالفین میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل پر بنا دیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا جس سے وہ محفوظ رہے، اور وہ ہمشکل سولی دیا گیا، ان لوگوں کو اس تدبیر کا علم تک بھی نہ ہو سکا اور دفع پر تو کیا قدرت ہوتی) اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں، (کیونکہ اوروں کی تدبیریں ضعیف ہوتی ہیں، اور کبھی قبیح اور بے موقع بھی ہوتی ہیں، اور حق تعالیٰ کی تدبیریں قوی بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ خیر محض اور موافق حکمت کے ہوتی ہیں، اور وہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جبکہ وہ گرفتاری کے وقت متردد اور پریشان ہوئے) فرمایا اے عیسیٰ (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تم کو (اپنے وقت موعود پر طبعی موت سے) وفات دینے والا ہوں (پس جب تمہارے لئے موت طبعی مقدر ہے تو ظاہر ہے کہ ان دشمنوں کے ہاتھوں دار پر جان دینے سے محفوظ رہو گے) اور (فی الحال) میں تم کو اپنے (عالم بالا کی) طرف اٹھائے لیتا ہوں، اور تم کو ان

لوگوں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں جو (تمہارے) منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں روز قیامت تک (گو اس وقت یہ منکرین غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں) پھر (جب قیامت آجائے گی اس وقت) میری طرف ہوگی، سب کی واپسی (دنیا و برزخ سے) سو میں (اس وقت) تمہارے (سب کے) درمیان (عملی) فیصلہ کردوں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے کہ (منجملہ ان امور کے مقدمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا)

واللہ خیر الماکرین کا معنی

اس آیت کے الفاظ و معانی میں بعض فرقوں نے تحریفات کا دروازہ کھولا ہے جو تمام امت کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور آخر زمانہ میں نزول کے منکر ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان الفاظ کی تشریح وضاحت کے ساتھ کردی جائے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ لفظ ''مکر'' عربی زبان میں لطیف و خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو تو اچھا ہے، اور برائی کے لئے ہو تو برا ہے، اسی لئے وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ (۳۵:۴۳) میں مکر کے ساتھ ''سیٔ'' کی قید لگائی، اردو زبان کے محاورات میں مکر صرف سازش اور بری تدبیر اور حیلہ کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے عربی محاورات پر شبہ نہ کیا جائے، اسی لئے یہاں خدا کو ''خیر الماکرین'' کہا گیا، مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کردیں، حتیٰ کہ بادشاہ کے کان بھردیئے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) ملحد ہے، تورات کو بدلنا چاہتا ہے، سب کو بددین بنا کر چھوڑے گا، اس نے مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دے دیا، ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر حق تعالیٰ کی لطیف و خفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی جس کا ذکر اگلی آیات میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

انی متوفیک کا معنی

لفظ ''متوفی'' کا مصدر ''توفی'' اور مادہ ''وفی'' ہے، اس کے اصل معنی عربی لغت کے اعتبار سے پورا پورا لینے کے ہیں، وفا، ایفا، استیفا اسی معنی کے لئے بولے جاتے ہیں، توفی کے بھی اصلی معنی پورا پورا لینے کے ہیں، تمام کتب لغت عربی زبان کی اس پر شاہد

ہیں، اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اجل مقدر پوری کر لیتا ہے، اور خدا کی دی ہوئی روح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لئے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے، اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۴۲:۳۹) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آتی ان کی نیند کے وقت۔"

حافظ ابن تیمیہؒ نے الجواب الصحیح ص ۸۳ ج ۲ میں فرمایا:

التوفی فی لغة العرب معناها القبض والاستيفاء وذلک ثلاثة انواع ، احدها التوفی فی النوم والثانی توفی الموت والثالث توفی الروح والبدن جمیعًا.

اور کلیات ابوالبقاء میں ہے: التوفی الاماتة وقبض الروح وعلیه استعمال العامة او الاستيفاء واخذ الحق وعلیه استعمال البلغاء.

اسی لئے آیت مذکورہ میں لفظ متوفیک کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ شیخ الہند رحمہ اللہ میں مذکور ہے، اس ترجمہ کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو یہودیوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے، بلکہ خود آپ کو لے لیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنی طرف آسمان پر چڑھا لیں گے۔

اور بعض حضرات نے اس کا ترجمہ موت دینے سے کیا ہے، جیسا کہ بیان القرآن کے خلاصہ میں اوپر مذکور ہے، اور یہی ترجمہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسانید صحیحہ کیساتھ منقول ہے، مگر اسکے ساتھ ہی یہ بھی منقول ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس وقت جبکہ یہودی آپکے قتل کے درپے تھے آپکی تسلی کیلئے دو لفظ ارشاد فرمائے، ایک یہ کہ آپکی موت ان کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت میں ہوگی، دوسرا یہ کہ اس وقت ان لوگوں کے نرغہ سے نجات دینے کی ہم یہ صورت کرینگے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھالیں گے، یہی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس طرح منقول ہے:

اخرج اسحٰق بن بشر وابن عساکر من طریق جوهر عن الضحاک عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ انی متوفیک ورافعک الی یعنی رافعک ثم متوفیک فی اخر الزمان. (درمنثور، ص ۳۶ ج ۲)

"اسحٰق بن بشر اور ابن عساکر نے بروایت جوہر عن الضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کی تفسیر میں یہ لفظ نقل کئے ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اٹھالوں گا، پھر آخر زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دوں گا۔"

اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ توفی کے معنی موت ہی کے ہیں، مگر الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے، رافعک کا پہلے اور متوفیک کا وقوع بعد میں ہوگا، اور اس موقع پر متوفیک کو مقدم ذکر کرنے کی حکمت و مصلحت اس پورے معاملے کی طرف اشارہ کرنا ہے جو آگے ہونے والا ہے، یعنی یہ اپنی طرف بلا لینا ہمیشہ کے لئے نہیں، چند روزہ ہوگا اور پھر آپ اس دنیا میں آئیں گے اور دشمنوں پر فتح پائیں گے، اور بعد میں طبعی طور پر آپ کی موت واقع ہوگی، اس طرح دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ ایک معجزہ بھی تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کی تکمیل بھی، نیز اس میں عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت کا ابطال بھی تھا، ورنہ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعہ سے ان کا یہ عقیدہ باطل اور پختہ ہو جاتا کہ وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرح حی و قیوم ہے، اس لئے پہلے متوفیک کا لفظ ارشاد فرما کر ان تمام خیالات کا ابطال کر دیا پھر اپنی طرف بلانے کا ذکر فرمایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انوکھی ہجرت

اور حقیقت یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی مخالفت و عداوت تو انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ ہی ہوتی چلی آئی ہے، اور عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ جب کسی نبی کی قوم اپنے انکار اور ضد پر جمی رہی پیغمبر کی بات نہ مانی، ان کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائی، تو دو صورتوں میں سے ایک صورت کی گئی ہے، یا تو اس قوم پر آسمانی عذاب بھیج کر سب کو فنا کر دیا گیا، جیسے عاد و ثمود اور قوم لوط علیہ السلام و قوم صالح علیہ السلام کے ساتھ معاملہ کیا گیا، یا پھر یہ صورت ہوتی

کہ اپنے پیغمبر کو اس دار الکفر سے ہجرت کرا کے کسی دوسری طرف منتقل کیا گیا اور وہاں ان کو وہ قوت و شوکت دی گئی کہ پھر اپنی قوم پر فتح پائی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کر کے شام میں پناہ لی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے علاقہ شام میں تشریف لائے اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے پھر وہاں سے حملہ آور ہو کر مکہ فتح کیا، یہودیوں کے نرغہ سے بچانے کے لئے یہ آسمان پر بلا لینا بھی درحقیقت ایک قسم کی ہجرت تھی، جس کے بعد وہ پھر دنیا میں واپس آ کر یہودیوں پر مکمل فتح حاصل کریں گے،

رہا یہ معاملہ کہ ان کی یہ ہجرت سب سے الگ آسمان کی طرف کیوں ہے؟ تو حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں خود فرما دیا ہے کہ ان کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش عام مخلوقات کے طریق پیدائش سے مختلف بغیر ماں باپ کے ہے اسی طرح ان کی پیدائش عام انسانوں کی پیدائش سے مختلف صورت سے ہوئی اور موت بھی عجیب و غریب طریقہ سے صدہا سال کے بعد دنیا میں آ کر عجیب ہوگی، تو اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی ہجرت بھی کسی ایسے عجیب طریقہ سے ہو۔

عیسائیوں کی گمراہی

یہی عجائب قدرت تو جاہل نصاریٰ کے لئے اس عقیدہ میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئے، کہ ان کو خدا کہنے لگے، حالانکہ انہی عجائب کے ہر قدم اور ہر چیز پر غور کیا جائے تو ہر ایک واقعہ میں ان کی عبدیت و بندگی اور تابع فرمان الٰہی ہونے اور بشری خصائص سے متصف ہونے کے دلائل ہیں، اور اسی لئے ہر ایسے موقع پر قرآن حکیم نے عقیدۂ الوہیت کے ابطال کی طرف اشارہ کر دیا ہے، آسمان پر اٹھانے سے یہ شبہ بہت قوی ہو جاتا ہے، اس لئے متوفیک کو پہلے بیان کر کے شبہ کا قلع قمع کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا اس تقدیم و تاخیر الفاظ کے ذریعہ اسی کے ساتھ نصاریٰ کی بھی تردید ہوگئی کہ وہ خدا نہیں جو موت سے بری ہوں، ایک

وقت آجائے گا جب ان کو بھی موت آئے گی۔

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ قرآن کریم میں اس طرح کی تقدیم و تاخیر اسی طرح کے مصالح کے ماتحت بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونے والے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا (تفسیر کبیر، ص ۴۸۱، ج ۲)

اپنی طرف اٹھانے کا مطلب

عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھالوں گا، اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ نام صرف روح کا نہیں بلکہ روح مع جسم کا ہے، تو رفع عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفع روحانی ہوا جسمانی نہیں اٹھایا گیا بالکل غلط ہے، رہا یہ کہ لفظ رفع کبھی بلندی مرتبہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۶:۱۶۶)، اور يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ (۵۸:۱۱) وغیرہ آیات میں مذکور ہے۔

تو یہ ظاہر ہے کہ لفظ رفع کو رفع درجہ کے معنی میں استعمال کرنا ایک مجاز ہے جو قرائن کی بنا پر مذکورہ آیات میں ہوا ہے، یہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی لینے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے علاوہ اس جگہ لفظ رفع کے ساتھ لفظ الیٰ استعمال فرما کر اس مجازی معنی کا احتمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اس آیت میں رافعک الی فرمایا، اور سورۂ نساء کی آیت میں بھی جہاں یہودیوں کے عقیدہ کا رد کیا گیا وہاں بھی یہی فرمایا وَمَا قَتَلُوْهُ يقينا. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۴:۱۵۸) یعنی یہودیوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا، اپنی طرف اٹھالینا روح مع جسد کے زندہ اٹھالینے ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کا آسمان پر اٹھایا جانا اور یہود کی تردید

قرآن کریم میں بھی یہود کی شرارتوں کا ذکر تھا، اور ان شرارتوں کی وجہ سے ان پر لعن طعن اور سزا کا بیان ہوا تھا، ان آیات میں بھی یہود کے بعض جرائم کی تفصیل مذکور ہے، اس کے ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے باطل خیال کی تردید کی گئی ہے، اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم و ستم سے بچا کر زندہ آسمان پر اٹھا لیا ہے، یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کر دیا ہے اور ان کو سولی دی ہے، یہ سراسر جھوٹا دعویٰ ہے، جس شخص کو انہوں نے قتل کیا تھا وہ عیسیٰ علیہ السلام نہیں تھے، بلکہ ان کے ہمشکل ایک دوسرا شخص تھا، جس کو قتل کر کے یہ لوگ یوں سمجھنے لگے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے کہ:

اور (ہم نے ان کو سزائے لعنت وغیرہ میں ان وجوہ سے بھی مبتلا کیا یعنی) ان کے (ایک خاص) کفر کی وجہ سے اور (تفصیل اس کی یہ ہے کہ) حضرت مریم علیہا السلام پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے (جس کی تکذیب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی لازم آتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ سے ان کی براءت ظاہر فرما چکے ہیں) اور (نیز بطور تفاخر کے) ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا (یہ کہنا خود دلیل ہے عداوت کی، اور عداوت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کفر ہے، نیز اس میں دعویٰ ہے قتل کا، اور قتل نبی بھی کفر ہے، اور دعویٰ کفر کا بھی کفر ہے) حالانکہ (علاوہ کفر ہونے کے خود ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کیونکہ) انہوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی (عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی

یہود کو) اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انہوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھالیا (اور ایک اور شخص کو ان کا ہمشکل بنا دیا اور وہ مصلوب و مقتول ہوا، اور یہی سبب ہوا یہود کے اشتباہ کا اور اس اشتباہ نے اہل کتاب میں اختلاف پیدا کیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست (یعنی قدرت والے) حکمت والے ہیں (کہ اپنی قدرت و حکمت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچالیا اور اٹھالیا، اور یہود کو بوجہ تشبیہ کے پتہ بھی نہ لگا) اور (یہود کو اپنا کذب و بطلان انکار نبوت عیسویہ میں بہت جلد دنیا ہی میں ظاہر ہو جائے گا، کیونکہ وقت نزول آیت سے لے کر کسی زمانہ میں) کوئی شخص اہل کتاب (یعنی یہود میں) سے (باقی) نہ رہے گا، مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوت) کی اپنے مرنے سے (ذرا) پہلے (جب کہ عالم برزخ نظر آنے لگتا ہے) ضرور تصدیق کر لے گا (گو اس وقت کی تصدیق نافع نہیں، مگر ظہور بطلان کے لئے تو کافی ہے تو اس سے اگر اب ہی ایمان لے آئیں تو نافع ہو جائے) اور (جب عالم دنیا اور عالم برزخ دونوں ختم ہو چکیں گے یعنی) قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ان (منکرین کے انکار) پر گواہی دیں گے۔

یہودیوں کی ناکامی

سورۂ آل عمران کی آیت یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ الآیہ (۳:۵۵) میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن یہود کے عزائم کو ناکام بنانے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی دستبرد سے بچانے کے سلسلہ میں پانچ وعدے فرمائے تھے جن کی تفصیل اور مکمل تشریح و تفسیر سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے، ان وعدوں میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ یہود کو آپ علیہ السلام کے قتل پر قدرت نہیں دی جائے گی، بلکہ آپؑ کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف اٹھالیں گے، اس آیت میں یہود کی شرارتوں اور جھوٹے دعوؤں کے

بیان میں اس وعدۂ الٰہیہ کی تکمیل اور یہود کے مغالطہ کا مفصل بیان اور یہود کے اس قول کی مکمل تردید ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا ہے۔

ان آیات میں واضح کیا گیا کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ یعنی ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا، بلکہ صورت حال یہ پیش آئی کہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کردیا گیا۔

یہود کو اشتباہ کس طرح پیش آیا؟

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قصہ یوں پیش آیا کہ جب یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تو آپ کے حواری ایک جگہ جمع ہوگئے، حضرت مسیح علیہ السلام بھی ان کے پاس تشریف لے آئے، ابلیس نے یہود کے اس دستہ کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کیلئے تیار کھڑا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ دیا، اور چار ہزار آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کرلیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حوارئین سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہے کہ باہر نکلے اور اس کو قتل کردیا جائے، اور پھر جنت میں میرے ساتھ ہو، ان میں سے ایک آدمی نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کردیا، آپ نے اس کو اپنا کُرتہ، عمامہ عطا کیا، پھر اس پر آپؑ کی مشابہت ڈال دی گئی، اور جب وہ باہر نکل آیا تو یہودا سے پکڑ کرلے گئے، اور سولی پر چڑھا دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا گیا (قرطبی)

بعض روایات میں ہے کہ یہودیوں نے ایک شخص طیطلانوس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے بھیجا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو مکان میں نہ ملے، اس لئے کہ انکو اللہ تعالیٰ نے اٹھالیا تھا اور یہ شخص جب گھر سے نکلا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہمشکل بنادیا گیا تھا، یہود یہ سمجھے کہ یہی عیسیٰ علیہ السلام ہے اور یہود نے اپنے ہی آدمی کو لے جاکر قتل کردیا۔ (مظہری)

ان میں سے جو بھی صورت حال پیش آئی ہو سب کی گنجائش ہے، قرآن کریم نے کسی خاص صورت کو متعین نہیں فرمایا، اس لئے حقیقت حال کا صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے، البتہ قرآن کریم کے اس جملے اور دوسری تفسیری روایات سے یہ قدر مشترک ضرور نکلتی ہے کہ

یہود و نصاریٰ کو زبردست مغالطہ ہو گیا تھا، حقیقی واقعہ ان سے پوشیدہ رہا، اور اپنے اپنے گمان و قیاس کے مطابق انہوں نے طرح طرح کے دعوے کیئے، اور ان کے آپس ہی میں اختلافات پیدا ہو گئے، اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا کہ ان کے پاس صحیح علم کی بنیاد پر کوئی یقینی بات نہیں ہے، جن جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کر کے طرح طرح کے دعوے کیئے ہیں یہ سب شک اور اٹکل کی باتیں ہیں، صحیح صورت واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو تنبہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے ہی آدمی کو قتل کر دیا ہے، اس لئے کہ یہ مقتول چہرے میں تو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مشابہ ہے، لیکن باقی جسم میں ان کی طرح نہیں، اور یہ کہ اگر یہ مقتول مسیح (علیہ السلام) ہیں تو ہمارا آدمی کہاں ہے اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیح (علیہ السلام) کہاں ہیں؟

موت سے پہلے یہود و نصاریٰ سب مان لیں گے

قرآن کریم میں ہے وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ یہ لوگ اس وقت اگر چہ بغض و حسد کی وجہ سے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باطل خیالات رکھتے ہیں، نیز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی انکار کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جبکہ ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اس وقت انہیں یقین ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہمارا خیال تھا وہ سب باطل تھا۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ یہود اپنی موت سے چند لمحے پیشتر جب عالم برزخ کو دیکھیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے اگر چہ اس وقت کا ایمان ان کے حق میں نافع نہیں ہوگا، جس طرح کہ فرعون کو اس کے اس ایمان نے فائدہ نہیں دیا

تھا جو وہ غرق ہونے کے وقت لایا تھا۔

دوسری تفسیر جس کو صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہ اللہ کی بڑی جماعت نے اختیار کیا ہے، اور حدیث صحیح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگرچہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے، یہود تو انہیں نبی ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ انہیں العیاذ باللہ مفتری اور کاذب قرار دیتے ہیں، اور نصاریٰ اگرچہ ان پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر بعض تو ان میں اپنی جہالت میں یہاں تک پہنچ گئے کہ یہود ہی کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول اور مصلوب ہونے کے قائل ہو گئے، اور بعض اعتقاد کے غلو میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ انہیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ لیا قرآن کریم کی اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر صحیح ایمان نہیں رکھتے، لیکن جب وہ قیامت کے قریب اس زمین پر پھر نازل ہوں گے تو یہ سب اہل کتاب ان پر صحیح ایمان لے آئیں گے، نصاریٰ تو سب کے سب صحیح اعتقاد کے ساتھ مسلمان ہو جائیں گے، یہود میں جو مخالفت کریں گے قتل کر دیئے جائیں گے، باقی مسلمان ہو جائیں گے، اس وقت کفر اپنی تمام قسموں کے ساتھ دنیا سے فنا کر دیا جائے گا، اور اس زمین پر صرف اسلام ہی کی حکمرانی ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے۔

عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال لینزلن ابن مریم حکمًا عدلاً فلیقتلن الدجال ولیقتلن الخنزیر ولیکسرن الصلیب وتکون السجدة واحدة لله رب العٰلمین.

ثم قال ابو هریرة واقرأوا ان شئتم وان من اهل الکتٰب الا لیؤمنن به قبل موته، قال ابوهریرة قبل موت عیسےٰ، یعید ها ثلاث مراتٍ. (قرطبی)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران بن کر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیر کو قتل کر دیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور اس وقت عبادت صرف پروردگار عالم کی ہوگی۔

اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت بھی پڑھ لو جس میں اسی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر یہ کہ وہ ان پر ان کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا، آپ نے فرمایا عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت سے پہلے، اور تین بار ان الفاظ کو دہرایا۔"

آیت مذکورہ کی یہ تفسیر ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہؓ سے بروایت صحیحہ ثابت ہے، جس نے آیت کا مفہوم واضح طور پر متعین کر دیا کہ یہ آیت قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے متعلق ہے۔

اس تفسیر کی بناء پر یہ آیت ناطق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور ان کے نزول سے اللہ جل شانہ کی جو حکمتیں وابستہ ہیں وہ حکمتیں پوری ہو جائیں گی، تب اس زمین پر ہی ان کی وفات ہوگی۔

ان روایات متواترہ کو ہمارے استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے جمع فرمایا جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے، حضرت استاذ کے حکم پر احقر نے اس مجموعے کو بزبان عربی مرتب کیا، حضرت رحمہ اللہ نے اس کا نام التصریح بما تواتر فی نزول المسیح تجویز فرمایا، جو اسی زمانے میں شائع ہو چکا تھا، حال میں حلب شام کے ایک بڑے عالم علامہ عبدالفتاح ابو غدہ نے مزید شرح و حواشی کا اضافہ کر کے بیروت میں اعلیٰ کتابت کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

الوہیت مسیح اور تثلیث کا عقیدہ رکھنا کفر ہے

قرآن کریم میں ہے کہ بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح بن مریم ہے (یعنی دونوں میں اتحاد ہے حالانکہ (حضرت) مسیح نے خود فرمایا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے (اور اس قول میں اپنے مربوب اور بندہ ہونے کی تصریح ہے، پھر ان کو الٰہ کہنا وہی بات ہے کہ مدعی سست گواہ چست) بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (خدائی میں یا خدائی خصوصیات میں) شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دے گا، اور اس کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (کہ دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچا سکے، اور جیسے عقیدۂ اتحاد کفر ہے اسی طرح عقیدۂ تثلیث بھی کفر ہے پس) بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین (معبودوں) میں کا ایک ہے، حالانکہ بجز ایک معبود (حق) کے اور کوئی معبود (حق) نہیں (نہ دو اور نہ تین، جب یہ عقیدہ بھی کفر و شرک ہے تو انه من یشرک الخ میں جو سزا مذکور ہے وہ اس پر بھی مرتب ہوگی) اور اگر یہ (دونوں عقیدہ کے) لوگ اپنے اقوال (کفریہ) سے باز نہ آئے تو (سمجھ رکھیں کہ) جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر (آخرت میں) دردناک عذاب واقع ہوگا کیا (ان مضامین توحید و وعید کو سن کر) پھر بھی (اپنے ان عقائد و اقوال سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ (جب کوئی توبہ کرتا ہے تو) بڑی مغفرت کرنے والے (اور) بڑی رحمت فرمانے والے ہیں (حضرت) مسیح ابن مریم (عین خدا یا جزو خدا) کچھ بھی نہیں صرف ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر (اہل معجزات) گزر چکے ہیں (جن کو عیسائی خدا نہیں مانتے، پس اگر پیغمبری یا خرق عادت دلیل الوہیت ہے تو سب کو الٰہ (خدا) ماننا چاہئے، اور اگر دلیل الوہیت نہیں ہے تو حضرت مسیح کو کیوں الٰہ کہا جائے، غرض

جب اوروں کو الٰہ نہیں کہتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مت کہو) اور (اسی طرح) ان کی والدہ (بھی الٰہ یا جز والٰہ نہیں بلکہ وہ) ایک ولی بی بی ہیں (جیسی اور بیبیاں بھی ولی ہو چکی ہیں، اور دونوں حضرات کے الٰہ نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک سہل دلیل یہ ہے کہ) دونوں (حضرات) کھانا کھایا کرتے تھے (اور جو شخص کھانا کھاتا ہے وہ اس کا محتاج ہوتا ہے اور کھانا کھانا خواص مادیات سے ہے، اور احتیاج اور مادیت خاصہ ممکن الوجود کا ہے، جس کا وجود ضروری نہ ہو، اور ممکن یعنی جس کا وجود ہی ضروری نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث

حضرت مسیح، روح القدس اور اللہ یا مسیح، مریم، اور اللہ تینوں خدا ہیں (العیاذ باللہ) ان میں کا ایک حصہ دار اللہ ہوا، پھر وہ تینوں ایک اور وہ ایک تین ہیں، عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہے، اور اس خلاف عقل و ہدایت عقیدہ کو گول مول اور پیچیدار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں، اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں۔ (فوائد عثمانی)

مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید

ارشاد الٰہی ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، یعنی جس طرح اور انبیاء دنیا میں آئے اور کچھ دن رہ کر چل بسے، ان کو دوام اور بقاء حاصل نہ تھا جو الوہیت کی شان ہے، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام (جو انہی کی طرح ایک انسان ہیں) کو دوام اور بقاء حاصل نہیں، لہٰذا وہ الٰہ نہیں ہو سکتے۔

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے، زمین، ہوا، پانی، سورج اور حیوانات سے اسے استغناء نہیں ہو سکتا، غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو بالواسطہ یا بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے، پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے، احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوہیت مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح و مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے، جو

مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے، اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے مستغنی نہیں ہوسکتا، پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی بقاء میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ خدا کیونکر بن سکتی ہے، یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں، یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے، اگرچہ نہ کھانا بھی کوئی الوہیت کی دلیل نہیں ورنہ سارے فرشتے خدا بن جائیں۔ (معاذ اللہ) (فوائد عثمانی)

عقیدۂ تثلیث وغیرہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیزاری

قرآن کریم میں ہے کہ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ (قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفار نصاریٰ کے سنانے کے لئے) فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ ابن مریم (ان لوگوں میں جن کا عقیدہ تثلیث کا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کو شریک الوہیت مانتے تھے تو) کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور میری ماں (حضرت مریم علیہ السلام) کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دے دو تو عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ) میں تو (خود اپنے عقیدہ میں) آپ کو (شریک سے) منزہ سمجھتا ہوں (جیسا کہ آپ واقع میں بھی منزہ (پاک) ہیں تو ایسی حالت میں) مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں (نہ باعتبار اپنے عقیدے کے کہ میں موحد یعنی ایک خدا کا قائل ہوں اور نہ باعتبار پیغام الٰہی پہنچانے کے کہ مجھ کو ایسا کوئی پیغام نہیں دیا گیا تھا، اور دلیل میری اس نہ کہنے کی یہ ہے کہ) اگر میں نے (واقع میں) کہا ہوگا تو آپ کو اس کا (یقیناً) علم ہوگا (مگر جب آپ کے علم میں بھی میں نے نہیں کہا تو واقع میں بھی نہیں کہا اور کہنے کی صورت میں آپ کو اس کا علم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ) آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں (تو جو زبان سے کہتا اس کا علم تو کیوں نہ ہوتا) اور میں (تو مثل دیگر مخلوقات کے اتنا عاجز ہوں کہ) آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو (بدوں آپ کے بتلائے ہوئے) نہیں جانتا (جیسے دیگر مخلوقات کا بھی یہی حال ہے پس) تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہی ہیں (سو جب اپنا اس قدر عجز اور آپ کا کمال مجھ کو معلوم ہے تو الوہیت میں

شرکت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، یہاں تک تو اس بات کے کہنے کی نفی ہوئی، آگے اس کی نقیض کے کہنے کا اثبات ہے کہ) میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا، صرف وہی (بات) جو آپ نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، اور (یہاں تک تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت کے متعلق عرض کیا، آگے ان لوگوں کی حالت کے متعلق عرض کرتے ہیں کیونکہ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ میں گو تصریحاً تو سوال اس کا ہے کہ آپ نے ایسا کلمہ کہا ہے یا نہیں لیکن اشارۃً اس کا بھی سوال معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث کہاں سے پیدا ہوا پس عیسیٰ علیہ السلام اس باب میں یوں عرض کریں گے کہ) میں ان (کی حالت) پر مطلع رہا جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت تک کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں) پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی اوّل بار میں تو زندہ آسمان کی طرف اور دوسری بار میں وفات کے طور پر) تو (اس وقت صرف آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب کیا ہوا اور کیونکر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں (یہاں تک تو اپنا اور ان کا معاملہ عرض کیا آگے ان کے اور حق تعالیٰ کے معاملات کے متعلق عرض کرتے ہیں کہ) اگر آپ ان کو (اس عقیدہ پر) سزا دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیونکہ) یہ آپ کے بندے ہیں، (اور آپ ان کے مالک، اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرائم پر سزا دے) اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ) آپ زبردست (قدرت والے) ہیں (تو معافی پر بھی قادر ہیں اور) حکمت والے (بھی) ہیں (تو آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی، اس لئے اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہو سکتی، مطلب یہ ہے کہ دونوں حال میں آپ مختار ہیں میں کچھ دخل نہیں دیتا)

(غرض عیسیٰ علیہ السلام نے معروض اوّل میں اپنی تبری ان اہل تثلیث کے عقیدے سے اور اس کی تعلیم سے، دوسری عرض میں اپنی تبری ان کے اس عقیدہ کے مفصل سبب جاننے تک سے، اور عرض سوم میں اپنی تبری ان کے باب میں کوئی تحریک کرنے تک سے ظاہر کر دی اور یہی مقصود تھا حق تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان مخاطبات سے، پس ان میں ان کفار کو پوری زجر اپنی نادانی پر اور حسرت اپنی ناکامی پر ہوگی)

اللہ تعالیٰ کے سوال کرنے کا مقصد

اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والے ہیں، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام سے سوال اس لئے نہیں فرما رہے کہ ان کو معلوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود ان کی قوم نصاریٰ کی ملامت اور سرزنش ہے کہ جس کو تم اللہ مان رہے ہو وہ خود تمہارے عقیدے کے خلاف اپنی عبدیت کا اقرار کر رہا ہے، اور تمہارے بہتان سے وہ بری ہے۔ (ابن کثیر)

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ اَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء وغیرہ کی بحث سورۂ آل عمران میں آیت اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ کے تحت گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور رفع الی السماء کے انکار پر استدلال صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ گفتگو قیامت کے روز ہوگی، اور اس وقت، آسمان سے نزول کے بعد آپ کو موت حقیقی حاصل ہو چکی ہوگی، چنانچہ ابن کثیر نے بروایت ابو موسیٰ اشعری ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں بلائی جائیں گی، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، اور ان کو نزدیک کر کے فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بیٹے مریم کے اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ یہاں تک کہ فرمائے گا يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِن دُونِ اللّٰهِ۔ عیسیٰ علیہ السلام انکار کریں گے کہ پروردگار میں نے نہیں کہا ہے، پھر نصاریٰ سے سوال ہوگا تو یہ لوگ کہیں گے کہ ہاں اس نے ہم کو یہی حکم دیا تھا۔ اس کے بعد ان کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔

مسئلہ حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام

یہودیوں کا عقیدہ

دنیا میں صرف یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہو کر دفن ہو گئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے، اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۂ نساء کی آیت میں واضح کر دی ہے، اور اس آیت میں بھی وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود انہی کی طرف لوٹا دیا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے مکان کے اندر گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص کی شکل و صورت تبدیل کر کے بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ڈھال دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا، آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط (۴:۱۵۷)

”نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا (کہ اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہو لئے)“

اس کی مزید تفصیل سورۂ نساء میں آئے گی۔

نصاریٰ کا عقیدہ

نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب تو ہو گئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے مذکورہ آیت نے ان کے اس غلط خیال کی بھی تردید کر دی، اور بتلا دیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے یہ دھوکہ عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اس لئے شبہ لھم کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہو گئے۔

اسلام کا عقیدہ

ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دوسری کئی

آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لئے آسمان پر زندہ اٹھالیا نہ ان کو قتل کیا جاسکا نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہوکر یہودیوں پر فتح پائیں گے، اورآخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔

اسی عقیدہ پر تمام امت مسلمہ کا اجماع واتفاق ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص الحبیر ص ۳۱۹ میں یہ اجماع نقل کیا ہے، قرآن مجید کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اوراس پر اجماع امت سے ثابت ہے، یہاں اس کی پوری تفصیل کا موقع بھی نہیں، اور ضرورت بھی نہیں، کیونکہ علماء امت نے اس مسئلہ کو مستقل کتابوں اور رسالوں میں پورا پورا واضح فرمادیا ہے، اور منکرین کے جوابات تفصیل سے دیئے ہیں، ان کا مطالعہ کافی ہے، مثلاً حضرت حجۃ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری کی تصنیف بزبان عربی عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنی کی تصنیف بزبان اردو حیات عیسیٰ علیہ السلام ،مولانا سید محمد ادریس صاحب کی تصنیف حیات مسیح علیہ السلام، اور بھی سینکڑوں چھوٹے بڑے رسائل اس مسئلہ پر مطبوع ومشتہر ہو چکے ہیں، احقر نے بامر استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ سو سے زائد احادیث جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ اٹھایا جانا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہونا بتواتر ثابت ہوتا ہے ایک مستقل کتاب التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں جمع کردیا ہے جس کو حال میں حواشی وشرح کے ساتھ حلب شام کے ایک بزرگ علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے بیروت میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۂ زخرف کی آیت وانه لعلم للساعة (۶۱:۴۳) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

وقد تواترت الاحادیث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه اخبر بنزول عیسیٰ علیه السلام قبل یوم القیامة اماماً عادلاً الخ.

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپؐ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبل قیامت نازل ہونے کی خبر دی ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور زندہ رہنے پھر قرب قیامت میں نازل ہونے کا عقیدہ قرآن کریم کی نصوص قطعیہ اور احادیث متواترہ سے ثابت

ہے جن کو علماء امت نے مستقل کتابوں رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے جن میں سے بعض کے نام اوپر درج ہیں مسئلہ کی مکمل تحقیق کے لئے تو انہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

قرآن وحدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصی تذکرہ

یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس پر نظر کرنے سے ذرا بھی عقل و انصاف ہو تو اس مسئلہ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کے چوتھے رکوع میں حق تعالیٰ نے انبیاء سابقین کا ذکر فرمایا تو حضرت آدم، نوح، آل ابراہیم، آل عمران سب کا ذکر ایک ہی آیت میں اجمالاً کرنے پر اکتفا فرمایا، اس کے بعد تقریباً تین رکوع اور بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خاندان کا ذکر اس بسط و تفصیل کے ساتھ کیا گیا کہ خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا ان کا ذکر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا ذکر، ان کی نذر کا بیان، والدہ کی پیدائش، ان کا نام، ان کی تربیت کا تفصیلی ذکر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطن مادر میں آنا، پھر ولادت کا مفصل حال، ولادت کے بعد ماں نے کیا کھایا پیا اس کا ذکر، اپنے خاندان میں بچے کو لے کر آنا، ان کے طعن و تشنیع، اول ولادت میں ان کو بطور معجزہ گویائی عطا ہونا، پھر جوان ہونا اور قوم کو دعوت دینا، ان کی مخالفت، حواریین کی امداد، یہودیوں کا نرغہ، ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا جانا وغیرہ، پھر احادیث متواترہ میں ان کی مزید صفات، شکل صورت، ہیئت، لباس وغیرہ کی پوری تفصیلات، یہ ایسے حالات ہیں کہ پورے قرآن وحدیث میں کسی نبی ورسول کے حالات اس تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے، یہ بات ہر انسان کو دعوت فکر دیتی ہے کہ ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا۔

ذرا بھی غور کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ورسول ہیں کوئی دوسرا نبی آپؐ کے بعد آنے والا نہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ قیامت تک جو جو مراحل امت کو پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ہدایات دے دیں، اس لئے آپؐ نے ایک طرف تو اسکا اہتمام فرمایا کہ آپؐ کے بعد قابل اتباع کون لوگ ہوں گے، ان کا تذکرہ اصولی طور پر عام اوصاف کے ساتھ بھی بیان فرمایا بہت سے حضرات کے نام متعین کر کے بھی امت کو ان کے اتباع کی تاکید فرمائی، اس کے بالمقابل ان گمراہ لوگوں کا بھی پتہ دیا جن سے امت کے دین کو خطرہ تھا۔

بعد کے آنے والے گمراہوں میں سب سے بڑا شخص مسیح دجال تھا، جس کا فتنہ سخت گمراہ کن تھا اس کے اتنے حالات وصفات بیان فرمادیئے کہ اس کے آنے کے وقت امت کو اس کے گمراہ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے، اسی طرح بعد کے آنے والے مصلحین اور قابل اقتدار بزرگوں میں سب سے زیادہ بڑے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جن کو حق تعالیٰ نے نبوت ورسالت سے نوازا، اور فتنۂ دجال میں امت مسلمہ کی امداد کے لئے ان کو آسمان میں زندہ رکھا، اور قرب قیامت میں ان کو قتل دجال کے لئے مامور فرمایا، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات وصفات بھی امت کو ایسے واشگاف بتلائے جائیں جن کے بعد نزول عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کسی انسان کو ان کے پہچاننے میں کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے۔

خصوصی اور مفصل تذکرہ کی حکمتیں

اس میں بہت سے حکم ومصالح ہیں، اوّل یہ کہ اگر امت کو ان کے پہچاننے ہی میں اشکال پیش آیا تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا امت مسلمہ ان کے ساتھ نہ لگے گی تو وہ امت کی امداد ونصرت کس طرح فرمائیں گے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر چہ اس وقت فرائض نبوت ورسالت پر مامور ہو کر دنیا میں نہ آئیں گے، بلکہ امت محمدیہ کی قیادت وامامت کے لئے بحیثیت خلیفۂ رسولؐ تشریف لائیں گے، مگر ذاتی طور پر جو ان کو منصب نبوت ورسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے، بلکہ اس وقت ان کی مثال اس گورنر کی سی ہوگی جو اپنے صوبہ کا گورنر ہے، مگر کسی ضرورت سے دوسرے صوبہ میں چلا گیا ہے، تو وہ اگر چہ صوبے میں گورنر کی حیثیت پر نہیں مگر اپنے عہدۂ گورنری سے معزول بھی نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت بھی صفت نبوت ورسالت سے الگ نہیں ہوں گے، اور جس طرح ان کی نبوت سے انکار پہلے کفر تھا اس وقت بھی کفر ہوگا تو امت مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوت پر قرآنی ارشادات کی بناء پر ایمان لائے ہوئے ہے اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہچانے تو انکار میں مبتلا ہو جائے گی، اس لئے ان کی علامات وصفات کو بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو دنیا کی آخری عمر میں پیش آئے گا، اگر ان کی علامات وحالات مبہم ہوتے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی دوسرا آدمی دعویٰ کر بیٹھے کہ میں مسیح عیسیٰ ابن

مریم ہوں، ان علامات کے ذریعہ اس کی تردید کی جا سکے گی، جیسا کہ ہندوستان میں مرزا قادیانی نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں، اور علماء امت نے انہیں علامات کی بناء پر اس کے قول کو رد کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ اور دوسرے مواقع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و صفات کا اتنی تفصیل کے ساتھ بیان ہونا خود ان کے قرب قیامت میں نازل ہونے اور دوبارہ دنیا میں تشریف لانے ہی کی خبر دے رہا ہے، احقر نے اس مضمون کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے رسالہ مسیح موعود کی پہچان میں بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباہلہ

قرآن کریم میں ہے کہ بیشک حالت عجیبہ (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک (یعنی ان کی تجویز ازلی میں) مشابہ حالت عجیبہ (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے ہے کہ ان (آدم علیہ السلام) کو (یعنی ان کے قالب کو) مٹی سے بنایا پھر ان (کے قالب) کو حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا، پس وہ (جاندار) ہو گئے، یہ امر واقعی (جو اوپر مذکور ہوا) آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیے، پس جو آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (واقعی) آئے پیچھے، تو آپ (جواب میں یوں) فرما دیجئے کہ (اچھا اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آ جاؤ ہم (اور تم) بلا (کر جمع کر) لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں، بیشک یہ (جو کچھ) مذکور (ہوا) وہی ہے سچی بات، اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے (یہ توحید ذاتی ہوئی) اور بلاشک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں (یہ توحید صفاتی ہوئی) پھر (ان سب حجتوں کے بعد بھی) اگر (حق قبول کرنے سے سرتابی کریں) تو (آپ ان کا معاملہ حوالہ بخدا کیجئے، کیونکہ) بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد کرنے والوں کو۔ (آل عمران ۵۹-۶۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم پر قیاس کرنا

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس بھی حجت شرعیہ سے ہے، اس لئے کہ اللہ

تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی، یعنی جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر باپ (اور ماں) کے پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے پیدا کیا، تو یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر قیاس کرنے کی طرف اشارہ فرمادیا۔ (مظہری)

مباہلہ کی تعریف

اگر کسی امر کے حق و باطل میں فریقین میں نزاع ہو جائے اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو تو پھر ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو اس امر میں باطل پر ہو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وبال اور ہلاکت پڑے، کیونکہ لعنت کے معنی رحمت حق سے بعید ہو جانا ہے، اور رحمت سے بعید ہونا قہر سے قریب ہونا ہے، پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر نازل ہو، سو جو شخص جھوٹا ہوگا وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا، اس وقت پوری تعیین صادق و کاذب کی منکرین کے نزدیک بھی واضح ہو جائے گی، اس طور پر دعا کرنے کو "مباہلہ" کہتے ہیں، اور اس میں اصل خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہو کر دعا کرنا ہے، اپنے اعزہ و اقارب کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر جمع کیا جائے تو اس سے اور اہتمام بڑھ جاتا ہے۔

واقعۂ مباہلہ اور ردِ روافض

اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کی جانب ایک فرمان بھیجا جس میں تین چیزیں ترتیب وار ذکر کی گئی تھیں (۱) اسلام قبول کرو (۲) یا جزیہ ادا کرو (۳) یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، نصاریٰ نے آپس میں مشورہ کر کے شرحبیل، عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن قیس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، ان لوگوں نے آ کر مذہبی امور پر بات چیت شروع کی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے میں ان لوگوں نے انتہائی بحث و تکرار سے کام لیا، اتنے میں یہ آیت مباہلہ نازل ہوئی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی، اور خود بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر مباہلہ کے لئے تیار ہو کر تشریف لائے، شرحبیل نے یہ دیکھ کر اپنے دونوں ساتھیوں

سے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کا نبی ہے، نبی سے مباہلہ کرنے میں ہماری ہلاکت ہے، بربادی یقینی ہے، اس لئے نجات کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو، ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک نجات کی کیا صورت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ نبی کی رائے کے موافق صلح کی جائے چنانچہ اسی پر سب کا اتفاق ہوگیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جزیہ مقرر کر کے صلح کر دی، جس کو انہوں نے بھی منظور کر لیا (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

اس آیت میں ابناء نا سے مراد صرف اولاد صلبی نہیں ہے، بلکہ عام مراد ہے، خواہ اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو، کیونکہ عرفاً ان سب پر اولاد کا اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا ابناء نا میں آپ کے نواسے حضرات حسنین رضی اللہ عنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں، خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابناء نا میں داخل کرنا اس لئے بھی صحیح ہے کہ آپؓ نے تو پرورش بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں پائی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا، اور آپؓ کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا، ایسے بچے پر عرفاً بیٹے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولاد میں داخل ہیں، لہٰذا روافض کا آپ کو ابناء نا سے خارج کر کے اور انفسنا میں داخل کر کے آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں

قرآن کریم میں ہے کہ (اور بلا شبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کا یقین کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہیں) اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلاف عادت بغیر باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب کے بھی لوگوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آسمان سے نازل ہونا قیامت کی علامت ہے۔ چنانچہ آپ کا آخری زمانے میں دوبارہ تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔

تورات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و بشارت

سورۂ صف میں ہے کہ اور (اسی طرح وہ وقت بھی قابل تذکرہ ہے) جبکہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے (ارشاد) فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو توارۃ (آ چکی) ہے میں اسکی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنیوالے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں (اور اس بشارت کا عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہونا خود اہل کتاب کے بیان سے حدیثوں میں ثابت ہے، چنانچہ خازن میں بروایۃ ابوداؤد نجاشی بادشاہِ حبشہ کا جو کہ نصاریٰ کے عالم بھی تھے، یہ قول آیا ہے کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اور خازن ہی میں ترمذی سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول جو کہ علماء یہود میں سے تھے آیا ہے کہ توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت لکھی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ مدفون ہونگے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام توراۃ کے مبلغ تھے، اس لئے توراۃ میں اس بشارت کا ہونا نیز عیسیٰ علیہ السلام سے منقول کہا جائیگا اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے اظہار الحق میں خود توراۃ کے موجودہ نسخوں سے متعدد بشارتیں نقل کی ہیں جلد دوم صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ قسطنطنیہ، اور ان مضامین کا انجیل موجودہ میں نہ ہونا اس لئے مضر نہیں کہ حسب تحقیق علماء محققین انجیل کے نسخے محفوظ نہیں رہے، مگر تاہم جو کچھ موجود ہیں ان میں بھی اس قسم کا مضمون موجود ہے، چنانچہ یوحنا کی انجیل مترجمہ عربی مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۳ء کے چودہویں باب میں ہے کہ "تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے، پس اگر میں جاؤں تو اسکو تمہارے پاس بھیج دوں گا" فارقلیط ترجمہ احمد کا ہے، اہل کتاب کی عادت ہے کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں احمد فرمایا تھا، جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو بیرکلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں احمد یعنی بہت سراہا گیا، بہت حمد کرنے والا، پھر جب یونانی سے

عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کو فارقلیط کردیا، اور بعض عبرانی نسخوں میں اب تک نام مبارک احمد موجود ہے، دیکھو پادری پارکہرست کی یہ عبارت دباد حمدہ غل ھکوتیم از حمایت الاسلام مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء ص ۴۸۱ ترجمہ اپالوجی گاؤفری ہینکنس مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء اور اس فارقلیط کی نسبت اس انجیل یوحنا میں یہ الفاظ ہیں: "وہ تمہیں سب چیزیں سکھادیگا" "اس جہان کا سردار آتا ہے" وہ آکر دنیا کو گناہ پر اور راستی اور عدالت (کے خلاف) پر سزا دیگا۔" یہ ہیں وہ الفاظ جو نبی مستقل ہونے پر دال ہیں، اور پوری بحث اس مقام کی تفسیر حقانی میں ہے، اسکا ایک شمہ نقل کیا گیا ہے، غرض عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا) پھر جب (یہ تمام مضامین ارشاد فرما کر اپنی نبوت کے اثبات کیلئے) وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ (ان دلائل یعنی معجزات کی نسبت) کہنے لگے کہ یہ صریح جادو ہے، (اور جادو بتا کر نبوت کی تکذیب کی، کما فی المائدة واذ کففت بنی اسرآئیل عنک اذ جئتهم بالبینٰت الخ اسی طرح بعد عیسیٰ علیہ السلام کے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ رسالت میں کفار موجودین نے آپ کی تکذیب کی اور مخالفت کی اور یہ ظلم عظیم ہے پس اس ظلم کا تعدیہ مٹانے کیلئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا۔

توراۃ کے تذکرہ کی حکمت

(یہاں پہلی کتابوں میں سے تورات کا خصوصیت سے ذکر غالباً اس لئے کیا کہ بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی قریبی کتاب وہی تھی ورنہ تصدیق انبیاء تو سب پچھلی کتابوں کو شامل اور عام ہے، نیز اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ شریعت عیسوی اگرچہ مستقل شریعت ہے مگر اس کے اکثر احکام شریعت موسوی اور تورات کے احکام ہی کے مطابق ہیں، صرف چند احکام ہیں جو بدلے گئے ہیں، یہ تو پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کا مضمون تھا، دوسری چیز یہ کہ بعد میں آنے والے رسول کی خوشخبری سنائی، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی ہدایات بھی اسی کے مطابق ہوں گی، اس لئے اس پر ایمان لانا عین تقاضائے عقل و دیانت ہے۔

ساتھ ہی جس آنے والے رسول کی خوشخبری عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو سنائی، اس کا نام پتہ بھی انجیل میں بتلا دیا گیا، اس میں بنی اسرائیل کو اس کی ہدایت ہے کہ جب وہ رسول تشریف لائیں، تو تمہارا فرض ہوگا کہ ان پر ایمان لاؤ، اور ان کی اطاعت کرو، بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ، میں اسی کا بیان ہے، اس میں آنے والے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد بتلایا گیا ہے، ہمارے نبی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد بھی تھا اور احمد بھی اور بھی متعدد نام تھے، مگر انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد صلی اللہ علیہ وسلم بتلانے میں شاید یہ مصلحت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نام رکھنے کا عرب میں قدیم سے دستور تھا، اس لئے اس نام کے دوسرے آدمی بھی عرب میں تھے، بخلاف احمد کے، یہ نام عرب میں معروف نہیں تھا، وہ آپ کی ذات ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔

انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت

یہ سب کو معلوم ہے اور خود یہود و نصاریٰ کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ تورات وانجیل میں تحریف ہوئی ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں تحریف اتنی ہوئی ہے کہ اصل کلام کا پہچاننا بھی آسان نہیں رہا، موجودہ تحریف شدہ انجیل کی بنا پر آج کل کے عیسائی قرآن کی اس خبر کو تسلیم نہیں کرتے کہ انجیل میں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد لے کر خوشخبری دی گئی ہو، اس کا مختصر جواب وہ کافی ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں آچکا ہے۔

اور مفصل جواب کے لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اظہار الحق کا مطالعہ کیا جائے جو مذہب عیسائیت کی حقیقت اور انجیل میں تحریفات اور باوجود تحریفات کے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں موجود ہونے کے متعلق بے نظیر کتاب ہے، خود بڑے عیسائیوں کے مقولے چھپے ہوئے ہیں کہ اگر ”دنیا میں یہ کتاب شائع ہوتی رہی تو عیسائیت کا کبھی فروغ نہیں ہوسکتا۔

یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی پھر ترکی، انگریزی میں اسکے ترجمے چھپے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مشن نے اس کتاب کو گم کر دینے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے، اس کا اردو ترجمہ اب تک نہیں ہوا تھا، حال میں اس کا اردو ترجمہ دار العلوم کراچی کے مدرس مولانا اکبر علی صاحب نے اور تحقیقات جدیدہ مفیدہ موجودہ زمانے کی مطبوعہ انجیلوں سے مولانا محمد تقی صاحب استاذ دار العلوم نے لکھی ہیں، جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس کی تیسری جلد میں صفحہ ۱۸۲ سے صفحہ ۳۶۲ تک انہی بشارتوں کی تفصیل موجودہ انجیل کے حوالہ سے اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

سیرت خاتم الانبیاء
صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

مقدمہ

امابعد: سرور کائنات، فخر موجودات، روح دو عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کی سیرت (سوانح عمری) پڑھنے پڑھانے کی ضرورت محتاج بیان نہیں یہی وجہ ہے کہ امت میں جب سے تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا آج تک ہر قرن ہر زمانہ کے علماء نے اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی زبانوں میں آپ کی سیرتیں لکھیں اور اس غیر منقطع سلسلہ میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی غیر محصور کتابیں زیر تصنیف آ چکی ہیں اور کتنی آنے والی ہیں۔

نہ من برآں گل عارض غزل سرایم وبس کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزاراں اند

مسلمانوں سے بڑھ کر سینکڑوں کی تعداد میں کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتیں لکھی ہیں۔ یورپین مؤرخین نے اس میں بڑا حصہ لیا جن میں بیس تیس تو ہمیں معلوم ہیں، لیکن ان لوگوں نے عام طور پر واقعات کے بیان میں شدید تعصب سے کام لیا ہے، اس لئے مسلمانوں کو ان کے مطالعہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔

الغرض بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں آج تک کسی انسان کی سیرت کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا۔ ایک یورپین سیرت نگار لکھتا ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے''۔ (از سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اردو زبان میں بھی قدیم وجدید بہت سی سیرتیں موجود ہیں جو اہل ہند کی طرف سے اس فریضہ کو ادا کر چکی ہیں، لیکن میری نگاہ عرصہ سے ایسی مختصر سیرت کو ڈھونڈھ رہی تھی جس کو ہر کاروباری مسلمان مرد وعورت دو تین مجلسوں میں ختم کر کے اپنا ایمان تازہ کر سکے اور اسوۂ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہنما بنا سکے اور جو اسلامی انجمنوں اور مدارس کے ابتدائی نصاب میں درج ہو سکے اور جس میں اختصار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا اجمالی نقشہ اپنے اصلی رنگ میں مکمل طور سے روایت میں احتیاط کو مدنظر رکھ کر پیش کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسا کوئی

رسالہ اردو زبان میں میری نگاہ سے نہ گزرا، اسی عرصہ میں بعض احباب شملہ نے اپنی اسلامی انجمن کے لئے ایسے رسالہ کی ضرورت محسوس کر کے احقر سے فرمائش کی تو باوجود اپنی کم علمی اور پھر اس کے ساتھ مشاغل تعلیم و تعلم کے اس خیال سے قلم اٹھایا کہ جس وقت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کے نام پیش ہوں، شاید کسی گوشہ میں اس سیہ کار کا نام بھی آ جائے۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست

اس لئے بنام خدا اس رسالہ کو شروع کیا اور امور ذیل کا التزام کرتے ہوئے سیرت کی معتبر کتابوں کا لب لباب اس میں پیش کر دیا۔

(۱) اس کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ رسالہ طویل نہ ہو جائے اور اسی وجہ سے ملک عرب کے جغرافیائی حالات اور عجم و عرب کی حالت قبل از اسلام وغیرہ جو سیرت کا جزو سمجھے جاتے ہیں اور ایک حد تک مفید بھی ہیں ان سے قطع نظر کر کے صرف ان حالات پر اکتفاء کرنا پڑا جو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق ہیں اور اسی اختصار کی وجہ سے اس کا نام "اوجز السیر لخیر البشر" بھی رکھا گیا۔

(۲) اختصار کے ساتھ اسکا بھی خیال رکھا گیا کہ جامعیت ہاتھ سے نہ جائے اور بحمد اللہ تقریباً تمام ضروری واقعات اس رسالہ میں لئے گئے ہیں۔

(۳) مسائل جہاد، تعداد ازدواج وغیرہ پر جو مخالفین کے اوہام ہیں ان کے بھی موٹے موٹے شافی جوابات درج کئے گئے ہیں۔

انتساب

مصنفین کا معمول ہے کہ اپنی تصنیفات کسی اپنے صاحب اقتدار مربی کی خدمت میں تحصیل برکت و اظہار عقیدت کے لئے بطور نذر پیش کرتے ہیں یہ ناکارہ خلائق اس تحفہ گدائی اور نوائے بے نوائی کو سید الاولین والآخرین فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ جلالت پناہ میں پیش کر کے عرض کرتا ہے۔

وَجِئنَا بِبِضَاعَةٍ مُزجَاةٍ فَاَوفِ لَنَا الكَيلَ وَتَصَدَّق عَلَينَا اِنَّ اللّٰهَ يَجزِى المُتَصَدِّقِينَ.

بضاعت نیاوردم الا امید

احوج الناس الی الشفیع الرفیع

محمد شفیع الدیوبندی غفرلہ ولوالدیہ (۱۳۴۳ ہجری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب مطہر تمام دنیا سے زیادہ شریف ﴿دلائل ابونعیم میں مرفوعاً روایت ہے جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں دنیا کے مشرق ومغرب میں پھرا مگر بنی ہاشم سے افضل کوئی خاندان نہیں دیکھا۔﴾ اور پاک ہے اور یہ وہ بات ہے کہ تمام کفار مکہ اور آپ کے دشمن بھی اس سے انکار نہ کر سکے۔ابوسفیان نے بحالت کفر شاہ روم کے سامنے اس کا اقرار کیا حالانکہ وہ اس وقت چاہتے تھے کہ اگر کوئی گنجائش ملے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عیب لگائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف والد ماجد کی طرف سے یہ ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ یہاں تک سلسلہ نسب اجماع امت سے ثابت ہے اور یہاں سے حضرت آدم علیہ السلام تک اختلاف ہے اس لئے اس کو ترک کیا جاتا ہے۔

اور والدہ ماجدہ کی طرف سے آپ کا نسب یہ ہے:

محمد بن آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب۔اس سے معلوم ہوا کہ کلاب بن مرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا نسب جمع ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت

اس بات پر جمہور کا اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ماہ ربیع الاول میں اس سال ہوئی جس میں اصحاب ﴿یمن کے بادشاہ نے ہاتھیوں کی فوج لے کر بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی ان لوگوں کو اصحاب فیل کہا جاتا ہے۔﴾ فیل نے بیت اللہ پر حملہ کیا اور خداوند عالم نے ان کو ابابیل یعنی چند حقیر جانوروں کی ٹکڑیوں کے ذریعہ شکست دی

جس کا اجمالی واقعہ قرآن عزیز میں بھی موجود ہے اور درحقیقت واقعہ فیل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کی برکات کا مقدمہ تھا۔ جائے ولادت وہ مکان ہے جو بعد میں حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے ہاتھ آیا تھا ﴿دروس التاریخ اسلامی صفحہ۴ اللخیاط۱۲ منہ﴾ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ واقعہ فیل ۲۰، اپریل ۵۷۱ء میں ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ سو اکہتر سال بعد میں ہوئی۔

امام حدیث ﴿اس تفصیل سے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں لیکن ابن عساکر نے اس کو صحیح فرمایا ہے (صفحہ نمبر ۲۱ جلد ۱﴾ ابن عساکر نے دنیا کی مجمل تاریخ اس طرح لکھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار دو سو برس کا فاصلہ ہوا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام سے ابراہیم علیہ السلام تک ایک ہزار ایک سو بیالیس سال کا اور ابراہیم علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک پانچ سو پینسٹھ برس کا اور موسیٰ علیہ السلام سے داؤد علیہ السلام تک پانچ سو بہتر اور داؤد علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک ایک ہزار تین سو چھپن اور عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چھ سو برس کا فاصلہ گزرا ہے۔ اس حساب سے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک پانچ ہزار بیس سال ہوئے اور حضرت آدم علیہ السلام کی عمر مشہور قول کے مطابق چالیس سال کم ایک ہزار سال ہوئی ہے اس لئے آدم علیہ السلام۔ کے دنیا میں تشریف لانے سے تقریباً چھ ہزار سال بعد یعنی ساتویں ہزار سال میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہوئے۔

(تاریخ ابن عساکر محمد بن اسحاق صفحہ ۱۹۔۲۰ جلد ۱)

الغرض جس سال اصحاب فیل کا حملہ ہوا اس کے ماہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ ﴿اس پر اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت ماہ ربیع الاول میں دوشنبہ کے دن ہوئی لیکن تاریخ کی تعیین میں چار اقوال مشہور ہیں، دوسری، آٹھویں، دسویں، بارہویں، حافظ مغلطائی نے دوسری تاریخ کو اختیار فرما کر دوسرے اقوال کو مرجوح قرار دیا ہے مگر مشہور قول بارہویں تاریخ کا ہے یہاں تک کہ ابن البزار نے اس پر اجماع نقل کر دیا اور اسی کو کامل ابن اثیر میں

اختیار کیا گیا ہے اور محمود پاشا ملکی مصری نے جونویں تاریخ کو بذریعہ حسابات اختیار کیا ہے یہ جمہور کے خلاف بے سند قول ہے اور حسابات پر بوجہ اختلاف مطالع ایسا اعتماد نہیں ہو سکتا کہ جمہور کی مخالفت اس کی بناء پر کی جائے (کذا فی المواھب) روز دوشنبہ دنیا کی عمر میں ایک نرالا دن ہے کہ آج پیدائش عالم کا مقصد، لیل ونہار کے انقلاب کی اصلی غرض آدم اور اولاد آدم کا فخر، کشتی نوح کی حفاظت کا راز، ابراہیم کی دعا اور موسیٰ وعیسیٰ کی پیشگوئیوں کا مصداق یعنی ہمارے آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز عالم ہوتے ہیں۔ ادھر دنیا کے بت کدہ میں آفتاب نبوت کا ظہور ہوتا ہے ادھر ملک فارس کے کسریٰ کے محل میں زلزلہ آتا ہے جس سے اس کے چودہ کنگرے گر جاتے ہیں۔ بحیرہ ساوہ (ملک فارس کا ایک دریا) دفعۃً خشک ہو جاتا ہے۔ فارس کے آتش کدہ کی وہ آگ جو ایک ہزار سال سے کبھی نہ بجھی تھی خود بخود سرد ہو جاتی ہے۔ (سیرت مغلطائی صفحہ ۵)

اور یہ درحقیقت آتش پرستی اور ہر گمراہی کے خاتمہ کا اعلان اور فارس اور روم کی سلطنتوں کے زوال کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح احادیث میں ہے کہ ولادت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کے بطن سے ایک ایسا نور ظاہر ہوا کہ جس سے مشرق ومغرب روشن ہو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر جلوہ افروز ہوئے تو دونوں ہاتھوں پر سہارے دیئے ہوئے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاک کی مٹھی بھری اور آسمان کی طرف دیکھا۔ (مواھب لدنیہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کی وفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد عبداللہ کو ان کے والد عبدالمطلب نے حکم کیا کہ مدینہ طیبہ سے کھجوریں لائیں۔ عبداللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصورت حمل چھوڑ کر چلے گئے۔ اتفاقاً وہیں ان کی وفات

﴿ ایک روایت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا انتقال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد ہوا یہ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سات مہینے تھی۔ لیکن زادالمعاد

میں ابن قیم نے اس قول کو مرجوح قرار دیا ہے ۱۲۔ زاد المعاد صفحہ ۶ جلد ا۔ ﷺ ہو گئی اور والد کا سایہ پیدائش سے پہلے ہی سر سے اٹھ گیا۔ (سیرت مغلطائی صفحہ ۷)

زمانہ رضاعت اور زمانہ طفولیت

سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی والدہ ماجدہ نے اور چند روز کے بعد ابولہب کی کنیز ثوبیہ نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد یہ دولت خداداد حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نصیب ہوئی۔ (مغلطائی)

شرفاءِ عرب کی عام عادت تھی کہ بچوں کو دودھ پلانے کے لئے قرب و جوار کے دیہات میں بھیج دیتے تھے جس سے بچوں کی جسمائی صحت بھی اچھی ہو جاتی تھی اور وہ خالص عربی بھی سیکھ جاتے تھے اور اسی لئے گاؤں کی عورتیں اکثر شہروں میں شیر خوار بچے لینے کے لئے جایا کرتی تھیں۔

حضرت حلیمہ سعدیہ کا بیان ہے کہ میں (طائف) سے بنی سعد کی عورتوں کے ہمراہ دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مکہ کو چلی۔ اس سال قحط تھا میری گود میں ایک بچہ تھا (مگر فقر و فاقہ کی وجہ سے) اتنا دودھ نہ تھا جو اس کو کافی ہو سکے رات بھر وہ بھوک سے تڑپتا تھا اور ہم اس کی وجہ سے بیٹھ کر رات گذارتے تھے ایک اونٹنی بھی ہمارے پاس تھی مگر اس کے بھی دودھ نہ تھا۔ مکہ کے سفر میں جس دراز گوش پر سوار تھی وہ بھی اس قدر لاغر تھا کہ سب کے ساتھ نہ چل سکتا تھا ہمراہی بھی اس سے تنگ آ رہے تھے۔ بالآخر مشکل سے یہ سفر طے ہوا مکہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عورت دیکھتی تھی اور یہ سنتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یتیم ہیں تو کوئی قبول نہ کرتی کیونکہ زیادہ انعام واکرام کی توقع نہ تھی ادھر حلیمہ کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا ان کے دودھ کی کمی ان کے لئے رحمت بن گئی کیونکہ دودھ کم دیکھ کر کسی نے ان کو اپنا بچہ دینا گوارا نہ کیا۔

حلیمہ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ خالی ہاتھ

واپس ہوں۔ خالی سے بہتر ہے کہ اس یتیم کو لے چلوں شوہر نے منظور کیا اور یہ اس دریتیم کو لے آئیں جس سے آمنہ اور حلیمہ کے گھر نہیں بلکہ مشرق ومغرب میں اجالا ہونے والا تھا۔

خدا کا فضل تھا کہ حلیمہ کی قسمت جاگی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کی گود میں آ گئے فرودگاہ پر لاکر دودھ پلانے بیٹھی تو برکات کا ظہور شروع ہوگیا۔ اس قدر دودھ اترا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور آپ کے رضاعی بھائی نے بھی خود سیر ہو کر پیا اور آرام سے سو گئے۔ ادھر اونٹنی کو دیکھا تو اس کے تھن دودھ سے لبریز تھے میرے شوہر نے اس کا دودھ نکالا اور ہم سب نے سیر ہو کر پیا اور رات بھر آرام سے گذاری۔ مدتوں بعد یہ پہلی رات تھی کہ ہم اطمینان کے ساتھ نیند بھر کر سوئے۔

اب تو میرا شوہر بھی کہنے لگا کہ حلیمہ تم تو بڑا ہی مبارک بچہ لائی ہو میں نے کہا کہ مجھے بھی یہی توقع ہے کہ یہ نہایت مبارک لڑکا ہے اس کے بعد ہم مکہ سے روانہ ہوئے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گود میں لے کر اسی دراز گوش پر سوار ہوئی مگر اس مرتبہ خدا کی قدرت کا یہ تماشا دیکھتی ہوں کہ اب وہ اتنا تیز چلتا ہے کہ کسی کی سواری اس کی گرد کو نہیں پہنچتی، میری ہمراہی عورتیں تعجب سے کہنے لگیں کہ یہ وہی ہے جس پر تم آئی تھیں؟

الغرض راستہ قطع ہوا ہم گھر پہنچے وہاں سخت قحط پڑا ہوا تھا تمام دودھ کے جانور دودھ سے خالی تھے۔ لیکن میرا گھر میں داخل ہونا تھا اور میری بکریوں کا دودھ سے بھرنا، اب روز میری بکریاں دودھ سے بھری آتی ہیں اور کسی کو ایک قطرہ بھی نہیں ملتا۔ میری قوم کے لوگوں نے اپنے چرواہوں سے کہا کہ تم بھی اپنے جانور اسی جگہ چراؤ جہاں حلیمہ کی بکریاں چرتی ہیں مگر وہاں تو چراگاہ اور جنگل کی خصوصیت نہ تھی بلکہ کسی اور ہی لعل کی خاطر منظور تھی اس کو وہ لوگ کہاں سے لاتے۔ چنانچہ ایک ہی جگہ چرنے کے بعد بھی ان کے جانور دودھ سے خالی اور میری بکریاں بھری ہوئی آتی تھیں۔ اسی طرح ہم برابر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دو سال پورے ہوگئے۔ اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دودھ چھڑا دیا۔ (الصالحات)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کلام

حلیمہؓ کا بیان ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دودھ چھڑایا تو یہ کلمات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوئے اَللّٰہُ اَکْبَر کَبِیْرًا وَّالْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا وَّسُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلاً یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کلام تھا۔ (اخرجہ البیہقی عن عباس کذا فی الخصائص ص ۵۵ ج ۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نشوونما اور سب بچوں سے اچھا تھا کہ دو سال ہی میں اچھے بڑے معلوم ہونے لگے۔ اب ہم حسب قاعدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کے پاس لائے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا اتفاقاً اس سال مکہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔ ہم وبا کا بہانہ کر کے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ واپس لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس رہے باہر نکلتے اور لڑکوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے تھے مگر خود علیحدہ رہتے تھے۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ میرے دوسرے بھائی دن بھر نظر نہیں آتے وہ کہاں رہتے ہیں میں نے کہا کہ بکریاں چرانے جاتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ان کے ساتھ بھیجا ﴿بچپن کے زمانہ میں داعیہ مساوات قابل دید ہے کہ جب میرا بھائی کام کرتا ہے تو میں کیوں نہ کروں ۱۲ منہ۔﴾ کرو اور اس کے بعد اپنے رضاعی بھائی (عبداللہ) کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ (خصائص ج ۱) ایک مرتبہ دونوں مواشی میں پھر رہے تھے کہ عبداللہ دوڑتے اور ہانپتے ہوئے گھر پہنچے اور اپنے باپ سے کہا کہ میرے قریشی بھائی کو دو سفید کپڑے والے آدمیوں نے پکڑ کر لٹایا اور شکم چاک کر دیا میں ان کو اسی حال میں چھوڑ کر آیا ہوں ہم دونوں گھبرائے ہوئے جنگل کو دوڑے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہیں مگر رنگ (خوف سے) متغیر ہے میں نے پوچھا کہ بیٹا کیا بات ہے؟ فرمایا دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے اور پیٹ چاک کر کے اس میں سے کچھ ڈھونڈ کر نکالا معلوم نہیں کیا تھا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر ﴿سیرت ابن ہشام بحاشیہ زاد المعاد ۱۲ منہ۔﴾ لائے اسکے بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کاہن کے پاس لے گئی ﴿اسلام سے پہلے کچھ لوگ جنات و

شیاطین کے ذریعہ آسمانی خبریں اور چھپی ہوئی باتیں معلوم کر کے غیب دانی کے مدعی ہوتے تھے ان کو کاہن کہا جاتا تھا ۱۲۔) وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سینہ پر اٹھالیا، اور چلانا شروع کیا کہ اے آل عرب دوڑو جو بلا تم پر عنقریب پہنچنے والی تھی اس کو دفع کرو جس کی صورت یہ ہے کہ اس لڑکے کو قتل کردو اور اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو یاد رکھو کہ تمہارے دین کو مٹا دیگا اور ایسے مذہب کی طرف تمہیں دعوت دے گا جو تم نے اب تک کبھی نہیں سنا۔

حلیمہؓ یہ سن کر جھنجھلا اٹھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدبخت کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور کہا کہ تو دیوانہ ہو گیا ہے تجھے خود اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہئے۔ حلیمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گھر آ گئیں۔ لیکن اس دوسرے واقعہ نے ان کو اس پر آمادہ کر دیا کہ آپ کو آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کر دیں کیونکہ کماحقہ تحفظ نہ کر سکتی تھیں۔

(ماخوذ شواہد النبوۃ للمولانا الجامی وخصائص کبریٰ ص ۵۵)

جب مکہ پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ شریفہ کے سپرد کیا تو انہوں نے حلیمہ سے پوچھا کہ باوجود خواہش کر کے واپس لے جانے کے اس قدر جلد واپس لے آنے کی کیا وجہ ہے اصرار کے بعد حلیمہ کو تمام واقعہ عرض کر دینا پڑا۔ انہوں نے سن کر فرمایا بے شک میرے بیٹے کی ایک خاص نشانی ہے اور پھر ایام حمل اور وقت ولادت کے حیرانگیز واقعات سنائے۔ (ابن ہشام ص ۹)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی وفات

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف چار پانچ برس ہوئی تو مدینہ سے واپس ہوتے ہوئے بمقام ابواء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے بھی دنیا سے رحلت فرمائی۔ (مغلطائی ص ۱۰)

بچپن کا زمانہ چھ سال کی عمر ہے والد کا سایہ تو پہلے ہی اٹھ چکا ہے والدہ کی آغوش شفقت کا بھی خاتمہ ہوا، لیکن یہ یتیم جس آغوش رحمت میں پرورش پانے والا ہے وہ ان اسباب سے بے نیاز ہے۔

عبدالمطلب کی وفات

والدین کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دادا عبدالمطلب کے پاس رہے لیکن خدائے قدوس کو دکھلانا تھا کہ یہ نونہال محض آغوش رحمت میں پرورش پانے والا ہے، مسبب الاسباب اس کی تربیت کا خود کفیل ہو چکا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس دو مہینہ دس دن کی ہوئی تو عبدالمطلب بھی دنیا سے رحلت فرما گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر شام

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابو طالب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی ہوئے ان کے پاس رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف بارہ برس دو مہینہ کی ہوئی تو ابو طالب نے تجارت کے لئے ملک شام کے سفر کا ارادہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر شام کی طرف چلے، راستے میں مقام تیماء میں اقامت فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہود کے ایک بڑے عالم کی پیشین گوئی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام تیماء میں مقیم تھے کہ اتفاقاً یہود کے ایک بڑے عالم جن کو بحیرا راہب کہا جاتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ابو طالب سے خطاب کیا کہ یہ لڑکا جو آپ کے ساتھ ہے کون ہے، ابو طالب نے کہا کہ میرا بھتیجا ہے بحیرا نے کہا کیا آپ اس پر مہربان ہیں اور اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں، ابو طالب نے کہا بے شک، یہ سن کر بحیرا نے خدا کی قسم کھائی اور کہا اگر تم اس کو شام لے گئے تو اسکو یہود قتل کر ڈالیں گے کیونکہ یہ خدا کا نبی ہے جو یہود کے دین کو منسوخ کریگا، میں اس کی صفات اپنی آسمانی کتاب میں پاتا ہوں۔

(فائدہ) بحیرا راہب چونکہ تورات کا عالم تھا۔ اور تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حلیہ مرکوز تھا اس لئے اس نے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا کہ یہ وہی خاتم الانبیاء

ہیں جو تورات کو منسوخ اور احبار یہود کی حکومت کا خاتمہ کریں گے ابو طالب کو بحیرا کہنے سے خطرہ پیدا ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ واپس کر دیا۔ (مغلطائی ص ۱۰)

دوبارہ سفر شام بغرض تجارت

مکہ معظمہ میں خدیجہ رضی اللہ عنہا اس وقت ایک مالدار عورت تھیں اور ساتھ ہی نہایت عقلمند اور تجربہ کار، جن لوگوں کو ہوشیار اور معتبر سمجھتیں ان کو اپنا مال سپرد کر دیتیں کہ فلاں جگہ جا کر فروخت کر آؤ۔ اس قدر رقم کو بھی دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اگرچہ اس وقت تک ظہور نہ ہوا تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت و امانت کا تمام مکہ والوں میں بڑا شہرہ تھا اور ہر ایک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ اور پاک اخلاق کا اعتبار تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ شہرت اور بزرگی خدیجہ رضی اللہ عنہا پر پوشیدہ نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ اپنی تجارت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت داری سے نفع اٹھائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ اگر ہماری تجارت کا مال شام کو لے جائیں تو ہم اپنا ایک غلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے ہمراہ کر دیں اور دوسرے لوگوں کو نفع میں سے جو حصہ دیا جاتا ہے اس سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ چونکہ بلند ہمت اور وسیع الخیال ہستی واقع ہوئی تھی، فوراً اس بعید سفر کے لئے تیار ہو گئے اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ کو ساتھ لے کر ۱۶ ذی الحجہ کو شام کی طرف روانہ ہو گئے، وہاں اس مال کو نہایت عقلمندی سے بہت زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کر دیا اور شام سے دوسرا مال خرید کر واپس ہوئے۔ مکہ معظمہ میں لا کر خدیجہؓ کو مال سپرد کر دیا۔ اس کو خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہاں بیچا تو دو چند کے قریب نفع ہوا۔ شام کے راستہ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے ایک راہب نسطور نامی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور نبی آخر الزمان کی جو علامتیں پہلی کتابوں میں لکھی تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھ کر پہچان گیا، راہب میسرہ کو جانتا تھا اس سے پوچھا کہ تیرے ساتھ یہ کون شخص ہیں اس نے کہا کہ مکہ معظمہ کے رہنے والے ہیں۔ قریش

کے ایک شریف (نوجوان) ہیں اس نے کہا کہ یہ نبی ہونگے (از مغلطائی ص ۱۲، والصالحات)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک عقلمند فہمیدہ عورت تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت اور محیر العقول اخلاق کو دیکھ کر ان کو ایک سچا اعتقاد اور خالص انس ہو گیا۔ جس سے خدیجہؓ نے خود ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منظور فرما دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نکاح کر لیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس ﴿اس وقت عمر شریف کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ۲۵، ۲۹، ۳۰، ۲۷، سیرت مغلطائی ص ۱۲۔﴾ سال کی ہوئی تو حضرت خدیجہؓ سے نکاح مقرر ہوا۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر اس وقت چالیس اور بعض روایت کی رو سے پینتالیس سال تھی۔ (مغلطائی)

نکاح میں ابو طالب اور بنو ہاشم اور رؤساء مضر سب جمع ہوئے ابو طالب نے خطبہ پڑھا، اس خطبہ میں ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں وہ سننے کے قابل ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے۔ ''یہ محمد بن عبداللہ ہیں جو اگرچہ مال میں کم ہیں لیکن شریفانہ اخلاق اور کمالات کی وجہ سے جس شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں رکھا جائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ عالی مرتبہ نکلیں گے کیونکہ مال ایک زائل ہو جانے والا سایہ اور لوٹنے والی چیز ہے اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کی قرابت کو تم سب جانتے ہو، خدیجہ بنت خویلد سے نکاح کرنا چاہتے ہیں اور ان کا کل مہر معجل اور مؤجل میرے مال سے ہے اور خدا کی قسم اس کے بعد اس کی بڑی عزت اور عظمت ہونے والی ہے۔''

ابو طالب کے یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس وقت ہیں جب کہ اکیس سال کی عمر میں ہیں اور ابھی ظاہری طور سے نبوت بھی عطا نہیں ہوئی پھر اس پر یہ طرہ کہ ابو طالب اپنے اسی قدیم مذہب پر ہیں جس کو مٹانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی وقف ہے مگر بات یہ ہے کہ حق بات چھپائی نہیں جا سکتی۔

الغرض حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہو گیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چوبیس سال رہیں کچھ مدت نزول سے پہلے اور کچھ مدت نزول وحی کے بعد۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فرزند اور چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔ فرزندار جمند قاسمؓ اور طاہرؓ تھے۔ قاسم رضی اللہ عنہ کے نام سے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم مشہور ہے اور طاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انکا نام عبداللہ حاشیہ نمبر (۱) زادالمعاد میں ہے کہ آپکا اصلی نام عبداللہ تھا اور طیب وطاہر دونوں آپکے لقب تھے۔ تھا۔ چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، زینب رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔

حضرت زینبؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سب حافظ ابن قیم نے اس میں مختلف اقوال لکھے ہیں بعض حضرات زینب رضی اللہ عنہا کو اور بعض رقیہ رضی اللہ عنہا کو اور بعض ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو سب سے بڑی کہتے ہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ مروی ہے کہ رقیہ رضی اللہ عنہا سب سے بڑی تھیں اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا سب سے چھوٹی۔ (زادالمعاد ص ۲۵ جلد ا سے بڑی تھیں رضی اللہ عنھن وعنا اجمعین۔

یہ سب اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھی۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے صاحبزادے جن کا نام ابراہیم تھا صرف وہ ماریہ قبطیہ سے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تینوں فرزند بچپن ہی میں وفات پا گئے، البتہ حضرت قاسمؓ کے متعلق بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ سوار ہو جائیں۔

باقی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی حیات میں کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا، ہجرت سے تین سال پہلے جب ان کی وفات ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۴۹ برس میں پہنچی تو اور خواتین بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں جن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ سودہ بنت زمعہ، عائشہ، حفصہ، ام سلمہ، زینب بنت خزیمہ، زینب بنت جحش، جویریہ، ام حبیبہ، صفیہ، میمونہ رضی اللہ عنھن ، یہ گیارہ ہیں جن میں دو سامنے وفات پا گئیں اور نو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت زندہ تھیں اور یہ باجماع امت صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ امت کے لئے چار سے زائد عورتیں ایک وقت

میں بصورت نکاح جمع کرنا جائز نہیں اور اس خصوصیت کی بعض وجوہ آگے آتی ہیں۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

پہلے سکران بن عمرو کے نکاح میں تھیں اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں، چھ برس کی عمر میں تھیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح ہوا، اور ہجرت کے سال نو برس کی عمر میں رخصت ہوئیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہا کی عمر ۱۸ سال کی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نو سالہ مصاحبت سے آپ پر کیا رنگ چڑھا اور کیا حاصل ہوا اس کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے صحابہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں جب کسی مسئلہ میں شک ہوتا تھا تو عائشہ صدیقہؓ کے پاس اس کا علم پاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اجلہ صحابہ آپ کے شاگرد تھے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں پہلے انیس بن خدافہ کے نکاح میں تھیں، انکے بعد ہجرت سے دوسرے یا تیسرے برس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔ (مغلطائی ص ۴۸)

حضرت زینب بنت خزیمہ ہلالہ رضی اللہ عنہا

ام المساکین کے نام سے معروف ہیں، پہلے طفیل بن حارث کے نکاح میں تھیں اس نے طلاق دے دی، پھر اس کے بھائی عبیدہؓ سے نکاح ہو گیا، جب یہ بھی غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تو ۳ ہجری میں غزوۂ اُحد سے ایک ماہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں (سیرت مغلطائی ص ۴۵) اور صرف دو ماہ نکاح میں رہ کر وفات پا گئیں۔ (نشر الطیب)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

ابوسفیانؓ کی بیٹی ہیں، پہلے عبید اللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں، ان سے اولاد بھی

ہوئی، یہ دونوں مسلمان ہو کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے وہاں پہنچ کر عبید اللہ بن جحش نصرانی ہو گیا اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے ایمان پر قائم رہیں، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی شاہ حبشہ کو خط لکھا کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام نکاح دیں، چنانچہ نجاشی نے پیغام دیا اور خود ہی نکاح کا کفیل ہوا اور چار سو دینار مہر خود ہی ادا کر دیئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نام ہندہ ہے۔ پہلے ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں جن سے اولاد بھی ہوئی، جمادی الثانی ۴ ہجری میں اور بعض روایات کے مطابق ۳ ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ (سیرت مغلطائی ص ۵۵)

کہا جاتا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے تمام ازواج مطہرات کے بعد انتقال فرمایا۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہا سے کرنا چاہا تھا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر کے اپنا متبنیٰ بنا رکھا تھا۔ مگر چونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ پر غلامی کا نام آ چکا تھا اس لئے زینبؓ اس عقد کو پسند نہ کرتی تھیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعمیل ارشاد کے لئے راضی ہو گئیں۔ ایک سال کے قریب زیدؓ کے نکاح میں رہیں مگر چونکہ طبعی موافقت نہ تھی ہمیشہ شکر رنجی رہا کرتی تھی یہاں تک کہ زیدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر طلاق کا ارادہ ظاہر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھا کر طلاق سے روکا لیکن پھر کسی طرح موافقت نہ ہوئی۔ جب وہ آزاد ہو گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی اور دلجوئی کے لئے ان سے نکاح کرنا چاہا لیکن اس وقت عرب کے خیال میں متبنیٰ کو اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نکاح سے رکتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ لیکن چونکہ یہ جاہلیت کی رسم تھی جس کا مٹانا اسلام کا فرض تھا، اس لئے آیت نازل ہوئی کہ آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں حالانکہ ڈرنا

اللہ سے چاہئے (سورۂ احزاب) غرض ۴ ہجری میں اور بعض روایات کے موافق ۳ ہجری یا ۵ ہجری میں خداوند عالم کے حکم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان سے نکاح کر لیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ لے پالک یعنی متبنیٰ اصلی بیٹے کا حکم نہیں رکھتا، اس کی بیوی بعد قطع تعلق کے حرام نہیں ہوتی، اور جن لوگوں نے خدا کے اس حلال کو عقیدتاً یا عملاً حرام کر رکھا ہے وہ آئندہ اس غلطی سے نکل جائیں اور جاہلیت کی یہ رسم ٹوٹ جائے لیکن اس دیرینہ رسم کا ٹوٹنا جب ہی ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود عملاً اس کا نفاذ کریں۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس نکاح کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے نہایت صحیح روایات حدیث سے لکھا ہے جن کو صحیح بخاری کی شرح میں حافظ حدیث علامہ ابن حجر نے نقل کیا ہے۔ (دیکھو فتح الباری، تفسیر سورۂ احزاب) اس کے علاوہ جو لغو روایات مشہور کی گئی ہیں وہ سب منافقین اور کفار کی گھڑی ہوئی ہیں جن کو بعض مسلمان مؤرخین نے بھی بلا تنقید نقل کر دیا ہے۔ وہ محض جھوٹ اور افتراء ہیں۔

حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا

حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ یہ صرف ان کی خصوصیت تھی کہ ایک نبی کی صاحبزادی اور ایک نبی کی زوجہ تھیں۔ پہلے کنانہ ابن ابی الحقیق کے نکاح میں تھیں ان کے قتل کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

خزاعیہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی ہیں، جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور اس کی بدولت تمام قبیلہ آزاد ہو گیا اور ان کے باپ مسلمان ہو گئے۔

حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا

اول مسعود بن عمر کے نکاح میں تھیں، اس نے طلاق دیدی تو ابورہم سے نکاح ہو گیا، ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ (مغلطائی ص ٦٦)

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر ازواج میں سے ہیں، ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح نہیں کیا ان کے علاوہ اور بعض خواتین سے نکاح ہوا مگر ان کو شرف مصاحبت حاصل نہیں ہو سکا بلکہ قبل از رخصت ہی بعض وجوہ سے علیحدگی ہو گئی جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور پھوپھیاں

عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے، حارث، زبیر، حجل، ضرار، مقوم، ابولہب، عباس، حمزہ، ابوطالب، عبداللہ جن میں سے عبداللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد ہیں، باقی نو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، حضرت عباسؓ اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے ہیں۔ آپ کی پھوپھیاں چھ ہیں۔ امیمہ، ام حکیم، برہ، عاتکہ، صفیہ، اروی۔

آپ کی پہرہ داری کرنے والے

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہبانی کی، اور ذکوان بن عبد قیس رضی اللہ عنہ اور محمد بن سلمہ انصاری نے غزوۂ احد میں زبیر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خندق میں اور عباد بن بشیرؓ وسعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور ابوایوب رضی اللہ عنہ اور بلال رضی اللہ عنہ نے وادی قریٰ میں اور جب یہ آیت نازل ہوئی: " وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ " اللہ تعالیٰ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے تو پہرہ داری اٹھا دی گئی۔

بناء کعبہ اور قریش کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باتفاق "امین" تسلیم کرنا

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف پینتیس سال کی ہوئی تو اس وقت قریش ﴿اس سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر اول حضرت شیث علیہ السلام نے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی ۱۲۔﴾ نے بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کا ارادہ کیا۔ بیت اللہ کی تعمیر ہر شخص اپنی سعادت سمجھتا تھا اور قبائل قریش نے اپنی قسمتوں کا فیصلہ اس پر رکھا تھا کہ اس کی تعمیر میں زیادہ حصہ لیا

جائے چنانچہ اس تعمیر کو قبائل میں تقسیم کرنے کی نوبت آئی تا کہ کوئی جھگڑا پیش نہ آئے۔ اسی تقسیم عمل کے ساتھ بناء کعبہ حجر اسود کی حد تک پہنچ گئی، لیکن اب حجر اسود کو اٹھا کر تعمیر میں نصب کرنے کے متعلق سخت اختلاف ہوا، ہر قبیلہ اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ اس سعادت کو حاصل کرے یہاں تک کہ قتل وقتال پر عہد و پیان ہونے لگے، قوم کے بعض سنجیدہ لوگوں نے ارادہ کیا کہ مشورہ کر کے کوئی صلح کی صورت نکالیں اور اس غرض کے لئے مسجد میں گئے۔ مشورہ میں یہ طے ہوا کہ جو شخص سب سے پہلے مسجد کے اس دروازہ میں داخل ہو وہ تمہارے معاملے کا فیصلہ کرے اور اس کے حکم کو ہر شخص دست قدرت کا فیصلہ سمجھ کر تسلیم کرے۔

خدا کی قدرت کہ سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دروازہ سے داخل ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ امین ہیں، ہم ان کے حکم پر راضی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور وہ حکیمانہ فیصلہ کیا کہ سب خوش ہو گئے یعنی ایک چادر پھیلا دی اور اس میں حجر اسود کو اپنے ہاتھ سے اٹھا کر رکھ دیا اور پھر حکم دیا کہ ہر قبیلہ کا منتخب آدمی چادر کا ایک ایک کنارہ پکڑ لے اس طرح کیا گیا، جب بنیاد تک پہنچ گیا تو خود اپنے ہاتھ سے اٹھا کر رکھ دیا۔

ابن ہشام اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ نبوت سے پہلے تمام قریش بالاتفاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امین کہتے تھے۔ (سیرت ابن ہشام ص ۱۵۔ ج ۱)

عطاءِ نبوت

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف چالیس برس ایک دن کی ہوئی تو ظاہری طور پر بھی باضابطہ آپ کو خلعت نبوت کے ساتھ ممتاز و مشرف فرمایا جس کی تاریخ ولادت کی طرح ماہ ربیع الاول روز دوشنبہ ہے، اس کے علاوہ اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ (سیرت مغلطائی ص ۱۴)

دنیا میں اشاعت اسلام، تبلیغ کا پہلا قدم

ابتداء جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلانا تبلیغ کے لئے مامور نہ تھے بلکہ اس میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے احکام تھے۔ پھر کچھ دنوں سلسلہ وحی منقطع رہنے کے بعد جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دوبارہ وحی

شروع ہوئی تو اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ اسلام کے لئے حکم ہوا، مگر دنیا میں جہالت وضلالت کی حکومت تھی، بالخصوص عرب کا تکبر اور غرور اور تقلید آبائی انہیں حق پر کان لگانے کی ہرگز اجازت نہ دیتی تھی، اس لئے ابتداء میں حکمت الٰہیہ کا اقتضاء یہ ہوا کہ آپ کو اعلاناً تبلیغ واشاعت اسلام کا امر نہ کیا جائے تاکہ اول ہی سے لوگ متنفر نہ ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً دعوت اسلام اپنی جان پہچان کے لوگوں میں اور ان شخصوں میں شروع کی جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد تھا، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فراست کے ذریعہ ان میں خیر وصلاح کے آثار دیکھتے تھے۔

اس طریق سے سب سے پہلے زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آپ کے چچازاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ زید بن حارثہ مشرف باسلام ہوئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و دیانت واخلاق سے خوب واقف تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رسالت الٰہیہ کی خبر دی تو فوراً آپ رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے مسلم بزرگ تھے، تمام معاملات میں لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد آپؓ نے بھی ان لوگوں کو دعوت اسلام دینی شروع کی جن میں کچھ صلاح وخیر کے آثار دیکھے چنانچہ حضرت عثمان غنی، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن العوام اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم نے ان کی دعوت قبول کی، اور آپؓ ان سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ان کے بعد ابوعبیدہ بن جراح، عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب، سعید بن زید عدوی، ابوسلمہ مخزومی، خالد بن سعید بن العاص، عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں بھائی قدامہ رضی اللہ عنہ اور عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور ارقم بن ارقم رضی اللہ عنہم اجمعین مشرف باسلام ہوئے۔ یہ سب کے سب قریش میں سے تھے اور غیر قریش میں سے

صہیب رومی، عمار بن یاسر، ابو ذر غفاری، عبداللہ بن مسعودؓ اسلام میں داخل ہوئے، اس وقت تک یہ دعوت اسلام محض خفیہ جاری تھی۔ عبادات اور اعمال شریعہ بھی چھپ چھپ کر ادا کئے جاتے تھے یہاں تک کہ بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے چھپ کر نماز پڑھتا تھا۔ جب مسلمانوں کی تعداد تیس سے بڑھ گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے ایک وسیع گھر مقرر کر دیا جس میں وہ سب جمع ہو جایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تعلیم فرماتے تھے۔

اس طریقہ کی دعوت اسلام تین سال تک جاری رہی۔ اسی دوران میں قریش کی ایک خاصی جماعت اسلام میں داخل ہو گئی اور پھر اور لوگ بھی داخل ہونے شروع ہو گئے اور یہ خبر مکہ میں پھوٹ نکلی اور لوگوں میں جا بجا اس کا چرچا ہونے لگا اور اب اعلاناً دعوت حق کا وقت آ پہنچا۔

اعلاناً دعوت اسلام

تین سال کے بعد جب کہ کثرت سے مرد عورت اسلام میں داخل ہونے لگے اور لوگوں میں اس کا چرچا ہوا تو خداوند عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ علی الاعلان لوگوں کو کلمہ حق پہنچائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی اور مکہ کی پہاڑی صفاء پر چڑھ کر اور قبائل قریش کا نام لے لے کر آواز دی، جب تمام قبائل جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً سب سے دریافت کیا کہ اگر میں آپ کو یہ خبر دوں کہ غنیم کا لشکر تم پر چڑھا چلا آ رہا ہے اور قریب ہے کہ تم پر لوٹ ڈال دے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے، سب یہ سن کر یک زبان ہو کر بولے کہ بیشک ہم آپ کی خبر کو بالکل حق سمجھیں گے کیونکہ ہم نے آج تک کبھی آپ کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ تم نے اپنے باطل عقائد کو نہ چھوڑا تو خدا تعالیٰ کا سخت عذاب تم پر آنے والا ہے۔ اور فرمایا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا میں کوئی انسان اپنی قوم کے لئے اس تحفہ سے بہتر تحفہ لے کر نہیں آیا جو میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ میں تمہارے لئے دین و دنیا کی فلاح و بہبود لے کر آیا ہوں اور خداوند عالم نے مجھے فرمایا ہے کہ تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ خدا کی قسم اگر میں تمام دنیا کے انسانوں سے جھوٹ بولتا تب بھی تمہارے سامنے جھوٹ نہ بولتا اور اگر ساری دنیا کو دھوکہ دیتا تب بھی تمہیں دھوکہ نہ دیتا اس ذات قدوس کی قسم ہے جو ایک ہے

اور جس کا کوئی سہیم و شریک نہیں کہ میں تمہاری طرف خصوصاً اور تمام عالم کی طرف عموماً خدا تعالیٰ کا رسول پیغمبر ہوں۔ ﴿از دروس السیرت ص ۱۰﴾

تمام عرب کی مخالفت وعداوت اور آپ کی استقامت

یہ دعوت وتبلیغ کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، عرب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کی وحی میں ان کے بتوں کی حقیقت کھولی گئی ہے۔ ان کی پرستش کرنے والوں کی بیوقوفی ظاہر کی گئی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے لئے کھڑے ہو گئے اور ان کی ایک جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے پاس آئی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی باتوں سے روک دیں اور یا آپ ان کی حمایت چھوڑ دیں، ابو طالب نے ایک عمدہ پیرائے میں جواب دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کلمہ حق کی نشر واشاعت میں سرگرم اور بتوں کی عبادت سے لوگوں کو منع کرتے رہے۔ جب عرب کو اس پر صبر نہ ہوسکا تو پھر ابو طالب پاس آئے اور سختی سے ان سے مطالبہ کیا کہ یا آپ اپنے بھتیجے کو باز رکھیں ورنہ ہم سب تمہارے خلاف جنگ کریں گے یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک فنا ہو جائے۔

تمام قبائل عرب کے مقابلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب

اب تو ابو طالب کو بھی فکر ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ میں گفتگو کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عم بزرگوار! ''خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب لاکر رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں خدا کا کلمہ اس کی مخلوق کو نہ پہنچاؤں تو میں ہرگز اس کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ یا خدا کا سچا دین لوگوں میں پھیل جائے اور یا کم از کم اسی جدوجہد میں اپنی جان دے دوں''۔

ابو طالب نے جب یہ رنگ دیکھا تو کہا اچھا جاؤ تم اپنا کام کرتے رہو میں بھی تمہاری حمایت ونصرت سے کسی وقت ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔

لوگوں میں نفرت پھیلانا اور اس کا الٹا نتیجہ

جب قریش نے دیکھا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں

اورادھر موسم حج قریب ہے اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ میں سرگرم کوشش کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام حق کی مقناطیسی کشش سے سب واقف تھے اس لئے اندیشہ ہے کہ اب ان کا مذہب تمام دنیا کے اطراف میں پھیل جائیگا تو سب نے جمع ہو کر یہ طے کیا کہ مکہ کے تمام راستوں پر اپنے آدمی بٹھا دیئے جائیں تا کہ اطراف عالم سے جو لوگ حج کے لئے آئیں انہیں دور ہی سے کہہ دیا جائے کہ یہاں ایک ساحر ہے جو اپنے کلام سے باپ بیٹے اور خاوند بیوی میں اور تمام رشتہ داروں میں ہی تفریق ڈال دیتا ہے تم اس کے پاس نہ جاؤ لیکن۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد　کسے کش تف زند ریشش بسوزد

﴿جس چراغ کو حق تعالیٰ روشن فرمائیں جو شخص (بجھانے کے لئے) اس پر پھونک مارتا ہے اس کی ہی داڑھی جل جاتی ہے۔﴾

خدا کی قدرت ان کا یہ طرز عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا کام کر گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ بہت سے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ سنتے، لیکن ان کی اس جدوجہد نے سب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشتاق بنا دیا۔

قریش کی ایذاءرسانی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت

جب قریش اپنی تدبیروں میں ناکام رہے اور دیکھا کہ روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عام ہوتی جاتی ہے اور لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو اب ہر قسم کی ایذاءرسانی شروع کی، مکہ کے چند اوباش لوگوں کو جمع کر کے اس پر آمادہ کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر مجلس میں استہزاء کریں اور جس صورت سے ممکن ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بین معجزہ

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف کے پاس نماز پڑھ رہے تھے جب سجدہ میں گئے تو ابوجہل نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک کچل ڈالے مگر۔

''دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است''

﴿اگر دشمن قوی ہے تو نگہبان اس سے زیادہ قوی ہے﴾

جب پتھر لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچتا ہے تو ہاتھ کانپ جاتے ہیں پتھر ہاتھ سے گر جاتا ہے۔ رنگ فق ہو جاتا ہے اور بھاگ کر اپنی جماعت کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کی جانب ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو ایک عجیب وضع کا اونٹ منہ کھولے ہوئے میری طرف جھپٹا اور قریب تھا کہ مجھے کھا جائے میں نے ایسا اونٹ آج تک کبھی نہیں دیکھا یہ واقعہ ہے جو کفار کے مجمع میں سب کے سامنے پیش آیا، اور خود کفار کے سردار ابو جہل نے اس کا اقرار کیا۔

ابو جہل، عقبہ بن ابی معیط، ابولہب، عاص بن وائل، اسود بن یغوث، اسود بن عبدالمطلب، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث یہ لوگ ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درپے آزار رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کو اسلام کی توفیق نہیں ہوئی بلکہ سب کے سب نہایت ذلیل ہو کر ہلاک ہوئے۔ کچھ غزوۂ بدر میں تلوار کے گھاٹ اتر گئے اور کچھ نہایت گندے اور سخت امراض میں گل سڑ کر مر گئے۔

قریش کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی طمع دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب

جب کفار قریش نے دیکھ لیا کہ یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی تو سب نے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ وہ اپنے سب سے زیادہ چالاک سردار عتبہ بن ربیعہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجیں تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی دنیاوی طمع دلائے، شاید اس تدبیر سے آپ اپنے دعوے میں خاموش ہو بیٹھیں۔ عتبہ بن ربیعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے پاس جا کر کہا بھتیجے'' تم حسب نسب کے اعتبار سے ہم سب میں بہتر ہو، اور اس کے باوجود تم نے اپنی جماعت میں ایک تفریق ڈال دی اور ان کے معبودوں کو اور ان کو برا بھلا کہا، ان کو اور ان کے آباؤ

اجداد کو جاہل ٹھہرایا، تم آج اپنے دل کی بات کہہ دو۔ اگر ان سارے قصوں سے تمہاری غرض یہ ہے کہ بڑی دولت جمع کرلو تو سنو ہم تمہارے واسطے اتنا مال جمع کر دینے کے لئے تیار ہیں کہ تم اہل مکہ میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ اور اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہیں سرداری حاصل ہو جائے تو اس پر راضی ہیں کہ تمام قریش کا سردار بنا دیں اور آپ کے حکم کے بغیر کوئی ذرہ نہ ہلائیں اور اگر آپ کی غرض بادشاہت ہے تو ہم آپ کو اپنا سب کا بادشاہ بھی بنا سکتے ہیں اور اگر تم پر معاذ اللہ کسی جن کا اثر ہے اور یہ اسی کا کلام (وحی) تم لوگوں کو سناتے ہو اور تم اس کے دفع کرنے سے عاجز ہو تو ہم آپ کے لئے کوئی طبیب تلاش کریں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علاج کرے۔ (سیرت مغلطائی ص ۲۰) جب عتبہ اپنے کلام سے فارغ ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی داستان کے جواب میں ایک سورت قرآن سنا دی جس کو سن کر عتبہ ہکا بکا رہ گیا اور اپنی قوم میں واپس آ کر کہنے لگا کہ خدا کی قسم آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے اپنی عمر میں کبھی نہیں سنا تھا خدا کی قسم نہ وہ شعر ہے نہ نجومیوں کا کلام ہے اور نہ سحر میری رائے یہ ہے کہ تم سب اس شخص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء سے باز آؤ، کیونکہ ان کا جو کلام میں نے سنا ہے واللہ ان کی شان عظیم ظاہر ہونے والی ہے میں تمہارا خیر خواہ ہوں تم میری بات مانو اور زیادہ نہیں تو کچھ دنوں انتظار کرو اگر عرب ان پر غالب آ گئے تو تم مفت میں اس تکلیف سے نجات پاؤ گے اور اگر وہ عرب پر غالب آ گئے تو ان کی عزت ہماری ہی عزت ہے کیونکہ وہ ہمارے ہی قبیلہ سے ہیں۔ قریش اپنے سب سے زیادہ ہوشیار سردار کی یہ باتیں سن کر حیرت میں رہ گئے اور یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ اس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کر دیا ہے۔ (دروس السیرۃ ص ۱۴) جب قریش کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا تو اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اور متعلقین واقربا کو بھی ستانا اور طرح طرح کی ایذائیں دینا شروع کیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کو سخت ایذائیں دی گئیں۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ اسی بناء پر نہایت دردناک طریقہ سے شہید کی گئیں، اور یہ سب سے پہلا واقعہ شہادت ہے جو اسلام میں پیش آیا۔ (دروس السیرۃ ص ۲۱)

صحابہؓ کے لئے ہجرت حبشہ کا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر ہر قسم کے مظالم اور تکالیف برداشت کرتے رہے مگر جب صحابہ کرام اور دیگر اقارب تک اس کی نوبت پہنچی اور دیکھا کہ وہ نہایت صبر کیساتھ تمام مظالم سہنے کے لئے تیار ہیں، مگر اس کلمہ حق اور نور الٰہی سے منہ موڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو ان کو آپ کے ذریعہ سے وصول ہوا ہے تو ان حضرات کو اجازت دی کہ ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جائیں۔ عطائے نبوت سے پانچویں سال رجب میں بارہ ﴿از سیرت مغلطائی ص ۲۱ مہاجرین کی تعداد میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ ۱۲ منہ۔﴾ مرد اور عورتوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جن میں حضرت عثمانؓ اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت رقیہ بھی تھیں۔ (دروس السیر ۃ ص ۱۵)

نجاشی بادشاہ حبشہ نے ان مہاجرین کا اکرام کیا، یہ سب امن و عافیت کیساتھ وہاں رہنے لگے۔ جب قریش کو اس کی خبر ہوئی تو عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو نجاشی ﴿ملک حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کہتے تھے، ۱۲ مغلطائی۔﴾ کے پاس بھیجا کہ یہ لوگ مفسد ہیں، ان کو اپنی قلم رو میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دو بلکہ ان کو ہمارے سپرد کر دو۔

نجاشی ایک سنجیدہ آدمی تھا اس نے ان کے جواب میں کہا کہ میں یہ کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ ان کے مذہب اور خیالات کی تحقیق نہ کر لوں، ان حضرات سے جب نجاشی نے یہ دریافت کیا کہ اپنا مذہب اور اس کے صحیح واقعات بتلائیں تو جعفر بن ابی طالبؓ آگے بڑھے اور فرمایا ﴿یورپ کے بعد مشہور سیاسی لوگوں نے (غالباً لارڈ کرومر نے کہا ہے کہ مشرق و مغرب کے علماء جمع ہو کر دین اسلام کی حقیقت بیان کرنا چاہیں تو اس سے اچھا بیان نہیں کر سکتے جو مہاجرین حبشہ نے بیان کیا ص ۲۱، ۱۲ منہ۔﴾ ''شاہا! ہم پہلے جاہلیت والے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، اور مردار کھاتے تھے، فحش کاری، قطع رحمی اور بد خلقی میں مبتلا تھے، ہمارا قوی ضعیف کو کھا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جو ہمارے ہی کنبہ سے ہے، ہم ان کے نسب اور سچائی، امانت اور عفت کو خوب جانتے ہیں اور انہوں نے ہمیں اس کی دعوت دی کہ اللہ کو ایک سمجھیں اور اس کے ساتھ کسی کو سہیم و شریک نہ

جائیں اور بت پرستی چھوڑ دیں، سچ بولیں، عزیز و اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کریں، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور محرمات سے منع فرمایا اور خون بہانے اور جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے روکا اور ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا حکم فرمایا، ہم نے جب یہ سنا تو اس پر ایمان لے آئے'' نجاشی ﴿نجاشی کوئی اور شخص ہے (جو نبوت کے پانچویں سال مسلمان ہوا) صحمہ جس کا ذکر ۲ ھ میں اسلام میں آتا ہے وہ اور ہے۔۱۲﴾ یہ سن کر متاثر ہوا، قریش کے دونوں قاصدوں کو واپس کر دیا اور مسلمان ہو گیا! مہاجرین تقریباً تین مہینے وہاں امن و عافیت کے ساتھ قیام کر کے واپس آ گئے۔ اس وقت حضرت فاروق اعظمؓ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے مشرف با سلام ہو گئے۔

اس وقت مسلمانوں کی مردم شماری چالیس مرد اور گیارہ عورتوں سے زائد نہ تھی۔ فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے داخل اسلام ہونے سے مسلمانوں کو ایک قسم کی شوکت حاصل ہوئی اور وہ لوگ جو دلائل واضحہ کے ذریعہ سے اسلام ظاہر نہ کرتے تھے اب اعلانیہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس طرح قبائل عرب میں اسلام پھیلتا اور ترقی کرتا رہا۔ جب قریش نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزت روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے اور بادشاہ حبشہ نے بھی مسلمانوں کا احترام کیا تو انہیں اپنا انجام نظر آنے لگا، تمام قریش نے یہ طے کیا کہ بنی عبدالمطلب اور بنی ہاشم سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے سپرد کر دیں ورنہ ہم ان سے بالکل قطع تعلق کر دیں گے، مگر بنی عبدالمطلب نے اسکو منظور نہ کیا تو باتفاق رائے یہ عہد نامہ (عہد نامہ منصور بن عکرمہ نے لکھا تھا اور اسکی شامت میں اسکا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ سیرت مغلطائی ص ۲۴، ۲۱ منہ سیرت مغلطائی ص ۲۲، ۱۲ منہ) لکھا گیا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے بالکل مقاطعہ کیا جائے، رشتے ناطے، نکاح بیاہ، خرید و فروخت سب بند کر دیئے جائیں اور یہ عہد نامہ بیت اللہ کے اندر معلق کر دیا گیا۔

ایک پہاڑ کی گھاٹی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام رفقاء و اقرباء کو مقید کر دیا گیا اس وقت ابولہب کے سوا تمام بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے تمام افراد بلا امتیاز مسلم و کافر سب کے سب ابوطالب کے ساتھ رہے اور اس گھاٹی میں مقید و

محصور ہو گئے۔ سب طرف سے آمدورفت ہونے کے راستے بند تھے، شدت بھوک سے درختوں کے پتے کھانے کی نوبت آئی۔ یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کے لئے فرمایا، اس مرتبہ ایک بڑے قافلے نے ہجرت کی جس کی تعداد تراسی (۸۳) مرد اور بارہ عورتیں ﴿حاشیہ نمبر(۱) سیرت مغلطائی ص۲۴، ۱۲ منہ۔﴾ بیان کی جاتی ہیں اور پھر ان کے ساتھ یمن کے مسلمان بھی مل گئے جن میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور ان کی قوم بھی تھی۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی آل واصحاب نے تقریباً تین سال ﴿روایات میں دو سال اور بعض میں چند سال بیان کئے جاتے ہیں۔ سیرت مغلطائی ص۱۳، ۱۲ منہ۔﴾ انہی مظالم اور مصائب کے ساتھ بسر کئے۔ اس کے بعد چند آدمی اس عہد کو توڑنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے یہ محاصرہ اٹھا دینے پر آمادہ ہوئے ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلایا گیا کہ اس عہد نامہ کو دیمک نے کھا لیا ہے اور بجز خدا کے نام کے اس میں کوئی حرف نہیں چھوڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے بیان کیا دیکھا تو ٹھیک اسی طرح نکلا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔ الغرض آپ سے محاصرہ اٹھا دیا گیا۔

طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

اسی عرصہ میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ جو نہایت شریف اور اپنی قوم کے سردار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی بدیہی حقانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو دیکھ کر برضا ورغبت مسلمان ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے، میں جا کر ان کو بھی اسلام کی دعوت دیتا ہوں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ میرے ساتھ کوئی ایسی کھلی ہوئی علامت ظاہر کر دی جائے جس کے ذریعہ سے میں ان کو اپنی باتوں کا یقین دلا سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پیشانی پر ایک ایسا نور چمکا دیا کہ جو اندھیرے میں ایک نہایت روشن چراغ کی طرح چمکتا تھا۔ جب طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے پاس

گئے تو یہ خیال ہوا کہ کہیں میری قوم اس نور کو مصیبت اور بیماری نہ سمجھے اور یہ نہ کہے کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مجھ پر یہ مرض مسلط ہو گیا ہے۔ اس لئے دعا کی کہ یہ نور آپ کے تازیانہ (یعنی کوزا اور جاپان ۱۲منہ) میں آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور اس نور کو انکے کوڑے کیساتھ قندیل کی طرح لگا دیا اپنے قبیلے میں پہنچ کر تبلیغ کی، کچھ آدمی آپکی سعی سے مسلمان ہو گئے مگر چونکہ انکے گمان کے مطابق زیادہ نہ ہوئے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایئے کہ میری سعی کامیاب ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور ارشاد فرمایا جاؤ اب تبلیغ کرو اور نرمی سے کام لو۔

طفیل بن عمرؓ لوٹے اور پھر لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا اور خدا کے فضل سے ایسے کامیاب ہوئے کہ غزوۂ خندق کے بعد ستر اسی گھرانے مسلمان کر کے غزوۂ خیبر میں اپنے ساتھ لائے اور سب شریک جہاد ہوئے۔ (سیرت مغلطائی للحافظ علاؤ الدین ص ۲۵)

ابو طالب کی وفات

اسی عرصہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کی وفات ﴿سیرت مغلطائی ص ۲۵﴾ ہو گئی، یہ سانحہ نبوت سے دس سال ماہ شوال کے نصب پر پیش آیا اور اس کے تین ﴿تاریخ وفات میں اور بھی مختلف روایتیں ہیں مثلاً ماہ رمضان ہجرت سے ۵ سال پہلے چار سال پہلے بعد معراج۔ کذا فی سیرت مغلطائی ص ۲۶۔﴾ دن بعد حضرت خدیجہؓ کی وفات ہو گئی اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال ﴿اور اسی سال حضرت سودہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے بعد ان سے نکاح ہوا ہے۔ (سیرت مغلطائی ص ۲۶۔۱۲)﴾ کو غم کا سال فرمایا۔

ہجرت طائف

ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقعہ مل گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مکہ کے قبول اسلام سے مایوسی کی صورت پیدا ہونے لگی تو اسی سال یعنی ۱۰ھ نبوی میں آخر ماہ شوال میں زید بن حارثہ رضی

اللہ عنہ کو ساتھ لے کر طائف تشریف لے گئے اور اہل طائف کو کلمہ حق کی دعوت دی اور ایک ماہ تک متواتر ان کی تبلیغ و ہدایت میں مصروف رہے مگر ایک شخص کو بھی قبول حق کی توفیق نہ ہوئی بلکہ ظالموں نے اپنے شہر کے چند اوباش لوگوں کو سکھا دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائیں۔ یہ سنگدل بدنصیب اس سرور کائنات کے درپے ہو گئے کہ شان رحمۃ للعالمین مانع نہ ہو تو ایک جنب لب میں ان کی ساری بدمستیوں کا خاتمہ ہو سکتا تھا، طائف اور طائف کے بسنے والوں کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹایا جا سکتا تھا۔

ان بدبخت لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسانے شروع کئے جن سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم شریف زخمی ہو جاتے تھے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جس طرف سے پتھر آتا ہوا دیکھتے اس طرف خود کھڑے ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچاتے اور پتھر کو اپنے سر پر لیتے تھے، یہاں تک کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا سر زخمی ہو گیا۔ بالآخر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ بعد طائف سے اس طرح واپس ہوئے کہ آپ کے ٹخنے شریف لہولہان تھے مگر زبان پر حرف بددعا اس وقت بھی نہ آتا تھا۔

اسراء اور معراج

نبوت کا پانچواں سال اسلام کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے جس میں فخر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اعزازی جلوس کے ساتھ نوازا گیا، جو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں سے بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم حطیم کعبہ ﴿اس میں اختلاف ہے کہ یہ آسمانی سیر بھی براق پر ہوئی یا کسی سیڑھی وغیرہ پر، حافظ نجم الدین غیطی نے قصہ المعراج میں اس پر مفصل بحث کی ہے ص ۱۱۲-۱۲ منہ﴾ میں لیٹے ہوئے تھے کہ جبرئیل اور میکائل علیہما السلام آئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو براق پر سوار کیا گیا جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ جس جگہ اس کی نظر پڑتی تھی وہیں قدم پڑتا تھا۔ اس سرعت رفتاری کے ساتھ اول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک شام میں مسجد اقصیٰ تک لے گئے یہاں پر اللہ

تعالیٰ نے تمام انبیاء سابقین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام کے لئے (بطور معجزہ) جمع فرمایا تھا، جبرئیل علیہ السلام نے یہاں پہنچ کر اذان دی، انبیاء و رسل کی صفیں تیار ہو کر کھڑی ہوئیں لیکن سب اس کا انتظار کر رہے تھے کہ نماز کون پڑھائے۔ جبرئیل امینؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پکڑ کر آگے کر دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء و مرسلین اور ملائکہ کو نماز پڑھائی، یہاں تک عالم دنیا کی سیر تھی جو براق پر ہوئی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد اقصیٰ سے آسمان پر لے جایا گیا۔ بعض روایات کے مطابق یہ آسمانی سفر بھی براق پر ہوا مگر احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر براق پر نہیں ہوا بلکہ بذریعہ معراج ہوا، معراج کے معنی سیڑھی یا زینہ کے ہیں۔ زینہ کی آج کل بھی بہت سی قسمیں ہیں ان میں ایک طریقہ لفٹ کا بھی ہے اس کو بھی زینہ کہہ سکتے ہیں وہ کس قسم کا زینہ تھا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آسمان تک پہنچے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کسی روایت میں منقول نہیں۔

پہلے آسمان پر آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور دوسرے پر عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے اور تیسرے پر یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے پر ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں پر ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری ہندی ص ۴۸۵ پ ۱۵)

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ کی طرف تشریف لے چلے۔ راستہ میں حوض کوثر پر گزر ہوا پھر جنت میں داخل ہوئے وہاں دست قدرت کے وہ عجائب و غرائب دیکھے جو نہ کسی آنکھ نے آج تک دیکھے اور نہ کسی کان نے سنے اور نہ کسی انسان کے وہم و گمان کی وہاں تک رسائی ہوئی۔ پھر دوزخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی گئی جو ہر قسم کے عذاب اور سخت شدید آگ سے بھری ہوئی تھی جس کے سامنے لوہے اور پتھر جیسی سخت چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو دیکھا کہ مردار جانور کھا رہے ہیں دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا یہ وہ ہیں جو لوگوں کے گوشت

کھاتے تھے (یعنی ان کی غیبت کرتے تھے) دوزخ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور جبرئیل امین وہیں ٹھہر گئے، کیونکہ ان کو اس درجہ سے آگے بڑھنے کا حکم نہیں تھا۔ اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند جل وعلا کی زیارت ہوئی، صحیح یہ ہے کہ زیارت فقط قلب سے نہیں بلکہ آنکھوں سے ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور تمام محققین صحابہ اور ائمہ کی یہی تحقیق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گر پڑے اور خداوند عالم سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اسی وقت نمازیں فرض کی گئیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے وہاں سے براق پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کی طرف تشریف لے چلے۔ راستہ میں مختلف مقامات پر قریش کے تین تجارتی قافلوں پر گزرے جن میں سے بعض کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا، اور انہوں آپ کی آواز پہچانی اور مکہ واپس ہونے کے بعد اس کی شہادت دی۔ صبح سے پہلے ہی یہ سفر مبارک تمام ہو گیا۔

اسراء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عینی شہادتیں

جب صبح ہوئی اور یہ خبر قریش میں پھیلی تو ان کا ایک عجیب عالم تھا کہ اچھا بتلایئے کہ بیت المقدس کی تعمیر اور ہیئت کیسی ہے اور پہاڑ سے کتنے فاصلے پر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا پورا نقشہ بتلا دیا۔ اسی طرح وہ مختلف چیزیں دریافت کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے رہے یہاں تک کہ اب انہوں نے ایسے سوالات شروع کر دیئے جو باوجود کئی مرتبہ دیکھ لینے کے بھی کوئی شخص نہ بتلا سکے۔ مثلاً یہ کہ مسجد کے کتنے دروازے ہیں، کتنے طاق ہیں وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں کون شمار کرتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اضطراب ہوا۔ مگر بطور معجزہ مسجد اقصیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کر دی گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم شمار کرتے اور بتاتے جاتے تھے ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اور قریش بھی اب تو سب کے سب چپ ہوئے اور کہنے لگے حالات وصفات تو بالکل درست بیان کئے ہیں۔ اور پھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے خطاب کر کے کہنے لگے کہ کیا تم تصدیق کرتے ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میں مسجد اقصیٰ تک پہنچ بھی گئے اور لوٹ بھی آئے؟ حضرت صدیق

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس سے بھی زیادہ بعید چیزوں میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، میں ایمان لاتا ہوں کہ صبح وشام ذراسی دیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانی خبریں پہنچ جاتی ہیں تو پھر اس میں کیا تردد ہوسکتا ہے۔ اس لئے بھی آپ رضی اللہ عنہ کا نام صدیق رکھا گیا ہے۔

خود کفار قریش کی چشم دید شہادتیں

اس کے بعد قریش نے پھر بغرض امتحان دریافت کیا اچھا بتلاؤ ہمارا قافلہ جو ملک شام کی طرف گیا ہوا ہے وہ کہاں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فلاں قبیلہ کے ایک تجارتی قافلے پر مقام روحا میں میرا گزر ہو رہا تھا ان کا اونٹ گم ہو گیا تھا، وہ سب اسی کی تلاش میں گئے ہوئے تھے، میں ان کے کجاووں کے پاس گیا تو وہاں کوئی نہ تھا اور ایک کوزہ میں پانی رکھا ہوا تھا وہ میں نے پی لیا تھا۔ اس کے بعد فلاں قبیلہ کے تجارتی قافلے پر فلاں مقام میں ہمارا گزر ہوا جب براق اس کے قریب ہوا تو اونٹ دہشت سے ادھر ادھر بھاگنے لگے اور ان میں ایک سرخ اونٹ تھا جس پر دو خروار (گون) سیاہ وسپید تھے، وہ تو بیہوش ہو کر گر گیا۔ اس کے بعد فلاں قبیلہ کے تجارتی قافلہ پر فلاں مقام میں ہمارا گزر ہوا جس میں سب سے آگے ایک خاکی رنگ کا اونٹ تھا اور اس پر سیاہ ٹاٹ اور دو سیاہ خروار (گون) تھے اور یہ قافلہ عنقریب تمہارے پاس آنے والا ہے لوگوں نے دریافت کیا کہ کب تک؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدھ کے روز تک آجائے گا۔

چنانچہ ٹھیک اسی طرح ہوا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ان قافلوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیانات کی تصدیق کی۔ جب قریش پر خدا کی حجت تمام ہو گئی اور اس محیر العقول سفر کی خود ان کی قوم نے شہادت دی تو اب معاندین کے لئے بھی اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سحر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (معاذ اللہ) جادوگر کہہ کر کھڑے ہو گئے۔

مدینہ طیبہ میں اسلام

دس سال تک برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب کو اعلان کے ساتھ دعوت

اسلام دیتے رہے اور عرب کی کوئی مجلس اور کوئی مجمع نہیں چھوڑا، جس میں جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تبلیغ حق نہ کی ہو۔ موسم حج میں بازار عکاظ اور ذی المجاز وغیرہ میں گھر گھر جا کر لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے مگر وہ اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچاتے اور مذاق اڑاتے تھے کہ پہلے اپنی قوم کو مسلمان بنائیے، پھر ہماری ہدایت کے لئے آیئے۔ اسی پر ایک مدت گزر گئی جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اسلام کی اشاعت اور ترقی ہو تو قبیلہ اوس کے چند آدمی مدینہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیئے جن میں سے اس سال دو شخص اسد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس مشرف باسلام ہوئے اور پھر آئندہ سال ان میں سے کچھ اور آئے جن میں سے چھ یا آٹھ آدمی مسلمان ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم پیغام خداوندی کی تبلیغ میں میری مدد کرو گے انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ابھی ہمارے آپس کی اوس اور خزرج کی خانہ جنگیاں ہو رہی ہیں۔ اگر اس وقت جناب مدینہ تشریف لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت پر سب کا اجتماع نہ ہو سکے گا۔ ابھی ایک سال اس کا ارادہ ملتوی فرما دیں۔ ممکن ہے کہ ہماری آپس میں صلح ہو جائے اور پھر اوس و خزرج مل کر اسلام قبول کر لیں۔ آئندہ سال ہم پھر حاضر خدمت ہونگے، اس وقت ﴿اس وقت مدینہ کی آبادی دو قسم کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ مشرکین اور اہل کتاب، مشرکین دو بڑے قبیلوں پر منقسم تھے۔ اوس اور خزرج اور یہ دونوں ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے اور تقریباً ایک سو بیس سال سے ان کے درمیان آپس میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ (سیرۃ طیبہ ص ۲۴۰ ج ۱) اسی طرح یہود بھی دو صفوں میں منقسم ہو گئے تھے بنو قریظہ اور بنو نضیر، یہ دونوں بھی آپس میں قدیم عداوتیں رکھتے تھے (بیضاوی مع حاشیہ) ۱۲ منہ۔﴾ اس کا فیصلہ ہو سکے گا۔ یہ حضرات واپس مدینہ آئے اور مدینہ میں سے سب سے پہلے مسجد نبوی رزیق میں قرآن پڑھا گیا۔

خداوند عالم کو منظور تھا کہ مدینہ میں اسلام کی اشاعت ہو، اس سال بھر کے عرصے میں اوس و خزرج کے اکثر جھگڑے مٹ گئے اور سال آئندہ حج کے موقعہ پر حسب وعدہ بارہ آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جن میں دس قبیلہ خزرج کے اور دو اوس

کے تھے، ان میں جو لوگ سال گذشتہ مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ اب مسلمان ہو گئے۔ اور سب کے سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے یہ بیعت چونکہ سب سے پہلے عقبہ ﴿یعنی جمرہ، وہ عقبہ جو منیٰ کے ابتدائی حصہ میں واقع ہے اور حج کرنے والے اس پر کنکریاں مارتے ہیں، بعد میں اس جگہ ایک مسجد بھی تعمیر کردی گئی تھی جو مسجد بیعت کے نام سے موسوم ہے۔﴾ کے پاس ہوئی تھی اس لئے اس کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا گیا۔ (سیرت حلبیہ ص ۲۲ ج ۱)

یہ لوگ مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ واپس آئے تو مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا تھا اور ہر مجلس میں یہی ایک بات رہ گئی۔

سب سے پہلا مدرسہ مدینہ طیبہ میں

مدینہ پہنچ کر اوس وخزرج کے ذمہ دار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا کہ یہاں الحمدللہ اسلام کی اشاعت ہو چکی ہے اب کسی صاحب کو ہمارے یہاں بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن شریف پڑھائے اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت اور ہمیں احکام شرعیہ کی تعلیم دے اور نماز میں ہمارے لئے امام بنے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر کو تعلیم قرآن کے لئے بھیج دیا اور اسلام میں سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد مدینہ طیبہ میں پڑ گئی۔ (سیرت طیبہ ص ۳۰۴ جلد ۱)

آئندہ سال حج کے ایام میں مدینہ طیبہ سے ایک بڑا قافلہ مکہ معظمہ پہنچا جن میں ستر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کیا اور ان سے عقبہ کے پاس رات کو ملنے کا وعدہ فرمایا حسب وعدہ نصف رات کے وقت سب لوگ جمع ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے اگرچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔

جب سب جمع ہو گئے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ یہ میرا بھتیجا (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیشہ اپنی قوم میں عزت وحفاظت کے ساتھ رہا ہے تم جو اس کو مدینہ لے جانا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ اگر تم ان کے عہد کو پورا کر سکو اور مخالفین

سے ان کی پوری حفاظت کر سکو تو اس کا ذمہ لو ورنہ ان کو اپنے قبیلہ میں رہنے دو، مدنی قبیلہ کے سردار نے کہا، بیشک ہم اس کا ذمہ لیتے ہیں اور ہمارا یہی قصد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو پورا کریں، یہ سن کر (عہد بیعت کو پختہ کرنے کے لئے) حضرت اسعد بن زرارہؓ بول اٹھے" اے اہل مدینہ، ذرا ٹھہرو، تم سمجھتے ہو کہ آج تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ سمجھ لو کہ یہ بیعت تمام عرب وعجم کے مقابلے اور مخالفت کا عہد ہے، اگر تم اس کو نباہ سکتے ہو تو عہد کرو، ورنہ عذر کر دو" اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم کسی حال میں اس بیعت سے ہٹنے والے نہیں، پھر عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہم نے اس عہد کو پورا کیا تو ہمیں اس کی کیا جزا ملے گی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا، اور جنت۔ یہ سن کر سب نے کہا کہ ہم اس پر راضی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دست مبارک دیجئے کہ ہم بیعت کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا اور سب بیعت سے مشرف ہوئے۔

خدا جانے اس رسول امین کی نظر فیض اثر اور چند کلمات نے ان لوگوں پر کیا اثر کیا تھا کہ ایک ہی صحبت میں تمام دنیوی علائق اور جاہ ومال اور عزت وآبرو اس کے مقابلہ پر قربان کر سکنے کے لئے کمر بستہ ہو گئے اور پھر یہ رنگ ان کی اولاد تک قائم رہا۔ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا جو شریک بیعت تھیں ان کے صاحبزادے حضرت حبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کو مسیلمہ کذاب مدعی نبوت نے گرفتار کر لیا اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھ کر نہایت بیدردی سے قتل کیا۔ لیکن اس عہد کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالا، یہ ظالم ان سے دریافت کیا کرتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو وہ فرماتے بیشک، پھر پوچھتا کہ اس کی بھی گواہی دیتے ہو کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں؟ تو فرماتے ہرگز نہیں۔ اس پر وہ ان کا ایک عضو کاٹ لیتا تھا پھر دوبارہ اسی طرح دریافت کرتا اور جب وہ اس کی نبوت ماننے سے انکار کرتے تو کم بخت ایک اور عضو کاٹ ڈالتا۔ اسی طرح ایک ایک عضو کر کے تمام بدن کے ٹکڑے کر دیئے (سیرت ص ۴۰۹) الغرض شہید ہو گئے اور باوجود جائز ہونے کے اس کو گوارا نہ کیا کہ عہد اسلام کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالیں۔

اگرچہ خرمن عمرم غم تو داد بباد　　　بخاک پائے عزیزت کہ عہد نشکستم

﴿ترجمہ:۔ تیرے غم نے اگرچہ میرے خرمن عمر کو برباد کر دیا لیکن تیرے قدم شریف کی قسم کہ میں نے تیرا عہد نہیں توڑا۔۱۲ منہ۔﴾

اس کے بعد سب نے بیعت کی اس وقت بیعت کرنے والوں کی تعداد تہتر مرد اور دو عورتیں تھیں اس بیعت کا نام عقبہ ثانیہ ہے۔ اس کے بعد سب نے ان میں سے بارہ آدمیوں کو تمام قافلہ کا ذمہ دار امیر بنایا۔

ہجرت مدینہ کی ابتداء

قریش کو جب اس بیعت کی خبر ہوئی تو ان کے غیظ کی انتہا نہ رہی اور مسلمانوں کو ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیا، صحابہ نے آہستہ آہستہ قریش سے خفیہ ایک ایک دو دو کر کے مکہ معظمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تھوڑے سے غیر مستطیع لوگوں کے علاوہ کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا تھا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کہ ابھی ٹھہرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ہجرت کی اجازت دیدے۔ صدیق اکبرؓ اس کے انتظار میں رہے اور دو اونٹنیاں اس سفر کیلئے مہیا کیں ایک اپنے لئے اور دوسری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے۔ (سیرت مغلطائی ص ۳۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ

کفار قریش کو جب حالات معلوم ہوئے تو دار الندوہ میں مشورہ کیلئے جمع ہوئے کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ کسی نے قید کرنے کی رائے دی اور کسی نے جلاوطن کرنے کی، مگر ان کے چالاک لوگوں نے کہا کہ وہ مناسب نہیں کیونکہ قید کرنے کی صورت میں ان کے اعوان و انصار ہم پر چڑھ آئیں گے اور ہم سے چھڑا لیں گے اور جلاوطن کرنے کی صورت تو سراسر ہمارے لئے مضر ہے کیونکہ اس صورت میں اطراف مکہ کے عرب

تمام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق اور شیریں کلام اور کلام پاک کے گرویدہ ہو جائیں گے اور وہ ان سب کو لے کر ہم پر چڑھائی کریں گے۔ (سیرت مغلطائی) اس لئے بدبخت ابوجہل نے یہ رائے دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا جائے اور قتل میں ہر قبیلے کا ایک ایک آدمی شریک ہوتا کہ بنی عبد مناف (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ) بدلہ لینے سے عاجز ہو جائے سب نے اس رائے کو پسند کیا، اور ہر قبیلے کا ایک ایک جوان اس کام کے لئے مقرر کر دیا کہ فلاں رات میں یہ کام کیا جائے۔ ادھر خداوند عالم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مشورہ کی اطلاع دیدی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم فرمایا۔ جس رات میں کفار قریش نے اپنے خیال خام کو پورا کرنے کا ارادہ کیا اور مختلف قبائل کے بہت سے جوان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کر کے بیٹھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ اور حضرت علیؓ کو ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار پائی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھ کر سو جائیں تاکہ کفار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نہ ہونے کا علم نہ ہو۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے تو دروازے پر قریش کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے باہر نکلے اور جب آیت فَاَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۔ پر پہنچے تو اس کو کئی مرتبہ دوہرایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے وہ پہلے ہی سے تیار تھے اور ایک راستہ بتانے والے کو بھی اپنے ساتھ لے چلنے کیلئے تیار کر رکھا تھا۔ صدیق اکبرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ہو لئے اور مکان کی پشت کی جانب سے ایک کھڑکی کے راستے سے دونوں باہر نکلے اور ثور کی طرف تشریف لے گئے (ثور مکہ کے قریب ایک پہاڑ ہے)

غار ثور کا قیام

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پہاڑ کے ایک غار میں جا کر ٹھہر گئے ادھر یہ قریشی جوان صبح تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر یہ معلوم ہوا کہ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ علیؓ ہیں تو سخت پریشان ہوئے اور چاروں طرف اپنے قاصد آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کی تلاش میں بھیجے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرفتار کرنے پر سو اونٹ کا انعام مقرر کیا۔ بہت سے آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور بعض قیافہ شناس لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم پر تلاش کرتے ہوئے ٹھیک اس غار کے کنارے پر پہنچ بھی گئے کہ اگر ذرا جھک کر دیکھتے تو صاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے تھے۔ اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ غمگین ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ خدا کی قدرت کہ ان سب کی نظریں اس غار سے پھیر دی گئیں اور کسی نے جھک کر نہ دیکھا بلکہ انکے سب سے بڑے چالاک امیہ بن خلف نے کہا کہ یہاں ان کا ہونا ہی محال ہے کیونکہ بحکم خداوندی اس غار کے دروازے پر رات رات میں مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور جنگل کے کبوتر نے گھونسلا بنالیا تھا حاشیہ نمبر (۱) حضرت سہیل فرماتے ہیں کہ حرم کے کبوتروں کی نسل اس کبوتر سے چلی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس غار میں تین رات متواتر چھپے رہے، یہاں تک کہ تلاش کرنے والے مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ ان تینوں دنوں میں برابر صدیق اکبرؓ کے صاحبزادے عبداللہ رات کو خفیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور صبح سے پہلے ہی مکہ پہنچ جاتے تھے دن بھر قریش کی خبریں سن کر راتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کرتے تھے اور انکی بہن اسماء بنت ابوبکرؓ ہر رات میں کھانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچاتی تھیں چونکہ عرب کے لوگ نشان قدم کو بہت پہنچانتے تھے اس لئے عبداللہ نے اپنے غلام سے کہہ رکھا تھا کہ روزانہ بکریاں چرانے کیلئے اس غار تک لے جایا کرے تا کہ انکے نشانات قدم مٹ جائیں۔

غارِ ثور سے مدینہ کی طرف روانگی

غار ثور کے قیام کے تیسرے دن ربیع الاول ۱ھ بروز پیر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ دونوں اونٹنیاں لیکر پہنچے جو اسی سفر کیلئے حضرت صدیقؓ نے مہیا کی تھیں اور ان کے ساتھ عبداللہ بن اریقط بھی پہنچے جن کو راستہ بتلانے کیلئے اجرت دیکر ساتھ لے لیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ناقہ پر سوار ہو گئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دوسری پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو بھی خدمت کیلئے بٹھالیا اور عبداللہ بن اریقط آگے آگے راستہ دکھانے کیلئے چلے۔ (سیرت مغلطائی)

سراقہ بن مالک کا راستہ میں پہنچنا اور اس کے گھوڑے کا زمین میں دھنسنا

قاصدوں میں سے سراقہ بن مالک جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں پھر رہا تھا یہاں تک پہنچ گیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سراقہ گر پڑا مگر پھر سوار ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت قرآن کی آواز سنی، اس وقت صدیق اکبرؓ بار بار مڑ کر اس کو دیکھتے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف التفات ہی نہ کیا جب زیادہ قریب آ گیا تو اس کے گھوڑے کے چاروں پاؤں زمین کے خشک اور سخت ہونے کے باوجود گھٹنوں تک اندر اتر گئے اور سراقہ دوبارہ زمین پر گر پڑا۔ اب ہر چند گھوڑے کو نکالتا ہے مگر وہ نہیں نکلتا۔ مجبور ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پناہ مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے گھوڑا وہاں سے نکل آیا۔ (سیرت مغلطائی)

جب گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکلے تو پاؤں کی جگہ سے ایک دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کو دیکھ کر سراقہ اور بھی زیادہ ششدر رہ گیا اور نہایت عاجزی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے توشہ اور موجود سامان اونٹ وغیرہ پیش کرنے لگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جب تم اسلام قبول نہیں کرتے تو ہم بھی تمہارے اونٹ وغیرہ قبول نہیں کرتے۔ پس اتنا کافی ہے کہ تم ہمارے حال کو کسی سے بیان نہ کرو، سراقہ ادھر سے واپس ہوا اور جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خطرہ ہو سکتا تھا اس وقت تک کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ ﴿ابوجہل کی کنیت عرب میں ابوحکم تھی مگر اسلام سے منحرف ہونے سے اس کو ابوجہل کا خطاب دیا، اس مضمون کو کسی نے اس شعر میں خوب ادا کیا ہے:

"الناس کنوہ ابا حکم واللہ ابوجہل"۔﴾ (حلبیہ ص ۴۳۶ ج ۱۰)

سراقہ کی زبان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف

کچھ دنوں کے بعد سراقہ نے ابوجہل سے اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد چند اشعار

پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ابوحکم (ابوجہل) لات کی قسم، (لات ایک بت کا نام ہے جس کی قریش پوجا کرتے تھے) اگر تم اس گھوڑے کے زمین میں دھنس جانے کا مشاہدہ کرتے تو تمہیں اس بات میں شک کی گنجائش نہ رہتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ میری رائے میں تمہیں لازم ہے کہ ان کی مخالفت سے خود بھی اجتناب کرو اور لوگوں بھی منع کرو، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی کامیابی کے نشانات اس طرح چمک جائیں گے کہ تمام انسان اس کی تمنا کریں گے کہ کاش ہم ان سے صلح کر لیتے'' (سیرت مغلطائی ص ۳۵)

اباحکم واللات لو کنت شاھدا لامر جواد اذ تسرخ قوائمه
عجت ولم تشکک بان محمدا نبی و برھان فمن ذا یقاومه
علیک بکف الناس عنه فاننی لدی امره یوما ستبدو معالمه
بامر یود الناس فیه باسرھم لو بان جمیع الناس طریسالمه

اصلی اشعار یہ نہیں۔ یہ اشعار مغلطائی کے نسخہ میں غلط تھے ان کی تصحیح روض الانس ص ۶ ج ۲ سے کی گئی ہے ۱۲۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ

ام معبد رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند رضی اللہ عنہ کا اسلام

راستہ میں ایک عورت (ام معبد بنت خالد) کے مکان پر گزر ہوا ان کی بکری جو بالکل دودھ نہ دیتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیر دیا تو وہ دودھ سے بھر گئے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا اور یہ برکت اسی طرح برابر جاری رہی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے رخصت ہوئے تو ام معبد کا خاوند آیا اور بکری کے دودھ کے متعلق یہ عجیب واقعہ دیکھ کر حیران رہ گیا، سبب پوچھا تو ام معبد نے کہا کہ ایک نہایت شریف و کریم جوان آج ہمارے یہاں تھوڑی دیر کے لئے مہمان ہوئے تھے یہ سب ان کے ہاتھ کی برکت ہے، خاوند یہ سن کر کہنے لگا، بخدا یہ تو وہی مکہ

والے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ اس کے بعد ان دونوں نے بھی ہجرت کی اور مدینہ پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔

نزول قبا

یہاں سے روانہ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبا پہنچے (یہ مدینہ کے قریب ایک مقام ہے) انصار کو جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کی خبر پہنچی تھی روزانہ استقبال کے لئے بستی سے باہر آتے تھے اس روز بھی حسب دستور انتظار کر کے واپس ہو گئے تھے کہ یکا یک ایک آواز سنی گئی کہ جن کا انتظار تھا تشریف لے آئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لاتے ہوئے دیکھ کر سب نے جوش مسرت سے استقبال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء نے چودہ روز قبا میں قیام ﴿ قیام قبا کے متعلق اقوال تین دن اور چار یا پانچ دن اور بعض روایات میں بائیس دن مذکور ہیں (سیرت مغلطائی ۳۶) ﴾ فرمایا،اسی عرصہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی اور یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو اسلام میں بنائی گئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہجرت اور قبا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جانا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت داری چونکہ کفار کو بھی مسلم تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اکثر لوگوں کی امانتیں رہتی تھیں وقت ہجرت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے پیچھے چھوڑا تھا کہ جو امانتیں لوگوں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھیں وہ ان کے سپرد کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ بھی مدینہ پہنچ جائیں۔

اسلامی تاریخ کی ابتداء

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اسلامی تاریخ کی ابتداء حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی اور اس کا پہلا مہینہ محرم کو قرار دیا۔﴿ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے رسالہ الشماریخ فی علم التاریخ میں اس کی تائید کی ہے ۱۲ منہ۔ ﴾

مدینہ طیبہ میں داخل ہونا

ماہ ربیع الاول بروز جمعہ قبا سے رخصت ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف روانگی ہوئی انصار مدینہ جوش مسرت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے ارد گرد چل رہے تھے کوئی پیدل کوئی سوار ہر شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ کی باگ تھامنے میں پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ ہر شخص کی دلی تمنا تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے یہاں مقیم ہوں، عورتیں، بچے خوشی کے ترانے پڑھ رہے تھے، یہ چونکہ جمعہ کا دن تھا، بنی سالم بن عوف کے مکانات کے قریب جمعہ کا وقت ہو گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے اترے اور جمعہ ادا کرنے کے بعد پھر سوار ہوئے اب جس انصاری کا مکان راستہ میں پڑتا تھا وہ التجا کرتا ہے کہ میرے غریب خانہ پر قیام فرمایئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ننھیال بنی عدی بن نجار کے مکانات آ گئے تو ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے جا کر اونٹنی بیٹھ گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوایوبؓ کے مکان پر مہمان ہوئے اور ایک مدت تک انہی کے مکان پر مقیم رہے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر

اس وقت مدینہ میں کوئی مسجد موجود نہیں تھی، جس جگہ موقعہ ملتا نماز ادا کی جاتی تھی، اس کے بعد وہ جگہ خریدی گئی جس جگہ ناقہ بیٹھی تھی اس جگہ مسجد نبوی کی تعمیر کی گئی ۞ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس میں اور جگہ بڑھائی مگر تعمیر اسی وضع کی باقی رکھی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں اس میں بہت بڑا اضافہ اور تغیر کیا جگہ بھی بہت بڑھا دی اور دیواریں منقش پتھروں اور چاندی کے نقش و نگار سے آراستہ اور ستون منقش پتھروں اور چھت سال کی لکڑی کی بنائی پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ولید بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں اسکے حکم سے مسجد میں اور توسیع کی اور ازواج مطہرات کے حجرات بھی اس میں شامل کر دیئے اس کے بعد ۱۶۰ھ میں خلیفہ مہدی نے اور اس کے بعد ۲۰۲ھ میں مامون نے اس میں توسیع، تغیرات کئے اور اس کی بنیاد کو خوب مضبوط کر دیا (سیرت مغلطائی ۳۷) اس کے بعد سلاطین آل عثمان نے نہایت عمدہ تعمیر کی جو اب تک موجود ہے اور اب موجودہ

شاہ سعود اور شاہ فیصل نے توسیع کی ہے۔ ﴾ جس کی دیوار کچی اینٹوں کی، ستون کھجور کے درخت کے، لکڑی اور چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی تھی اور قبلہ کا رخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا (جو اس وقت مسلمانوں کا قبلہ تھا) مسجد کے ساتھ دو حجرے بھی بنائے گئے ایک حضرت عائشہؓ کیلئے اور دوسرا حضرت سودہؓ کیلئے، اسکے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو مکہ بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آل وعزت کو مدینہ طیبہ لے آئے اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی سب اہل وعیال کو مدینہ بلوالیا۔ چنانچہ ام المومنین سودہؓ اور دو صاحبزادیاں فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا مدینہ آ گئیں تیسری صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو انکے خاوند ابوالعاص نے (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) نہ آنے دیا اور ادھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ اپنی مادر اور دونوں بہنوں عائشہ اور اسماءؓ کو ساتھ لیکر مدینہ پہنچے۔ اور اب مکہ میں صرف چند مسلمان رہ گئے جن کو سفر کی طاقت نہیں تھی بلکہ بعض ایسے لوگ بھی وہاں سے چل نکلے کہ راستہ ہی میں ان کی وفات ہوگئی۔

مشروعیت جہاد ۱ ھ

سریہ حمزہؓ، سریہ عبیدہؓ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترپین سالہ زندگی کا اجمالی نقشہ ناظرین کے سامنے آ چکا ہے کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا میں اسلام کی اشاعت کس طرح ہوئی اور وہ ہر طبقہ اور ہر قبیلہ کے ہزار ہا انسان جو ہجرت تک اسلام کے حلقہ بگوش بن کر کچھ ایسے مست ہوئے تھے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مال آباؤ اجداد بیویوں اور بچوں سے بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے، ان کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب کیا تھا، حکومت کا جبر واکراہ تھا یا کوئی لالچ اور جاہ کی طمع تھی یا کوئی پرشوکت جمعیت تھی جس پر تلوار نے ان کو مجبور کیا تھا یا کچھ اور؟ لیکن جب اس نبی امی (ان پر میرے ماں باپ فدا ہوں) صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات طیبات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بلا وہم اختلاف ان سب کا جواب نفی میں ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ یتیم جس کے والد کا سایہ دنیا میں آنے سے

پہلے ہی اس کے سر سے اٹھ چکا ہو اور جس کو بچپن کے چھٹے سال میں والدہ کی آغوش شفقت سے بھی جواب مل گیا ہو جس کے گھر میں مہینوں آگ جلنے کی بھی نوبت نہ آتی ہو جس کے گھر والوں نے کبھی پیٹ بھر روٹی نہ کھائی جس کے رہے سہے عزیز و اقارب بھی ایک کلمہ حق کہنے کی وجہ سے نہ صرف یکسو بلکہ سخت دشمن ہو گئے ہوں وہ کیا کسی پر حکومت کر سکتا یا مال کے لالچ سے یا تلوار کے زور سے کسی کو اپنا ہم خیال بنا سکتا تھا؟ اس کے علاوہ تاریخ کے دفتر سامنے ہیں جن میں بلا اختلاف موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے یہ ترپین سال اس طرح گزرے کہ ابتدائی بے سروسامانی و بے کسی کے بعد جب اسلام کو ایک ظاہری قوت بھی حاصل ہوئی اور بڑے بڑے شجاع و بہادر اور متمول صحابہ داخل اسلام بھی ہو گئے اس وقت بھی اسلام نے کسی کافر پر ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ ظالموں کے ظلم کا جواب تک نہیں دیا حالانکہ کفار مکہ کی طرف سے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام متعلقین آل و اتباع پر بھی وہ مظالم ڈھائے گئے کہ بیان اور تحریر میں نہیں آسکتے کفار قریش نے جو ہر قسم کی قوت و شوکت رکھتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء رسانی بلکہ قتل کرنے میں کوئی امکانی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا جیسا کہ تین سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مع اپنے متعلقین کے محصور رہنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریش کا مکمل مقاطعہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے سازشیں، صحابہ کرامؓ کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچانا وغیرہ وغیرہ، آپ معلوم کر چکے ہیں یہ سب کچھ تھا، مگر قرآن اپنے پیروؤں کو صبر و استقلال کے سوا کسی حربہ کے استعمال کی اجازت نہ دیتا تھا، ہاں اس وقت جس جہاد کا حکم تھا وہ یہ کہ کفار کو حکمت ﴿آیت: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَن کا یہی مضمون ہے ۱۲۔﴾ اور نصیحت کی باتوں سے اپنے رب کی طرف بلاؤ اور اگر باہمی مقابلے کی نوبت آئے تو حسن تدبیر اور نرم کلام سے ان کا مقابلہ کریں اور قرآن ﴿آیت عزی کرو کا یہی مطلب ہے ۱۲ منہ۔﴾ کے دلائل واضحہ سے ان کے ساتھ پورا جہاد کرو تا کہ وہ حق کو سمجھ لیں، اس وقت تک جو ہزارہا انسان اسلام کے حلقہ بگوش بن کر ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بننے پر راضی ہوئے ظاہر ہے کہ وہ کسی دنیوی طمع یا

حکومت کے جبر یا تلوار کے ذریعہ سے مجبور نہیں ہو سکتے، اس کھلی ہوئی ہدایت کو دیکھتے ہوئے بھی کیا وہ لوگ خدا سے نہ شرمائیں گے جو اسلام کی حقانیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا، کیا وہ اس کا کوئی جواب دے سکتے ہیں کہ ان تلوار چلانے والوں پر کس نے تلوار چلائی تھی جو نہ صرف مسلمان بنے بلکہ اسلام کی حمایت پر تلوار اٹھانے اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے پر راضی ہو گئے، کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ ابوبکر صدیق، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضی رضی اللہ عنہم اجمعین پر کس نے تلوار چلا کر ان کو مسلمان بنایا تھا۔ اور ابوذر رضی اللہ عنہ وانیس رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلہ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے، ضماد ازدی کو کس نے مجبور کیا تھا اور طفیل بن عمرو دوسی اور ان کے قبیلہ پر کس نے تلوار چلائی اور قبیلہ بنی عبدالاشھل کو کس نے دبایا تھا اور تمام انصار مدینہ پر کس نے زور دیا تھا جنہوں نے فقط اسلام قبول نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں بلا کر تمام ذمہ داری اپنے سر لی اور اپنے جان و مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کئے، بریدہ اسلمیؓ کو کس نے مجبور کیا کہ ستر آدمیوں کی جماعت لے کر مدینہ کے راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور برضا و رغبت مسلمان ہو گئے۔ نجاشی بادشاہ حبشہ پر کون سی تلوار چلی تھی کہ باوجود اپنی سلطنت و شوکت کے قبل از ہجرت مسلمان ہو گئے، ابو ہند اور تمیم اور نعیم وغیرہ وغیرہ پر کس نے زور دیا تھا کہ ملک شام سے سفر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچیں اور آپ کی غلامی اختیار کریں اور اسی قسم کے صدہا واقعات جن سے کتب ﴿یہ سب واقعات رسالہ حمیدیہ سے لئے گئے ہیں۔﴾ تاریخ بھری ہوئی ہیں یہ ناقابل انکار مشاہدات ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان یہ یقین رکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اہم غزوات وسرایا اور واقعات متفرقہ

پہلا سریہ امارت حمزہؓ

ہجرت کے سات مہینہ کے بعد ماہ رمضان المبارک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو تیس مہاجرین پر امیر لشکر بنا کر ایک سفید جھنڈا عطا فرمایا اور قریش

کے ایک قافلہ کی طرف روانہ کیا، لیکن جب یہ حضرات دریا کے کنارے پر پہنچے اور باہمی مقابلہ ہوا تو مجدی بن عمرو جہنی نے درمیان میں پڑ کر جنگ کو روک دیا۔

سریہ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ اور اسلام میں تیر اندازی کا آغاز

پھر شوال ۱ھ میں حضرت عبیدہ بن الحارث کو ساٹھ آدمیوں کا امیر لشکر بنا کر بطن رابغ کی طرف ابوسفیان کے مقابلہ کے لئے روانہ فرمایا، اسی جہاد میں اول تیر سعد بن ابی وقاصؓ نے کفار پر پھینکا اور یہ سب سے پہلا تیر ہے جو اسلام میں کفار پر چلایا گیا تھا۔

۲ھ تحویل قبلہ، سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ، غزوۂ بدر

اس سال سے اسلام کی زندگی میں ایک عظیم الشان تغیر یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قبلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار دیا جاتا ہے، جو دنیا کا پہلا گھر ہے اور جسے لوگوں کو یکجہتی کے ساتھ خدا کی عبادت پر مجتمع کرنے کے لئے مرکوز توجہ بنایا گیا ہے۔

سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور اسلام میں پہلی غنیمت

اسی سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ مہاجرین پر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر ماہ رجب میں مقام نخلہ میں ایک قریشی قافلہ کے لئے روانہ فرمایا جس روز قافلہ سامنے آیا تو اتفاقاً ماہ رجب کی پہلی تاریخ تھی اور رجب ان مہینوں میں سے ہے جن میں ابتداءِ اسلام میں قتل وقتال حرام تھا لیکن حضرات صحابہ اس تاریخ کو جمادی الثانیہ کی تیسویں تاریخ سمجھ رہے تھے جیسا کہ لباب النقول اور بیضاوی میں ابن جریر اور بیہقی سے نقل کیا ہے اس لئے مشورہ کے بعد یہی قرار پایا کہ مقابلہ کرنا چاہئے مقابلہ ہوا تو رئیس قافلہ مارا گیا اور دو آدمی گرفتار ہوئے، باقی بھاگ گئے اور مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا، جو امیر سریہ نے شرکاء جہاد میں تقسیم کر دیا اور پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکال رکھا اور بعض روایات میں ہے کہ کل مال غنیمت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہیں شہر حرام یعنی رجب

میں مقابلہ کا حکم نہ دیا تھا، یہ مال غنیمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے فارغ ہونے کے بعد اس کے مال غنیمت کے ساتھ تقسیم کیا۔

اس واقعہ سے عرب میں یہ چرچا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشہر حرام میں قتال کو جائز کر دیا اس وقت آیت کریمہ "یَسئَلُونَکَ عَنِ الشَّھرِ الحَرَام" ان کے جواب کیلئے نازل ہوئی۔

غزوۂ بدر

مدینہ منورہ سے تقریباً اسی میل کے فاصلہ پر ایک کنویں کا نام بدر ہے اور اسی کے نام سے ایک گاؤں کی آبادی بھی ہے، یہ عظیم الشان جہاد اسی سرزمین پر وقع ہوا جس کا واقعہ بالاختصار یہ ہے۔

قریش کا مایہ ناز اوران کی تمام تر قوت وشوکت کا سبب چونکہ ملک شام کی تجارت تھی اس لئے سیاسی اصول کے مطابق ضرورت تھی کہ ان کی شوکت توڑنے کے لئے اس سلسلہ کو بند کیا جائے۔ ایک مرتبہ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ملک شام سے آرہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو ۱۲ رمضان المبارک ۲ ھ کو تین سو چودہ صحابہ مہاجرین وانصار کو ساتھ لے کر مقابلے کے لئے خود بنفس نفیس تشریف لے گئے، روحا میں پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا (روحا مدینہ کی جنوبی جانب میں چالیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے) ادھر قریشی قافلے کے سردار کو اس کی اطلاع ہوگئی اس لئے وہ راستہ چھوڑ کر دریا کے کنارے کنارے قافلہ کو لے چلا اور ساتھ ہی ایک سوار کو مکہ کی طرف دوڑایا کہ قریش اپنی پوری طاقت کے ساتھ جلد موقعہ پر پہنچیں اور اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کریں، قریش پہلے ہی مسلمانوں کے استیصال کے منصوبے گانٹھ رہے تھے، اس خبر کا مکہ میں پہنچنا تھا کہ فوراً نوسو پچاس نوجوانوں کا ایک بڑا لشکر جن میں سو گھوڑے کے سوار اور سات سو اونٹ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کے لئے روانہ ہوگیا، اس لشکر میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور متمول لوگ سب کے سب شریک تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانثاری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ

سے مشورہ کیا، اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی جان و مال کو پیش کر دیا، عمر بن وقاصؓ اس وقت کم عمر تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شرکت جہاد سے روک دیا تو وہ رونے لگے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت عطا فرمائی اور وہ بھی شریک جہاد ہوئے، انصار میں قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا کہ خدا کی قسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں (صحیح مسلم) اور بخاری کی روایت میں ہے کہ مقدادؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے لڑیں گے، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت مسرور ہوئے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا، بدر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابوسفیان تو اپنے قافلہ تجارت کو لے کر نکل گیا ہے اور قریش کا بڑا لشکر اسی میدان کے دوسرے کنارے پڑا ہے اور قافلہ نکل جانے کے بعد بھی ابوجہل نے لوگوں کو یہی مشورہ دیا کہ جنگ کو ملتوی نہ کیا جائے مسلمانوں کا لشکر یہ سن کر آگے بڑھا، لیکن قریش پہلے پہنچ کر ایسی جگہ پر قابض ہو چکے تھے جو جنگی محاذ کے لئے بہتر تھی۔ پانی کے مواقع بھی سب اسی طرف تھے۔ مسلمان پہنچے تو ایسی ریتلی زمین ان کے حصہ میں آئی کہ اس میں چلنا دشوار ہونے کے علاوہ پانی کا نام نہیں۔

غیبی امداد

لیکن خداوند عالم فتح و نصرت کا وعدہ فرما چکا تھا، ایسے ہی اسباب مہیا فرما دیئے کہ اسی وقت بارش ہوئی جس سے زمین کا ریت جم گیا، تمام لشکر نے سیراب ہو کر پانی پیا اور پلایا، اپنے برتن سب بھر لئے اور زمین میں باقی ماندہ زمین کو حوض بنا کر روک دیا گیا، ادھر اسی بارش نے کفار کی زمین پر اس قدر کیچڑ پیدا کر دیا کہ چلنا مشکل ہو گیا جب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صفوف قتال کو درست کرنے کے لئے خود کھڑے ہوئے چنانچہ یہ لشکر ایک مستحکم دیوار کی صورت بن کر کھڑا ہو گیا۔

مسلمانوں کا ایفاء وعدہ

اس وقت جب کہ تین سو بے سروسامان آدمیوں کا مقابلہ ایک ہزار باشوکت کافروں سے ہے ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص بھی اس وقت ان کی امداد کو پہنچ جائے تو وہ کس قدر غنیمت

معلوم ہوگا لیکن اسلام میں پابندی عہد ان سب باتوں سے مقدم ہے، عین میدان کارزار میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ابو حسل رضی اللہ عنہ دو صحابی شرکت جہاد کے لئے پہنچتے ہیں مگر اپنے راستے کا حوالہ بیان کرتے ہیں کہ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کو جارہے ہو، ہم نے انکار کیا، اور عدم شرکت کا وعدہ کرلیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وعدہ کا علم ہوا تو دونوں کو شرکت جہاد سے روک دیا اور فرمایا کہ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے ہمیں اللہ کی امداد کافی ہے اور بس۔ (صحیح مسلم)

الغرض صفیں درست ہوگئیں تو پہلے قریش کے تین بہادر نکلے مسلمانوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب اور عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ نے ان کا مقابلہ کیا تینوں کافر قتل ہوگئے مسلمانوں میں صرف عبیدہ زخمی ہوئے، حضرت علیؓ نے ان کو کندھے پر اٹھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پائے مبارک سے تکیہ لگا کر ان کے چہرے کا غبار خود دست مبارک سے صاف فرمایا۔

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو　　رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے

عبیدہ رضی اللہ عنہ نے دم توڑتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں شہادت سے محروم رہا آپ نے فرمایا کہ نہیں تم شہید ہو اور میں اس پر گواہ ہوں اب تو عبیدہؓ مسرت سے کہنے لگے کہ آج ابو طالب زندہ ہوتے تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ ان کے اشعار کا پورا مستحق میں ہوں جب عبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو خود سرور کائنات ان کی قبر میں اترے اور اپنے دست مبارک سے دفن کیا یہ امتیازی فضیلت تمام صحابہ میں صرف عبیدہ رضی اللہ عنہ کا حصہ تھا (کنز) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب جو ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سرگرم تھے انہوں نے اپنے جذبہ حمایت کو ان اشعار میں ادا فرمایا تھا۔

كذبتم و بيت الله نبزى محمد　　ولما نطاعن دونه ونناضل

ونسلمه حتى نصرع حوله　　ونذهل عن ابنائنا والحلائل

﴿یعنی بیت اللہ کی قسم تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر سخت نیزہ بازی اور تیر اندازی کے سپرد خاک کردیں گے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے سپرد کر

دیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری لاشیں آپ کے گرد پڑی ہوں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں کو بھول جائیں (از کنز ص ۲۷۲ ج ۵)﴾

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے　کو بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

صحابہؓ کا حیرت انگیز ایثار و جانبازی

اس وقت جب دونوں لشکر ملے تو دیکھا گیا کہ بہت سے اپنے ہی لخت جگر تلواروں کی زد میں ہیں مگر اس حزب اللہ کا عقیدہ تھا

ہزار خویش کہ بیگان از خدا باشد　فدائے یکتن بیگانہ کاشنا باشد

﴿یعنی ہزار قریبی رشتہ دار جو اللہ تعالیٰ سے بیگانہ ہوں اس ایک شخص پر فدا ہوں جو آشنائے حق ہو۔﴾

چنانچہ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بیٹے جو اب تک کافر تھے، میدان میں آئے تو خود حضرت صدیق کی تلوار ان کی طرف بڑھی عتبہ سامنے آیا تو اس کے فرزند حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر باہر نکلے حضرت عمرؓ کا ماموں میدان میں بڑھا تو فاروقی تلوار نے خود اس کا فیصلہ کیا۔

(سیرت ابن ہشام واستیعاب ابن عبدالبر)

اس کے بعد گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی، ادھر میدان کارزار گرم تھا ادھر سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں پڑے ہوئے فتح و نصرت کی دعا مانگ رہے تھے بالآخر غیبی شہادت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن فرمایا۔

ابوجہل کی ہلاکت

چونکہ ابوجہل کی شرارت اور اسلام کی دشمنی سب میں مشہور ہے اس لئے انصار میں سے حضرت معوذ رضی اللہ عنہ اور معاذ رضی اللہ عنہ دونوں بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ وہ جب ابوجہل کو دیکھیں گے تو یا اسے مار دیں گے یا خود مر جائیں گے اس عہد پر یہ دونوں بھائی اپنا عہد پورا کرنے کیلئے نکلے مگر ابوجہل کو پہچانتے نہ تھے اس لئے عبدالرحمٰن بن عوف سے پوچھا کہ ابوجہل کونسا ہے انہوں نے اشارہ سے بتلا دیا، بتلانا تھا کہ دونوں باز کی طرح اس پر ٹوٹ

پڑے ابوجہل اسی وقت خاک وخون میں تھا ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے (جو بعد میں مسلمان ہوئے) پیچھے سے آکر معاذ کے شانہ پر تلوار ماری جس سے شانہ کٹ گیا مگر ایک تسمہ باقی رہا۔ معاذ نے عکرمہ کا تعاقب کیا مگر وہ بھاگ گئے پھر معاذ اسی حالت میں مصروف جہاد ہو گئے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے تکلیف ہوتی تھی اس لئے ہاتھ کو نیچے دبا کر کھینچا کہ وہ تسمہ بھی الگ ہو گیا اور پھر مصروف جہاد ہو گئے۔ (سیرت حلبیہ ص ۴۵۵ ج ۱)

ایک عظیم الشان معجزہ ایک مٹھی کنکروں سے سارے لشکر کو شکست اور ملائکہ کی امداد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی ایک مٹھی بھر کنکریاں دشمن کے لشکر کی طرف پھینکیں اور پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ دفعۃً ان پر ٹوٹ پڑو، ادھر ظاہری اسباب میں صحابہ کی تھوڑی سی جماعت ان کی طرف بڑھی اور ادھر خداوند عالم نے ملائکہ کی فوج مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیج دی اور اپنا وعدہ نصرت پورا فرما دیا، قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور باقی کے پاؤں اکھڑ گئے، بھاگنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا ان میں بعض کو قتل اور بعض کو قید کر لیا۔ جس میں ستر آدمی مقتول اور ستر گرفتار ہوئے قریش کے بڑے بڑے سردار، عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ بن خلف سب ایک ایک کر کے مارے گئے اور ادھر مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے، چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے۔

تنبیہ: یہ غزوہ دراصل اول سے آخر تک اسلام کا کھلا معجزہ تھا ورنہ اس میں مسلمانوں کی فتح کوئی معنی نہیں رکھتی، کیونکہ ادھر ایک ہزار نوجوانوں کا عظیم الشان لشکر ہے اور ادھر صرف تین سو چودہ آدمی، ادھر بڑے بڑے دولت مند امراء ہیں جو تنہا سارے لشکر کی رسد وغیرہ کا خرچ خود اٹھا سکتے ہیں اور ادھر بے سروسامان مفلس لوگ، ادھر سواروں کی جمعیت اور ادھر مسلمانوں کے لشکر میں صرف دو گھوڑے، ادھر ہر قسم کے ہتھیار واسلحہ کی بھرمار اور ادھر صرف معدود تلواریں۔

یورپین مؤرخین حیرت میں ہیں کہ یہ کیسے ہو گیا انہیں خبر نہیں کہ فتح ونصرت، کامیابی یا

ناکامی گھوڑوں اور تلواروں یا مال و دولت کے قبضے میں نہیں ہیں بلکہ اس میں اور کوئی ہاتھ کار فرما ہے لیکن اسباب ظاہری کے دلدادہ، برق و بھاپ کے پوجنے والے کہاں اس حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ اکبر نے خوب کہا ہے ؎

چھوڑ کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

اسیران جنگ بدر کیساتھ مسلمانوں کا سلوک، تہذیب کے مدعی یورپینوں کے لئے سبق

اسیران جنگ بدر جب مدینہ طیبہ پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو چار چار کر کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم کر دیئے اور سب کو حکم فرمایا کہ ان کو آرام کے ساتھ رکھیں جس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابوعزیز بھی ان قیدیوں میں تھے ان کا بیان ہے کہ مجھے جن انصار کے سپرد کیا گیا تھا جب وہ کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے۔

اسیران جنگ کے معاملہ میں بعد مشورہ صحابہ یہ طے ہوا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے چنانچہ چار چار ہزار فدیہ لیکر چھوڑ دیا گیا۔

اسلامی مساوات

ان قیدیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے (جو بعد میں مسلمان ہوئے) حضرت عباس رضی اللہ عنہ رات کو قید کی تکلیف سے کراہتے تھے ان کی آواز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش مبارک میں پہنچی تو نیند اڑ گئی لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو نیند کیوں نہیں آئی ارشاد ہوا کہ میں کیسے سو سکتا ہوں جب کہ میرے عم بزرگوار کے کراہنے کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ (کنز ص ۲۷۶ ج ۵)

یہ سب کچھ تھا مگر مساوات اسلامی اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ اپنے ضعیف العمر

بزرگوار کو قید سے رہا کر دیا جائے، جس طرح سب سے فدیہ لیا گیا ان سے بھی اسی طرح وصول کیا گیا بلکہ عام قیدیوں کی نسبت سے کچھ زیادہ کیونکہ عام اسیروں سے چاز ہزار اور امراء سے کچھ زیادہ لیا گیا، حضرت عباس بھی غنی تھے ان کو بھی چار ہزار سے زیادہ دینا پڑا، انصار نے بھی عرض کیا کہ عباس سے فدیہ معاف کر دیا جائے مگر اسلامی مساوات میں عزیز واقارب اور دوست دشمن سب برابر تھے انصار کے کہنے پر بھی یہ قبول نہیں کیا گیا، اسی طرح آپ کے داماد حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ بھی اسیران جنگ میں آئے ان کے پاس فدیہ کیلئے مال نہ تھا اس لئے ان کی زوجہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو جو مکہ میں مقیم تھیں کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں ان کے گلے میں ایک ہار تھا، جو ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کے جہیز میں دیا تھا وہی گلے سے اتار کر بھیج دیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہار دیکھا تو بے اختیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اگر تم سب راضی ہو تو زینب رضی اللہ عنہ کے پاس اس کی والدہ کی یادگار ہے اس کو واپس کر دو۔ صحابہ نے بخوشی قبول کر کے واپس کر دیا اور ابوالعاص سے کہہ دیا کہ حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں۔ (مشکوۃ بحوالہ ابوداؤد، احمد ص ۳۴۶)

ابوالعاص کا اسلام

ابوالعاص آزاد ہو کر مکہ پہنچے اور شرط کے موافق حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ بھیجا، ابوالعاص ایک بڑے تاجر تھے اتفاقاً دوسری مرتبہ پھر ملک شام سے مال لاتے ہوئے پکڑے گئے اور پھر اس مرتبہ رہا ہو کر مکہ واپس آئے تو تمام شرکاء کا حساب بے باق کر کے مشرف باسلام ہوئے اور لوگوں سے کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آ کر مسلمان ہوتا ہوں کہ لوگ یوں نہ کہیں کہ ہمارا مال لے کر تقاضہ کے ڈر سے مسلمان ہو گیا یا بجبر واکراہ مسلمان کر لیا گیا۔ (تاریخ طبری)

بدر کے قیدیوں کے پاس کپڑے نہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے کپڑے دلوا دیئے مگر حضرت عباس کا قد اس قدر لمبا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر راست نہ آیا تو عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے اپنا کرتہ دیدیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنا کرتہ عبداللہ بن ابی کے کفن میں عنایت فرمایا تھا

اس میں احسان کا معاوضہ بھی ملحوظ تھا(صحیح بخاری)

اسلامی سیاست اور ترقی تعلیم

اسیران جنگ میں جو لوگ فدیہ نہیں دے سکتے تھے ان میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے کہا گیا کہ تم دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو، یہی تمہارا فدیہ ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

۳ھ غزوۂ احد و غطفان وغیرہ

غزوۂ غطفان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا معجزہ

۳ھ میں ساڑھے چار سو آدمی لے کر دعشور بن الحارث محاربی مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لئے چلا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقابلے کے لئے تشریف لائے تو سب نے بھاگ بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مطمئن ہو کر میدان سے واپس آئے، اس وقت اتفاقاً بارش سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے تر ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سکھانے کے لئے نکال کر درخت پر پھیلا دیا اور خود ان کے سایہ میں لیٹ گئے ادھر پہاڑ کے اوپر دعشور دیکھ رہا تھا، جب اس نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مطمئن ہو کر لیٹ گئے تو سیدھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے پہنچا اور تلوار کھینچ کر سامنے آیا اور کہا بتلاؤ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا، مگر مقابلے میں خدا کا رسول تھا بغیر کسی ہراس کے جواب دیا کہ ہاں اللہ تعالیٰ بچائے گا اس کلمہ کا سننا تھا کہ دعشور کے بدن میں رعشہ پڑ گیا اور تلوار ہاتھ سے گر گئی، اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھا کر فرمایا تم بولو اب تمہیں کون بچائے گا؟ اس کے پاس اس کے سوا کیا جواب تھا کہ کوئی نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بیچارگی پر رحم آ گیا اور اس کو معاف فرما کر چھوڑ دیا۔ (سیرت مغلطائی ص ۴۰)

دعشور یہاں سے اٹھا اور یہ اثر لے کر اٹھا کہ نہ فقط خود مسلمان ہوا بلکہ اپنی قوم میں جا کر اسلام کا ایک زبردست مبلغ بن گیا۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہے تھے کسی کی نگاہ میں

﴿حاشیہ نمبر(۱) شپرہ چشمی سے اعتراض کرنے والی یورپینی اقوام دیکھیں کہ اشاعت اسلام کا ذریعہ یہ خلق عظیم تھا نہ کہ تلوار کا زور یا مالی طمع۔۱۲۔﴾

حضرت حفصہ اور زینب رضی اللہ عنہن سے نکاح

شعبان ۳ھ میں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور رمضان ۳ھ میں حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ (سیرت مغلطائی)

غزوۂ احد

احد مدینہ کے قریب ایک پہاڑ ہے جس جگہ جہاد ہوا ہے اسی جگہ حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر بھی ہے، یہ باتفاق جمہور شوال ۳ ھ میں ہوا ہے اور تاریخ میں مختلف اقوال ہیں، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱۔ (زرقانی شرح مواہب ص ۴۰ جلد ۳)

بدر کے شکست خوردہ مشرکین نے سال بھر کے بعد جب کچھ ہوش سنبھالا تو حرارت انتقام بڑھنے لگی اور اس مرتبہ اہتمام سے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور اس غرض کیلئے تین ہزار نوجوانوں کا لشکر پورے ساز وسامان کے ساتھ مدینہ کی طرف بڑھا، جن میں سات سو زرہیں اور دو سو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے اور چودہ عورتیں بھی اس غرض کیلئے ساتھ تھیں کہ مردوں کو غیرت دلائیں اور اگر بھاگیں تو لعنت ملامت سے شرما دیں، ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو اس وقت اسلام لا چکے تھے مگر ابھی تک مکہ میں ہی مقیم تھے، انہوں نے فوراً تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو فوراً دو آدمی تحقیق حالات کیلئے بھیجے انہوں نے آ کر خبر دی کہ قریش کا لشکر مدینہ آ پہنچا، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے اور صبح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کے بعد ایک ہزار صحابہ کی جمعیت کے ساتھ مدینہ سے باہر تشریف لائے جن میں عبداللہ بن ابی منافق اور اسکے تین سو ہم خیال منافقین بھی شامل تھے، مگر یہ سب کے سب راستے ہی سے واپس ہو گئے اور اب مسلمانوں کا لشکر صرف سات سو ہی رہ گیا۔

فوج کی ترتیب اور صحابہ کے لڑکوں کو شوق جہاد

مدینہ سے نکل کر جب فوج کا جائزہ لیا گیا تو کمسن بچے واپس کر دیئے گئے مگر بچوں میں جہاد کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ جب رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ تمہاری عمر کم ہے، تم واپس جاؤ تو پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ اونچے معلوم ہونے لگیں چنانچہ وہ جہاد میں لے لئے گئے۔

سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ جوان کے ہم عمر تھے، جب انہوں نے دیکھا تو عرض کیا کہ میں تو رافع کو لڑائی میں پچھاڑ سکتا ہوں، اگر وہ جہاد میں لئے جاتے ہیں تو مجھے بدرجہ اولیٰ لینا چاہیے ان کے کہنے کے مطابق دونوں میں مقابلہ کرایا گیا سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور ان کو بھی جہاد میں لے لیا گیا (تاریخ طبری ج ۳)

کیا اشاعت اسلام کو بزور شمشیر کہنے والے ان قربانیوں کو دیکھ کر بھی اپنے افتراء سے نہ شرمائیں گے؟

الغرض مقابلہ پر پہنچ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صف آرائی فرمائی، احد پہاڑ پشت کی طرف تھا، اس لئے اس کی طرف سے غنیم کے آنے کا احتمال تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمی پہاڑ پر پہرے کے لئے کھڑے کر دیئے اور ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست مگر تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا، لڑائی شروع ہوئی اور دیر تک گھمسان کی لڑائی کے بعد جب فوجیں ہٹیں تو مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا، قریش بدحواس ہو کر منتشر ہو گئے مسلمانوں نے مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا، یہ دیکھتے ہی وہ لوگ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر یہاں آ گئے جن کو عقب کی جانب پہاڑ کی نگرانی کے لئے مقرر فرمایا تھا ان کے امیر عبداللہ بن جبیرؓ نے بہت منع کیا مگر وہ یہ سمجھ کر اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں سے ہٹ گئے نہ رکے اور یہاں صرف چند صحابہؓ رہ گئے، یہ دیکھ کر خالد بن ولید نے (جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفار کی طرف سے لڑ رہے تھے) عقب کی جانب سے دفعۃً حملہ کیا، عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے باقی ماندہ چند ساتھیوں نے نہایت جانبازی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، بالآخر سب کے سب شہید

ہو گئے، اب راستہ صاف ہو گیا تو خالد اپنے دستے کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور دونوں فوجیں اس طرح مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، یہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے، ان کی شہادت سے یہ مشہور ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ کسی شیطان یا مشرک نے زور سے یہ آواز دے دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے (زرقانی شرح مواہب ص ۴۳ ج ۲)

اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مسلمانوں کی فوج میں مایوسی چھا گئی بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن بہت سے جاں نثار لوگ اس وقت بھی برابر سرگرم قتال تھے، مگر سب کی نگاہیں اسی کعبہ مقصود صلی اللہ علیہ وسلم کو اشتیاق کے ساتھ ڈھونڈ رہی تھیں، سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو انہوں نے خوشی سے پکارا کہ مبارک ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بخیر و عافیت تشریف فرما ہیں، یہ سنتے ہی صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑ پڑے مگر ساتھ ہی کفار نے بھی سب کی طرف سے ہٹ کر اسی جانب رخ کیا کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ ہوا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہے، ایک مرتبہ جب کفار نے ہجوم کیا تو ارشاد ہوا "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ مع چار اصحاب کے آگے بڑھے سب کے سب نہایت دلیرانہ جانبازی کے ساتھ شہید ہو گئے، جب زیاد رضی اللہ عنہ زخمی ہو کر گرے تو ارشاد فرمایا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ لوگ اٹھا لائے اس وقت تک کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی، سبحان اللہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کا زخمی ہونا

قریش کا مشہور بہادر عبداللہ بن قمیہ صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر تلوار ماری جس سے خود کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں گھس گئیں اور ایک دندان مبارک شہید ہو گیا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خود کی کڑیوں کو زخم سے نکالنے کیلئے آگے بڑھے تو ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے قسم دی کہ خدا کیلئے یہ خدمت مجھے کرنے دو اور خود آگے بڑھ کر ہاتھ کے بجائے اپنے منہ سے ان کڑیوں کو کھینچا تو پہلی

مرتبہ ایک کڑی نکلی مگر ساتھ ہی اسکے زور سے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ایک دانت بھی گر گیا۔ یہ دیکھ کر دوسری کڑی نکالنے کیلئے پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بڑھنے لگے تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے پھر قسم دیکر انکو روکا اور خود ہی دوبارہ اسی طرح سے منہ سے دوسری کڑی نکالی جس کیساتھ ابوعبیدہؓ کا دوسرا دانت بھی گر گیا (ابن حبان ودارقطنی وغیرہ از کنز ص ۲۷۴ ج ۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گڑھے میں گر پڑے جو کفار نے اس لئے بنایا تھا کہ مسلمان اس میں گریں۔

صحابہ کی جاں نثاری

یہ دیکھ کر جانباز صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر چھا گئے تیروں اور تلواروں کی بارش ہو رہی تھی مگر یہ سب صحابہ اپنے اوپر لیتے تھے، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ جھک کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھال بن گئے تھے جو تیر آتا ان کی پشت میں لگتا تھا، حضرت طلحہ نے تیروں اور تلواروں کو اپنے اوپر روکا جس سے ہاتھ کٹ کر گر گیا (بخاری) اور جنگ کے بعد دیکھا گیا تو ان کے بدن پر ستر سے زیادہ زخم تھے، (ابن حبان وغیرہ از کنز ص ۲۷۴ ج ۵)

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ایک ڈھال کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب گردن اٹھا کر فوج کی طرف دیکھتے تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے یا رسول اللہ! آپ سر نہ اٹھایئے، نصیب اعداء کوئی تیر نہ لگ جائے اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے میرا سینہ موجود ہے (بخاری غزوۂ احد)

ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر میں قتل ہو گیا تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں" ان کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں جو کھا رہے تھے یہ سنتے ہی انہیں پھینک کر سیدھے معرکہ میں پہنچے اور سرگرم قتال ہونے کے بعد شہید ہو گئے۔ (بخاری غزوۂ احد)

یہ قریش بدبخت بے رحمی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر تلواریں برسا رہے تھے مگر رحمۃ للعالمین کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے:

اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون. (اے میرے پروردگار میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں) (فتح الباری پارہ ۱۲ ص ۴۸ غزوۂ احد)

چہرہ انور سے خون جاری تھا، اور سراپا رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کسی کپڑے وغیرہ سے پونچھتے جاتے تھے اور فرمایا کہ اگر اس خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر جاتا تو سب پر عذاب خداوندی نازل ہو جاتا (فتح الباری غزوۂ احد) اس غزوۂ میں کفار کے صرف بائیس یا تیئیس آدمی مارے گئے اور مسلمانوں میں سے ستر آدمی شہید ہوئے۔

۴ھ سریہ منذر بجانب بیر معونہ

اس سال ماہ صفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک دستہ اہل نجد کی طرف تبلیغ اسلام کیلئے بھیجا، جن میں بڑے بڑے علماء صلحاء شامل تھے، وہاں پہنچے تو عام، رعل، ذکوان، عصیہ ان کے مقابلے کیلئے کھڑے ہو گئے، بالآخر جنگ ہوئی اور اتفاقاً سب شہید ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت رنج پہنچا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے قاتلین کیلئے چند روز صبح کی نماز میں بددعا فرمائی۔
(سیرت مغلطائی ص ۵۲)

اور اسی سال ماہ شوال میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔

۵ھ قریش اور یہود کی متفقہ سازش اور غزوۂ احزاب قریش اور یہود کا اتفاق

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود سے مصالحت کا معاہدہ فرمایا تھا جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفا کرتے رہے لیکن چونکہ یہود مدینہ طیبہ کے رئیس اور بڑے مانے جاتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد اسلام کی روز افزوں ترقی اور شوکت کو دیکھ کر ان کو سخت غیظ ہوتا اور اسی لئے ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے۔

غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو حیرت انگیز فتح یابی ہوئی تو ان کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور بالآخر انہوں نے اعلانیہ عہد شکنی شروع کر دی، چنانچہ ۶ھ میں ان کے قبیلہ بنی

قینقاع نے اعلان جنگ کیا، یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری شروع کی، مقابل ہوا تو وہ قلعہ بند ہو گئے، کچھ عرصہ محصور رہنے کے بعد جلا وطن ہو کر قینقاع شام کے علاقہ میں بنونضیر خیبر وغیرہ میں چلے گئے ادھر قریش مکہ پہلے سے یہاں یہود اور منافقین کو خطوط لکھ کر نہ صرف مخالفت پر اکسا رہے تھے بلکہ یہ دھمکی بھی ساتھ تھی کہ اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال نہ دو گے تو ہم تمہارے ساتھ جنگ بھی کریں گے (ابوداؤد)

اس وقت یہ اسباب باہمی ربط واتحاد کا بہانہ بن گئے اور اب قریش مکہ یہود مدینہ اور منافقین، سب کی مجموعی طاقتیں اسلام کے خلاف کھڑی ہو گئیں مکہ سے مدینہ تک تمام قبائل میں ایک آگ سی لگ گئی چنانچہ غزوۂ ذات الرقاع مورخہ ۱۰ محرم ۵ ھ اسی سازش کا نتیجہ تھا اور پھر غزوۂ دومۃ الجندل جو ربیع الاول ۵ ھ میں واقع ہوا وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی غزوۂ بنی مصطلق مورخہ ۲ شعبان ۵ ھ کا باعث بھی یہی متفقہ سازش تھی، یہ سازشیں ایک عرصہ تک اس طرح مختلف صورتوں میں ظاہر ہو کر ترقی کرتی رہیں۔

غزوۂ احزاب اور واقعہ خندق

بالآخر ذی قعدہ ۵ ھ میں سب نے اپنی پوری قوتیں جمع کر کے یک بارگی مدینہ پر حملہ کی ٹھہرائی اور اس طرح دس ہزار آدمیوں کا لشکر جرار مسلمانوں کو مٹانے کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف بڑھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خبر ہوئی تو صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسیؓ نے رائے دی کہ کھلے میدان میں جنگ کرنا مناسب نہیں، بلکہ جس طرف سے مدینہ کے اندر انکے گھسنے کا احتمال ہے اس طرف خندق کھودی جائے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین ہزار صحابہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر خندق کھودنے کیلئے خود بھی کمربستہ ہو گئے، چھ دن میں یہ پانچ گز گہری خندق اس طرح تیار ہوئی کہ اس کے کھودنے میں خود سیدالرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کا ایک بڑا حصہ تھا (سیرت مغلطائی ص ۵۶)

ایک مرتبہ خندق کھودتے ہوئے ایک پتھر کی چٹان نکل آئی جس کی وجہ سے سب کے سب عاجز ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دست مبارک سے ایک پھاوڑا مارا تو اس

کے ٹکڑے اڑ گئے غرض خندق تیار ہوگئی ادھر کفار کا لشکر آ پہنچا، اور مدینہ کا محاصرہ کرلیا، تقریباً پندرہ روز تک مسلمان اس میں محصور رہے محاصرہ کی وجہ سے مدینہ میں سخت بے چینی پھیل گئی رسد کی قلت، صحابہ پر تین تین دن کے فاقے گزر گئے۔

ایک روز مضطر ہوکر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹ کھول کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے کہ سب نے پیٹ سے پتھر باندھ رکھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا شکم مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، ادھر محاصرین جب خندق عبور نہ کر سکے تو وہیں سے تیر اور پتھر برسانے شروع کر دیئے جانبین سے مسلسل تیر اندازی ہوئی۔ اسی سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں قضا ہوئیں۔

کفار پر ہوا کا طوفان اور نصرت الٰہی

بالآخر خداوند کریم نے اس بے سروسامان جماعت کی امداد فرمائی اور لشکر کفار پر ہوا کا ایک ایسا طوفان مسلط فرما دیا کہ خیموں کی چوبیں اکھڑ گئیں، چولہوں سے دیگچیاں الٹ گئیں، جس نے ان کی فوج کے حواس معطل کر دیئے، اور ان کا سامان رسد بھی ختم ہوگیا۔

ادھر حضرت نعیم بن مسعود نے ایک ایسی تدبیر کی کہ جس سے کفار کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی، غرض ایسے اسباب جمع ہوگئے کہ اب کفار کے پاؤں اکھڑ گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں میدان صاف ہوگیا۔

۶ھ صلح حدیبیہ، بیعت رضوان، سلاطین دنیا کو دعوت اسلام

شروع ذی قعدہ ۶ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ فرمایا اور عمرہ کا احرام باندھا، صحابہ کی بھی ایک بڑی جماعت جس کی تعداد چودہ پندرہ سو بیان کی جاتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوئی (سیرت مغلطائی)

حدیبیہ مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ایک کنواں ہے اور اسی کے نام سے گاؤں کا نام بھی حدیبیہ مشہور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچ کر قیام فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ

ایک کنواں بالکل خشک تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعجاز سے اس میں اتنا پانی آ گیا کہ سب سیراب ہوگئے، یہاں پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ قریش کو مطلع کر دیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت محض زیارت بیت اللہ اور عمرہ کیلئے تشریف لائے ہیں اور کوئی سیاسی غرض نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے تو کفار نے ان کو روک لیا، ادھر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ کفار نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ رضی اللہ عنہا سے جہاد پر بیعت لی جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی، بلکہ قریش نے سہیل بن عمرو کو شرائط صلح کرنے کیلئے بھیجا۔ حسب ذیل شرائط طے ہو کر عہد نامہ لکھا گیا اور دس سال کیلئے باہمی صلح ہوگئی۔

(۱) مسلمان اس وقت واپس جائیں۔ (۲) آئندہ سال صرف تین دن قیام کر کے واپس جائیں (۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں، تلوار ساتھ میں ہو تو میان میں رکھیں (۴) مکہ سے کسی مسلمان کو اپنے ساتھ نہ لیجائیں اور (۵) اگر کوئی مسلمان مکہ میں رہنا چاہے تو اسے منع نہ کریں (۶) اگر کوئی شخص مکہ سے مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیں اور (۷) اگر مدینہ سے کوئی آ جائے تو کفار اسے واپس نہ کریں۔ یہ تمام شرائط اگرچہ مسلمانوں کے خلاف تھیں اور یہ صلح بظاہر مغلوبانہ تھی لیکن خدا تعالیٰ نے اس کا نام فتح رکھا اور اسی سفر میں سورۂ فتح نازل ہوئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس طرح دب کر صلح کرنا سخت ناگوار تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو باصرار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے خدا کا یہی حکم ہے اور اسی میں ہمارے مستقبل کی تمام فلاح مضمر ہے چنانچہ بعد کے واقعات نے اس معمہ کو حل کر دیا کیونکہ اس صلح کی بدولت اطمینان کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان آمد و رفت شروع ہوگئی کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اور مسلمانوں کے پاس آنے جانے لگے ادھر اسلامی اخلاق کی مقناطیسی کشش نے ان کو کھینچنا شروع کیا،

مؤرخین کا بیان ہے کہ اس عرصہ میں اس قدر کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے کہ اتنے کبھی نہیں ہوئے تھے اور درحقیقت یہ صلح فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی۔

سلاطین دنیا کو دعوتی خطوط

اس صلح کی وجہ سے راستہ مامون ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ یہ حق کی آواز تمام دنیا کے بادشاہوں تک بھی پہنچا دی جائے چنانچہ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اصحمہ نامی نجاشی بادشاہ حبشہ کی طرف بھیجا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبار کو دونوں آنکھوں پر رکھا اور تخت سے نیچے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا اور خوش دلی سے اسلام قبول کر لیا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں انتقال کر گیا۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ہرقل نامی بادشاہ کے پاس بھیجا اسے بھی دلائل قاطعہ اور کتب سابقہ کی شہادتوں سے ثابت ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں چنانچہ اسلام لانے کا ارادہ کر لیا، مگر اس پر تمام رعیت برہم ہو گئی اور اس کو یہ قوی خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں مسلمان ہو گیا تو یہ لوگ مجھے سلطنت سے معزول کر دیں گے اس لئے اسلام لانے سے رک گیا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو کسریٰ خسرو پرویز کج کلاہ ایران کی طرف روانہ فرمایا، اس بدبخت نے نامہ مبارک کے ساتھ گستاخی کی اور چاک کر کے پارہ پارہ کر دیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کو اس طرح پارہ پارہ کرے جس طرح اس نے ہمارے خط کو کیا ہے، سید الرسل کی دعا کیسے خالی جاتی، تھوڑے ہی عرصہ بعد خسرو پرویز خود اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے نہایت بے دردی کے ساتھ مارا گیا اور حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو سلطان مصر و اسکندریہ (مقوقس) کی طرف بھیجا اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسلام کی یہ حقانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ڈال دی چنانچہ حضرت حاطب کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چند تحفے بھیجے، جن میں ایک کنیز ماریہ قبطیہؓ اور ایک سفید خچر جس کا نام دلدل تھا، اور ایک روایت میں ہے کہ ایک ہزار

دینار اور بیس جوڑے بھی ہدیہ میں تھے اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بادشاہان عمان یعنی جیفر اور عبداللہ کے پاس بھیجا، ان کو بھی ذاتی تحقیق اور کتب سابقہ کے ذریعہ سے آپکی نبوت کا کماحقہ یقین ہو گیا اور دونوں مسلمان ہو گئے اور اسی وقت سے مال زکوٰۃ کا جمع کرنا شروع کر دیا، اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا (از سرور المحزون وغیرہ)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاصؓ کا اسلام

خالد بن ولید اس وقت تک اسلام کے ہر معرکہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے تھے، اکثر غزوات میں اور بالخصوص احد میں ان ہی کے ذریعہ کفار کے اکھڑے ہوئے پاؤں جمے تھے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد خود مسلمان ہونے کے لئے سفر کرتے ہیں راستہ میں عمرو بن عاصؓ سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اسی قصد سے جا رہے ہیں، دونوں ساتھ پہنچ کر مشرف باسلام ہوئے (اصابہ للحافظ)

غزوۂ خیبر، فتح فدک وعمرہ قضا

یہود مدینہ بنونضیر جب خیبر ﴿حاشیہ نمبر(۱) مدینہ طیبہ سے شام کی جانب تین چار منزل کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر (زرقانی ص ۲۱۷ ج ۲)﴾ میں جا کر آباد ہوئے تو خیبر یہودیت کا مرکز بن گیا تھا یہ لوگ تمام اطراف کے عرب کو اسلام کے خلاف بھڑکاتے تھے، محرم یا جمادی الاولی ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار سو پیادہ اور دو سو سواروں کے ساتھ ان پر جہاد کے لئے تشریف لے گئے، قتل وقتال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو فتح دی اور یہود کے تمام قلعے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے اس جہاد میں حضرت علیؓ نے زیادہ حصہ لیا اور باب خیبر کو تنہا ہاتھ سے اکھاڑ دیا حالانکہ ستر آدمی اس کے ہلانے سے عاجز تھے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس دروازہ کو آپؓ نے بجائے ڈھال کے استعمال کیا (زرقانی ص ۲۲۹ ج ۲)

فتح فدک

خیبر فتح ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود فدک کی طرف ایک رسالہ بھیجا، انہوں نے صلح کی۔

عمرہ قضا

صلح حدیبیہ میں جو عمرہ چھوڑ دیا گیا تھا اور کفار قریش سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ آئندہ سال عمرہ کریں گے اور تین دن سے زائد قیام نہ کریں گے، اس سال حسب وعدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مع تمام رفقاء کے پھر تشریف لے گئے اور شرائط معاہدہ کی پوری پابندی کے ساتھ عمرہ ادا فرما کر تشریف لے آئے۔

۸ ھ سریہ موتہ، فتح مکہ معظّمہ

موتہ ﴿حاشیہ نمبر (۱) بضم میم وسکون واؤ بغیر ہمزہ اور بعض کے نزدیک واؤ پر ہمزہ ہے ۱۲ (زرقانی ص ۲۶۷ ج ۲)﴾ ملک شام میں شہر بلقاء کے مضافات میں بیت المقدس سے تقریباً دو منزل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام ہے، یہاں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی جس کا باعث یہ تھا کہ عمرو بن شرجیل نے جو شاہ روم کی طرف سے بصرہ کا گورنر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ ھ کے نصف میں تین ہزار صحابہ کا لشکر اس کی طرف روانہ کیا جب لشکر موتہ کے قریب پہنچا تو رومیوں کو اطلاع ہوئی وہ ڈیڑھ لاکھ لشکر لے کر مقابلہ کے لئے نکلے چند روز جنگ ہونے کے بعد خدا تعالیٰ نے ڈیڑھ لاکھ کفار پر تین ہزار مسلمانوں کا رعب اس طرح ڈال دیا کہ پسپا ہونے کے سوا ان کو کوئی صورت نجات نہ ملی (تلخیص السیرۃ)

فتح مکہ

حدیبیہ میں صلح نامہ لکھا گیا تھا، مسلمان اپنی عادت کے موافق پوری پابندی کے ساتھ اس پر عامل تھے کہ ۸ ھ میں قریش نے عہد شکنی کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قاصد بھیج کر قریش کے سامنے چند شرطیں تجدید عہد صلح کے لئے پیش فرمائیں اور آخر میں تحریر فرما دیا کہ اگر یہ شرطیں منظور نہ ہوں تو حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا قریش نے نقض معاہدہ کو ہی پسند کیا۔

بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی پوری تیاری شروع کر دی اور ۱۰ رمضان المبارک ۸ ھ بروز چہارشنبہ عصر کے بعد دس ہزار صحابہ کی جمعیت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم مدینہ سے نکلے، مقام کدیدیہ میں مغرب کا وقت ہو گیا تو روزہ افطار فرمایا مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لشکر کے ایک حصہ کیساتھ روانہ کیا کہ اوپر کی جانب سے مکہ میں داخل ہوں اور ان سے فرمایا کہ جو شخص تم سے مقاتلہ نہ کرے تم بھی اس سے قتال نہ کرنا۔

ادھر دوسری جانب سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے اور اعلان فرمادیا کہ جو شخص مسجد میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔ اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ مامون ہے البتہ صرف گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا خون معاف نہ فرمایا جن کا وجود ہر قسم کے فتنوں کا مجسمہ تھا۔ مگر یہ سب منتشر ہو گئے اور پھر ان میں سے اکثر آدمی بعد فتح مکہ کے مدینہ طیبہ پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔

۲۰ رمضان یوم جمعہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا، اس وقت تک کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک لکڑی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بت کے پاس سے گزرتے تو اشارہ فرمادیتے تھے اور وہ بت منہ کے بل گر پڑتا تھا اور یہ آیت کریمہ زبان مبارک پر تھی۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

فتح کے بعد قریش کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک

طواف سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ شیبی حاجب کعبہ سے لے لی اور اندر تشریف لے گئے وہاں سے باہر تشریف لانے کے بعد مقام ابراہیم پر نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے تھے، لوگ اس کے منتظر تھے کہ آج قریش کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم صادر ہوتا ہے لیکن رحمت عالم نے قریش کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم ہر طرح آزاد ہو اور مامون ہو، پھر کعبہ کی کنجی بھی ان ہی کو واپس کر دی (تلخیص السیرۃ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق اور ابوسفیان کا اسلام

ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو اب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے سب

سے بڑے علمبردار تھے اور تقریباً قریش کے تمام معرکوں میں ان کی فوج کے افسر بھی یہی ہوتے تھے، فتح مکہ سے پہلے اسلامی لشکر کی خبر لینے کے لئے مکہ سے باہر نکلے تھے صحابہ نے گرفتار کرلیا لیکن جب گرفتار ہوکر رحمۃ للعالمین کے دربار میں حاضر کئے جاتے ہیں تو وہاں سے معافی کا حکم ہوجاتا ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ ابوسفیان فوراً اسلام کے حلقہ بگوش ہوجاتے ہیں اور اب ہم ان کو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ فتح مکہ کے دن ایک شخص ہانپتا کانپتا ہوا حاضر ہوا سراپا رحمت نے ارشاد فرمایا کہ ٹھہرو مطمئن رہو میں کوئی بادشاہ نہیں بلکہ ایک معمولی عورت کا بیٹا ہوں۔ فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿سیرت مغلطائی بروایت بخاری ص ۱۷۰، اس میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔﴾ پندرہ روز مکہ معظمہ میں مقیم رہے، اس وقت انصار کو یہ خیال ہوکر رنج تھا کہ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہیں اقامت فرمائیں گے اور ہم آپ سے دور ہوجائیں گے مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس خیال کی اطلاع ہوئی تو فرمایا نہیں، بلکہ اب تو ہماری موت وحیات تمہارے ساتھ ہے پھر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا امیر مقرر فرما کر خود مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے۔

غزوۂ حنین

فتح مکہ کے بعد عام طور سے عرب اسلام کا حلقہ بگوش ہوگیا کیونکہ ان میں کثرت سے وہ لوگ تھے جو اسلام کی حقانیت کا پورا یقین رکھنے کے باوجود قریش کی شوکت کے ڈر سے مسلمان ہونے میں توقف اور فتح مکہ کا انتظار کررہے تھے اس وقت وہ سب کے سب فوج درفوج اسلام میں داخل ہوگئے باقی ماندہ عرب کی بھی ہمت نہ رہی کہ اسلام کے مقابلہ میں کھڑے ہوں۔

البتہ دو قبیلے ہوازن اور ثقیف غیرت کی وجہ سے آمادہ جنگ ہوکر مکہ معظمہ کی طرف مسلمانوں کے قتال کے لئے بڑھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار کا لشکر مقابلے کے لئے جمع کیا جن میں دس ہزار تو مہاجرین وانصار تھے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار نومسلم تھے جو فتح مکہ میں مسلمان ہوئے تھے اور اب تک اسلامی لشکروں میں سب سے بڑی تعداد تھی۔ ۶ شوال ۸ ھ کو یہ حزب اللہ (خدائی لشکر) روانہ ہوا اور جب وادی حنین میں پہنچا تو دشمن جو پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے فوراً

مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے چونکہ ابھی تک ترتیب صفوف بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اسلامی لشکر کا اگلا حصہ پسپا ہونے لگا۔

اس پسپائی کا ظاہری سبب تو یہی بے ترتیبی تھی لیکن حقیقی سبب وہ ہے جس کی طرف قرآن عزیز نے اشارہ کیا ہے یعنی مسلمان اس وقت خلاف عادت اپنی کثرت اور سازوسامان دیکھ کر خوش ہورہے تھے اور بعض صحابہ کی یہاں تک کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبان پر کلمات آ گئے کہ آج تو ہم مغلوب نہیں ہوسکتے۔ اس لئے مالک بے نیاز نے ان کو تنبیہ کرنے کے لئے یہ صورت ظاہر فرمائی تا کہ مسلمان سمجھ لیں کہ ہماری فتح وشکست ہمارے ہاتھوں اور تیروں تلواروں کا کھیل نہیں بلکہ

باحریفاں آنچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد　　ایں ہمہ مستی و بیہوشی نہ حد بادہ بود

﴿اور غالباً اسی شعر کا ترجمہ کسی نے اردو زبان میں اس طرح کیا ہے:

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں　　کوکب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں﴾

بدر میں بے سروسامانی کے ساتھ فتح مبین اور حنین میں اس قدر سازوسامان کے باوجود شکست کا یہی راز تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دوزرہ پہنے ہوئے ایک خچر پر سوار تھے جس کو دلدل کہا جاتا تھا قبائل کو پسپا ہوتے ہوئے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایک دلیرانہ آواز دی جس سے لوگوں کے اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے اور طرفین سے قتل وقتال شروع ہوگیا۔

ایک عظیم الشان معجزہ، ایک مٹھی سے تمام لشکر غنیم کو شکست

ادھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین سے ایک مٹھی اٹھا کر لشکر غنیم کی طرف پھینکی جس کو قدرت خداوندی نے مخالف لشکر کے ہر سپاہی کی آنکھ میں اس طرح پہنچا دیا تھا کہ کوئی ایک آنکھ اس سے بچ نہ سکی (سیرت مغلطائی ص ۷۲) آخر دشمن مرعوب ومغلوب ہوکر بھاگے، مسلمانوں میں سے صرف چار آدمی اور کفار کے ستر آدمی مارے گئے، مسلمانوں نے جوش انتقام میں بچوں اور عورتوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

غزوۂ طائف

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی طرف متوجہ ہوئے جہاں بنی ثقیف اور ہوازن کا مرکز تھا تقریباً اٹھارہ دن تک اس کا محاصرہ کیا، لیکن فتح نہ ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لائے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ مقام جرانہ میں طائف سے قبیلہ ہوازن کے وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ حنین کے موقعہ پر جوان کے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوئے تھے ان کو واپس کر دیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرما کر ان کے قیدی واپس کر دیئے جب آپ طائف سے واپس آ کر مدینہ میں مقیم ہو گئے تو اہل طائف کا ایک وفد حاضر خدمت ہو کر اور خود درخواست کر کے داخل اسلام ہو گیا۔

عمرۂ جعرانہ

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ ہی سے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور احرام باندھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور اداء عمرہ کے بعد پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہوئی۔ ٦ ذی قعدہ ۸ھ کو مدینہ میں داخل ہوئے۔

۹ھ غزوۂ تبوک، حج الاسلام وفود کی آمد اور فوج در فوج مسلمان ہونا غزوۂ تبوک اور اسلام میں چندہ کا رواج

طائف سے واپسی کے بعد ۹ھ کے نصف تک مدینہ میں مقیم رہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ غزوۂ موتہ کے شکست خوردہ رومیوں نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کیلئے مقام تبوک میں بہت کچھ تیاریاں کر رکھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاری شروع کی، لیکن اس وقت مسلمان قحط سالی کی وجہ سے نہایت تنگ دستی اور افلاس کی حالت میں تھے، اور اس پر مزید یہ کہ سخت گرمی پڑ رہی تھی، لیکن جانثاروں کی جماعت تھی کہ اس کے باوجود بھی جہاد کی تیاریاں شروع ہو گئیں چندہ کیا گیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ لا کر رکھ دیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم الشان

امداد سامان جنگ وغیرہ سے پیش کی جو نو سو اونٹ اور گھوڑوں پر مشتمل تھی۔ (سیرت مغلطائی ص ۱۲۷)

جمعرات کے روز ماہ رجب میں تیس ہزار صحابہ کی جمعیت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی طرف تشریف لے چلے۔

الغرض آپ تقریباً پندرہ بیس روز وہیں مقیم رہے لیکن کوئی مقابلے پر نہیں آیا تو واپسی کا ارادہ ہوا اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ تھا رمضان المبارک ۹ ھ میں واپس مدینہ پہنچے۔

مسجد ضرار کو آگ لگانا

واپسی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ آگ لگا دینے کا حکم فرمایا جو منافقین نے مسلمانوں کے خلاف مشورہ کرنے کے لئے مسجد کے نام سے بنائی تھی اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اس کا نام مسجد رکھ دیا تھا (مغلطائی) اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مسجد ضرار در حقیقت مسجد نہ تھی۔

اسلام میں داخلہ

صلح حدیبیہ کے بعد جب راستے مامون ہوئے تو اشاعت اسلام جس کو امن و امان ہی کی ضرورت تھی ایک حد تک وسیع پیمانہ پر ہو سکی۔ اور اسی لئے اس صلح کا نام آسمانی دفتروں میں فتح رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی کچھ لوگ قریش کے دباؤ کی وجہ سے اسلام میں داخل نہ ہو سکتے تھے، فتح مکہ نے اس قصہ کو بھی تمام کر دیا اور اب قرآن عظیم نے تمام عرب میں گھر گھر پہنچ کر اپنے اعجازی تصرف سے سب قلوب پر سکہ بٹھا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی لوگ جو کسی طرح اسلام اور مسلمان کی صورت نہ دیکھنا چاہتے تھے آج جوق در جوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دور دراز کے سفر طے کرتے ہوئے وفود کی صورت میں پہنچتے ہیں، اور برضا و رغبت اسلام کے حلقہ بگوش بن کر اپنی جان و مال فدا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور یہ وفود اکثر ۹ ھ میں حاضر اقدس ہوئے۔

وفد ثقیف

یہ وفد تبوک سے واپسی کے بعد ہی مدینہ طیبہ میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا اور پھر پے در پے وفود آنے شروع ہو گئے جن کی تعداد ستر تک نقل کی جاتی ہے ان میں سے بعض کے واقعات مختصراً یہ ہیں۔

وفد بنی فزارہ

پہلے ہی مسلمان ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

وفد بنی تمیم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ مکالمات کے بعد سب کے سب مسلمان ہوکر وطن کو لوٹ گئے۔

وفد بنی سعد بن بکر اس وفد کے امیر ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے سوالات کئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے شافی جواب دیئے اور پوری تحقیق مذہب اور شرح صدر کے بعد مشرف باسلام ہوکر اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم میں تبلیغ کی جس کی وجہ سے انکی ساری قوم مسلمان ہوگئی۔

وفد کندہ

سورۂ صافات کی ابتدائی آیات سنتے ہی ان کے قلوب میں اسلام نے گھر کرلیا۔

وفد بنی عبدالقیس

پہلے نصاریٰ تھے، سب کے سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہو گئے، آپ نے ضروری امور اسلامی ان کو تعلیم فرمائے۔

وفد بنی حنیفہ

بھی حاضر خدمت ہوکر مسلمان ہوگئے ان میں مسیلمہ بھی شامل تھا جو بعد میں نبوت کا دعویٰ کرکے مسیلمہ کذاب کے نام سے پکارا گیا اور محض اس دعویٰ نبوت کی بناء پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں سے مع اپنے رفقاء کے قتل کیا گیا۔

فائدہ: مسیلمہ کذاب بوقت دعویٰ نبوت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن و اسلام کا منکر نہیں تھا اور اپنے آپ کو مستقل تشریعی نہیں کہتا تھا بلکہ ہمارے زمانہ کے قادیانی مرزا صاحب کی طرح غیر تشریعی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت نبوت کا دعویٰ کرتا

تھا۔ چنانچہ امام الحدیث والتفسیر شیخ ابو جعفر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ مسیلمہ نے اپنے مؤذن کو حکم دیا کہ اذان میں برابر اشهدان محمد ارسول الله کہا کرے لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی نبوت کا دعویٰ جائز نہیں بلکہ مطلقاً دعویٰ نبوت بہت سی نصوص قرآنی اور احادیث متواترہ اور اجماعی عقیدہ نبوت سے انکار ہے اس لئے باجماع صحابہ مسیلمہ کا غیر تشریعی نبوت کا دعویٰ بھی کفر وارتداد سمجھا گیا اور باجماع صحابہ اس پر جہاد کیا گیا صحابہ کو اس کی اذان ونماز وتلاوت قرآن نے اس کو کافر کہنے سے نہیں روکا۔

قادیانی مرزا صاحب جن کے دعوے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں یہی نہیں کہ اپنے آپ کو تمام انبیاء سے افضل بتاتے ہیں بلکہ بہت سے انبیاء کی ایسی جگر خراش توہین کرتے ہیں کہ کسی شریف انسان سے ممکن نہیں بالخصوص حضرت عیسیٰ پر تو اپنا ترکش خالی کر دیا ہے اور وہ بازاری گالیاں دی ہیں کہ کوئی مسلمان اس کو سن کر کسی طرح صبر نہیں کر سکتا جس کی تصدیق خود مرزا صاحب کی تصانیف ضمیمہ انجام اتھم او دافع البلاء نزول المسیح سے ہر شخص کر سکتا ہے اور یہ اسی قسم کے بہت سے مشرکانہ دعوے دیکھ کر تمام اسلامی فرقوں کے علماء نے متفقہ طور پر ان کے کفر کا فتویٰ دیا اور ان کی نماز روزہ اور ان کی مزعومہ تبلیغ اسلام کی پرواہ نہ کی تو بلاشبہ اسوہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیروی کی، ان پر اس میں کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔

وفد بنی قحطان

جس کے امیر زید الخیل تھے، یہ بھی سب کے سب حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔

وفد بنی الحارث

ان میں خالد بن الولید رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مع اپنے رفقاء کے مسلمان ہو گئے اسی طرح بنی اسد، بنی محارب، ہمدان، غسان وغیرہ کے وفود کچھ حاضری سے پہلے اور کچھ بعد میں مسلمان ہوئے۔ حمیر کے مختلف سردار جو اپنی اپنی جماعت کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے، انکی طرف سے قاصد یہ خبر لائے کہ ان سب نے برضا ورغبت اسلام قبول کر لیا اور اسی طرح پیادہ وسوار وفود حاضر ہو کر اسلام لاتے رہے، یہاں تک کہ ۱۰ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ایک لاکھ

سے زیادہ مسلمان تھے اور جو لوگ اس حج میں حاضر نہیں تھے انکی تعداد بھی اس سے کئی گنا تھی۔

صدیق اکبرؓ کا امیر حج ہونا

غزوۂ تبوک کے بعد ذی قعدہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ کو امیر حج بنا کر مکہ معظمہ روانہ فرمایا۔

۱۰ھ حجۃ الاسلام

۲۵ ذی قعدہ ۱۰ھ روز دوشنبہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے، صحابہ کی بھی عظیم الشان جمعیت ساتھ ہوئی جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد منقول ہے، مدینہ منورہ سے چھ میل پر بمقام ذوالحلیفہ احرام باندھا۔ ۴ ذی الحجہ کو بروز شنبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور حسب قواعد شرعیہ حج ادا فرمایا۔

خطبہ عرفات

نویں تاریخ کو عرفات تشریف لے جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مفصل اور بلیغ خطبہ دیا جو نصائح اور حکم سے بھرا ہوا، اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری پیغام تھا خصوصاً اس کے مندرجہ ذیل ارشادات ہر مسلمان کو اپنے صفحہ دل پر لکھ لینے چاہئیں۔

اے لوگو! میرا کلام سنو تا کہ میں تمہارے لئے ضروری امور کو بیان کر دوں، نہ معلوم کہ آئندہ سال پھر میں تم سے مل سکوں یا نہیں اس کے بعد فرمایا مسلمانوں کی جان و مال و آبرو تم پر قیامت تک اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن (عرفہ) اس مہینہ (ذی الحجہ) اور اس شہر (مکہ) کی حرمت ہے اس لئے جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو تو وہ اس کی امانت واپس کر دے۔ اس کے بعد فرمایا اے لوگو! تمہاری عورتوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں، اور ان پر تمہارے حقوق ہیں، اے لوگو! مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کا مال بغیر اس کی خوشی کے حلال نہیں، میرے بعد تم پھر کافر نہ ہو جاؤ کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، اس لئے کہ میں نے تمہارے لئے اپنے بعد خدا کی کتاب چھوڑی ہے

کہ اگر تم اس کے احکام کو مضبوطی سے پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

پھر ارشاد فرمایا ''اے لوگو'' تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارے باپ ایک ہیں، تم آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو کہ میں تبلیغ کر چکا اور یا اللہ تو گواہ ہے کہ میں تبلیغ کر چکا حاضرین کو چاہئے کہ یہ کلمات غائبین کو پہنچادیں''۔

حج سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس روز تک مکہ معظمہ میں مقیم رہ کر مدینہ طیبہ واپس ہوئے۔

۱۱ھ سریہ اسامہ اور مرض وفات

سریہ اسامہ

مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد ۲۶ صفر ۱۱ھ بروز شنبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ جہاد روم کے لئے تیار فرمایا جس میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جیسے اکابر شامل تھے مگر اس سریہ کے امیر حضرت اسامہؓ مقرر ہوئے اور یہ آخری لشکر جس کی روانگی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انتظام فرمایا تھا ابھی روانہ نہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار شروع ہو گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض وفات

۲۸ صفر ۱۱ھ چہار شنبہ کی رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان بقیع غرقد میں تشریف لے جا کر اہل قبور کے لئے دعاء مغفرت کی اور فرمایا:

''اے اہل مقابر تمہیں اپنا یہ حال اور قبروں کا قیام مبارک ہو، کیونکہ اب دنیا میں تاریک فتنے ٹوٹ پڑے ہیں۔'' وہاں سے تشریف لائے تو سر میں درد تھا اور پھر بخار ہو گیا اور یہ بخار صحیح روایات کے موافق تیرہ روز تک متواتر رہا اور اسی حالت میں وفات ہو گئی، اسی عرصہ میں آپ اپنے دستور کے مطابق ہر روز ازواج مطہرات کے حجروں میں منتقل ہوتے رہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض طویل اور سخت ہو گیا تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ ایام مرض میں عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں رہیں سب نے اجازت دے دی۔

صدیق اکبرؓ کی امامت

رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تک بھی تشریف نہ لا سکے تو ارشاد فرمایا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہو نماز پڑھائیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تقریباً سترہ نمازیں پڑھائیں پھر ایک روز اتفاقاً صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ انصار کی ایک مجلس پر گزرے تو وہ سب رو رہے تھے سبب پوچھا تو کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کو یاد کر کے رو رہے ہیں حضرت عباسؓ نے یہ خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پہنچادی۔

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ اور حضرت فضلؓ کے کاندھوں پر ٹیک لگائے ہوئے باہر تشریف لائے، حضرت عباسؓ آگے آگے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے لیکن نیچے ہی سیڑھی پر جلوہ افروز رہے اور اوپر نہ چڑھ سکے اور بلیغ خطبہ دیا جس کے بعض کلمات یہ ہیں۔

آخر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ

اے لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے نبی کی موت سے ڈر رہے ہو، کیا مجھ سے پہلے کوئی نبی ہمیشہ رہا جو میں رہتا، ہاں میں اپنے پروردگار سے ملنے والا ہوں اور تم مجھ سے ملنے والے ہو، ہاں تمہارے ملنے کی جگہ حوض کوثر ہے پس جو شخص کہ یہ پسند کرے کہ بروز قیامت اس حوض سے سیراب ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنے ہاتھ اور زبان کو لایعنی اور بے ضرورت باتوں سے روکے، میں تمہیں مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک اور اتحاد کی وصیت کرتا ہوں اور ارشاد فرمایا کہ جب لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں تو ان کے حکام اور بادشاہ ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور جب وہ اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ بے رحمی کرتے ہیں۔ (دروس السیرۃ الحمدیہ)

اسکے بعد مکان میں تشریف لے گئے اور وفات سے پانچ یا تین روز پہلے ایک مرتبہ تشریف لائے سر مبارک باندھا ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ (صحیح یہ ہے کہ ظہر کی نماز تھی، فتح الباری ۱۰۶ ہندی۔ نماز پڑھا رہے تھے وہ پیچھے ہٹنے لگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کے اشارہ سے منع فرمایا اور خود ابوبکرؓ ﴿صحیح روایات کے موافق اس وقت آپ

ہی امام تھے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور تمام جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقتدی تھی، البتہ صدیق اکبرؓ بلند آواز سے تکبیر کہتے جاتے تھے۔ (مشکوۃ باب متابعۃ الاسلام ۱۲ منہ)

کے بائیں جانب بیٹھ گئے نماز کے بعد ایک مختصر خطبہ دیا جس کے دوران فرمایا ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ میرے محسن ہیں اور اگر میں خدا کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا، لیکن چونکہ خلیل خدا کے سوا کوئی نہیں اس لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے بھائی اور دوست ہیں۔"

اور فرمایا مسجد میں جتنے لوگوں کے دروازے ہیں وہ سب سوائے ابوبکرؓ کے دروازے کے بند کردیئے جائیں۔ (صحیح بخاری مع فتح ص ۳۵۶ ج ۱)

محدث ابن حبان نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس حدیث میں صاف اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبر ہی خلیفہ ہیں (فتح الباری پ ۱۴ ص ۳۵۶)

اس کے بعد دوسری ربیع الاول دوشنبہ کے روز لوگ صبح کی نماز حضرت صدیق اکبرؓ کے پیچھے پڑھ رہے تھے کہ یکایک آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کا پردہ کھول کر لوگوں کی طرف دیکھا اور تبسم فرمایا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے اور خوشی کی وجہ سے صحابہ کے قلوب نماز میں منتشر ہونے لگے۔

در نماز خمِ ابروئے تو چو یاد آمد   حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ نماز پوری کرو اور خود اندر تشریف لے گئے اور پردہ چھوڑ دیا اور اس کے بعد پھر باہر تشریف نہیں لائے اسی روز ظہر کے بعد اس عالم سے انتقال فرما کر رفیق اعلیٰ کے ساتھ واصل ہوئے فانا للہ وانا الیہ راجعون صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ✻ حاشیہ نمبر (۱) تاریخ وفات میں مشہور ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو واقع ہوئی ہے اور یہی جمہور مؤرخین لکھتے چلے آئے ہیں لیکن حساب سے کسی طرح یہ تاریخ وفات نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ بھی متفق علیہ اور یقینی امر ہے کہ وفات دوشنبہ کو ہوئی اور یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کا حج ۹ ذی الحجہ روز جمعہ کو ہوا، ان دونوں باتوں کے ملانے سے ربیع الاول دوشنبہ نہیں پڑتی اس لئے حافظ ابن حجر نے شرح صحیح بخاری میں طویل بحث کے بعد اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ تاریخ وفات دوسری ربیع الاول ہے کتابت کی غلطی

سے (۲-کا-۱۲) اور عربی عبارت میں ثانی شہر ربیع الاول کا ثانی عشر ربیع الاول بن گیا۔ حافظ مغلطائی نے بھی دوسری تاریخ کو ترجیح دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ﴾ تریسٹھ (۶۳) برس تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس مرض کے دوران میں کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم چہرہ مبارک سے چادر اٹھا کر فرماتے تھے کہ یہود ونصاریٰ پر اس لئے خدا کی لعنت آئی کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ہے" غرض یہ تھی کہ مسلمان اس سے بچیں" (بخاری ص ۱۰۵)

آہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری کلمات میں جس چیز سے ڈرایا تھا وہ بھی آج مسلمانوں نے نہ چھوڑا اور اولیاء وصلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا ڈالا، نعوذ باللہ۔ حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں ﴿ بیہقی نے بروایت صدیقہ نقل کیا ہے کہ آخری لمحہ حیات میں زبان مبارک پر یہ الفاظ الصلوۃ وما ملکت ایمانکم یعنی نماز کا اوران لوگوں کے حقوق کا بڑا خیال رکھو جو تمہارے قبضہ میں ہیں۔ ﴾ کہ قریب وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھت کی طرف دیکھتے اور فرماتے تھے یعنی یا اللہ میں رفیق اعلیٰ کو پسند کرتا ہوں، بعض روایات میں ہے کہ آخری لحات حیات میں زبان رسالت پر الصلوٰۃ الصلوٰۃ کے کلمات جاری رہے۔

﴿ حاشیہ نمبر (۱) حافظ ابن حجر نے اس قول کو ترجیح دی ہے فتح الباری ۱۰۲ ﴾ (خصائص کبریٰ)

وفات کی خبر صحابہ رضی اللہ عنہم میں شائع ہوئی تو گویا سب کی عقلیں اڑ گئیں، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی فرط غم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا انکار کرنے لگے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس وقت تشریف لائے تو ایک مختصر سا خطبہ دیا جس میں لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو سن لے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو سمجھ لے کہ وہ "حی قیوم" آج بھی زندہ ہے یہ سن کر صحابہ کو کچھ ہوش آیا۔

پھر چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ کا قائم کرنا سب سے پہلا اور مقدم کام تھا کیونکہ دوسرے دینی ودنیوی معاملات کے خلل اور بیرونی واندرونی دشمنوں کے حملے کے علاوہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین سے پہلے ہی خلیفہ کا قائم کرنا ضروری

سمجھا اور اس قضیہ کے طے ہونے میں کچھ دیر ہوئی اور اسی پیر کے دن سے بدھ کی رات تک توقف ہوا، بدھ کی رات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل وکفن دیا اور نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ قبر شریف حدیث شریف کے موافق صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں اسی جگہ کھودی گئی جہاں وفات ہوئی تھی۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے قبر کھودی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وعباس رضی اللہ عنہ نے قبر میں رکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف ایک بالشت اونچی رکھی گئی۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو مختصراً بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ کا کچھ حصہ مختصراً پیش کر دیا جائے شاید خداوند کریم ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وماذلک علی اللہ بعزیز۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وخصائل ومعجزات اخلاق شریفہ

آپ سب سے زیادہ شجاع وبہادر اور سب سے زیادہ سخی تھے جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تو فوراً عطا فرما دیتے تھے، سب سے زیادہ حلیم وبردبار تھے، یہاں تک کہ صحابہ نے کفار کی ایک قوم کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان کے متعلق بددعا فرمائیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں رحمت ہو کر آیا ہوں عذاب بن کر نہیں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید کیا گیا مگر اس وقت بھی ان کے لئے دعائے مغفرت ہی فرماتے تھے۔ آپ سب سے زیادہ حیادار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کسی کے چہرے پر نہ ٹھہرتی تھی، اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے انتقام نہ لیتے تھے اور نہ غصہ ہوتے تھے ہاں جب حدود خداوندی پر دست اندازی کی جاتی تو غصہ آتا تھا، اور جب غصہ آتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی ٹھہر نہ سکتا، جب آپ کو دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو ہمیشہ ان میں سے آسان کو اختیار فرماتے۔۔ (تاکہ امت کے لئے سہولت ہو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا البتہ اگر مرغوب

ہوتا تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگا کر نہ کھاتے اور نہ میز پر بیٹھ کر کھاتے تھے، نہ سینی پر اور نہ کبھی آپ کے لئے پتلی چپاتی پکائی گئی، ککڑی خربوزہ کو کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے، شہد اور تمام شیریں کو طبعاً پسند فرماتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے اہل بیت نے جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر دو دو مہینے صاف اس طرح گزر جاتے تھے کہ چولہے میں آگ جلانے کی بھی نوبت نہ آتی تھی بلکہ صرف چھواروں اور پانی پر گزر ہوتی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا خود سی لیتے اور کپڑے میں پیوند خود لگاتے تھے، اپنے اہل بیت کے کاروبار میں رہتے تھے، مریضوں کی عیادت کرتے تھے جب کوئی آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیتا "خواہ وہ امیر ہوتا یا مفلس" اس کے یہاں تشریف لے جاتے تھے کسی مفلس کو اس کے فقر کی وجہ سے حقیر نہ جانتے تھے اور کسی بڑے سے بڑے بادشاہ سے اس کے ملک کی وجہ سے مرعوب نہ ہوتے تھے، اپنے پیچھے اپنے غلام وغیرہ کو سوار کر لیتے تھے، موٹے کپڑے پہنتے تھے اور گٹھے ہوئے جوتے پہن لیتے تھے، سفید کپڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند تھے، کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے اور بیکار باتوں سے اجتناب فرماتے تھے، نماز کو طویل اور خطبہ مختصر پڑھتے تھے، غلاموں اور مفلسوں کے ساتھ چلنے پھرنے سے پرہیز نہ فرماتے تھے، کبھی کبھی ہنسی اور خوش طبعی کی باتیں فرماتے تھے لیکن اس وقت بھی واقعہ کے خلاف نہ بولتے تھے تمام انسانوں سے زیادہ خندہ پیشانی و خوش خلق تھے عذر خواہ کا عذر قبول فرما لیتے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن مجید تھا یعنی جس چیز کو قرآن پسند کرتا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پسند فرماتے تھے، اور جس کو قرآن پسند نہ کرتا تھا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناپسند فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہیں سونگھی۔

معجزات

دنیوی بادشاہ جب کسی کو اپنی طرف سے کسی صوبہ کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے ہیں تو

اس کے ساتھ کچھ نشانیاں دی جاتی ہیں کہ فوج اور وہ اختیارات جن کو عام رعایا نافذ نہیں کر سکتی اس طرح خدائے تعالیٰ کے رسول جب دنیا میں آتے ہیں تو ان کے ساتھ صدق و دیانت اور حسن خلق اور جملہ کمالات بشریہ کی نشانیوں کے ساتھ ایک قوت قاہرہ بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے معاندین کی گردنیں جھک جاتی ہیں اسی قوت قاہرہ اور فوق العادت اختیارات کا نام معجزات اور خرق عادت ہے۔

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تعداد اور کیفیت کے لحاظ سے بھی تمام انبیاء سابقین سے افضل ہیں اور زائد ہیں۔

پہلے انبیاء علیہم السلام کے معجزات ان کی مقدس ہستیوں تک محدود تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن آج بھی ہر مسلم کے ہاتھ میں ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری قومیں اور جن وانس عاجز ہیں اس کے علاوہ چاند کے دوٹکڑے کر دینا، انگلیوں سے پانی جاری ہونا۔ کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، لکڑی کے ستون کا رونا، درختوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنا، درختوں کا بلانا اور ان کا آ جانا، ہزاروں پیشین گوئیوں کا آفتاب کی طرح صادق ہونا وغیرہ وغیرہ ہزاروں معجزات ہیں جو نہ صرف آیات اور صحیح احادیث میں وارد ہیں بلکہ کفار کی شہادت سے بھی ثابت ہیں جن کو علماء متقدین ومتاخرین نے مستقل تصنیفوں میں ثابت کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ کی خصائص کبری اور متاخرین میں رسالہ ''الکلام المبین'' اردو اسی مضمون میں لکھے گئے ہیں مگر اس مختصر رسالہ میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مولای صل وسلم دائما ابداً
علی حبیبک خیر الخلق کلھم

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

بندہ محمد شفیع دیوبندی غفرلہ ولوالدیہ ومشائخہ

تعدادازواج پرایک نظر

حضرت مولاناسیدابوالحسن ندوی رحمہ اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کا ایک حصہ تجرد میں گزارا، یہ پچیس سال کی وہ مدت ہے، جونوجوانی کا خاص زمانہ ہوتا ہے، آپ کامل الفطرت انسانی وعربی جوانمردی اور جسمانی صحت کا بہترین واعلیٰ پیکر تھے، بادیہ عرب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش ہوئی تھی، تہذیب وتمدن کے امراض اور عیوب سے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی تھی، شہسواری اور مردانگی کی اعلیٰ صفات سے آپ کو حصہ وافر ملا تھا، جن کی عربوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی، اور جن کو علم النفس اور اخلاقیات کے ماہر بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آپ کے بدترین دشمنوں کو بھی اس زمانہ میں (جو نبوت سے قبل آپ کا بہت اہم اور نازک دور تھا) آپ پر حرف گیری اور انگشت نمائی کا کوئی موقع نہ ملا، نہ آپ کی نبوت کے بعد آج تک کسی نے اس سلسلہ میں آپ پر نکتہ چینی کی آپ طہارت وعفت، پاکیزگی قلب ونظر، معصومیت وطہارت کی اعلیٰ مثال تھے اور ہر اس کمزوری سے بہت دور تھے، جو آپ کے شایان شان نہ تھی۔

پچیس سال کی اس عمر میں آپ نے سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو بیوہ تھیں، چالیس سال ان کی عمر تھی، اس سے قبل ان کی دوشادیاں ہو چکی تھیں، صاحب اولاد تھیں، پھر مشہور قول کے مطابق آپ کے اور ان کے سن میں پندرہ سال کا فرق تھا...... اس کے بعد دوسری شادی آپ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت کی جبکہ آپ کی عمر مبارک پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی، ان کے شوہر کا حبشہ میں ایک مہاجر مسلمان کی حیثیت سے انتقال ہو گیا تھا، آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی دوشیزہ اور غیر شادی شدہ خاتون سے نکاح نہیں فرمایا، اس کے علاوہ جتنی

شادیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں، اس میں دین اور دعوت دین کی کوئی مصلحت، فراخ قلبی و عالی ظرفی، مکارمِ اخلاق، مسلمانوں کا کوئی مفادِ عام، یا کسی برے اجتماعی خطرہ اور مفسد کا سد باب آپ کے پیش نظر تھا۔ رشتوں اور ازدواجی قرابتوں کی عربوں کی قبائلی اور سماجی زندگی میں جس قدر اہمیت ہے، اتنی کسی اور سوسائٹی اور سماج میں نہیں ہے، اس لئے یہ شادیاں اور نئی قرابتیں، اسلامی دعوت اور اسلام کے مثالی معاشرہ کی تاریخ خون بہانے سے حفاظت اور عربی قبائل کے ضرر سے بچاؤ کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔

مزید یہ کہ ان ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی زندگی کوئی عیش و آرام مرفہ الحالی یا لذت کام ودہن کی زندگی نہ تھی، جو تعدد ازدواج میں بہت سے لوگوں کے پیش نظر رہتا ہے، وہ اس درجہ زہد و تقشف اور ایثار و قناعت کی زندگی تھی، جس کی استطاعت قدیم اور جدید دور کے بڑے سے بڑے حوصلہ مند اور اولوالعزم افراد اور نامور زہاد میں بھی نہیں ہے، ایک انصاف پسند شخص کے لئے قرآن مجید کی یہی ایک آیت کافی ہے:

”اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کردوں اور اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلب گار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں، ان کے لئے خدا نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔“

اس عالی مقصد، پاکیزہ جذبہ پاک وصاف ذہن اور عمیق و حکیمانہ تربیت کا اثر یہ تھا کہ ان سے ازواج مطہرات نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور ادنیٰ درجہ کے تردد کے اللہ اور اس کے رسول، اور دارِ آخرت کو ترجیح دی، مثال اور نمونہ کے طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا وہ جواب کافی ہے، جو اس سلسلہ میں انہوں نے دیا۔

”آپ نے یہ آیت ان کے سامنے تلاوت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو جلدی نہ کرنا اپنے والدین سے مشورہ ضرور کر لینا، انہوں نے جواب دیا، بھلا اس معاملہ میں والدین سے مشورہ کی ضرورت ہے؟ مجھے تو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر مطلوب ہے۔“

وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب بیویوں نے ایسا ہی کیا۔

تعددِ ازواج اور اس کے نفسیاتی اقتصادی اور اجتماعی اثرات اور تقاضوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کی عظیم ذمہ داری، جہد و مجاہدہ کی زندگی اور مسلمانوں کے اہم ترین امور سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں کیا، بلکہ اس سے آپ کی سرگرمی واولوالعزمی اور قوت و نشاط میں کچھ اور اضافہ ہوگیا، ازواج مطہرات تبلیغ اسلام اور تعلیم دین کے مقصد عظیم میں آپ کی معاون و مددگار تھیں، وہ غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہتی تھیں، زخمیوں کا علاج معالجہ اور مریضوں کی تیمارداری کرتی تھیں، آپ کی گھریلو اور معاشرتی زندگی کا ایک تہائی حصہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے احکام وتعلیمات ازواج مطہرات ہی کی رہینِ منت ہیں، اور مسلمانوں نے ان کو باقاعدہ ان سے سیکھا، یاد کیا، اور دوسروں کو بتایا اور سکھایا ہے۔

اس سلسلہ میں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نام لے لینا کافی ہے، جن کے متعلق فن علم الرجال اور طبقات کے امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے اپنی مشہور کتاب تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:

''وہ فقہائے صحابہ میں بھی سب سے ممتاز تھیں، فقہائے صحابہ مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے، قبیصہ بنت ذویب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مسائل سے سب سے زیادہ واقف تھیں، اکابر صحابہ ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے، ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ اہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حدیث کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے اور ان کے پاس اس کا علم ضرور ہوتا، حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید، حلال وحرام، فرائض واحکام، اشعار، تاریخ عرب اور انساب سے ان سے زیادہ کسی کو واقف نہیں پایا۔''

جہاں تک مکارم اخلاق، عالی ہمتی، جود وسخا، ہمدردی وغمخواری اور شفقت ودلداری کا تعلق ہے، اس کے متعلق جتنا بھی کہا جائے کم ہی ہوگا، اس سلسلہ میں وہ روایت کافی ہوگی، جو ہشام نے اپنے والد سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک لاکھ درہم بھیجے، بخدا ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اہل حاجت پر اس کو تقسیم کر کے فارغ ہوگئیں، شام کو ان کی باندی نے کہا کہ اگر آپ اس میں ایک درہم کا گوشت خرید لیتیں تو اچھا تھا، کہنے لگیں کہ تم نے اس وقت یاد نہ دلایا؟

اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روزہ سے تھیں۔

اس مسئلہ نے مغرب کے بہت سے اہل فکر اور مستشرقین کے ذہن و دماغ کو الجھا رکھا ہے، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انہوں نے ممالک عرب میں اور اسلامی شریعت میں ازدواجی زندگی کے مخصوص نظام کو مغربی تصورات اور حالات و عادات اور رسم و رواج کا پابند بنانا چاہا ہے، انہوں نے مغرب کے پیمانوں کو (جو ایک خاص تہذیب اور سوسائٹی کی پیداوار ہیں) اس صورت حال پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے، جو فطرت سلیم اور عربی ماحول کے عین مطابق تھی، اور جس کے پیچھے مختلف اخلاقی اور سماجی مصالح کارفرما تھے، اور جس کی خدا کی طرف سے اجازت بھی تھی، یہ دراصل مغربی طرز فکر اور مغربی مصنفین کی کتابوں کا ایک بہت کمزور پہلو ہے کہ وہ پہلے مغرب کو میزان قرار دیتے ہیں، پھر ہر اس چیز کے خلاف جو اس کے خلاف ہو، بے رحمی سے فیصلے صادر کرتے ہیں، وہ خود ایک مسئلہ کھڑا کرتے ہیں، جس کی کوئی جڑ بنیاد نہیں ہوتی پھر اس کو حل کرنے کے درپے ہوتے ہیں، یہ ان کے قومی تکبر اور مغرب کے دل پسند افکار و تصورات کی حد سے بڑھی ہوئی تقدیس کا نتیجہ ہے۔

انگریز مصنف مسٹر بوڈلے (R.V.C. Bodley) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مسئلہ میں اس مغربی احساس اور طرز فکر پر بہت جرأت و انصاف سے تنقید کی ہے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ازدواجی زندگی کو نہ تو مغرب کے پیمانہ سے جانچنے کی ضرورت ہے، اور نہ ان رسوم و قوانین کے نقطۂ نظر سے جنہیں عیسائیت نے جنم دیا ہے، یہ لوگ نہ مغربی تھے نہ عیسائی، بلکہ وہ ایک ایسے ملک میں ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جبکہ ان کے اپنے ضابطۂ اخلاق کا ہی چلن تھا، اس کے باوجود امریکہ اور یورپ کے ضابطۂ اخلاق کو عربوں کے ضابطۂ اخلاق سے بہتر سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، مغرب کے پاس مشرق کو دینے کے لئے بہت کچھ ہے، لیکن اپنے طریقۂ زندگی کو بہتر اور اپنے ضابطہ اخلاق کو اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے تو انہیں بھی بہت چھان بین کرنے کی ضرورت ہے، لہٰذا انہیں دوسروں کے مذہب و تمدن پر نکتہ چینی کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔"

اس کے علاوہ تعداد ازواج کی وہ قباحت جو آج مغرب میں ایک بدیہی حقیقت بن گئی ہے، اور اہل مغرب نے اس کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرلیا ہے، کوئی ایسی قباحت نہیں جو صدیوں اور نسلوں تک قائم رہے، یہ نہ طے شدہ علمی اصولوں پر قائم ہے، نہ انسان کی فطرت سلیم کے مطابق ہے، یہ دراصل ایک خیالی اور جذباتی قباحت ہے، جو پر جوش اور طاقتور پروپیگنڈہ اور تشہیر کے بل پر قائم ہے، اور اس کا پورا امکان ہے کہ زمانہ کی رفتار اور اقتصادی سماجی اور تربیتی رجحانات اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ نہ صرف اس کا زور کم ہو جائے بلکہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

ایک مغربی مصنف (Alwin Toffler) نے اپنی نئی کتاب
(Future Shock) میں جس نے مغرب کے علمی حلقوں میں
ایک ہلچل مچا دی ہے، اس ذہنی وسماجی تبدیلی کی طرف اشارے بھی
کئے ہیں جس کا مستقبل قریب میں امکان ہے۔

(بحوالہ ماہنامہ ''مدینۃ العلم'')

عِصمتِ انبیاء علیہم السلام

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے مضمون پر ایک نظر

(از مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری استاذ دار العلوم دیوبند)

"اسلام" اپنی ان بنیادی خصوصیات میں جن کی بنا پر وہ پورے عالم انسانیت میں تمام مذاہب وادیان پر ایک حقیقی اور سچی فوقیت رکھتا ہے۔ اور جن حقائق کے باعث وہ خالق ارض وسماء کا پسندیدہ مذہب اور مقبول ومنتخب "دین" ٹھہرا ہے منفرد اور یکتا حیثیت رکھتا ہے ان سب میں اس کا سب سے زیادہ واضح امتیاز وخصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام اوہام وغلط تخیلات کو جن کا تعلق اعمال وافعال، عقائد وافکار، کلیات وجزئیات، کردار وعمل سے تھا، یکسر غلط قرار دے کر عالم انسانیت کے سامنے تاریکیوں واندھیریوں سے نکلنے کے لئے کبھی گل نہ ہونے والی ایک روشنی پیش کر دی۔ سچائی وصداقت کے صاف وشفاف سرچشمہ سے پھوٹنے والی سوتیں گمراہ انسانوں کے ہجوم اور باطل پرست دل ودماغ کو تموہات واوہام کی آلودگیوں اور غلاظتوں سے پاک وصاف کرتی چلی گئیں۔

اس نے افراط وتفریط کے بالمقابل "اعتدال" وراست روی کا ایک ایسا صحیح اور بے خطر نقطۂ اعتدال انسان کے سامنے پیش کیا جو فطرت سلیم کے مطابق اور انسانیت کے ہر توانا و صحیح مزاج کے یقیناً موافق تھا۔ یہی سب سے بڑا امتیاز وانفرادیت ہے جس کی بناء پر ترجمان فطرت (قرآن حکیم) نے با آواز بلند کہا کہ:

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" یقیناً یہی وہ "دین مستقیم" تھا جس کی تعلیم خدا کے

برگزیدہ پیغمبر و رسل نے خالق کائنات کے بے راہ رو بندوں کو دی تھی اور جس پر قائم و دائم رہنے کی وصیت آخری لمحات میں بھی کی جاتی رہی۔

وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

"اور وصیت کی اس ملت کی حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام نے اے میری اولاد اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین اسلام منتخب کرلیا ہے پس تم مسلمان ہو کر ہی مرنا"

لیکن زود فراموش انسان نے جس کی دماغی طاقتیں، بشری کمزوریوں کی بناء پر "ابلیس رجیم" کی اغوائی قوتوں کے سامنے اکثر و بیشتر مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں راہ ہدایت کو چھوڑ کر غوائت و ضلالت کے راستوں کو اختیار کیا۔ اس گم کردہ راہی کے نتائج ظاہر ہیں کہ حقیقت سے دور ہو جانے کے بعد، عقائد و اعتقادات اعمال و افعال، ظاہر و باطن میں اتنے رخنے پڑ گئے کہ "دین قیم" کی مضبوط عمارت کمزور اور اس کی صورت و شکل انسانوں کے ہاتھوں مسخ سے مسخ تر ہوتی چلی گئی۔ اور پھر افکار و عقائد کی غلط روی "اللہ واحد" کے بارے میں بھی ٹھوکریں کھاتی رہی اور اس کے بعد انسانیت کے مرکزی محور اور عبد و معبود کے درمیان "نقطۂ اتصال" یعنی معاشر انبیاء کے متعلق بھی شکوک و شبہات کے دروازے کھول دیئے گئے، دامن عصمت تار تار کیا گیا، مثال عفت و پاک دامنی داغدار کی گئی، باطن سے پھوٹنے والے تقویٰ و تقدس کے مواج بحر کو، نمود و نمائش کا مکروہ نام دیا گیا۔ غرضیکہ کوئی عیب و سقم نہ تھا۔ کوئی اخلاق و کردار کی لغزش نہ تھی جس میں اس مقدس ترین جماعت کو ملوث و تر دامن نہ سمجھا گیا۔ بہر حال انبیاء صادقین کی روشن کی ہوئی شمع جب بجھادی گئی تو ساری دنیا میں روحانی اعتبار سے ایک اندھیرا چھا گیا، دنیا اور اس میں رہنے والے انسان انہیں فکری و اعتقادی اندھیریوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے کہ اچانک یثرب کی پہاڑیوں سے یقین و ایمان کی ایک روشنی نمودار ہوئی جس نے حقیقت کو بے غبار کر دیا، اور صداقت کے گرد آلود مطلع کو صاف و شفاف کر کے سامنے رکھ دیا۔ اللہ کے اس پیغامبر نے عبد و معبود کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو از سر نو جوڑا، اور انسان کے سامنے حقیقت کو "آمیزش" سے الگ کر کے

پیش کیا۔ نبوت ورسالت سے متعلق انسانی غلط تصورات وخیالات کومحو کر کے حقیقت کے رخ زیبا کو بے نقاب کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلام سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبوں اور زاویوں کی طرح انبیاء کے متعلق بھی دنیا کے سامنے کوئی واضح اور حقیقت پسندانہ تصور نہ تھا بلکہ خود انسانوں کے تراشے ہوئے افکار وعقائد تھے جن سے حقیقت کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''اسلام سے پہلے نبوت ورسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔'' (سیرۃ النبی جلد ۴ ص ۵۸۴)

لیکن: ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی اس کے فرائض بتائے اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا۔'' (بحوالہ مذکور)

اور پھر عصمت انبیاء کے بارے میں ایک ایسا یقین، عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا کہ جس کی ہوا تک دنیا کو لگی نہ تھی، لکھتے ہیں کہ:

''نبوت ورسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی ورسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو نبوت و رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔'' (ایضاً ص ۵۸۶)

تسلیم ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معصوم سمجھتے تھے لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ باقی تمام انبیاء کے متعلق وہ ایسے گھناؤنے خیالات کے مالک تھے جن کے تصور سے بھی انسانیت پانی پانی ہو جاتی ہے، مگر اسلام نے اس غلط اور مشتبہ تصور کے مقابل: ''دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے، کیوں کہ گناہ گار گناہ گاروں کی راہنمائی کا مستحق نہیں اور اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا نہیں۔'' (ایضاً)

اس مختصر تفصیل سے واضح ہوا کہ انبیاء کی عصمت کے متعلق ایک غیر مشتبہ حقیقت اور واضح تصور اسلام ہی نے پیش کیا ورنہ اسلام سے قبل اس شعبہ میں بھی دنیا عام طور پر غلط اور گمراہ کن تصور اختیار کیے ہوئے تھی۔ لیکن افسوس کہ اب مسلمانوں ہی میں ایک تجدد پسند اور

(بزعم خود) روشن خیال طبقہ (جیسا کہ پروفیسر اجمل خاں صاحب اور سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) عہد مظلمہ (مورخین کی اصطلاح مراد نہیں، بلکہ حقیقت واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے بے اختیار یہ لفظ قلم پر جاری ہو گیا۔ (انظر) کی یاد تازہ کر رہا ہے اور انہیں گڑے ہوئے دبے ہوئے خیالات کو اپنا کر اچھال رہا ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ طاقتوں نے حرف غلط کی طرح صفحۂ عالم سے مٹا کر رکھ دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط خیالات کی جانب متجددین کا رجحان، الصادق المصدوق روحی فداہ کی اس پیشین گوئی کے مطابق ہے کہ ''جو اگلی امتوں میں ہوا ہے وہ بعینہ میری امت بھی کر کے رہے گی'' انہیں گمراہ کن تصورات کو بعض تو عقیدہ کی حیثیت اختیار کر کے خود بھی گمراہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ضلالت میں ڈال رہے ہیں اور بعض اہل قلم باوجود عقیدہ کی استقامت کے ان مخدوش عقائد کو نادانستہ طور پر زبان قلم پر لا رہے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ ایسے وقت میں جبکہ ''تجدد پسند حلقہ'' دین قیم کی شکل کو مسخ کرنے پر تلا ہوا ہے، یہ اقدام کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں ہمارے مشہور اور قابل عزت مضمون نگار پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (یہاں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ زیر نظر مضمون میں پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کو اجمل خاں صاحب اور مودودی صاحب کی طرح ان متجددین میں شمار کیا جا رہا ہے جنہوں نے تجدد کے شوق باطل میں روح اسلام کو نظر انداز کر دیا ہے، اس لئے کہ اسی مضمون کے اخیر میں پروفیسر صاحب سے مضمون نگار نے اپنے اختلاف کی حدود متعین کر دی ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا، وہ صرف ان کی ایک علمی تحقیق تھی جو غلط بھی ہو سکتی ہے اس علمی تحقیق کا تعلق کسی دینی گمراہی اور عقائد میں مسلک جمہور سے انحراف کے جذبے سے بالکل نہیں۔ پروفیسر صاحب رسالہ دار العلوم کے قابل قدر مضمون نگار ہیں اور ان کے علمی افادات (علمی اختلاف کی گنجائش کے ساتھ) اہل علم کے لئے قابل قدر ہیں) نے عصمت انبیاء پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے لیکن مقالہ نگار کے دینی رسوخ و استقامت پر اعتماد کے باوجود مضمون کے بعض گوشوں سے دلائل و شواہد کی روشنی میں ہم کو اختلاف ہے۔ اپنی رائے اور محققین امت کے فیصلہ کو ناظرین تک پہنچانے کے لئے یہ سطور تحریر کی جا رہی

ہیں، اس مقالہ کی تحریر کا باعث یہ امر بھی ہے کہ سطحی معلومات رکھنے والے غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہوں اور گمراہ فرقوں کو اس کی آڑ میں خود تراشیدہ خیالات کی اشاعت و تائید حاصل کرنے کا موقع نہ ملے۔ فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ انبیاء سے صغائر کا صدور بالقصد ہو سکتا ہے، اسی خیال کی تائید علامہ تفتازانی کی ایک تحریر سے بھی حاصل کی گئی ہے، حالانکہ محققین علماء کا مسلک اور فیصلہ یہ ہے کہ انبیاء سے صغائر کا صدور ارادہ سے ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ کبائر کا ارتکاب بالقصد محال ہے۔ نقطۂ نظر کے اسی اختلاف کو تحقیق و علم کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ سب سے پہلے ہم بتاتے ہیں کہ عصمت انبیاء کا مفہوم کیا ہے۔

عصمتِ انبیاء

فلاسفہ نے اپنے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے عصمت انبیاء کی تعریف میں کہا ہے کہ

"هو ملكته تمنع الفجور" (الدوانی ص ۹۷)

عصمت ایک ایسی قوت راسخہ کا نام ہے جس کے بعد گناہوں کا صدور محال ہو جاتا ہے۔"

لیکن متکلمین علماء کے خیال میں۔

"العصمة ان لايخلق الله تعالٰى فيهم ذنباً" (ایضاً)

"عصمت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ انبیاء میں ارتکاب گناہ کی صلاحیت نہ رکھے۔"

کا نام ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر "قصص القرآن" کی ایک عبارت پیش کی جائے جس سے عصمت انبیاء کے متعلق حقائق پسند تصورات کا علم ہو سکتا ہے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ:

"خالق کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کرسکتا ہے اور نیکی بھی، وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے ورارادۂ خیر کا بھی ہے اور یہی اس کے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے، ان متضاد قوتوں کے حامل انسانوں میں سے حضرت حق انسانی رشد و ہدایت اور وصول الی اللہ کے لئے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے اور اسکو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے

ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں'' سو جب یہ ہستی نبوت کے لئے چن لی جاتی ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل اور ارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی نافرمانیوں سے منزہ ہوتا کہ پیغام الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے، اور ''او خویشتن گم است کرا راہبری کند'' کا مصداق ثابت نہ ہو۔'' (قصص القرآن ج اول ص ۳۴)

مولانا آگے لکھتے ہیں کہ: ''اسی مجموعۂ حقیقت کا نام عصمت انبیاء ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔'' (بحوالۂ مذکور)

اس تفصیل سے غالباً معلوم ہو گیا ہو گا کہ دین و شریعت میں ''عصمت'' کی حقیقت کیا ہے اور عقائد میں اس معرکۃ الآراء مسئلہ کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ آیا انبیاء سے صغائر کا صدور بالقصد ہو سکتا ہے یا نہیں؟

مسامرہ میں ہے کہ: ''والمختار بجمهور اهل السنة العصمة عنهما ای عن الكبائر وعن الصغائر مطلقا.'' (ص ۹۵)

''انبیاء کے متعلق عصمت کا عقیدہ صغائر و کبائر سے مطلقاً رکھنا واجب ہے۔''

ہاں وہ صغائر جن سے کہ عام طور پر نفرت نہیں کی جاتی ان کا ارتکاب انبیاء سے ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی خطاء یا سہواً، اور لازم ہے کہ متنبہ ہونے کے ساتھ ہی ان کو ترک کر دے۔

مسامرہ میں ہے کہ: ''الا الصغائر غير المنفرة خطأً اوسهواً مع التنبيه عليه'' (مسامرہ) ''البتہ وہ صغائر صادر ہو سکتے ہیں جن سے عام طور پر نفرت نہیں کی جاتی بشرطیکہ متنبہ ہونے کے ساتھ ہی ان کو بھی چھوڑ دے۔''

اور رہے وہ صغائر جن کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ان سے انبیاء کی عصمت و احتراز ضروری ہے، اسی کتاب میں ہے: ''اما الصغائر المنفرة كسرقة لقمة اوجته و تسمى صغائر الخسته فهم معصومون عنها مطلقًا و كذا من غير المنفرة كنظرة الاجنبية عمداً (ص ۹۵)

''صغائر منفرۃ جن کا دوسرا نام صغائر خسیسہ ہے جیسا کہ کسی حقیر ترین شے کا چرانا وغیرہ

اس سے انبیاء قطعاً محفوظ ہیں۔ (مسامرہ ص ۹۵)

امام رازی نے لکھا ہے: "والمختار عندنا انه لم يصدر عنهم ذنب لاصغيرة ولا كبيرة من حين جاء تهم النبوة" "یعنی ہمارے نزدیک مختار مذہب یہ ہے کہ نبوت کے بعد انبیاء سے نہ کبیرہ کا صدور ہو سکتا ہے اور نہ صغیرہ کا۔" (ص ۴۵ خازن ج ۳)

علامہ سید شریف شرح مواقف میں لکھتے ہیں کہ: "والمختار عندنا وهو ان الانبياء فى زمان نبوتهم معصومون عن الكبائر مطلقاً وعن الصغائر عمداً." "ہمارا مختار مذہب ہے کہ انبیاء زمانہ نبوت میں کبائر وصغائر کے عمداً ارتکاب سے قطعاً محفوظ ہیں۔" (ص ۴۳۰)

علامہ تفتازانی خود شرح "مقاصد" میں رقم طراز ہیں کہ "والمذهب عندنا منع الكبائر بعد البعث مطلقاً والصغائر عمدًا" "ہمارا مذہب یہ ہے کہ بعثت کے بعد کبائر اور صغائر کا صدور انبیاء سے محال ہے۔" (ص ۱۹۳)

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی حاشیہ علی العقائد العضدیہ میں لکھتے ہیں کہ "عصمتهم عن الصغائر عمدًا مذهب المختار عند محققى الاشاعره." "عمداً صغائر سے محفوظ رہنا، محققین اشاعرہ کا مذہب مختار ہے۔" (حاشیہ علی العقائد العضدیہ)

حکیم الامت مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں کہ "ثم انتفاء الكبائر وتعمد الصغائر متفق عليه" (بیان القرآن ج اول) "پھر جان لو کہ کبائر کا صادر نہ ہونا مطلقاً اور صغائر کا صادر نہ ہونا قصداً متفق علیہ مسئلہ ہے۔"

یہ ملحوظ رہے کہ مولانا کی اس تحریر میں "تعمد صغائر" بذریعہ عطف، انتفاء کے تحت ہے۔

مذہب مختار پر مصنفات کے حوالوں سے جو کچھ سپرد قلم کیا گیا، اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ صغائر کا صدور بھی بالقصد والارادہ انبیاء سے محال ہے یہ محققین علماء کا اجماعی فیصلہ ہے اب اس سے اختلاف مناسب نہیں اور جو مذہب کہ اس کے مقابل پیش کیا جائے وہ متروک یا مرجوح قرار دیا جائے گا، عصمت انبیاء پر سب سے زیادہ منضبط کلام امام رازیؒ نے کیا ہے، ہم ان کے مختار مذہب کو سطور بالا میں پیش کر آئے ہیں اب عصمت پر امام کے

بعض دلائل مسئلہ کی وضاحت کے لئے سپر دقلم کئے جاتے ہیں۔

عصمت انبیاء پر امام رازیؒ کے چند حکیمانہ دلائل وشواہد

(۱) امام کہتے ہیں کہ اگر انبیاء سے گناہ کا صدور ہوگا تو ان کا مقام امت کے عام افراد سے بھی پست سمجھا جائے گا اور یہ ہرگز مناسب نہیں کیوں کہ تمام انبیاء رفعت ومنزلت کے سب سے اعلیٰ مقام پر من جانب اللہ فائز ہوتے ہیں۔

(۲) نیز اگر ان سے گناہوں کا صدور ہوا تو ان کی شہادت شرعاً قبول نہیں ہوسکتی، اور اس صورت میں وہ امت کے عام عادل افراد سے کم سمجھے جائیں گے۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ نبوت ورسالت کا مطلب یہ ہے کہ نبی خداوند تعالیٰ کے متعلق یہ خبر دیتا ہے کہ اس نے فلاں حکم کو مشروع قرار دیا ہے اگر نبی گنہ گار ہے تو پھر اس کی یہ شہادت وخبر کیسے مقبول ہوسکتی ہے، کیوں کہ عاصی وگنہ گار انسان کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، اور اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ یوم حشر ونشر میں نبی تمام انسانوں پر شاہد کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا جس کی تصریح قرآن کریم سے ثابت ہے، حالانکہ سطور بالا سے معلوم ہو چکا کہ مرتکب گناہ کی شہادت قابل قبول نہیں۔

(۳) تیسری قباحت یہ لازم آئے گی کہ اگر ان سے گناہ صادر ہوسکتے ہیں تو ان کی اتباع اس بدنام شعبہ میں بھی ضروری ہے اور یہ محال ہے کہ کسی ایسے شخص کو مقتدی بنایا جائے جس کا دامن لغزشوں سے داغ دار ہو۔

(۴) اس بنیادی حقیقت کا انکار کوئی سبک سر بھی نہیں کرسکتا کہ نبی جس کے مقام کو خداوند تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے اعلیٰ وارفع کیا، اور جس کو وحی پر امین قرار دیا اور جس کو اپنے بندوں اور اپنی مخلوق میں نائب کی حیثیت سے متعین کر کے بھیجا، اور جو براہ راست خداوند تعالیٰ سے "لاتفعل کذا" کو سن رہا ہے پھر وہی انہیں امور ممنوعہ کا صرف اپنی ہوا وہوس کے تحت ارتکاب کرے اور خداوند تعالیٰ کے اوامر ونواہی کو پس پشت ڈال دے، کیا اس سے زیادہ قبیح کوئی اقدام ہوسکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر سفلگی اور ہوسکتی ہے؟

(۵) اور امت کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ انبیاء اللہ اطاعت کی تعلیم دیتے ہیں

اور خالص عبودیت کی جانب مخلوق الٰہی کو متوجہ کرتے ہیں، اب اگر وہ خود اللہ کی اطاعت و حدود کو توڑتے ہیں تو پھر اس سے وعید کے مخاطب وہ بھی ہیں جس کو الکتاب المبین نے اس طرح سے پیش کیا ہے۔

"اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ افلا تعقلون وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَآ اَنْھٰکُمْ عَنْہُ"

"کیا تم امر کرتے ہو لوگوں کو بھلائی کا اور اپنے کو بھول جاتے ہو، اور حالانکہ تم کتاب اللہ کی تلاوت بھی کرتے ہو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور میں نہیں چاہتا کہ جس بات سے تم کو روکتا ہوں اس کی تم سے مخالفت کروں۔"

(۶) خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ۔ اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ.

"یعنی انبیاء امور خیر کی جانب میلان خاطر رکھتے تھے۔"

اس آیت ربانی کے الفاظ عام ہیں لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء ان تمام امور کو کرتے تھے جن کا ارتکاب مناسب اور بہتر ہوتا، اور ان افعال کو چھوڑتے تھے جن کا ترک اولیٰ تھا۔

"فثبت ان الانبیاء کانوا فاعلین لکل خیر و تارکین لکل منھی و ذٰلک ینافی صدور ذنب عنھم"

(۷) خداوند تعالیٰ نے متعدد آیات میں انبیاء کی اصطفائی شان کا اظہار کیا ہے اور بار بار اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام عالم میں ان کو منتخب کیا اور نبوت کے جلیل القدر منصب پر ان کو فائز کیا۔ اور جب کہ خداوند تعالیٰ ان کو اجتبائی و اصطفائی اعزاز سے سرفراز کر چکا، تو اب یہ صدور گناہ کے بالکل منافی ہے اس کے علاوہ اور بہت سے وجوہ و دلائل کا امامؒ نے اپنی تصانیف خصوصاً اربعین میں خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ (خازن، مواقف، و مقاصد وغیرہ)

اس مقام پر بعض سطحیت پسند ارباب کو غالباً یہ خلجان ہو کہ جب گناہ کا صدور انبیاء سے محال و ناممکن ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ان کی بعض لغزشوں کو عصیان وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور نیز ان کے اعتراف علی الذنوب و استغفار و انابت کے طویل قصے مکرر اور مفصل پیش کئے گئے ہیں حالانکہ اعتراف، انابت، ندامت، خوف و بکا مجرم ہی کرتا

ہے جو عصیان ونافرمانی سے محفوظ ہو اس کو ان تمام امور سے کیا واسطہ؟ امام نے اسی خلجان کو پیش کر کے ایک معقول جواب (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب القاسم میں موجود ہے جس میں مولانا ممدوح نے اسی مسئلہ عصمت پر ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ''معصیت کے تحقق کے لئے امر قبیح کا ارتکاب بہ نیت قبیح ہونا شرط ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک مفقود ہوگا تو معصیت باقی نہیں رہے گی، اب انبیاء سے جو لغزش ہوتی ہے اور جس کی ظاہری شکل وصورت گو امر قبیح یعنی معصیت سے ملتی جلتی ہوتی ہے لیکن اس میں نیت قبیح نہیں بلکہ نیت حسن کارفرما رہتی ہے۔ جیسا کہ حضرت آدمؑ نے شجر ممنوعہ کو کھایا بظاہر یہ فعل قبیح ہے لیکن ان کی نیت حسن تھی یعنی وہ خلود فی الجنۃ کے متمنی اور حضرت حق جل مجدہ کے قرب میں ہمیشہ رہنا چاہتے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ نبی سے معصیت کا کبھی صدور ہی نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں نیت قبیح موجود نہیں ہوتی جو کہ تحقق معصیت کے لئے شرط ہے۔ اب گناہ کا صدور جو امور اختیاریہ میں سے ہے اگر ہو بھی تو اس کو معصیت نہیں کہیں گے کیوں کہ معصیت کے تحقق کی شرط یعنی ''نیت قبیح'' کا ہونا مفقود ہے، انتہیٰ۔

یہ عاجز کہتا ہے کہ حضرت مولانا کی اس تحریر سے یہ سمجھنا کہ عام انسان بھی اپنی معصیت کو معصیت تسلیم کرنے سے انکار کریں گے کیونکہ وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری نیت قبیح نہیں تھی غلط ہوگا، کیونکہ تقریر مذکور کا تعلق صرف انبیاء سے عام انسانوں کی معصیت سے بحث نہیں، مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند درنوشتن شیر وشیر
شیر آں باشد کہ مردم می خورند　　شیر آں باشد کہ مردم رادریں

(انظر)

دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''انبیاء علو رفعت اور معرفت باللہ میں سب سے پیش پیش ہیں اور قرب خداوندی میں کوئی ان کا ہمسر وہموزن نہیں، ان زلات ولغزشوں کو وہ اپنے علو منصبی کے مقابل میں گناہ سمجھتے ہیں اور اپنے کمال طاعت کے بالمقابل عصیان سے تعبیر کر دیتے ہیں حالانکہ یہ ایسے گناہ نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ غیر سے صادر ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری جلالت قدر کے مقابل یہ افعال مناسب نہیں، مشہور مقولہ ہے کہ۔

''حسنات الابرار سیات المقربین'' (خازن ص ۴۵۱)

غرضیکہ امام رازیؒ کے حقائق پسند تصورات پر یہ انقلاب انگیز شواہد و براہین نیز علماء راسخین، جن کے علم وفہم، تقویٰ وتقدس پر امت نے اعتماد وبھروسہ کیا ہے، ان کے بیانات سے ثابت ہوگیا کہ انبیاء کو صغائر سے بھی اسی طرح محفوظ تسلیم کرنا ہوگا جیسا کہ کبائر کے ارتکاب سے عقیدۂ عصمت ذریعۂ ایمان اور داخل ایمان ہے، اب ہم بتائیں گے کہ تفتازانی نے جو کچھ شرح عقائد میں لکھا ہے وہ معتزلہ اور ایک جماعت قلیل کا مذہب ہونے کے علاوہ خلاف مختار بھی ہے۔

خازن میں ہے کہ: ''من منع من الکبائر و جواز الصغائر علی جهة العمد وهو قول اکثر المعتزلة (ص ۴۵۰)'' یہ قول ومسلک معتزلہ کا ہے کہ وہ انبیاء سے صغائر کا صدور بالقصد تسلیم کرتے ہیں۔''

شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ ''ذهب امام الحرمین منا وابوهاشم المعتزلی الی تجویز الصغائر عمدًا. (ص ۱۹۳ شرح مقاصد)'' یہ خیال ہے امام الحرمین کا اور ابوالہاشم معتزلی کا کہ وہ قصداً صغائر کا ارتکاب انبیاء سے جائز سمجھتے ہیں۔''

ایسے ہی مسامرہ میں ہے کہ: ''وهذا القول منقول عن امام الحرمین منا وابی هاشم من المعتزله.'' (مسامره ص ۹۵) ''امام الحرمین اور ابوالہاشم معتزلی اس کو جائز سمجھتے ہیں۔''

اس کے علاوہ مذکورہ بالا حقائق سے یہ بھی واضح ہوا کہ معتزلہ کا یہ مسلک مختار بھی نہیں جیسا کہ محققین علماء کے بیانات واقوال سے ثابت کیا گیا، نیز علامہ سید شریف نے مواقف میں خود اس کو خلاف مختار ٹھہرایا ہے۔ مواقف میں ہے کہ ''والمختار خلافه''. (ص ۴۲۹)

روح المعانی میں لکھا ہے کہ:

''قال العلامة الشریف المختار خلافه.'' (ص ۴۷۲ ج ۱۷)

''علامہ شریف نے لکھا ہے کہ مختار مذہب اس کے خلاف ہے۔''

ہماری اس مختصر بحث سے مسلک مختار کے تمام گوشے تقریباً واضح ہو چکے ہیں امید ہے کہ مسئلہ عصمت انبیاء میں سلامت روی کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے مذہب کو معتزلہ اور بعض دوسرے علماء کے اقوال کی تائید سے شکست وریخت کرنے کی جرأت نہ کی جائے گی اور فاضل مقالہ نگار کی تحریر سے غلط مضامین و ناروا جسارتوں کے لئے تائید کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ ہم اس حقیقت کا ایک بار پھر اعادہ کریں گے، مقالہ نگار کے عقائد وخیالات پر ہم کو اطمینان کلی ہے، جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں تفتازانی کی تحقیقات پر اعتماد کیا گیا ہے جس کو ''قلمی تسامح'' سے زیادہ نہیں کہا جاسکتا، حاشا کہ فاضل مضمون نگار، اجمل خان صاحب اور سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرح ''راہ اعتدال'' سے ہٹ کر عقائد کی الجھنوں میں مبتلا نہیں ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہماری تحریر کا مطالعہ کریں گے۔

بحث کے اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک تحریر پیش کی جائے، جو کہ جمہور کے مختار مذہب کی بہترین آئینہ دار ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ۔ ''انبیاء معصوم اور اولیاء (نظر انصاف شرط ہے جبکہ اخبار امت و ابرار وصالحین سے گناہ کبیرہ کا وقوع نہیں ہوتا تو کم از کم اولیاء اور انبیاء کے فرق مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے انبیاء سے صغائر کا صدور ممتنع ہونا چاہئے ورنہ کبائر کے عدم وقوع میں دونوں شریک ہوکر پھر کس مرکز پر ایک دوسرے سے جدا ہوں گے، حالانکہ دونوں گروہوں کے درمیان فرق مراتب کی دیواریں کی دیواریں حائل ہیں **وبینھما مفاوز تنقطع فیھا اعناق المطی**۔ (انظر شاہ) محفوظ ہوتے ہیں معصوم تو وہ ہے کہ باوجود استعداد گناہ کے پھر صدور گناہ اس سے محال ہو، اور محفوظ وہ ہے جس سے گناہ کا صدور ممکن ہو اگرچہ واقع نہ ہوتا ہو، اول مستلزم محال ہے اور ثانی ممکن غیر واقع۔'' (ملفوظات عزیزی)

حیرت ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے عصمت انبیاء پر معتزلہ کی دلیل کو راجح اور قوی قرار دیا ہے حالانکہ معتزلہ قبل نبوت صغائر کا ارتکاب انبیاء سے ناممکن نہیں سمجھتے، اب اگر عام نفرت سے محفوظ رہنے کے لئے کبائر سے احتیاط ضروری ہے تو اسی طرح صغائر سے بھی احتراز لازمی ہوگا، یہ تسلیم ہے کہ عام طور پر مرتکب کبیرہ سے جو تنفر ہوتا ہے اس درجہ کا صغائر کے مرتکب سے نہیں لیکن اس پر بھی نظر رکھنا ہوگی کہ مخالفین کے ہجوم اور معاندین کے انبوہ

میں نبوت ایسے منصب جلیل دعوے کے لئے ہمہ قسم کے گناہوں اور لغزشوں سے اپنے دامن کو پاک وصاف رکھنے کی شدید ضرورت ہے ورنہ دعویٰ نبوت کو شکست وریخت کرنے کے لئے معاندین ومنکرین جس طرح کبائر کے اظہار سے کام لے سکتے ہیں اسی طرح صغائر کے افشاء سے بھی نبی کی عصمت کو داغدار بنا کر اس کے خلاف نفرت کا جذبہ دل ودماغ، اور اذہان وقلوب میں پیدا کیا جا سکتا ہے، عام طور پر اس کا مشاہدہ بھی ہوتا رہا ہے۔ آج کل بھی آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص انتخابی مہم میں شرکت کرتا ہے تو اس کی ان فروگذاشتوں سے بھی عوام کو واقف وآگاہ کیا جاتا ہے جن پر نکیر کے لئے خواص امت بھی تیار نہیں، تو معتزلہ جبکہ قبل نبوت صغائر کے اقدام وارتکاب کو غیر ممکن نہیں سمجھتے تو عصمت انبیاء پر ان کی دلیل کیسے راجح کہی جا سکتی ہے معاذ اللہ کہ اس ''رائے'' میں اختلاف نظریات وفکر کو دخل نہیں، علم وتحقیق کی روشنی میں بات کو سمجھنا ہے ورنہ خذ ماصفا ودع ما کدر کے حکیمانہ اصول کے مطابق ان کی ناقابل قبول تحقیقات کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت وحرج نہیں۔''

عصمت انبیاء

فرمایا: حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے اور بائیں جانب شیطان ہوتا ہے فرشتہ خیر کی طرف لاتا ہے اور شیطان شر کی طرف اس پر حضرت عائشہؓ صدیقہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کی بھی بائیں جانب شیطان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہے **ولکنہ اسلم یا ولکنی اسلم** لیکن میں اس کے شر سے بچا لیا گیا ہوں۔ یا وہ میری خیر سے مغلوب ہو کر خود اسلام لے آیا تو ایک ہے مواد کا ہونا یہ تخلیق کا کمال ہے اگر مادہ بالکل نہ ہو تو خلقت کامل نہ ہوگی اور خلقت نہ ہو تو مادہ کامل نہیں ہو سکتا لیکن انبیاء میں مقاومت اور مخالفت نفس کی اتنی طاقت ہوتی۔ ہے کہ سارے عالم کی مخالفت نفس اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو کچھ انبیاء علیہم السلام کا عزم مضبوط ہوتا ہے اور ادھر حفاظت خداوندی شامل حال ہوتی ہے کہ شر کو پاس نہیں آنے دیتی۔ اسی لئے وہ ان کے حق میں کمال بنا۔ انبیاء کا عزم اور مجاہدہ اتنا قوی اتنا ہے کہ ان پر شر کا اثر نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مادے میں خود ہی اعتدال رکھا گیا ہو اور ان کے اندر ہر قسم کا اعتدال ہی اعتدال ہو۔

(ارشاد: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ)

حیات النبی
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ کے مضمون سے انتخاب
تفصیل کیلئے جدید ''سیرت النبی'' صفحہ ۱۵۵۱ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

یہ عقیدہ رکھنا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روح مبارک علیین میں ہے آپ کا اپنی قبر اور جسد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا آپ کی قبر مبارک پر درود وسلام پڑھا جائے تو پڑھنے والے کو ثواب ملتا ہے لیکن آپ سنتے نہیں کیا ایسا عقیدہ صحیح ہے کہ نہیں؟ اور غلط ہونیکی صورت میں بدعت سئیہ ہے یا نہیں؟ اور ایسے عقیدے والے کی امامت کا کیا حکم ہے؟ **بینوا توجروا**

الجواب: مبسملا و محمد لا و مصلیا و مسلما

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزار مبارک میں بجسدہ موجود ہیں اور حیات ہیں آپکے مزار کے پاس کھڑے ہو کر جو سلام کرتا اور درود پڑھتا ہے آپ خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں ہمارے کان نہیں کہ ہم سنیں آپ اپنے مزار میں حیات ہیں مزار مبارک کے ساتھ آپ کا تعلق بجسدہ وبروحہ ہے جو اس کے خلاف کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے وہ بدعتی ہے خراب عقیدے والا ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے حدیث میں ہے۔

ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیا (الحدیث)

" مشکوۃ فی الجمعۃ رواہ ابن ماجہ ای باسناد جید عن المنذری وله طرق کثیرۃ بالفاظ مختلفۃ مرقات جدید" (ج ۳ ص ۲۳۸)

ترجمہ:۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کے اجسام کو کھائے۔

یہ حدیث مشکوۃ باب الجمعہ میں ہے اسکو ابن ماجہ نے عمدہ سند کے ساتھ منذری سے روایت کیا ہے اور یہ بہت سے طرق سے مروی ہے۔

وعن ابی هريرة رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مَن صلى على عند قبرى ومن صلى على من بعيد اعلمته (رواه ابو الشيخ و سنده جيد) القول البديع ص١١٦)

" مشكوة رواه البيهقى فى شعب الايمان وفى حاشية اللمعات الجليله (ج٢ص ١٩٨)

اخرجه ابوبكر ابن ابى شيبه والعقيلى والطبرانى وفى المرقات رواه ابو الشيخ وابن حيان بسند جيد. (ج٣ ص ٣٤٣)

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو مجھ پر درود پڑھتا ہے میری قبر کے پاس، میں اس کو سنتا ہوں اور جو درود پڑھے مجھ پر دور سے اسکی اطلاع کی جاتی ہے (اسکو ابوالشیخ نے روایت کیا اسکی سند عمدہ ہے) مشکوۃ میں ہے بیہقی نے اسکو روایت کیا ہے شعب الایمان میں اور لمعات میں ہے کہ ابوبکر بن ابی شیبہ اور عقیلی اور طبرانی نے بھی یہ حدیث ذکر کی ہے اور مرقات میں ہے کہ اسکو ابوالشیخ اور ابن حیان نے عمدہ سند سے روایت کیا ہے۔

عن انس رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الانبياء (صلوة الله عليهم) احياء فى قبورهم يصلون (رواه ابن عدى رحمه الله والبيهقى رحمه الله) وغيرهما (شفاء السقام ص ١٣٤) اخرجه ابوا يعلى فى مسنده والبيهقى انباء الاذكيا للسيوطى.

ترجمہ:۔ حضرت انس سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں (اسکو عدی اور بیہقی نے اور انکے علاوہ نے روایت کیا کتاب شفاء السقام میں ص ۱۳۴ پر یہ حدیث ذکر کی ہے ابو العلی نے اپنی مسند میں اور بیہقی سے انباء الاذکیا جو سیوطی کی ہے۔

دو تین حدیثیں نقل کردی ہیں اس بات میں بکثرت احادیث وارد ہیں جن کا انکار نہیں

کیا جا سکتا اور جو انکار کرتا ہے بدعتی ہے خارج از اہل سنت والجماعت ہے غرض پڑھنے والے کو ثواب بھی پہنچتا ہے اور مزار مبارک کے قریب پڑھنے سے آپ سنتے بھی ہیں اور آپ اپنے مزار مبارک میں بجسدہ موجود ہیں اور حیات ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ السید مہدی حسن نقی دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح جمیل احمد تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور ۲۱ شوال ۱۳۷۶ھ اجاب المجیب واجاد محمد ضیاء الحق کان اللہ لہٗ مدرسہ جامعہ اشرفیہ، الجواب صواب، محمد رسول خان عفا اللہ عنہ.

ترجمہ:۔ مذکورہ جواب درست ہے جسکی تصحیح مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ مولانا ضیاء الحق صاحبؒ اور استاد الکل حضرت مولانا رسول خان صاحب نے کی ہے۔

الجواب: مبسملا و محمد لا و مصلیا و مسلما

انبیاء کیلئے موت مستمر کا قول حرام اور حیات مستمر کا قول واجب ہے

آیت کریمہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ۴ ع۸ آیت ۱۶۹)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے انکو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں انکو رزق بھی ملتا ہے وہ خوش ہیں اس چیز سے جو انکو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطاء فرمائی اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں انکی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں اور ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع

ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہونگے وہ خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت و فضل خداوندی کے اور بوجہ اسکے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں فرماتے (بیان القرآن آل عمران آیت ۱۷۱)

حکم بواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کو ہے یا ایسے ہی ہر مخاطب کو ہے کہ ان کو مستقل مردہ بھی مت گمان کرو۔ کیونکہ امواتا فعل "قتل" کا مفعول ثانی ہے اور افعال قلوب جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں جس سے استمرار کے معنی پیدا ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ کہنا تو کہنا، ایسا گمان کرنا بھی حرام ہے۔

اور احیاء بھی هم احیاء جملہ اسمیہ خبریہ استمرار یہ ہے جو حیات مستمرہ و مستقلہ کو ثابت کرتا ہے دونوں آیات سے جب موت مستمر کا قول اور موت دائم کا گمان کرنا حرام معلوم ہو گیا تو اسکی نقیض عدم قول و عدم گمان موت مستمر واجب قرار پائی۔ اور جیسے اوپر کی آیت میں الف، ب، ج، د، جاری ہیں یہاں بھی جاری ہونگے اور حضرات انبیاء خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء میں موت مستمر کا قول اور موت مستقل کا گمان حرام اور حیات مستمر کا قول و گمان واجب قرار پاتا ہے۔

" لا تحسبن" صیغہ نہی ہے اور نون تاکید ثقیلہ سے اس کی بہت تاکید کر کے موت مستمر کے گمان کرنے کے حرام ہونیکا حکم دیا ہے اور زبان سے کہنا تعبیر ہے ذہنی خیال کی۔ جس کو اصطلاح یہ کہتے ہیں کہ قضیہ ملفوظہ حکایت و نقل ہے قضیہ معقولہ، کی جیسے کہ وہ واقعہ کی نقل ہے جب اصل ذہنی تخیل ہی حرام ہے تو زبان اور لفظوں سے نکالنا بھی حرام ہے دونوں خلاف واقع ہیں کذاب ہیں حرام ہیں۔

حیات انبیاء کی حقیقت اور اس کے دلائل

" احیاء" کے بعد یہاں چند صفتیں بھی ہیں جن سے حیات کی نوعیت کی تشخیص ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اب اس پر غور کرنا ہے کہ جس حیات کا عقلی تخیل اور لفظوں میں بیان واجب ہے وہ کونسی حیات ہے۔

سنئے حیات کے حقیقی معنی زندگی مراد ہو سکتے ہیں یا مجازی معنی علم یا ایمان یا شہرت و نام مراد ہو۔ اور یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکتے ہوں ان سے ہٹانے والی کوئی

بات نہ ہو مجازی معنی مراد لینا غلط ہے۔اس لئے یہاں زندگی ہی کے معنی مراد ہوں گے پھر اس زندگی کی دو ہی صورتیں ہیں آخرت میں ہونا مراد ہوگا یا قبر میں ہونا مراد ہوگا، پھر قبر میں ہونے والی زندگی کی بھی دو ہی صورتیں ہیں صرف روح کی زندگی یا جسم و روح دونوں کی زندگی۔عقلا صرف یہی چار صورتیں بن سکتی ہیں۔کیونکہ پانچویں صورت کہ صرف جسم بلا روح کی زندگی ہو یہ ناممکن عادی ہے۔اب اس حیات سے آخرت کی حیات مراد لینا تو درست نہیں ہوگا۔کیونکہ ''اموات'' کہنے کی ممانعت کے بعد ''احیاء'' فرمایا ہے یہ کہنے کی ممانعت دنیا ہی میں ہے اور حیات ہونا اسی کی دلیل ہے جو دنیا ہی میں ہو سکنی ضروری ہے۔

دوسری دلیل: پھر بقول امام رازیؒ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی ہے شہیدوں کو دنیا ہی میں فرمایا جا رہا ہے کہ احیاء ہیں تو اسی وقت کی حیات مراد ہوگی۔

تیسری دلیل: تیسرے یہ کہ یہاں انکی عزت اور امتیاز کا بیان ہے آخرت کی ابدی حیات تو سب کو حاصل ہوگی کافروں کو بھی خلود فی النار کی حیات ہوگی تو امتیاز اسی میں ہے کہ ابھی ابھی دنیا میں و قبر میں حیات ہے۔

چوتھی دلیل: چوتھے ثواب عذاب سے افضل ہے جب عذاب کیلئے اسی وقت کی حیات ہوگی تو ثواب کیلئے بدرجہ اولی ہوگی۔کفار کیلئے ہے ''اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا'' فا کی تعقیب بتاتی ہے کہ غرق ہوتے ہی نار میں داخل ہو گئے اور عذاب کیلئے حیات ضروری ہے قیامت سے پہلے غرق ہوتے ہی نار میں داخل ہوں تو یہ عذاب قبر اور حیات قبر ہی ہے۔

پانچویں دلیل: پانچویں آیت ''اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا'' صبح و شام کے نار پر پیش کرنے کے لئے جب حیات ہے تو ثواب کیلئے بدرجہ اولی ہے۔آگے کی آیت ''وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ. اَدْخِلُوْآ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ'' سے معلوم ہو گیا کہ یہ قیامت سے پہلے ہے جو قبر ہی میں ہے حیات کیساتھ ہے ورنہ جامدات کو کیا عذاب۔

چھٹی دلیل: چھٹے اگر قیامت کی زندگی مراد ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''لاتحسبن'' نہ فرماتے جبکہ تمام مومنین کی حیات قیامت میں کی معلوم ہے۔

ساتویں دلیل: ساتویں '' یستبشرون '' آیت میں ان لوگوں کے حال سے

بشارت ہے جو ابھی تک ان سے نہیں ملے یہ دنیا میں ان کے حال سے بشارت حاصل کرنا بھی دنیا ہی میں قبل قیامت ہے اور حدیثوں سے دلیل حاصل ہے (تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۱۳۸)

روح مع الجسم کی حیات کے دلائل

بلکہ امام صاحب نے فرمایا ہے۔ والروایات فی ھذا الباب کانھا بلغت حد التواتر فکیف ممکن انکارھا.

ترجمہ:۔ اس باب (حیات النبی کے مسئلہ) میں روایات حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں ان سے انکار کیوں کر ممکن ہے۔

صرف روح کی زندگی مراد نہیں ہوگی کیونکہ یہ اعزاز و امتیاز کا موقعہ ہے اور وہ تو کافروں کو بھی حاصل ہوگی تو پھر امتیاز کیا ہوا۔

دوسری دلیل: دوسرے ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''لا تحسبن '' نہ فرمایا جاتا، موت کا عدم گمان حیات کا گمان ہوتا ہے حالانکہ خلود مومن و کافر سے یقینی حیات ہونا معلوم تھا صرف گمان نہ تھا۔

تیسری دلیل: تیسرے پہلی آیت میں ''احیاء '' کے بعد ''لا تشعرون '' ہے اگر صرف روحی حیات ہوتی تو ہر مسلمان جانتا کہ روحیں سب کی زندہ خلود جنت دوزخ سے ہونگی۔ پھر عدم شعور کیسا، وہاں تو شعور ہی شعور ہوگا۔

چوتھی دلیل: چوتھے اس آیت کا لفظ ''وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ '' دلیل ہے اسکی کیونکہ حصول بشارت جو خاصہ مجموعہ کا ہے زندہ لوگوں کے متعلق ہی کہا جا سکتا ہے کہ بشرہ جسم میں ہی تو ہے بشرہ کھال کو کہتے ہیں۔ استبشار اسی کا کھلوانا ہے یعنی خوشی ہے۔

پانچویں دلیل: پانچویں ''یرزقون '' فرمایا ہے۔ رزق کی ضرورت روح مع الجسم کو ہی ہوتی ہے۔

چھٹی دلیل: چھٹے جس قدر آیات واحادیث عذاب قبر کے بارے میں اور قبر میں جسم ہی ہوتا ہے مع الروح جمہور کے نزدیک اور بغیر روح کے عذاب وثواب کا فادہ ہی نہیں

نہ نقصان ہے نہ ثواب نہ عذاب۔ یہ سب دلیل ہیں کہ یہ حیات مجموعہ روح وجسم کی ہوتی ہے اور یہ مسئلہ تو تواتر سے ثابت ہے امام رازی کہتے ہیں۔ الاخبار فی ثواب القبر و عذابه کالمتواترة (ج۲ ص۵۳ تفسیر کبیر)

ترجمہ:۔ ثواب اور عذاب قبر کے بارے میں روایات مثل متواتر کے ہیں۔

آگے کچھ آیات نفس مسئلہ کے متعلق آنے والی ہیں جن سے روح وجسم کے مجموعہ کی حیات بھی ثابت ہوتی ہے بلکہ انبیاء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلکہ مومن کی بھی خصوصیت نہیں کافر تک کو بھی ایک قسم کی حیات جسمی حاصل ہے۔

حدیث سے حیات النبی کا اثبات اور اسکی نوعیت

احادیث صحیحہ ومتواترہ سے حیات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت ہے عربی میں امام بیہقیؒ اور علامہ سیوطیؒ وغیرہ کے اس پر رسائل ہیں اور اردو میں زمانہ حال کے مولینا صفدر صاحب اور مولانا خالد محمود صاحب کے رسالے موجود ہیں۔

علامہ سیوطیؒ کتاب الحاوی للفتاوی (ج۲ ص۱۴۷) پر کہتے ہیں۔

حیاة النبی صلی الله علیه وسلم فی قبره هو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا لما قام عندنا من الادلة فی ذالک وتواترت به الاخبار.

ترجمہ:۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کی حیات ہمارے نزدیک علم قطعی کے طور پر معلوم ہے جبکہ اس پر دلائل قائم ہو چکے ہیں اور احادیث حد تواترہ کو پہنچ چکی ہیں۔

اور اس کے بعد بہت سی احادیث نقل کر کے علامہ قرطبیؒ کا قول لکھا ہے۔

الی غیر ذالک مما یحصل من جملته القطع بان موت الانبیاء انما هو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لاندرکهم وان کانو موجودین احیاء وذالک کالحال فی الملائکة فانهم موجودون احیاء ولا یراهم احد من نوعنا الامن خصه الله بکرامته من اولیائه.

ترجمہ:۔ اس قسم کی روایات سے یہ بات قطعی طور پر حاصل ہوگئی ہے کہ موت انبیاء کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سے غائب ہیں کہ ہم ان کو پاتے نہیں اگرچہ وہ موجود ہیں زندہ ہیں

ان کا حال فرشتوں کا سا ہے کہ وہ موجود ہیں زندہ ہیں انسانوں میں سے کوئی انکونہیں دیکھ سکتا سوائے اس کے جس کو اللہ نے اپنے کرم سے خاص کرلیا ہو اولیاء میں سے۔

(شرح مواقف ج ۸ ص ۲۱۸) **والاحادیث الصحیحة الدالة علیه ای عذاب القبر اکثر من ان تحصی بحیث تواتر القدر المشترک وان کان کل واحد منها من قبیل الآحاد** ۔اوراس کے بعد احادیث درج ہیں۔

ترجمہ:۔اوراحادیث صحیحہ اس بات پر کہ عذاب قبر ہوتا ہے اتنی زیادہ ہیں کہ انکا احاطہ نہیں کیا جاسکتا ان میں عذاب قبر کا ہونا مشترک ہے اگر چہ ان میں سے ہر ایک از قبیل خبر واحد ہو۔

اورعلامہ سیوطیؒ کی کتاب شرح الصدور فی شرح احوال الموتی والقبور (ص ۶۳ سے ص ۷۲) تک پچاس احادیث درج ہیں اور پھر کچھ لوگوں کے واقعات بھی درج کئے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی بلکہ تمام انسانوں کی حیات احادیث متواترہ سے ثابت شدہ نقل کرنے کے بعد ہم جیسوں کو احادیث نقل کرنیکی ضرورت ہی نہیں اور نہ کسی راوی کے ضعف وقوت پر نظر کرنیکی گنجائش رہی کہ تواتر اس سے بلند وبالا حجت ہے اس لئے تواتر احادیث کے حوالے نقل کئے گئے نقل احادیث کی ضرورت نہیں۔

شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کا فتویٰ

عزیز الفتاوی جلد ا صفحہ ۹۳

ترجمہ سوال:۔انسان کا مرنے کے بعد ادراک وشعور باقی رہتا ہے اپنی قبر پر آنے والوں کو پہچانتا ہے ان کا سلام وکلام سنتا ہے یا نہیں؟

ترجمہ جواب: انسان کا ادراک وشعور باقی رہتا ہے اس بات پر شریعت اور قواعد فلسفیہ میں اجماع ہے پس باعتبار شریعت تو عذاب قبر اور قبر کی لذتوں کا پانا اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے جسکی تفصیل کیلئے ایک دفتر درکار ہے۔کتاب شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور جو کہ شیخ جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے میں اور دوسری کتب حدیث میں دیکھا جاسکتا ہے علم کلام کی کتابوں میں عذاب قبر کا ثبوت دیکھا جاسکتا ہے حتیٰ کہ بعض اہل کلام نے اس کے

منکر کو کافر قرار دیا ہے اور عذاب وراحت بغیر ادراک وشعور کے نہیں ہو سکتے۔

نیز مشہور احادیث میں زیارت قبور کے باب میں مردوں کو سلام کرنا اور ان سے ہمکلام ہونے کا ذکر یوں ثابت ہے " انتم لنا سلف و نحن بالاثر وانا انشاء اللہ بکم لا حقون " آپ ہم سے پہلے چلے گئے ہیں اور ہم آپکے نقش قدم پر آ رہے ہیں اور جلد ہی انشاء اللہ آپ سے مل جائیں گے اور بخاری ومسلم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء بدر سے یوں خطاب فرمایا:

"کیا تم نے اللہ کے وعدے کو سچ پالیا" لوگوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ کیا آپ ایسے جسموں سے کلام فرماتے ہیں جن میں روح نہیں "فرمایا" تم ان سے زیادہ نہیں سنتے لیکن وہ جواب نہیں دیتے"

قرآن پاک میں ثابت ہے "جو اللہ کے راستہ میں مارے گئے انکو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں انکو انکے رب کے پاس سے رزق ملتا ہے خوش ہوتے ہیں اس پر جو ان کو اللہ کے فضل سے ملتا ہے"

بلکہ اپنے پسماندگان کے احوال کے علم پر بھی انکی خوشی و بشارت ثابت ہے (قرآن میں ہے) "اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ (ان شواہدات کی روشنی میں) بالجملہ اگر اموات کے ادراک وشعور کا انکار کفر نہ بھی ہو تو اس کے الحاد ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔

اور قواعد فلسفیہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جسم سے روح کے جدا ہونے کے بعد اسکا باقی رہنا اور شعور و ادراک ولذت روحانی کا باقی رہنا یہ فلاسفہ کا متفق علیہ موقف ہے سوائے جالینوس کے اور اسی وجہ سے اسکو فلاسفہ میں شمار نہیں کیا گیا۔ پس یہ بات ظاہر ہے کہ بدن ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور روح کے شعور ادراک میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے پس روح کے جسم سے جدا ہونے کی صورت میں اس کے ادراک وشعور کے سلب ہونے کو ہم کس قسم میں شمار کریں گے۔

ترجمہ سوال: اگر ادراک وشعور باقی رہتا ہے تو کیا حیات تک باقی رہتا ہے یا کم وبیش؟

ترجمہ جواب: اہل قبور کا ادراک وشعور مرنے کے بعد بعض امور میں زیادہ ہو جاتا

ہے اور بعض میں کم۔ جن امور کا تعلق غیب سے ہوتا ہے ان میں ادراک زیادہ ہوتا ہے اور جن امور کا تعلق دنیا سے ہوتا ہے ان میں ادراک کم ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا التفات اور توجہ امور غیبیہ کی طرف زیادہ ہوتی ہے اور امور دینویہ کی طرف کم۔ اس اعتبار سے فرق ہو جاتا ہے۔ مگر اصل کے اعتبار سے ادراک وشعور میں دونوں یکساں ہیں۔ اگر غور کرو تو دنیا میں بھی توجہ کی کمی زیادتی سے ادراک وشعور میں کم زیادتی ہوتی ہے چنانچہ علمی نکات اور درباری موشگافیوں کو کم لوگ سمجھ پاتے ہیں اور کھانوں کے ذائقوں عورتوں کی عشرہ طرازیاں اور گانوں کی کیفیات وغیرہ کو امراء خوب محسوس کرتے ہیں اور علماء وفضلاء عموماً ان چیزوں کے ادراک سے قاصر ہیں یہ سب فرق اصل میں توجہ اور التفات کی کم بیشی سے ہی تو ہوتا ہے۔ فقط: خلیل احمد تھانوی

منکر حیات النبی کی امامت کا حکم

اوپر آیت واحادیث متواتر واجماع اہل حق وقبول عقل سلیم کے دلائل کے بعد شاہ صاحبؒ کا فتویٰ فیصلہ کن ہے۔

آیات کا انکار احادیث، متواترہ کا انکار، اجماع کا انکار، یہ سب ایسا تھا کہ اس پر اسلام کا باقی رہنا مشکل تھا۔ مگر بات یہ ہے قطعی الثبوت کے ساتھ قطعی الدلالت ہونا جب تک نہ ہو سکے انکار کو کفر نہیں کہا جا سکتا چونکہ بعض تاویلات ایسی ممکن ہیں جو قواعد عربیت پر صحیح بن جاتی ہیں گو دوسری آیات احادیث سے ان پر عمل درست نہ ہو۔

والحد و دتندرء بالشبہات۔

(شبہ پیدا ہونے سے حد ساقط ہو جاتی ہے)

اس لئے شاہ صاحبؒ نے فرمادیا ہے۔

"اگر کفر نہ باشد" (اگر کفر نہ ہو)

چونکہ یہ عقیدہ تمام اہل سنت کے خلاف ہے باطل فرقوں معتزلہ خارجیہ اور رافضیہ کا ہے اس لئے اس کو بدعت ضرور قرار دیا جائیگا۔ اور نماز کی امامت کا قاعدہ کے تحت آ

جائیگا جو فاسق یا بدعتی کے پیچھے نماز کا ہے ایسے شخص کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا۔ اور جس کو اچھے امام کے پیچھے نماز ملتی ہو پھر اقتداء کرنا بھی امام بنانا ہے اسکی اور امام بنائے رکھنے والوں کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔ اور جس کو ان دونوں سے یعنی امام بنائے رکھنے یا صحیح مل سکنے سے معذوری ہو اس کیلئے مکروہ تنزیہی ہوگی۔ کہ تنہا سے یہ جماعت افضل ہے جیسے کہ شامی میں یہ تفصیل احادیث

"من وقر فاسقا اور من وقر بدعیا" (الحدیث)

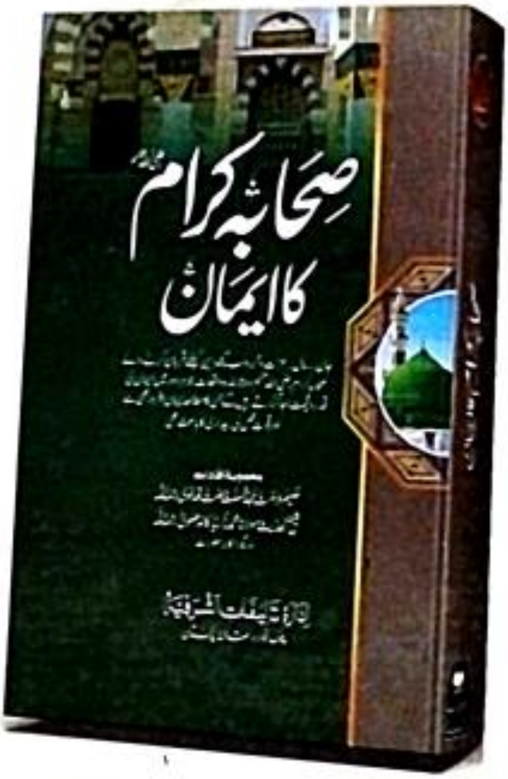
"اور صلوا خلف کل بر و فاجر" حدیث سے ماخوذ کر کے بیان ہے (جیسے کہ شامی نے کیا ہے جو توقیر کرے فاسق کی اور توقیر کرے بدعتی کی، اور نماز پڑھو ہر نیک و فاجر کے پیچھے والی احادیث سے استدلال کر کے مسئلہ کی وضاحت کی ہے)۔ واللہ اعلم

چونکہ انبیاء علیہم السلام اور دوسروں کی حیات بعد الموت میں اہل السنت والجماعت کی مخالفت سلف کے باطل فرقوں نے کی تھی۔ کچھ عقلی و نقلی دلائل بھی پیش کئے تھے بزرگان ملت نے ان کو نقل کر کے انکا باطل ہونا ظاہر و ثابت ہے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کیا کیا دلائل تجویز کرتے ہیں تو باطل ہونے کی دلیلیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ اہل السنت والجماعت سے معتزلہ وغیرہ کی تقلید کی امید نہیں ہے اسلئے سر دست پیش نہیں کی گئیں۔

وما علینا الا البلاغ

تم بحمد اللہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات وواقعات پر 5 مستند کتابیں



جان... مال... عزت وآبرو سب کچھ دین کیلئے قربان کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ تابندہ واقعات جو ہر دور میں ایمان کی قدر و قیمت اُجاگر کرتے رہیں گے جن کا مطالعہ ایمان افروز بھی ہے اور قوت عمل کی بیداری کا باعث بھی







کامل 2 جلد

www.taleefat.com
facebook.com/taleefat

لاکھوں میں پڑھا اور زندگیوں میں انقلاب لانے والا
23 سال سے مسلسل شائع ہونے والا اصلاحی میگزین

ماہنامہ
محاسنِ اسلام ملتان

زیر سرپرستی شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ